میں کون ہوں؟

نام کتاب:	میں کون ہوں؟ (پانچواں ایڈیشن)
پہلا ایڈیشن:	2021ء
پانچواں ایڈیشن:	2024ء
ناشر:	افتخار عارف (اسداللہ پبلشرز)
پروف ریڈنگ:	علیزہ وقار، عبداللہ حسن، عائزہ بشیر
سرورق:	سنان احمد
تزئین و آرائش:	ایچ گرافکس، لاہور

بذریعہ کوریئر کتاب منگوانے کے لیے رابطہ نمبر:

0312-4164284

میں کون ہوں؟ (حصہ اول)

نوٹ:

اِس کتاب کے دونوں حصے اور تمام ابواب؛ یہ سب ایک ہی وحدت کے مختلف اجزاء اور پہلو ہیں، لہٰذا کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ابواب کی ترتیب کوملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

میں کون ہوں؟ (حصہ دوم)

نوٹ:

اِس کتاب کے دونوں حصے اور تمام ابواب؛ یہ سب ایک ہی وحدت کے مختلف اجزاء اور پہلو ہیں، لہٰذا کتاب کا مطالعہ کرتے وقت ابواب کی ترتیب کو ملحوظِ خاطر رکھا جائے۔

اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش
کے ساتھ
چند چاہت بھری باتیں

میں کون ہوں؟

(حصہ اوّل)

باب:1

کتّااور بلّی

سُنا ہے انسانی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں!

یہ۔۔۔لامحدود کیا ہوتا ہے؟

انسانی خواہشات کی حقیقی نوعیت اور ماہیت جاننے کی کوشش کرنا یقیناً ایک دلچسپ مشغلہ ثابت ہوسکتا ہے،لیکن اس کے ساتھ ساتھ لامحدود کا تصور اپنی جگہ اِک دلکش معمّہ ہے، ایک قابلِ ذکر شے ہے۔

اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش جب بھی کسی چیز کو لامحدود کہہ رہے ہوتے ہیں تو دراصل تھوڑے دبے دبے الفاظ میں، اِک ڈھکے چھپے سے انداز میں اس چیز کی حقیقی نوعیت جاننے کے بارے میں اپنی لاعلمی کا اظہار کر رہے ہوتے ہیں۔ اس چیز کے حدودِ اربعہ کا کچھ بھی ٹھیک سے اندازہ نہ کر سکنے پر اپنی بےبسی کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ بنیادی طور پر لامحدود کہتے ہی اس چیز کو ہیں، جس کا حقیقی طور پرٹھیک ٹھیک تصور کرنا بھی انسان کے لیے ناممکن ہو۔ جو چیز بھی ایک بار انسانی تخیّل میں سما جائے، وہ چیز پھر لامحدود نہیں رہتی بلکہ محدود ہو جاتی ہے۔

آپ اپنے ذہن میں کوئی بھی بڑے سے بڑا عدد تصور کیجیے۔آپ کے ذہن میں پرورش پانے والا یہ عدد چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو جائے، یہ عدد ہمیشہ محدود رہے گا۔ لامحدود آپ کے اس تخیّلاتی عدد سے ہمیشہ بڑا ہی ہوگا۔نہ صرف بڑا ہوگا بلکہ۔۔۔۔۔لامحدود طور پر بڑا ہوگا۔

لامحدود کی اس تمام تر لامحدودیت کے باوجود ہر انسانی ذہن میں لامحدود کا ایک خام سا نقشہ ضرور موجود رہتا ہے اور پھر۔۔۔۔۔کسی بھی چیز کو لامحدود کہہ دینا اس چیز کو موضوعی (Subjective) بھی بنا دیتا ہے۔ ہر انسان کے ذہن میں موجود لامحدود کا تصور خود اس شخص کی اپنی ہی ذہنی وسعت اور استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔ میرے جیسے ایک عام انسان کا لامحدود کا تصور کچھ اور شے ہے، جبکہ کسی دانشور کے ذہن میں پرورش پانے والا لامحدود کا نقشہ بالکل ایک الگ چیز ہے۔

اگرچہ یہ دونوں ہی لامحدود کے تصورات ہیں مگر وسعت کے اعتبار سے یہ دونوں لامحدود کبھی برابر نہیں ہو سکتے اور شاید۔۔۔

اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کچھ لامحدود بڑے ہوتے ہیں تو کچھ لامحدود چھوٹے۔

تو یہ جو۔۔۔۔۔انسانی خواہشات ہیں۔۔۔۔۔یہ کون سے والا لامحدود ہوتی ہیں؟

ایک عام انسان کا چھوٹے والا لامحدود؟

یا پھر۔۔۔۔۔کسی دانشور کا بڑے والا لامحدود؟

گئے وقتوں کی بات ہے کہ کسی ساحلِ سمندر سے بس کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا کنواں ہوا کرتا تھا۔ اس کنویں میں کچھ مینڈک رہتے تھے۔ یہ کنواں نہ صرف بہت گہرا تھا بلکہ اس میں پانی کی سطح بھی بہت نیچی تھی، جس کی وجہ سے یہ مینڈک کنویں سے کبھی باہر نہ نکل پاتے۔ یہ مینڈک اسی کنویں میں پیدا ہوتے اور پھر اسی کنویں میں ہی پُھدک پُھدک کر مر جاتے۔ یہ محدود کنواں ہی ان مینڈکوں کی کل کائنات تھا۔

ہوا یوں کہ ایک چودھویں رات سمندر میں مدّوجزر بہت زیادہ ہوا۔ اتنا زیادہ کہ سمندر کا کچھ پانی بہتا ہوا اس کنویں میں گرنے لگا اور پھر اسی پانی کے بہاؤ پر غوطے کھاتا ہوا سمندر کا ایک مینڈک بھی کنویں میں گر گیا۔ ایک اجنبی مینڈک کو کنویں میں گرتا دیکھ کر کنویں کے سبھی مینڈک اس نووارِد کے گرد جمع ہو گئے اور حیرانی کے ساتھ اسے دیکھنے لگے۔ پھر کچھ لمحات بعد کنویں کا ایک مینڈک سمندر کے اس مینڈک سے پوچھنے لگا:

''میاں تم کہاں سے آن ٹپکے ہو؟''

سمندر کا مینڈک اس چھوٹے سے کنویں میں قید ہو کر بہت پریشان تھا۔ کنویں کی دیواریں اسے خود پر گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس اندھیرے میں ڈوبے کنویں میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سانس لیتے ہوئے وہ بتانے لگا:

''میں سمندر کا مینڈک ہوں۔ مدّوجزر کے سبب سمندر کے پانی کے ساتھ بہتا ہوا اس کنویں میں آن گرا ہوں۔''

کنویں کے مینڈکوں کے لیے یہ لفظ 'سمندر' بالکل اجنبی تھا۔ سب حیران ہو کر پوچھنے لگے:

''یہ۔۔۔۔سمندر کیا چیز ہوتی ہے؟''

سمندر کا مینڈک اس تنگ و تاریک کنویں میں کچھ وقت گزار کر ہی نڈھال ہو چکا تھا مگر

اپنی بچی کھچی ہمت جمع کر کے بتانے لگا:

''سمندر پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوتا ہے اور اس پانی میں بڑے بڑے جاندار موجود ہوتے ہیں۔''

یہ سب سن کر کنویں کے ایک مینڈک نے اچھل کود کرنا شروع کر دی اور کنویں کی دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلہ طے کر کے سمندر کے مینڈک سے پوچھنے لگا:

''کیا۔۔۔۔۔کیا اتنا بڑا ہوتا ہے یہ سمندر؟''

کنویں کے مینڈک کی یہ بات سن کر سمندر کے مینڈک کو اپنی حالتِ زار کے باوجود ہنسی آ گئی، لیکن اپنی ہنسی پر قابو پا کر بتانے لگا:

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔سمندر تو اس سے بہت بڑا ہوتا ہے۔''

کنویں کے مینڈک نے یہ سنتے ہی ایک بار پھر سے کنویں کی دیوار کے ساتھ ساتھ اپنی اچھل کود شروع کر دی۔ اب کی بار اس نے کنویں کا ایک چکر مکمل کیا اور پھر امید بھری نگاہوں سے سمندر کے مینڈک کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا:

''کیا اتنا بڑا ہوتا ہے سمندر؟''

اب کی بار تو سمندر کے مینڈک کے لیے اپنی ہنسی روکنا ہی مشکل ہو گیا۔ ہنستے ہنستے وہ کنویں کی دیواروں کے ساتھ لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ اسے کھانسی کا شدید دورہ بھی پڑا۔ کافی دیر بعد سانس کچھ بحال ہوئی تو کنویں کے مینڈک کو بتانے لگا:

''سمندر تمہارے اس کنویں سے بڑا، بہت بڑا۔۔۔ بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔''

یہ سنتے ہی کنویں کے سبھی مینڈک مل کر چلّانے لگے:

''نہیں نہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو۔ اس کنویں سے بڑا کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کنواں ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ یہ کنواں ہی کل کائنات ہے۔''

انسانی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں اور یہ لامحدود کتنا بڑا لامحدود ہے، اس بات کو جاننے کے لیے ہم میں سے ہر شخص بھی محض کنویں کا ایک مینڈک ہے۔ ہر انسان اپنے حالاتِ زندگی کے ایک محدود کنویں میں پیدا ہوتا ہے اور پھر اسی کنویں میں پُھدک پُھدک کر مر جاتا ہے۔

یہ جانے بنا ہی کہ اس محدود کنویں سے باہر کتنی بڑی دنیا موجود تھی۔

پھر مسئلہ محض یہ نہیں ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ساری زندگی خود اپنی ہی خواہشات کی

لامحدودیت سے لاعلم رہتا ہے، اصل پریشانی والی بات تو یہ ہے کہ جن چیزوں کو ہم اپنی خواہشات سمجھ کرانہیں حاصل کرنے کی جستجو کرتے رہتے ہیں، ان میں سے ہماری حقیقی خواہش کوئی ایک چیز بھی نہیں ہوتی۔ ہم لاعلمی میں اپنی مجبوریوں کو اور چھوٹی چھوٹی ضروریاتِ زندگی کو اپنی خواہشات سمجھ رہے ہوتے ہیں، حالانکہ ہماری حقیقی خواہشات تو اس چھوٹے کنویں سے باہر۔۔۔دور۔۔۔

کہیں بہت دور موجود ہوتی ہیں۔

شاید۔۔۔۔شاید آپ میری اس بات سے اتفاق نہ کرتے ہوں گے اور شاید آپ کا یہ اختلافِ رائے کچھ ایسا غلط بھی نہ ہو۔ ظاہری بات ہے کہ اگر ایک شخص اپنی پسندیدہ گاڑی حاصل کرنے کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا ہے تو یقیناً اس گاڑی کا حصول ہی اس شخص کی حقیقی خواہش بھی ہو گی۔

چلیں! ایک کام کرتے ہیں۔

انسانی خواہشات کی حقیقی نوعیت جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

پاکستان کے خوبصورت شمالی علاقہ جات کی جانب ایک سفر کرتے ہیں۔ اس مختصر سفر میں میرا ساتھ دیتے ہوئے اپنی قوتِ تخیل کا بھرپور۔۔۔۔۔بھرپور استعمال کیجیے گا۔۔۔

فرض کیجیے۔۔۔

آپ ایک ادبی ذوق رکھنے والے انسان ہیں اور۔۔۔

آپ کے زندگی میں بس تین ہی شوق ہیں۔۔۔

کتاب۔۔۔۔۔سنگیت۔۔۔۔۔اور سفر۔

کتاب اور سنگیت تو خیر ہمیشہ ہی آپ کے ساتھ رہتے ہیں، البتہ سفر کی اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے آپ کو موسمِ گرما کی تعطیلات کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ ہر سال کی طرح اس موسمِ گرما بھی آپ سیر و تفریح کا ایک پروگرام مرتب کرتے ہیں اور۔۔۔

اب کی بار آپ کی منزل ہے۔۔۔''وادیٔ نیلم''۔

آپ معاشی طور پر ایک متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لیے آپ کا یہ سفر ہمیشہ پبلک ٹرانسپورٹ پر ہوتا ہے۔ آپ کو خود اپنے ساتھ وقت گزارنا اچھا لگتا ہے، اس لیے آپ سفر ہمیشہ اکیلے ہی کرتے ہیں۔

اب اس وقت، لمحۂ موجود میں آپ ایک بس میں سوار اپنی منزل کی جانب گامزن ہیں۔ آپ کا یہ سفر بائیس گھنٹوں پر مشتمل تھا، جس میں سے نو گھنٹے گزر بھی چکے ہیں۔

رات 2 بج کر 35 منٹ۔۔۔

بس کے اندر سبھی مسافر خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں۔ ہر سُو اِک خاموشی ہے۔

بس سے باہر چاروں طرف چاند کی مدھم روشنی ہے۔ ہر جانب ایک سکون ہے۔

آپ کو لگتا ہے کہ پوری کائنات میں اس وقت بس اکیلے آپ موجود ہیں۔آپ اپنی اس تنہائی کو جی جان سے محسوس کرتے ہیں۔آپ کی سفر کی خواہش آپ کے مزاج کے عین مطابق پوری ہو رہی ہے۔آپ خوش ہیں اور پھر اپنی اس خوشی کو دوبالا کرنے کے لیے آپ اپنے دوسرے دونوں ذوق بھی پورے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہینڈز فری کانوں میں لگا کر آپ جگجیت کی ایک غزل چلاتے ہیں اور ساتھ ہی اپنی پسندیدہ کتاب کا مطالعہ بھی شروع کر دیتے ہیں۔

کتاب ہے۔۔۔۔۔سنگیت ہے۔۔۔۔۔اور سفر بھی۔

کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لیتے ہوئے آپ اپنی زندگی کے تینوں شوق بیک وقت پورے کرتے رہتے ہیں اور اب آپ کی منزل بھی تو آپ سے کچھ زیادہ دور نہیں رہی۔آپ کے لاشعور میں وادئ نیلم ہوشربا انگڑائیاں لینا شروع ہو چکی ہے۔دریائے نیلم کے یخ بستہ پانی کی ٹھنڈک کو آپ ابھی سے اپنے اندر اترتا ہوا محسوس کرنے لگتے ہیں۔آپ کی سبھی خواہشات پوری ہو رہی ہیں۔

آپ خوش ہیں۔۔۔۔۔آپ مزے میں ہیں۔

آپ کو زندگی سے اور کچھ نہیں چاہیے اور۔۔۔

اور اگلا آدھا گھنٹہ آپ کو واقعتاً زندگی سے اور کچھ نہیں چاہیے۔

سب اچھا ہے۔۔۔۔۔سب خوبصورت ہے۔

مگر پھر۔۔۔

آدھے گھنٹے بعد کولڈ ڈرنک اپنا اثر دکھانا شروع کر دیتی ہے۔

اور۔۔۔۔آپ کو لگ جاتی ہے۔

لگ جاتی ہے مطلب۔۔۔۔۔''لگ'' جاتی ہے۔

اور لگی چاہے دل کی ہو یا پھر۔۔۔۔۔دونوں بہت بری ہوتی ہیں۔

انسان کو کوئی اور کام کرنے لائق چھوڑتی ہی نہیں۔ لاکھ کوشش کریں اسے نظر انداز کرنے کی مگر یہ لگی انسان کو اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہے، اپنی جانب متوجہ کیے رکھتی ہے۔ یہ لگی بڑی ضدی اور ہٹ دھرم ہوتی ہے۔بس اپنی بات منواتی ہے ہمیشہ۔

آپ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ آپ کی اس لگی کی لگن میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ دریائے نیلم میں اچانک سے سیلابی کیفیت پیدا ہونا شروع ہو جاتی ہے۔

بدلتے حالات کے پیشِ نظر آپ کولڈ ڈرنک سے ہاتھ واپس کھینچ لیتے ہیں لیکن اپنا مطالعہ جاری رکھتے ہیں۔ پسِ منظر میں ایک خوبصورت غزل بھی آپ کے کانوں میں رس گھول رہی ہے۔

اور پھر۔۔۔

ہولے ہولے۔۔۔ دھیرے دھیرے۔۔۔ چپکے چپکے۔۔۔

آپ کی لگی کی لگن اس درجہ بڑھ جاتی ہے کہ پورا دریائے نیلم آپ کو اپنے اندر بہتا ہوا محسوس ہونے لگتا ہے۔ دریا کی طغیانی ہے کہ ہر لمحہ بڑھتی چلی جا رہی ہے اور پھر۔۔۔

ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ آپ کے لیے اپنی پسندیدہ کتاب پر توجہ مرکوز رکھنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اپنی عدم توجہگی کو محسوس کرتے ہوئے آپ کتاب کو بند کر دیتے ہیں اور محض سنگیت سے دل بہلانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، مگر جانے کیوں؟

جگجیت بھی آج کچھ اچھا نہیں گا رہا۔ اپنی لگی کے بوجھ تلے آپ کو جگجیت جی کے سُر بھی جلے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ایک بیزاری والی کیفیت میں آپ میوزک بھی بند کر دیتے ہیں اور اب آپ کو حالات کی سنگینی کا اچھے سے اندازہ ہو جاتا ہے۔ آپ محسوس کرتے ہیں کہ اگر ابھی سے دریا کے آگے بندھ نا لگائے گئے تو یہ سب کچھ۔۔۔۔۔ سب کچھ اپنے ساتھ بہا کر لے جائے گا۔

مجبوراً آپ بس کے عملے کو اپنی جانب متوجہ کرتے ہیں اور پھر۔۔۔

شرماتے شرماتے لگن گاہ (Toilet) کے بارے میں دریافت کرتے ہیں اور جواب میں آپ کو یہی بتایا جاتا ہے کہ بس کو تقریباً چالیس منٹ بعد ایک سروس ایریا پر روکا جائے گا۔

اگلے چالیس منٹ آپ اپنی نشست پر خاموش، بالکل خاموش بیٹھ کر بس کسی نہ کسی طرح اس لگی کی لگن کو برداشت کرتے رہتے ہیں۔ آپ سرتوڑ کوشش کرتے ہیں کہ کسی بھی طرح دریا میں آتے سیلاب کو روکا جائے۔ حالات کی سنگینی کے بوجھ تلے آپ کے چہرے کے تاثرات بھی معمول سے تھوڑا ہٹ کر ہیں۔۔۔۔۔ قوتِ ضبط کی اس آزمائش کے دوران۔۔۔

آپ اپنی ''حقیقی خواہشات'' کتاب اور سنگیت کو تو بالکل ہی بھول چکے ہوں گے، جبکہ اگلے چالیس منٹ آپ اپنی پسندیدہ چیز۔۔۔۔۔ یعنی سفر سے شدید نفرت محسوس کریں گے۔ آپ کی یہی

خواہش ہوگی کہ کسی بھی طرح بس۔۔۔۔۔جلدی سے یہ مردود سفر ختم ہوجائے۔

جبکہ۔۔۔۔۔کولڈ ڈرنک؟؟؟

کولڈ ڈرنک کی جانب تو محض دیکھنا بھی پوری وادی کو پانی پانی کرسکتا ہے۔اب آپ کی زندگی کی تمام خواہشات،تمام ادبی ذوق وشوق۔۔۔۔۔سب ختم ہو چکا ہے،سب کچھ ختم ہو چکا ہے۔

اب آپ کی زندگی میں بس ایک ہی جستجو باقی ہے اور ایک ہی تلاش۔۔۔

آپ کی نگاہیں نہایت بے صبری کے ساتھ ڈھونڈ رہی ہیں۔۔۔

ایک بیت الخلاء(Toilet)

ان حالات میں آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہوگی۔۔۔

ایک بیت الخلاء(Toilet)

چالیس منٹ بعد بس جب سروس ایریا پر رکے گی تو۔۔۔

اس وقت اگر آپ کو اپنی اس ''خواہش'' کی تکمیل کے لیے بھاگنا پڑا۔۔۔

آپ بھاگیں گے۔۔۔۔۔اگر آپ کو جھک جھک کر چلنا پڑا۔۔۔

آپ جھک جھک کر چلیں گے اور اگر آپ کو اپنی اس ''خواہش'' کے حصول کے لیے اپنے ہی جیسے کسی لگی کے مارے کے ساتھ دوڑ لگانا پڑی تو آپ دوڑیں گے۔

آخر یہ زندگی ایک ریس ہی تو ہے ناں۔

چلیں!اب بس۔۔۔

بس اب واپس آجایئے۔واپس اپنے کمرے میں آجایئے۔

اب آپ سے ایک سوال پوچھتا ہوں۔ذرا سوچ سمجھ کر جواب دیجیے گا۔

آپ کی اس لگی کو،اس لگن کو۔۔۔۔۔آپ کی اس لگی لگن کو یا پھر لگن لگی کو کیا کہنا چاہیے؟

خواہش؟۔۔۔۔۔شوق؟۔۔۔۔۔ضرورت؟۔۔۔۔۔یا پھر مجبوری؟

آپ کی حقیقی خواہشات تو کتاب،سنگیت اور سفر تھیں ناں؟

مگر ایک بیت الخلاء کی ضرورت نے آپ کو آپ کی ان تینوں خواہشات سے دور کردیا۔

تو پھر۔۔۔۔۔کیا۔۔۔۔۔

کیا یہ بیت الخلاء۔۔۔۔۔یہ ٹوائلٹ۔۔۔۔۔

آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے؟؟؟

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں ہمارے اردگرد جتنی بھی ''بڑی بڑی خواہشات'' نظر آتی ہیں ۔۔۔
وہ خواہشات جن کے پیچھے ہم ساری ساری زندگی دوڑتے رہتے ہیں، دوسروں کے ساتھ ریس لگائی جاتی ہے، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ہماری حقیقی خواہش نہیں ہے۔

یہ تمام چیزیں ہماری ضروریات ہیں، مجبوریاں ہیں۔

بالکل ویسی ہی مجبوری۔۔۔۔۔ جیسے مجبوری بیت الخلاء ہے۔

ہماری حقیقی خواہشات ان مجبوریوں سے پرے۔۔۔۔۔ دور، کہیں بہت دور موجود ہیں۔

اس تخیلاتی سفر کے دوران بیت الخلاء کی ضرورت نے آپ کی خواہشات کتاب، سنگیت اور سفر کو اپنے پیچھے چھپا لیا۔ بیت الخلاء کی ضرورت نے پردے کا کام کیا۔ بالکل اسی طرح سے یہ کتاب، سنگیت اور سفر بھی آپ کی حقیقی خواہشات نہیں ہیں۔ یہ بھی ایک پردہ ہے۔

یہ بھی ایک حجاب ہے۔۔۔۔۔ حجاب در حجاب ہے۔

درحقیقت انسانی خواہشات تہہ در تہہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپی ہوئی موجود رہتی ہیں۔ جب تک پہلی تہہ کو الگ نہ کیا جائے گا، تب تک معلوم ہو ہی نہیں سکتا کہ نیچے والی تہہ میں کیا چھپا ہے۔

تو کیا۔۔۔

کیا کسی بھی طرح انسان کی حقیقی خواہشات کو جانا جا سکتا ہے؟

اگر ایک انسان سے اس کی تمام ضروریات کو، تمام مجبوریوں کو دور کر دیا جائے تو پھر۔۔۔

اس انسان کی خواہشات کی نوعیت اور ماہیت کیا ہو گی؟

انسانی خواہشات تہہ در تہہ اک دوسرے کے پیچھے چھپی ہوئی ہوتی ہیں۔ اگر ان تمام تہوں کو، اگر ان تمام پردوں کو ہٹا دیا جائے تو سب سے پیچھے۔۔۔

سب سے آخر میں کیا چیز موجود ہو گی؟

ایک کے بعد ایک۔۔۔۔۔ ایک کے بعد ایک اگر کسی شخص کی تمام خواہشات کو پورا کیا جاتا رہے تو اس شخص کی آخری خواہش کی نوعیت کیا ہو گی؟

اور کیا۔۔۔

کیا کسی بھی طرح اس کنویں کے مینڈک کو۔۔۔۔۔ کنویں سے باہر نکالا جا سکتا ہے؟؟؟

بنیادی طور پر انسانی شعور اور لاشعور میں موجود تمام خواہشات کو تین حصوں یا لیولز میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

لیول ون: امید کا دریا

جب میں چھوٹا سا تھا۔۔۔

مطلب جب میں بہت ہی چھوٹا سا تھا۔۔۔اتنا چھوٹا کہ اگر اماں ایک دن کے لیے بھی مجھے اپنے ساتھ کہیں لے کر جاتیں تو میرے لیے الگ سے کپڑوں کا ایک بیگ تیار کیا جاتا اور پھر اس بیگ میں میرے لیے ایک قمیض رکھی جاتی اور جانگیے (Trousers) سات۔ قمیض اور نیکروں کی تعداد میں موجود اس عدم توازن کی وجہ میں کبھی نہ جان سکا۔ جانے اماں ایسا کیوں کیا کرتی تھیں؟

بہرحال یہ بچپن کی، پچھلی صدی کی باتیں ہیں۔ ان دنوں گرمیوں کی دوپہریں، سردیوں کی راتوں سے زیادہ خاموش اور ویران ہوا کرتی تھیں۔ ہر جانب اِک ہُو کا عالم ہوتا تھا۔ گرمیوں کی ان طویل ترین دوپہروں میں میرا سارا وقت اپنے کتے اور بلی کے ساتھ گزرا کرتا تھا۔ یہی میرے بچپن کے ساتھی تھے اور یہی میرے دو بہترین دوست۔

میرے یہ کتا اور بلی ''وہ'' والے کتا بلی نہ تھے بلکہ یہ تو دو چھوٹے چھوٹے مقناطیس تھے۔ نسبتاً بڑا مقناطیس میرا کتا تھا جبکہ چھوٹے والے مقناطیس کو میں نے بلی کا نام دے رکھا تھا۔

اگرچہ اس وقت تک مجھے مقناطیسی قوتوں کے بارے میں کچھ بھی اندازہ نہیں تھا مگر کتے اور بلی کی چند عجیب وغریب حرکتیں مجھے حیران ضرور کیا کرتی تھیں اور پھر اپنے بار بار کے تجربات کے سبب میں یہ بات جان گیا کہ اگر کتا اور بلی دونوں ہی کھڑے یا بیٹھے ہوتے تو دونوں ایک دوسرے کو خود سے دور دھکیل دیتے، لیکن اگر ان دونوں میں سے ایک کھڑا اور ایک بیٹھا ہوتا تو دونوں ایک دوسرے کی جانب کھنچے چلے آتے اور۔۔۔۔۔ جھٹ سے بغل گیر ہو جاتے۔

کتے اور بلی کی یہ نادیدہ صلاحیتیں میرے بڑے کام کی تھیں۔

بلی کو زمین پر بٹھا کر جب میں ''بیٹھے کتے'' کو بلی کے قریب کرتا تو مقناطیسی قوت کے سبب بلی تھوڑا آگے کی جانب کِھسک جاتی۔۔۔

میں کتے کو تھوڑا اور قریب کرتا، بلی تھوڑا اور آگے کو کھِسک جاتی اور بس۔۔۔

یہ میری زندگی کی پہلی خود ساختہ وائرلیس ریموٹ کنٹرول گاڑی تھی۔

ہر دوپہر جب سب گھر والے آرام کرتے، میں اپنے کتے اور بلی کو اٹھا کر باہر صحن میں آجاتا۔ دھوپ اور گرمی سے بے پرواہ ہو کر ساری دوپہر تپتے فرش پر کتے بلی کا یہ کھیل جاری رہتا۔ کتے کو ہاتھ

میں پکڑ کر میں بلی کے قریب کرتا رہتا اور ساتھ ہی ایک خاص سُر اور لَے میں یہ گانا بھی گاتا۔۔۔

''دوڑ بلی، کتا آیا۔۔۔۔۔دوڑ بلی، کتا آیا''۔

کتے کے ''کتے پن'' کو۔۔۔۔۔مقناطیس کی مقناطیسی قوت کو محسوس کر کے بلی تھوڑا تھوڑا آگے کی جانب کھسکتی رہتی اور اپنی اس ''گاڑی'' کو سارے صحن میں کِھسکا کِھسکا کر میں خوش ہوتا رہتا۔

ایک وقت تھا کہ کتے بلی کے اس کھیل میں میری ساری ہمدردی بلی کے ساتھ ہوتی تھی مگر جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، رفتہ رفتہ میری ساری نیک تمنائیں کتے کی جانب منتقل ہونا شروع ہو گئیں اور میرا یہ پارٹی بدلنا بلا وجہ بھی نہیں تھا۔ اس کتے کو میری ضرورت تھی۔

کتے بلی کے اس کھیل میں بظاہر یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کتا، بلی کو دوڑنے پر مجبور کرتا اور بلی کو سکون کے ساتھ ایک جگہ پر بیٹھنے نہیں دیتا تھا، مگر حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی۔

کتا، بلی کی جانب بڑھتا تو بلی تھوڑا آگے کی جانب کِھسک جاتی اور کتے سے اپنا ایک مناسب فاصلہ برقرار رکھتی۔ کتا اپنی جگہ پر ساکن ہو جاتا تو بلی بھی اپنی جگہ پر ساکن ہو جاتی، لیکن ایک مناسب فاصلہ اب بھی برقرار رہتا۔

کتے نے بلی کو پکڑنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر بلی کبھی کتے کے ہاتھ نہ آئی اور اب کتا بھی بلی کے پیچھے دوڑ دوڑ کر تھک چکا تھا، مایوس ہو چکا تھا۔ کتا اب بلی کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہتا تھا۔

اس لیے کتا اپنی جگہ پر ساکن ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بلی اپنی جگہ پر ساکن ہو گئی مگر اپنے بالکل سامنے بس کچھ ہی فاصلے پر موجود بلی کو دیکھ کر کتے کو ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا کہ۔۔۔

''میں ایک ذراسی۔۔۔۔۔بس ذراسی کوشش کر کے اس بلی کو پکڑ سکتا ہوں۔''

کتے اور بلی کے مابین بالکل محدود فاصلہ کتے کے اندر ایک امید پیدا کرتا، کتے کو ایک اور کوشش پر آمادہ کرتا۔ کتا اپنی بچی کھچی توانائی اکٹھی کر کے پھر سے بلی کو پکڑنے کی کوشش کرتا۔ کتے کے حرکت کرتے ہی بلی بھی آگے کی جانب کھسک جاتی اور ایک مناسب فاصلہ پھر سے برقرار رہتا۔

تھک کر، مایوس ہو کر کتے نے ایک بار پھر فیصلہ لیا کہ۔۔۔

''اب مزید بلی کے پیچھے نہیں بھاگنا، نہیں بھاگنا۔''

کتا اپنے فیصلے پر ڈٹ گیا۔

کتا اپنی جگہ پر ساکن ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی بلی اپنی جگہ پر ساکن ہو گئی۔

اب ایک بار پھر سے کتے کے بالکل پاس، سامنے ہی موجود وہ شرارتی بلی کتے کو اپنی جانب بلا رہی

تھی، بار بار دعوت دے رہی تھی۔ کتے کو یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ۔۔۔

''اب کی بار تو کتا بلی کو پکڑ ہی لے گا۔ اب کی بار تو جیت کتے کی ہی ہوگی۔''

کتا امید اور مایوسی کے بیچ معلق ہو گیا۔

کتے کو اپنی ساری زندگی کبھی یہ سمجھ ہی نہیں آیا کہ۔۔۔

''بلی کے پیچھے بھاگنے میں زیادہ خوشی ہے؟

یا پھر۔۔۔۔۔اپنی جگہ ساکن بیٹھے رہنے میں زیادہ سکون ہے؟''

میرے بچپن کی وہ وائرلیس ریموٹ کنٹرول گاڑی، میرے وہ کتا اور بلی۔۔۔

بہت عرصے تک میں اپنی حماقت میں یہی سمجھتا رہا کہ میری اس خود ساختہ گاڑی میں ریموٹ کتا اور گاڑی بلی تھی۔ یہ تو کافی وقت گزر جانے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ ریموٹ کی کچھ نہ کچھ صلاحیتیں بلی کے پاس بھی ضرور موجود رہی ہوں گی۔

بہرحال یہ بچپن کی، پچھلی صدی کی باتیں ہیں۔ وقت گزرتا رہا اور میں بڑا ہوتا گیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ میرے وہ دونوں مقناطیس کہیں کھو گئے اور میں نے بازار سے نئی گاڑی خرید لی، مگر میرے بچپن کے دو دوست، میرے وہ کتا اور بلی؛ دونوں ساری زندگی میری نگاہوں کے سامنے موجود رہے۔

یہ دونوں ہر لمحہ، ہر لحظہ میرے ساتھ رہے ہیں۔ یہ دونوں میری زندگی کا ایک حصہ ہیں۔

بات اگر زندگی اور خواہشات کی ہو تو ہر انسان کے لیے خواہشات کی نوعیت ساری زندگی یکساں نہیں رہتی۔ جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے، یہ خواہشات بھی رنگ اور چولے بدلتی ہیں۔ بچپن کی خواہشات کچھ اور ہوتی ہیں تو بڑھاپے کی خواہشات کچھ اور۔

جبکہ جوانی۔۔۔۔۔اس جوانی کے تو خیر رنگ ہی نرالے ہوتے ہیں۔

ایک وقت تھا جب میں بھی جوان تھا اور یونیورسٹی میں تھا۔

نہیں نہیں۔۔۔۔۔مطلب۔۔۔۔۔ویسے تو میں اب بھی جوان ہوں مگر اس وقت میں واقعی جوان تھا۔ اس ''جوان'' اور ''واقعی جوان'' کے بیچ بس ذرا سی بالوں کی رنگت کا فرق ہے۔

بہرحال میری یونیورسٹی کی، زمانۂ طالب علمی کی خواہشات کا ذکر بھٹی کے ذکر کے بنا ادھورا رہے گا۔ یہ ان دنوں کی بات ہوگی جب میرا MSc کا آخری سمیسٹر خود اپنی آخری سانسیں گن رہا تھا، جبکہ بھٹی اس وقت یوں تو BS اکنامکس کے ساتویں سمیسٹر کا ایک حصہ تھا لیکن وہ اکثر مضامین چوتھے یا پانچویں سمیسٹر کے لیا کرتا۔ اپنی ان تعلیمی آوارہ گردیوں کے ساتھ ساتھ بھٹی شاعرانہ مزاج بھی رکھتا تھا اور وہ خود

اپنا شمار حضرت جون اِیلیا کے غائبانہ مریدین میں کیا کرتا۔

میں بھٹی کے حلیے کو محض ایک نظر دیکھتے ہی بھٹی کے اس دعوے پر ایمان لے آیا تھا۔

بھٹی کے قد اور صحت، دونوں کو آپس میں ضد تھی۔

جیسے جیسے بھٹی کا قد بڑھا، صحت بیٹھتی چلی گئی اور اب اس کا قد چھ سے اوپر جبکہ کمر چوبیس کے نیچے تھی اور پھر۔۔۔۔۔اس پر بھٹی کا Jeans پہننے کا وہ شوق۔۔۔

بھٹی کے اس غیر معمولی ''طول عرض'' کی بدولت جینز خریدنا اس کے لیے ایک دشوار ترین مرحلہ ثابت ہوتا۔ بچوں کی جینز بھٹی کی کمسن کمر یا پر جچتی، خوب جچتی، مگر بچگانہ لمبائی کے سبب اس کا ستر ڈھانپنے میں ناکام رہتی، جبکہ بڑوں کی جینز میں اگر بھٹی کو دہرا کر کے بھی پھینک دیا جاتا، تب بھی کمر کے دونوں جانب تین تین انگلیوں کے ساتھ گدگدی کرنے کے لیے جگہ باقی رہ جاتی۔

بھٹی کے ہم عمر جینز خرید کر اس کا طول کم کروایا کرتے، جبکہ اس کی ساری محنت ''عرض'' پر ہی ہوا کرتی تھی۔ وہ بڑوں کی جینز خرید کر اس کو اپنی کمر کے حساب سے ایڈجسٹ کروالیا کرتا، لیکن اس تمام تگ ودو کے باوجود بھٹی کی پہنی ہوئی جینز اور کسی ڈیڑھ سالہ بچے کے سردیوں کے موسم میں۔۔۔

پچھلے آٹھ گھنٹوں سے مسلسل زیرِ استعمال ڈائپر۔۔۔

دونوں ایک ہی نقشہ پیش کیا کرتے۔

بھٹی کو جب میں نے پہلی بار دیکھا تو وہ ایک ایسی ہی جھول مارتی نیلی جینز اور اپنی جسامت سے دوگنا بڑی سیاہ ٹی شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس حلیے میں اگر بھٹی کو ایک فٹ زمین میں گاڑ دیا جاتا تو اس کے اطراف تیس تیس فٹ تک کسی چڑیا کو کھیتی میں سے دانہ چگنے کی جرأت نہ ہوتی۔

بھٹی کے ہاتھ میں اکثر سگریٹ موجود ہوتا اور وہ ہر چند لمحات بعد سگریٹ کا ایک زوردار کش لگاتا۔ اس ورزش کے دوران بھٹی کے منہ اور سگریٹ کے فلٹر کے مابین حد درجہ مشابہت پیدا ہو جاتی اور پہلی نظر میں تو بالکل بھی اندازہ نہیں ہوتا کہ کہاں سگریٹ ختم ہوتی اور۔۔۔بھٹی کا منہ شروع۔

بڑھی ہوئی داڑھی۔۔۔۔۔بکھرے بال۔۔۔۔۔پریشان حلیہ۔۔۔۔۔

اگرچہ بھٹی کے والد صاحب ابھی حیات تھے مگر۔۔۔اس کے چہرے پر ہر وقت یتیمی ہی برسا کرتی۔

ویسے بھٹی سادہ مزاج، دل کا صاف اور ایک کھرا لونڈا تھا۔

ایک روز شام ڈھلے بھٹی میرے ہاسٹل کے کمرے میں وارد ہو گیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بے چین تو وہ ہمیشہ ہی رہتا تھا، مگر اس روز بھٹی کے چہرے پر باقاعدہ کرب کے تاثرات بھی

نمایاں تھے۔ میں نے سبب دریافت کرلیااور وہ تو شاید آیا ہی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے تھا۔

بھٹی نے سگریٹ کا ایک زوردار کش لگا کر دھواں میری جانب اچھالنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں میں ستارے جگمگائے اور پھر بولا:

''عبداللہ! تیرے بھائی کوعشق ہوگیا ہے۔''

میں جو اپنے بستر پر نیم دراز تھا، بھٹی کی بات سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اپنی اندرونی کیفیات کے برعکس میں نے بڑے سکون سے بھٹی کی ''داستانِ عشق'' سنی۔

حالات میری سوچ سے زیادہ سنگین تھے۔

بھٹی ایک ایسی ''ریل گاڑی'' کا منتظر تھا۔۔۔جو سیکنڈ سمیسٹر میں ہی دوسرے ڈیپارٹمنٹ کے ایک ''انجن'' کے ساتھ۔۔۔۔کلاس چھوڑ کر ''کیفے'' کی جانب جا چکی تھی۔

بھٹی کوسنبھالنا مشکل تھا۔

ایک آخری امید کے طور پر میں نے اس سے پوچھ لیا:

''بھٹی یارا!عشق کرتے ہو یا محبت؟''

جواباً بھٹی مسکرایا۔۔۔۔شاید زندگی میں پہلی بار اور پھر بولا:

''عبداللہ! تیرا بھائی عشق کرتا ہے عشق اور شادی بھی اسی کے ساتھ کرے گا۔''

بھٹی کی بات سنتے ہی میں مراقبے میں چلا گیا۔ چند لمحات بعد آمد ہوگئی اور پھر میں نے بھٹی کو جو جواب دیا، اسے تاریخ تو یاد نہیں رکھے گی۔۔۔۔البتہ بھٹی نے ضرور یاد رکھا ہوگا۔

''بھٹی! یارا یہ لَو میرج ہوتے میں نے بہت سنا ہے، کافی دیکھا بھی ہے
مگر۔۔۔۔۔مگر یہ عشق میرج؟؟؟
یار!۔۔۔۔۔سننے میں ہی تھوڑا عجیب نہیں لگتا تجھے؟''

میں نے اپنے دونوں بازو پھیلا کر اپنے دائیں ہاتھ پر بھٹی کے ''عشق'' کو رکھا اور۔۔۔ بائیں ہاتھ پر ''میرج'' کو۔۔۔۔اور پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی۔۔۔

''دیکھ بھٹی!
یہ رہا تیرا عشق۔۔۔اور یہ رہی تیری میرج۔۔۔
نہیں نہیں۔۔۔نہیں بھٹی تُو بھول جا۔۔۔
کم بخت! مجھے تو یہ کمبی نیشن ہی ٹھیک نہیں لگ رہا۔''

اور پھر بھٹی کی عمر میں ''عشق میرج'' کی خواہش کرنے والا یہ اکیلا انسان نہیں ہے، اس عمر میں تو ہر انسان کو ہی عشق ہو جاتا ہے۔ بس ایک فرد سے دوسرے فرد تک اس عشق کی نوعیت بدل جاتی ہے جیسا کہ ہمارا وہ چوہدری۔۔۔

ویسٹ انڈیز کا کرس گیل، سری لنکا کا مُرلی دھرن اور ہندوستان کا لکشمی پتی بالا جی۔۔۔ان تینوں کے چہروں کی رنگت کو یکجا کر دینے سے جو ایک گہرا، مضبوط اور ضدی رنگ حاصل ہوگا ناں۔

بس وہی۔۔۔۔۔وہی چوہدری کے چہرے کی رنگت تھی۔ اپنی رنگت کے اس کھردرے پن کے برعکس، چوہدری حد درجہ نازک مزاج انسان واقع ہوا تھا۔ چوہدری جنوبی پنجاب کا ایک کھاتا پیتا ''سائیں'' تھا اور آدھے ڈیپارٹمنٹ کو اپنی کرولا میں پک اینڈ ڈراپ کی سہولت فراہم کر چکا تھا۔ چوہدری کو زندگی سے یہی شکوہ رہتا تھا کہ اسے زندگی میں کبھی سچا پیار نہیں ملا۔

چوہدری کی اس شکایت کو دور کرنے کی اگر کسی نے کوشش کی تو وہ ہمارا لالہ تھا۔

لالے نے اپنی ہمت بھر ''سچا پیار'' کیا، مگر چوہدری کے ساتھ نہیں، کسی اور کے ساتھ۔

لالہ ہاسٹل میں میرا ہم کمرہ جبکہ ڈیپارٹمنٹ میں مجھ سے سینئر تھا۔ یوں تو میرے اور لالے کی عمر میں فرق بس دو سال کا تھا مگر لالے کے سر پر بالوں کی عدم موجودگی کے سبب یہ دو سال کا فرق بھی ایک دہائی پر پھیلا ہوا محسوس ہوتا اور پھر۔۔۔لالے کو اس جاتی عمر میں عشق ہو گیا۔

بات اگر یہیں پر ختم ہو جاتی، تب بھی کچھ ایسا برا نہ تھا، مگر لالے کے اس نوزائیدہ عشق کے محض تین ہفتوں بعد ہی لالے کے ساتھ ہاتھ بھی ہو گیا۔ لالے کی اپنی ''خواہش'' سے ایک ذرا سی بات پر تلخ کلامی ہوئی۔ لالے نے حق پر ہونے کے باوجود بہت بار معذرت بھی کی، مگر۔۔۔

لالے کی ''خواہش'' بھری کلاس کے سامنے ہی لالے کو لالہ (بھائی) بول کر چلتی بنی۔

لالہ رات نو سے صبح آٹھ تک خراٹے دار نیند لینے کا عادی تھا۔

جھوٹ بولوں تو کوا کاٹے۔۔۔۔۔اس حادثے کے بعد سے لالے کو ساری ساری رات کروٹیں بدلتے دیکھا، آہیں بھرتے سنا۔ راتوں کو اٹھ اٹھ کر لالہ ایک لمبی سرد آہ بھرتا اور پھر مجھے مخاطب کر کے اپنی ''خواہش'' کی تعریف کچھ یوں کر دیا کرتا:

''عبداللہ! یہ عورت بھی کیا عجب چیز ہے یار۔''

اس ایک فقرے کے الفاظ شاید اتنے اہم نہ ہوں گے، مگر جس کیفیت میں لالہ ان الفاظ کو ادا کیا کرتا تھا۔۔۔

کاش! کاش لالے کے اس اندازِ بیان کو میں الفاظ دے سکتا۔ اپنی ساری زندگی کی پونجی جوئے میں ہار جانے والے شخص کے لہجے میں بھی ایسی مایوسی اور بے بسی نہ ہوتی ہوگی کہ جیسی مایوسی اور بے بسی لالے کے محض اس ایک فقرے سے ٹپکا کرتی۔

لالے کے برعکس، گوندل، ساقی اور بگا بہت مثبت سوچ رکھنے والے انسان تھے۔

آپ نے محبت کے ٹرائی اینگل تو بہت دیکھے سنے ہوں گے، مگر ان تینوں کا اپنا ہی ایک عجب ریکٹینگل تھا۔ یہ تینوں حضرات مل کر ایک ہی جگہ۔۔۔

اس ریکٹینگل کے چوتھے زاویے سے عشق فرما رہے تھے۔

ان تینوں میں سے ہر ایک کی بات بن سکتی تھی۔۔۔۔۔ اگر باقی دو موجود نہ ہوتے۔

جیسے ہی کوئی ایک ذرا آگے بڑھنے لگتا۔۔۔۔۔ باقی دو مل کر اسے پیچھے کھینچ لیتے۔

اور پھر ان کی اس ساری کشمکش کا ''فائدہ'' ایک سینئر اٹھا گیا۔

انسانی تاریخ کے یہ پہلے اور آخری تین رقیب ہوں گے، جن کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا سب ایک ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اور تو اور اپنی اس مشترکہ ناکامی کے بعد یہ تینوں ایک دوسرے کو حوصلہ بھی دیا کرتے۔

بہرحال یہ زمانۂ طالبِ علمی کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں کو بہت وقت گزر چکا ہے۔

یہ لالہ، گوندل اور بھٹی۔۔۔۔۔ وہ بگا، ساقی اور چوہدری۔۔۔۔۔ یہ سب محض میرے دوست اور ان کی زندگیوں کے حالات نہیں ہیں، یہ انسان اور انسانی خواہشات ہیں۔

چوہدری کی طرح کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں، جن کی بہت سی خواہشات پوری ہو رہی ہوتی ہیں، بظاہر سب ٹھیک، سب اچھا نظر آتا ہے، مگر کوئی ایک ادھوری خواہش اندر ہی اندر کچو کے لگائے رکھتی ہے۔ بہت ساری پوری ہو جانے والی خواہشات کے مثبت اثرات محض اسی ایک ادھوری خواہش کے منفی اثرات تلے دفن ہو جاتے ہیں۔ کوئی ایک ناآسودہ خواہش انسان کو اچھے سے خوش نہیں ہونے دیتی۔

کسی گزر جانے والی ٹرین کے پیچھے بھاگتے، ایک لاحاصل کی جستجو میں خود کو باؤلا کر لینے والے بھٹی جیسے افراد بھی ہر معاشرے میں موجود رہتے ہیں۔ اپنی یقینی شکست کے باوجود ایک بے نام سی امید کا دامن پکڑے بھاگے چلے جاتے ہیں اور پھر کچھ خواہشات ایسی بھی تو ہوتی ہیں، جو انسان کی زندگی سے سکون ختم کر دیتی ہیں۔ محض ایک خواہش کو پورا کرنے کی کوشش میں دیگر بہت سی خواہشات سے دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ لالے کی طرح آہیں بھری جاتی ہیں، خواہش کو کوسنے بھی دیے جاتے ہیں اور خواہش کے پیچھے بھاگا بھی جاتا ہے اور بھاگنا تو خیر اس زندگی میں سبھی کو پڑتا ہے۔ کسی ایک مشترک خواہش کے حصول

کے لیے اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے دوڑ لگائی جاتی ہے اور پھر ضرورت پڑنے پر کسی دوسرے فرد کی ٹانگ بھی کھینچ لی جاتی ہے۔

بالکل بگا، ساقی اور گوندل کے ریکٹینگل کی طرح۔

اور جانے کیوں؟ آج ایک بار پھر سے میرے بچپن کے وہ دو دوست۔۔۔

میرے وہ کتا اور بلی میری نگاہوں کے سامنے موجود ہیں، مگر اب کی بار یہ کتا اور بلی ایک بالکل ہی بدلی ہوئی شکل میں آئے ہیں۔

آج نہ تو یہ کتا، کتا ہے۔۔۔۔۔اور نہ ہی یہ بلی، بلی ہے۔

آج یہ کتا اور بلی۔۔۔۔۔انسان اور انسانی خواہشات کا روپ دھار چکے ہیں۔

ہر انسان کا اپنی خواہشات کے ساتھ بالکل وہی رشتہ ہوتا ہے، جو رشتہ کتے کا بلی کے ساتھ تھا۔

کتا بھاگا، بلی بھاگی۔۔۔۔۔کتا ساکن، بلی ساکن۔

بالکل اسی طرح سے انسان جب خواہشات کے پیچھے بھاگتا ہے تو خواہشات تھوڑا آگے کی جانب کِھسک جاتی ہیں۔خواہشات تھوڑا اور بڑھ جاتی ہیں، خواہشات تھوڑا اور پھیل جاتی ہیں اور اگر انسان خواہشات کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے تو خواہشات بھی اپنی جگہ پر رک جاتی ہیں، تھم جاتی ہیں، مگر ہر لمحہ، ہر لحظہ اور ہر آن۔۔۔

ہر ہر انسان کے بالکل آس پاس، بالکل سامنے کچھ نہ کچھ خواہشات ضرور موجود رہتی ہیں۔اس شرارتی بلی کی مانند یہ خواہشات بھی انسان کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہیں۔انسان کو دعوت دیتی ہیں، اپنی جانب بلاتی ہیں۔انسان کو حرکت کرنے پر آمادہ کیا جاتا ہے اور پھر جب انسان ان خواہشات کی پیروی کرنا شروع کر دے تو یہ خواہشات آگے کی جانب سِرکنا شروع کر دیتی ہیں۔ میرے اس کتے کی مانند پھر انسان کو بھی کچھ سمجھ نہیں آتا کہ۔۔۔

ان خواہشات کے پیچھے بھاگنے میں زیادہ خوشی ہے؟

یا پھر۔۔۔۔۔ان خواہشات سے دستبردار ہو جانے میں زیادہ سکون ہے؟

ہمیں ہمارے اردگرد جتنی بھی چھوٹی بڑی خواہشات نظر آتی ہیں، یہ سب لیول وَن کی خواہشات ہیں۔ان خواہشات کی بس ایک ہی خاص بات ہے۔۔۔

یہ انسان کو امید اور مایوسی کے بیچ معلّق رکھتی ہیں۔

لیول ٹو: خوابوں کی دنیا

بچپن میں مجھے گرمیوں کی راتیں دنوں کی نسبت زیادہ بھلی معلوم ہوا کرتی تھیں۔ سرِشام صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کیا جاتا اور پھر چارپائیوں کی ایک لمبی قطار سج جاتی۔ اِدھر سورج غروب ہوتا اور اُدھر رات ہو جاتی۔ میں رات کے وقت اپنی چارپائی پر لیٹ کر آسمان اور آسمان میں موجود تاروں کو دیکھتا رہتا اور پھر ان ستاروں کی مدد سے آسمان میں مختلف شکلیں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔ روز کوئی نہ کوئی تارا گم ہو جایا کرتا اور اسی کھوئے ہوئے تارے کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے جانے کب آنکھ لگ جاتی۔

میری زندگی کی پہلی خواہش جسے میں آج بھی یاد کر سکتا ہوں، وہ یہی تھی کہ کسی بھی طرح سے اپنے اور آسمان کے بیچ کی دوری کو جانا جائے۔ بچپن میں یہ آسمان مجھے اپنے بالکل قریب محسوس ہوا کرتا تھا اور پھر آسمان پر موجود یہ ستارے بھی تو اس وقت بڑے حقیر ہوتے تھے۔ میں اپنی چھوٹی سی ہتھیلی پر ایسے ہزاروں ستارے اکٹھے کر لیا کرتا تھا۔ لیکن جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا، یہ آسمان مجھ سے دور اور دور ہوتا چلا گیا۔ میری ہتھیلی میں قید وہ چھوٹے چھوٹے ستارے میرے بالغ ہونے سے پہلے پہلے میرے ہر تصور سے بھی بڑے ہو چکے تھے، بلکہ بچپن میں مجھے امید تھی کہ بڑا ہو کر، تھوڑا اور بڑا ہو کر میں آسمان کی مجھ سے دوری کو ضرور جان لوں گا۔

مگر آج میری یہ امید اپنی موت آپ مر چکی ہے۔ اس آسمان کی مجھ سے دوری کو میں تو کیا اس دنیا کے سبھی صاحبانِ علم و دانش مل کر بھی نہیں جان سکتے اور نہ ہی کبھی جان پائیں گے۔ انسان جتنا مرضی بھاگ لے، سائنس جتنی مرضی ترقی کر لے، اس آسمان کی مجھ سے دوری کو میں کبھی نہیں جان سکوں گا۔

میرے بچپن کی وہ پہلی خواہش آج بھی ناآسودہ ہے اور ہمیشہ ناآسودہ رہے گی۔

میں نے اپنی اس خواہش کے پورا ہونے کی امید چھوڑ دی ہے، میں مایوس ہو چکا ہوں۔

اور بس۔۔۔۔۔ اسی مایوسی سے خوابوں کی دنیا جنم لیتی ہے۔

وہ خواہشات جن کا حصول انسان کے لیے ناممکن ہو جائے تو پھر ایسی خواہشات، خواہشات نہیں رہتیں بلکہ خواب بن جاتی ہیں اور۔۔۔ خوابوں کو دیکھا تو جا سکتا ہے مگر چھوا نہیں۔

لیول وَن کی خواہشات میں انسان امید اور مایوسی کے بیچ معلّق رہتا ہے، جبکہ لیول ٹو میں یہ امید ختم ہو جاتی ہے، محض ایک گہری مایوسی باقی رہ جاتی ہے۔ انسان کی خواہش مر جاتی ہے۔

بس۔۔۔۔۔ ایک خواب، حسرت اور ایک Fantasy باقی رہ جاتی ہے۔

یہ خواب، خواب نہیں ہوتے بلکہ یہ انسان کی مردہ خواہشات ہوتی ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی خواہشات مر مر کر خواب بنتی چلی جاتی ہیں۔ اگر ہم انسان کے شعور اور لاشعور میں جھانک سکتے تو ہمیں معلوم ہو جاتا کہ ہر انسان کے اندر لامحدود خواہشات نہیں پائی جاتیں بلکہ ہر انسان کے اندر لامحدود خواہشات کے بے گور و کفن لاشے پائے جاتے ہیں۔ ہر انسان کے اندر خود اس کی اپنی ہی خواہشات کے بے نام مقبرے موجود ہوتے ہیں۔

گلی محلے میں کرکٹ کھیلنے والے ہر بچے کے اندر، کہیں بہت اندر قومی ٹیم کی نمائندگی کرنے کی خواہش موجود ہوتی ہے، لیکن پھر رفتہ رفتہ بچوں کی اکثریت میں یہ خواہش مر کر ایک خواب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ انسان اور کوئی کام سیکھے یا نہیں، خود اپنی ہی خواہشات کو ان کی ولادت سے بھی پہلے قتل کر دینے کا فن ضرور سیکھ جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان ''حقیقت پسند'' ہو جاتا ہے اور پھر حقیقت پسندی میں ایک مرحلہ وہ بھی آ جاتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو اپنانے سے انکار کر دیتا ہے، انسان اپنے ہی خوابوں کو Own کرتے ہوئے ہچکچاتا ہے۔ بہرحال۔۔۔

یہ خوابوں کی دنیا ہے اور یہاں خواہشات کو حاصل کرنے کی امید مر جاتی ہے۔

بس۔۔۔۔۔ ایک خواب، حسرت اور ایک Fantasy باقی رہ جاتی ہے۔

لیول تھری: کائناتِ وہم و گماں

امید کے دریا اور خوابوں کی دنیا سے پرے بھی انسانی خواہشات کی ایک لامحدود کائنات ضرور موجود ہوگی۔ یہ وہ خواہشات ہیں جن کی حقیقی نوعیت کا ادراک اور فہم نہ تو ہمیں ہے اور نہ ہی کبھی ہو سکے گا۔

یہ کائناتِ وہم و گماں ہے۔ یہ لیول تھری ہے۔

ان خواہشات کو جاننے کے لیے ہم انسان بس کنویں کے مینڈک ہی ہیں۔ بہترین چیز جو ہم کسی بھی طرح جان سکتے ہیں، وہ یہی ہے کہ اس محدود کنویں کے باہر بھی ایک کائنات، ایک بہت بڑی کائنات ضرور موجود ہوگی۔ ہمارا یہ چھوٹا کنواں ہی کل کائنات نہیں ہے۔

انسانی خواہشات کو ان تین سادہ لیولز میں تقسیم کرنا میری ایک بالکل ذاتی رائے ہے۔ آپ میری اس رائے سے اختلاف کر سکتے ہیں، ضرور کر سکتے ہیں۔ البتہ ایک بات یقینی ہے کہ انسانی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں اور ہم میں سے ہر انسان کے لیے ان خواہشات کی لامحدودیت تو اپنی جگہ پریشانی کا ایک سبب ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان خواہشات کی پیروی کرتے کرتے ایک مقام وہ بھی آ جاتا ہے

کہ انسان امید اور مایوسی کے پیچ پھنس کر رہ جاتا ہے۔ امید اور مایوسی کے پیچ معلّق ہو کر، امید یا مایوسی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا اپنی جگہ ایک درد ِسر بن جاتا ہے۔

انسان کے دل میں کسی بھی خواہش کا پیدا ہو جانا ایک بالکل فطری چیز ہے، مگر اس خواہش کی پیروی کرنا یا نہ کرنا انسان کا اپنا فیصلہ ہے اور کبھی کبھار یہ فیصلہ بالکل بھی آسان نہیں ہوتا۔

یہ زمانہ ٔطالبِ علمی کی بات ہو گی کہ جب مجھے مجموعی طور پر اپنی زندگی کی چھٹی جبکہ یونیورسٹی دور کی پہلی ''خواہش'' ہو گئی۔ مطلب۔۔۔۔۔ مطلب مجھے ''لگ'' گئی اور۔۔۔

یہ بات تو یقیناً اب آپ بھی جانتے ہوں گے کہ لگی چاہے دل کی ہو۔۔۔

یا پھر بیت الخلاء کی۔۔۔۔۔ دونوں بہت بری ہوتی ہیں۔

اب کی بار تو یہ لگی تھی بھی۔۔۔۔۔ دل کی لگی۔

پہلی پانچ بار کی طرح اس بار بھی مجھے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

بہت سوچا، کچھ سمجھ نہ آیا۔۔۔۔۔ خود کو بہت سمجھایا، کچھ آرام نہ ہوا۔

پھر میں نے اس بارے میں دوسروں سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ آخر یہ لگی کی لگن اکیلے عبداللہ کا مسئلہ تو نہیں تھی۔ میں نے اس دنیا کے دانشور، فلسفی اور سیانے لوگوں کو پڑھنا شروع کیا۔ مجھے ہر جانب سے بس ایک ہی مشورہ موصول ہوا۔۔۔ ''کم خواہشات، پُرسکون زندگی''

اور۔۔۔۔۔ اور میں نے دانشوروں کے اس مشورے پر عمل کرنے کی ٹھان لی۔

مشکل تھا۔۔۔۔۔ بہت مشکل تھا۔۔۔۔۔ بہت ہی مشکل تھا۔

مگر میں خود آپ اپنی خواہش کے سامنے ڈٹا رہا، جما رہا۔

آندھیاں آئیں، طوفان آئے مگر میں اپنی جگہ سے نہیں ہلا، میں اپنے فیصلے سے پیچھے نہیں ہٹا۔

میں نے اپنی ''خواہش'' کی پیروی نہیں کی، میں ''خواہش'' کے پیچھے نہیں بھاگا۔ اور پھر۔۔۔

''خواہش'' کی شادی ہو گئی اور اس دنیا کے سبھی دانشور، فلسفی اور سیانے لوگ میرے دل سے اتر گئے۔

چند سال مزید گزرے، میں عملی زندگی میں داخل ہو گیا اور پھر کل ملا کر مجھے اپنی زندگی کی تیرھویں جبکہ عملی زندگی کی پہلی ''خواہش'' ہو گئی۔ مطلب۔۔۔

مطلب مجھے ایک بار پھر ''لگ'' گئی، لیکن اب میں بڑا ہو چکا تھا، میں سمجھدار تھا۔

میں ماضی کی غلطیوں سے سبق سیکھ چکا تھا۔ اب کی بار میں نے اس دنیا کے دانشور اور سیانے لوگوں کی جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ اب کی بار میں نے عملی زندگی کے کھلاڑیوں کو اپنا رہبر بنایا۔ اب کی بار

میرے امام عملی زندگی کے وہ حقیقت پسند لوگ تھے، جن کا کہنا ہی یہ ہوتا ہے کہ محنت اور کوشش سے ہر ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے، لہٰذا اب کی بار میں نے ''خواہش'' کی پیروی کرنے کی ٹھان لی۔

میں اپنی ''خواہش'' کو حاصل کرنے کے لیے بھاگا، خوب بھاگا۔ رات دن ایک کر دیا اور میری اس ساری بھاگ دوڑ کا نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ دو ماہ بعد۔۔۔۔۔ محض دو ماہ بعد ہی شادی ہو گئی۔

''خواہش'' کی۔۔۔۔۔ کسی اور کے ساتھ۔

اور اس دنیا کے سبھی حقیقت پسند، عملی زندگی کے انسان بھی میرے دل سے اتر گئے۔

اس دنیا کے سبھی سیانے لوگ اب مجھے باقاعدہ زہر لگتے ہیں۔ دوسروں کو غلط مشوروں سے نوازنے والے یہ سیانے مجھے بالکل اچھے نہیں لگتے۔ اپنی اس بار کی ناکامی کے بعد سے میں کبھی جان ہی نہیں سکا کہ۔۔۔ ان خواہشات کے پیچھے بھاگنے میں زیادہ خوشی ہے؟

یا پھر۔۔۔ ان خواہشات سے دستبردار ہو جانے میں زیادہ سکون ہے؟

میں پریشان ہوں۔ میں گومگو کی کیفیت میں ہوں۔

میرا ''کنوار پن''۔۔۔۔ ''چھڑا پن'' کی حدود کو عبور کرتا ہوا۔۔۔۔۔ اب ''بوڑھا پن'' کی سرحدوں کو چھونے لگا ہے، مگر میرے اندر کی یہ کشمکش کسی طور ختم ہونے کو نہیں آ رہی۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے گلی محلے میں ''شٹاپو'' کھیلنے والی بہت ساری چھوٹی چھوٹی ''خواہشات'' پہلے جوان ہوئیں۔۔۔۔۔ ان کی شادی ہوئی۔۔۔۔۔ اور پھر ان بڑی ''خواہشات'' نے مزید بہت ساری چھوٹی چھوٹی ''خواہشات''۔۔۔ ''تمناؤں''۔۔۔۔۔ اور ''آرزوؤں'' کو جنم بھی دے دیا۔

میں آج بھی تذبذب کا شکار ہوں اور۔۔۔

ایک بار پھر سے۔۔۔ یہ نہ تو میں ہوں اور نہ ہی میری چھٹی یا تیرھویں خواہش۔۔۔

یہ انسان اور انسانی خواہشات ہیں۔

یہ میرے بچپن کے ساتھی، میرے وہ دو دوست،

یہ میرے کتا اور بلی ہیں۔

باب:2

نقطہ کا قیدی

5 ستمبر، 1977ء۔۔۔

اس دن امریکی خلائی تحقیق کے ادارے ناسا نے ایک Space Probe کو زمین سے خلا کی جانب روانہ کیا اور اسے Voyager1 کا نام دیا گیا۔

Voyager1 میں کچھ خاص ہے۔۔۔

Voyager1 پچھلے 44 برس سے مسلسل حالتِ سفر میں ہے اور امید ہے کہ مزید کئی دہائیاں بھی یہ اپنا سفر جاری رکھے گا۔

2020ء کے اختتام پر یہ زمین سے تقریباً چوبیس ارب کلومیٹر کی دوری پر موجود تھا۔ زمین سے سب سے زیادہ دوری پر موجود انسانی بنائی ہوئی کوئی بھی چیز Voyager1 ہی ہے، لیکن یہ Voyager1 کی سب سے خاص بات نہیں ہے۔ جو چیز Voyager1 کو دوسرے کسی بھی Space Mission سے ممتاز کر دیتی ہے، وہ ہے۔۔۔

''نیلا مدھم نقطہ''

14 فروری، 1990ء۔۔۔

اس دن انسانیت کی معلوم تاریخ کا ایک بہت اہم، بہت ہی خاص واقعہ رونما ہوا تھا۔ اس واقعہ کی اہمیت کے برعکس بہت کم لوگ ہیں کہ جو اس ''انہونی'' کے ہونے سے واقف ہوں گے۔

اس جذبات اور احساسات سے بوجھل دن Voyager1 نے نظامِ شمسی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے سے پہلے ایک آخری بار اپنے گھر۔۔۔۔۔ زمین کی جانب دیکھا تھا۔

اپنے گھر کی جانب دیکھتے ہوئے اس کی سانسیں بوجھل تھیں۔ وہ اپنے گھر سے بہت دور تھا۔ اس کے اور اس کے گھر کے بیچ چھے ارب کلومیٹر کا ختم نہ ہونے والا فاصلہ موجود تھا۔

اسے اپنے گھر کی یاد ستا رہی تھی، مگر وہ بے بس تھا۔ اگرچہ وہ گھر واپس نہیں آ سکتا تھا،

مگر نظامِ شمسی کو الوداع کہنے سے پہلے اس نے اپنے گھر کی ایک آخری تصویر کو اپنی پُرنم آنکھوں میں محفوظ ضرور کرلیا۔

Voyager 1 نے زمین کی اس آخری جھلک کو، اس آخری یادکو نہ صرف ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے پاس محفوظ کرلیا بلکہ محبت کے اس ''تاج محل'' کو زمین پر بھی ارسال کر دیا۔

Voyager 1 کی جانب سے انسانیت کو بھیجی جانے والی زمین کی اس تصویر کو۔۔۔

Pale Blue Dot کا نام دیا جاتا ہے۔ ❶

زمین کی اس خاص تصویر کی خاص الخاص بات یہ ہے کہ اس پوری تصویر میں آپ کو زمین کہیں بھی دکھائی نہیں دے گی۔ بہت کوشش کرنے سے، بہت محنت کے بعد جو چیز آپ ڈھونڈنے میں کامیاب ہوسکیں گے، وہ ہوگا۔۔۔''ایک نقطہ''

ایک بالکل چھوٹا سا۔۔۔۔۔نظر بھی نہ آنے والا۔۔۔۔۔ایک مدہم نیلا نقطہ۔

یہ نقطہ، یہ Dot۔۔۔۔۔یہ زمین ہے۔۔۔۔۔اور بس یہی زمین ہے۔

7.8 ارب انسان اپنی اپنی لامحدود خواہشات کے ساتھ اسی ایک نقطے کی قید میں ہیں۔

14 اگست 1947ء کے بعد اگر کوئی تاریخ مجھے یاد رہ جاتی ہے تو۔۔۔

وہ 14 فروری 1990ء ہی ہے۔

اول الذکر میں اس کرۂ ارض پر پاکستان نام کا ایک پورا ملک معرضِ وجود میں آیا تھا، جبکہ آخرالذکر میں یہ پورے کا پورا کرۂ ارض ہی۔۔۔۔۔کرۂ ارض سے ایک ''مدہم نیلے نقطے'' میں تبدیل ہوگیا۔

اس دن انسان کی بنائی ہوئی ایک مشین اپنے موجد کو آئینہ دکھا گئی۔

کنویں کا مینڈک تو خیر انسان ہمیشہ سے ہی تھا مگر اس تاریخی دن یہ کنویں کا مینڈک، کنویں سے پھسل کر نقطے کی قید میں چلا گیا۔

زمین جائیداد کے لڑائی جھگڑوں میں آج تک لاکھوں نہیں، کروڑوں انسان قتل کیے جا چکے ہوں گے۔ مختلف ریاستوں، ممالک اور تہذیبوں کے مابین ہونے والے تمام فسادات اور لڑائی جھگڑوں کا سب سے بڑا سبب بس یہی رہا ہوگا کہ کسی بھی طرح اس ایک نقطے پر اپنے حصے میں اضافہ کیا جائے، اپنے اثر ورسوخ کو بڑھایا جائے۔

---

❶ آگے بڑھنے سے پہلے Google پر Pale Blue Dot لکھ کر سرچ کا بٹن دبایئے اور ہماری اس زمین کی اب تک کی سب سے خاص تصویر ملاحظہ کیجیے۔

آئے دن کسی نہ کسی بہت بڑی ہاؤسنگ سوسائٹی کا افتتاح ہوتا ہے۔ اونچی سے اونچی عمارتیں بنانے کی دوڑ لگائی جاتی ہے۔

برج خلیفہ، شنگھائی ٹاور، کلاک ٹاور یا پھر آئفل ٹاور۔۔۔

دیوارِ چین اپنی لمبائی کے لیے مشہور ہے تو اہرام مصر اپنی دیوہیکل جسامت کے لیے۔۔۔

بڑے بڑے سمندروں سے لیکر ماؤنٹ ایورسٹ اور کے ٹو تک۔۔۔

یہ سب کچھ اسی ایک نقطے پر موجود ہے اور پھر میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ ہمارے اسی نقطے پر ''ورلڈ ٹور'' بھی لگتے ہیں۔

حد تو یہ ہے کہ اس نقطے کے آدھے قیدی اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ زندگی میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں، جبکہ ان آدھوں کی اسی خوش فہمی سے متاثر ہو کر باقی کے آدھے اس غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں کہ وہ زندگی میں ناکام ہیں۔

ایک ہی نقطے کی قید میں رہتے ہوئے کامیابی اور ناکامی کا یہ تصور۔۔۔

تھوڑا عجیب نہیں لگتا؟؟؟

بہر حال یہ تصویر زمین سے تقریباً چھ ارب کلومیٹر کی دوری سے کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کی تھی۔ اس فاصلے میں محض چند منٹ کی نوری مسافت کا اضافہ بھی اس نقطے اور نقطے پر موجود 7.8 ارب انسانوں کی زندگیوں کو خطرے میں ڈال سکتا ہے۔

نظامِ شمسی کی انتہا سے پہلے ہی ہماری یہ زمین ختم ہو جاتی ہے، دکھائی دینا بند ہو جاتا ہے، جبکہ کائنات کا تو ابھی اچھے سے آغاز بھی نہ ہوا ہوگا۔

بنیادی طور پر ہمارے اس پورے نظامِ شمسی (Solar System) میں سورج کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ نظامِ شمسی کے کل وزن کا تقریباً 99.8 فیصد حصہ اکیلے سورج پر مشتمل ہے۔

یہ ہمارا اپنا، یہ دن کو نظر آنے والا سورج اتنا بڑا ہے کہ ہماری زمین جیسی تیرہ لاکھ زمینیں اس کے اندر سما سکتی ہیں۔

ہماری زمین اور زمین ہی کی طرح کے سات مزید سیارے سورج کے گرد مسلسل گردش کر رہے ہیں، جبکہ پلوٹو اور سورج کا رشتہ کچھ ''مشکوک'' ہے۔

سورج سے زمین کا فاصلہ تقریباً 15 کروڑ کلومیٹر ہے، جبکہ سورج اور نظامِ شمسی کے آخری سیارے Neptune کے بیچ تقریباً 4.5 ارب کلومیٹر کی دوری پائی جاتی ہے۔ یہ بھی

بتایا جاتا ہے کہ سورج اپنے پورے کنبے کو لیے کسی انجانی منزل کی جانب گامزن ہے۔

ہمارے نظامِ شمسی کے سب سے قریبی ستارے کو Alpha Centauri کا نام دیا جاتا ہے اور یہ نزدیک ترین ستارہ بھی ہم سے اتنی دور ہے کہ اگر ہم آج، ابھی اور اسی وقت روشنی کی رفتار (تقریباً تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ) سے اپنے سفر کا آغاز کر دیں، تب بھی ہمیں اس ستارے تک پہنچنے میں کم از کم چار سال لگ جائیں گے۔

جبکہ سب سے بڑا ستارہ جسے سائنسدان ڈھونڈ نے میں کامیاب ہوئے ہیں، اسے Uy-Scuti کہتے ہیں۔Uy-Scuti کے اس نازک اندام نام پر مت جائیے۔

یہ ستارہ بڑا ہے، بہت بڑا ہے۔ ہمارا سورج اپنے اندر تیرہ لاکھ زمینیں چھپا لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔۔۔

مگر یہی سورج Uy-Scuti کے سامنے بالکل شرمندہ سا کھڑا ہے۔۔۔

اور نظر بھی تو کہیں نہیں آرہا۔

Uy-Scuti اتنا بڑا ہے کہ یہ ہمارے سورج جیسے 3.7 ارب سورج ایک ہی بار میں نگل سکتا ہے تو پھر۔۔۔

ہماری زمین جیسی کتنی زمینیں Uy-Scuti میں سما جاتی ہوں گی؟

بتایا جاتا ہے کہ لا تعداد ستارے آپس میں ایک جھنڈ کی شکل میں رہتے ہیں۔ ستاروں کے اس بہت بڑے جھرمٹ کو کہکشاں (Galaxy) کا نام دیا جاتا ہے۔

ہم اور ہمارا نظامِ شمسی جس کہکشاں کا ایک حصہ ہیں، اسے ''ملکی وے'' کہتے ہیں۔ ملکی وے اتنی بڑی ہے کہ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں روشنی کو اپنی بے پناہ رفتار کے باوجود ایک لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔

ایک اندازے کے مطابق ملکی وے میں 400-100 ارب تک نظامِ شمسی موجود ہو سکتے ہیں۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر ہمارے سورج کو آنکھیں دکھانے والے Uy-Scuti کی اپنی بھی سِٹی گم ہو جاتی ہے۔

یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر ہر ہر ستارہ اپنی انفرادی حیثیت و مرتبہ کھو بیٹھتا ہے۔

ملکی وے کے نزدیک ترین جو کہکشاں پائی جاتی ہے، اسے Andromeda یا M-31

کہا جاتا ہے۔ یہ نزدیک ترین کہکشاں بھی ہم سے 25 لاکھ نوری سال (Light Years) کی مسافت پر ہے۔ سب سے دور موجود کہکشاں جسے سائنسدان کسی بھی طور دیکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں، GN-z11 کہلاتی ہے اور۔۔۔ یہ ہم سے دور ہے، بہت دور ہے۔

چار گھنٹوں کی نوری مسافت سے ہماری یہ زمین دکھائی دینا بند ہو جاتی ہے، جبکہ GN-z11 ہم سے 32 ارب نوری سال کی دوری پر موجود ہے۔

کائنات کا وہ حصہ جسے ہم کسی بھی طرح دیکھ سکتے ہیں، قابلِ مشاہدہ کائنات کہلاتا ہے۔ ہماری یہ قابلِ مشاہدہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ اس کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچنے میں روشنی کو 93 ارب سال لگ جاتے ہیں۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ قابلِ مشاہدہ کائنات میں 2000 ارب سے زائد کہکشائیں پائی جاتی ہیں۔ یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر اربوں سورج نگل جانے والی ہر کہکشاں بھی اپنا انفرادی مقام اور حیثیت کھو بیٹھتی ہے۔ ہماری زمین پر ریت کے ذرات کی تعداد کم ہے، جبکہ قابلِ مشاہدہ کائنات میں ستاروں کی تعداد زیادہ ہے۔

اس قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے کیا چیز موجود ہے؟

Observable Universe سے پرے جو چیز بھی موجود ہے، وہ ہم سے اتنی دور ہے کہ روشنی کی محدود رفتار کے سبب ہم اسے کبھی نہیں دیکھ سکیں گے۔ البتہ قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے کے بارے میں آج ہمارے پاس درجنوں نظریات ضرور موجود ہیں۔

کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ۔۔۔

مگر ایک منٹ۔۔۔۔۔ ایک منٹ۔۔۔۔۔ یہ انسان کون ہے؟

کیا انسانی علم میں اس انسان کو جاننے کا بھی کوئی نظریہ موجود ہے؟

آخر قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے دیکھنا اس انسان کے لیے اتنا ضروری کیوں ہے؟

اپنے ہمسایے سے بے خبر انسان اس کائنات سے پرے کیوں دیکھنا چاہتا ہے؟

کیا یہ انسانی خواہشات کی لامحدودیت پر ایک دلیل نہیں ہے؟

آخر ایک محدود اور حقیر انسانی وجود میں یہ لامحدود تجسس کیوں پایا جاتا ہے؟

انسان میں موجود اس تجسس اور خواہشات کی لامحدودیت کا سبب تو اس دنیا کے سیانے ہی بہتر بتا سکتے ہیں، البتہ قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے کی چند کہانیاں میں آپ کو سنا دیتا ہوں۔۔۔

کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے بھی کائنات کا پھیلاؤ بالکل اسی طرح سے جاری رہتا ہے اور مکمل کائنات کا حجم کم سے کم 23000 ارب نوری سال ہے، جبکہ ایک رائے یہ بھی ہے کہ کل کائنات اس قابلِ مشاہدہ کائنات سے 10^23 گنا بڑی ہے۔

اور پھر کچھ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ہماری یہ کائنات ایک اکیلی کائنات نہیں ہے۔ ماہرِ طبعیات Alan Guth اور Andre Linde کے نظریات۔۔۔

Chaotic Inflation Theory اور Cosmic Inflation Theory

کے مطابق۔۔۔۔ ہماری اس کائنات سے پرے مزید 10^1000000000000 کائناتیں موجود ہوسکتی ہیں اور پھران کائناتوں کے طبعی قوانین بھی ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتے ہیں۔

10^1000000000000 کائناتیں۔۔۔۔ یہ تعداد، کتنی تعداد ہے؟

کچھ خام سا اندازہ کر سکتے ہیں تو کر لیجیے۔ یا چلیں۔۔۔

میں آپ کی تھوڑی سی مدد کر دیتا ہوں۔

1 کے بعد اگر 6 صفر لگائے جائیں تو ملین بنتا ہے۔

9 صفر لگائے جائیں تو بلین بنتا ہے اور۔۔۔

اگر 1 کے بعد 12 صفر لگا دیے جائیں تو ٹریلین بنتا ہے۔

اب اگر ہم 1 کے بعد 12 صفر نہیں بلکہ ٹریلین صفر لگا دیں تو۔۔۔

پھر کیا چیز بنے گی؟؟؟

بس۔۔۔۔۔ یہ جو بھی چیز بنے گی، اتنی ہی کل کائناتوں کی تعداد ہوسکتی ہے۔

ہماری زمین پر ریت کے ذرات کی تعداد 10^18 ہے۔

قابلِ مشاہدہ کائنات میں کل ستاروں کی تعداد 10^21 ہے۔

جبکہ Alan Guth اور Andre Linde کے نظریات کے مطابق کل کائناتوں کی تعداد 10^1000000000000 تک ہوسکتی ہے۔ یعنی۔۔۔

یعنی اس زمین پر موجود ریت کے ہر ایک ذرے کے بدلے میں اگر ایک پوری کائنات کو ہی اس عدد میں سے تفریق کر دیا جائے تب بھی۔۔۔

تب بھی اس عدد میں سے محض 18 صفر کم ہوں گے۔

999,999,999,982 صفر پھر بھی بالکل ویسے کے ویسے ہی موجود رہیں گے۔
البتہ ایک بات یقینی ہے کہ 1 کے بعد ٹریلین صفر لگا دینے سے جو بھی عدد حاصل ہو گا، وہ محدود ہو گا۔

لا محدود نہ صرف اس عدد سے بڑا ہو گا۔۔۔۔۔ بلکہ لا محدود طور پر بڑا ہو گا۔
ایک رائے یہ بھی ہے کہ ہماری کائنات سے پرے اس کائنات جیسی مزید لا محدود کائناتیں پائی جاتی ہیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کائنات اپنی جگہ بھی لا محدود ہے۔
یعنی۔۔۔۔۔لامحدود ضرب لامحدود۔۔۔۔۔حاصل پھر سے لامحدود۔
شاید یہ وہ مقام ہے کہ جہاں پر 93 ارب نوری سالوں پر محیط یہ قابلِ مشاہدہ کائنات بھی محض ایک ذرے کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔
ہر ایک کائنات بھی اپنا انفرادی مقام اور مرتبہ کھو بیٹھے گی۔
تو پھر ایک ذرے جیسی کائنات میں۔۔۔ ایک نظر بھی نہ آنے والی کہکشاں کے۔۔۔ایک چھوٹے سے نظامِ شمسی کی۔۔۔ایک نقطے جیسی زمین پر موجود۔۔۔
انسان کون ہے؟
میں کون ہوں؟
شاید۔۔۔۔۔کچھ بھی نہیں۔
کچھ بھی تو نہیں۔
مگر ایک منٹ۔۔۔۔۔اب ایک کام اور بھی کرتے ہیں۔کسی گرد آلود سطح پر اپنے ہاتھ کی انگلی سے ایک لکیر کھینچیں۔اس عمل کے نتیجے میں آپ کی فِنگر ٹپ پر خاک کے بہت سارے ذرات چپک جائیں گے۔ یہ ذرات اتنے چھوٹے اور ایسے باریک ہوں گے کہ انفرادی طور پر کسی ایک ذرے کو دیکھنا بہت مشکل ہو گا، مگر آپ تھوڑی کوشش کیجیے اور کسی ایک ذرے کا انتخاب کر کے اسے باقی ذرات سے الگ کر لیجیے۔
اس وقت آپ کی فِنگر ٹپ پر موجود یہ بالکل حقیر، نظر بھی نہ آنے والا خاک کا ذرہ شاید بہت اعلیٰ ظرف ہے۔ یہ خاک کا ذرہ اپنے اندر ایک پوری کائنات چھپائے بیٹھا ہے لیکن پھر بھی اس کی عاجزی کا عالم یہ ہے کہ آپ کی ایک ذرا سی پھونک سے یہ ہوا میں ہوا ہو جائے گا۔ بتایا جاتا ہے کہ خاک کے ایک حقیر، نظر بھی نہ آنے والے ذرے میں تقریباً

4330000000000000000000 ایٹمز موجود ہوتے ہیں۔

ان میں سے ہر ایٹم میں ایک نیوکلیس ہوتا ہے اور ہر نیوکلیس میں پروٹون اور نیوٹرون ہوتے ہیں، جبکہ نیوکلیس کے گرد مختلف تعداد میں الیکٹرونز بھی گردش کرتے رہتے ہیں۔

تقریباً کسی نظامِ شمسی کی مانند۔

ایٹم کی اس دنیا میں الیکٹرون، پروٹون اور نیوٹرون کے سوا بھی بہت سے۔۔۔

Sub-Atomic Particles موجود ہوتے ہیں اور وقت کے ساتھ ایٹم کی اس دنیا میں نئی سے نئی ''چیزیں'' دریافت ہوتی چلی جارہی ہیں۔

تو کیا ریت کا ہر ذرہ اپنے اندر ایک مکمل کائنات چھپائے خاموش بیٹھا ہے؟

میری ایک مٹھی میں خاک کے کتنے ذرات سما جاتے ہوں گے؟

میری چہل قدمی کے دوران کتنی کائناتیں میرے قدموں تلے روندی جاتی ہوں گی؟

میری تو ایک پھونک سے ہی اربوں کائناتوں میں قیامت آجاتی ہوگی ناں؟

اگر میں اپنی ہتھیلی پر لاتعداد کائناتیں اکٹھی کرسکتا ہوں تو پھر۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

کیا میں ایک لامحدود بڑی کائنات میں زندہ ہوں اور۔۔۔

میرے ہاتھوں میں خاک کے ذرات ہیں؟

یا پھر۔۔۔

میں خود ایک ذرے میں موجود ہوں اور۔۔۔

میری ہتھیلی پر اربوں کائناتیں بسیرا کرتی ہیں؟

ہر کائنات اگر ایک ذرے کی مانند ہے تو ہر ذرہ بھی اپنے اندر ایک مکمل کائنات چھپائے بیٹھا ہے۔ کائنات اور ذرات کی اس آنکھ مچولی میں۔۔۔

''میں نقطہ کا قیدی ہوں''

باب:3

غلام ابنِ غلام

انسانی زندگیوں کو بہت زیادہ متاثر کرنے والے عوامل میں سے ایک وقت (Time) بھی ہے۔ ہر انسان نہ چاہتے ہوئے بھی وقت کی ایک اَن دیکھی ڈور کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ آپ کہیں چلیں جائیں، جتنا مرضی بھاگ لیں۔۔۔

یہ وقت پیچھا نہیں چھوڑتا، ہمیشہ ساتھ ساتھ رہتا ہے۔

آپ فارغ بیٹھے ہوں یا کوئی کام کر رہے ہوں، وقت گزرنے کا ایک خیال آپ کے ذہن میں نہ صرف ہمیشہ موجود رہے گا بلکہ مستحضر بھی۔ آپ سفر میں ہوں یا میٹنگ میں، کوئی کتاب پڑھی جا رہی ہو یا پھر چل رہی ہو دوستوں کے ساتھ گپ شپ۔۔۔

ہر ایک کیفیت میں گزرتا وقت آپ کو اپنا احساس ضرور دلائے گا۔ ہر ایک کیفیت میں گھڑی پر وقت دیکھ کر یا تو وقت کی سست روی کی شکایت کی جاتی ہے یا پھر وقت کی برق رفتاری اعصاب پر گراں گزر رہی ہوتی ہے۔

حتیٰ کہ دورانِ نیند بھی وقت گزرنے کا ایک مدھم سا احساس ضرور رہتا ہے اور پھر نیند سے بیدار ہوتے ہی جو خیالات فوراً سے آپ کے دماغ میں بسیرا کرتے ہیں، ان میں وقت کا خیال یقیناً سرِفہرست ہوتا ہوگا۔

انسانی زندگیوں پر اس قدر گہرے اثرات مرتب کرنے والی چیز۔۔۔

یہ وقت آخر کیا چیز ہے؟

گھڑی میں حرکت کرتی ان حقیر بے جان سوئیوں میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی ہے کہ یہ انسانی زندگیوں کا رخ متعین کرتی ہیں؟

کبھی محسوس کیا آپ نے؟

ایک انسان کی زندگی کی بیشتر چیزوں کا فیصلہ یہ وقت کرتا ہے۔ اب سونے کا وقت ہے

تو اب جاگنے، ابھی کام کرنا چاہیے تو ابھی آرام۔

ہر چیز وقت کے ساتھ ساتھ رونما ہوتی ہے، ہر چیز کے لیے کوئی نہ کوئی وقت مقرر ہے اور انسان کے پاس اس وقت کی ماننے بِنا کوئی بھی دوسرا راستہ موجود نہیں۔

اس وقت کے آگے ہر انسان ہی مجبورِ محض ہے۔شاید۔۔۔

شاید ہر انسان وقت کا ایک ادنیٰ غلام ہے۔

وقت کی تلوار سر پر لٹکائے ہر انسان کبھی اِدھر بھاگا جاتا ہے تو کبھی اُدھر۔

نہ جانے انسان کی منزل کیا ہے؟

انسان پیدا ہوتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ جوان، پھر بوڑھا اور پھر۔۔۔

یہ وقت آخر کیا چیز ہے جو انسانی زندگیوں کو نگلے جا رہا ہے۔۔۔ بِنا رکے، بِنا بتائے۔

وقت گزرنے کے ساتھ چہرے پر جھریاں کیسے پڑ جاتی ہیں؟ بال سفید کیوں ہو جاتے ہیں؟

کیا ہمارے جسم میں موجود ہر ایک خلیے (Cell) میں کوئی خفیہ گھڑی بھی نصب ہے؟

ایک ایسی گھڑی جو کبھی رکتی نہیں، کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔

اور پھر۔۔۔۔۔ وقت کو دھوکا دینا ممکن ہے کیا؟

ہمارے جسم کو وقت گزرنے کا احساس کیسے ہو جاتا ہے؟ گھڑی میں حرکت کرتی ان بے جان سوئیوں کا ہمارے جسم میں ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

پھر بات محض ایک انسان پر ہی تو ختم نہیں ہو جاتی۔

وقت گزرنے کے ساتھ ایک پودا، درخت کیسے بن جاتا ہے؟ بیج سے کھیتی کیسے اُگ آتی ہے؟ کیا پودوں کے خلیے بھی وقت کا ادراک رکھتے ہیں؟

پھر یہ وقت تو بے جان چیزوں پر بھی اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ چیزیں پرانی اور خراب کیسے ہو جاتی ہیں؟

کیا اس کائنات کا ہر ایک ذرّہ وقت کا شعور رکھتا ہے؟

گھڑی میں نصب سوئیاں تو ہمیشہ ایک جیسی حرکت کرتی ہیں۔ایک ہی حرکت کو یکساں طور پر دہراتی رہتی ہیں۔۔۔

بار بار۔۔۔۔۔ بار بار۔

پھر انسانی زندگیوں میں یہ وقت ہمیشہ ایک جیسا کیوں نہیں رہتا؟

کبھی تو یہ وقت ایسا مہربان ہوجاتا ہے کہ بس ہر جانب اچھا ہی اچھا دکھائی دینے لگتا ہے۔ ہر سُو اتنی خوشیاں کہ انسان کو گمان ہونے لگتا ہے کہ اب کبھی غم واپس نہ آئیں گے مگر پھر۔۔۔

کیا اس وقت کو روکا جا سکتا ہے؟

کسی بھی طرح۔۔۔

خوشی کے لمحات اتنے مختصر کیوں ہوتے ہیں؟ کوئی بھی من پسند کام کرتے ہوئے وقت اتنی تیز رفتاری سے کیسے گزر جاتا ہے؟ انتظار یا تکلیف کے لمحات میں وقت تھم کیوں جاتا ہے؟

ہمارے اندر تبدیل ہوتے احساسات کا، ہماری جذباتی کیفیات کا اس وقت کو کیسے علم ہوجاتا ہے؟

یہ وقت انسان کی مرضی سے کیوں نہیں چلتا؟ جب چاہا رفتار بڑھا دی اور جب چاہا کم کر دی۔

یہ زمین بھی ایک ہی زمین ہے اور یہ سورج بھی وہی سورج ہے۔ زمین پر موجود ہر شخص کے لیے سورج روزانہ مشرق سے طلوع ہوتا ہے اور مغرب میں غروب۔ پھر سبھی دن ایک جیسے کیوں نہیں ہوتے؟ ہر دن، سب انسانوں کے ساتھ یکساں رویہ کیوں نہیں رکھتا؟

یہ وقت ہمیشہ ماضی، حال اور مستقبل میں کیوں بٹا رہتا ہے؟

ماضی یادوں سے بھرپور کیوں ہوتا ہے؟ مستقبل کے اندیشے انسان کو ڈستے کیوں رہتے ہیں؟

کیا ماضی سے پیچھا چھڑوا کر، مستقبل کو بھلا کر۔۔۔۔۔حال میں زندگی بسر کرنا ممکن ہے؟

اب تو اس دنیا میں ہر چیز کی دوا ملنے لگی ہے۔۔۔۔۔اس وقت کا بھی کوئی تریاق ہے کیا؟

دنیا میں موجود اتنی قومیں آزادی حاصل کر چکی ہیں تو پھر وقت کے اس غلام کو آزادی کب ملے گی؟۔۔۔۔۔کبھی ملے گی بھی یا نہیں؟

حضرتِ انسان کے لیے یہ وقت ہمیشہ سے ایک معمّہ بنا رہا ہے۔ ہر دور کے صاحبانِ علم و دانش اپنے اپنے انداز میں وقت کی اس الجھی ڈور کو سلجھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بہت سے ماہرِ طبعیات نے اپنی پوری پوری زندگیاں وقت کی چالیں سمجھنے میں صرف کر دیں، مگر وقت نے بھی شاید ٹھان رکھی ہے کہ کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آنا۔ انسان اپنی تمام کوششوں، علمی ترقی اور ٹیکنالوجی کے باوجود اس وقت کی حقیقت جاننے میں ناکام ہے۔ البتہ انسانی علم میں قید ہوجانے والے وقت کے کچھ خواص یقیناً قابلِ ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کے آغاز تک سمجھا یہی جاتا تھا کہ ''وقت کی رفتار اس کائنات میں ہر جگہ، ہر شخص اور ہر چیز کے لیے ہمیشہ یکساں رہتی ہے۔'' وقت کو ایک یک طرفہ لمبی سڑک کی مانند تصور کیا

جا تا تھا اور اس سڑک پر ہر چیز لمحہ بہ لمحہ، ایک سیکنڈ فی سیکنڈ کی رفتار سے آ گے کی جانب سِرکتی چلی جاتی تھی۔ اس سڑک پر واپسی کو ناممکن تصور کیا جا تا تھا۔ ماضی کے ساتھ انسان کا تعلق صرف یادوں کی حد تک ممکن تھا، جبکہ مستقبل ہر شخص کے لیے ہی اَن دیکھا اور نا معلوم تھا۔

1905 میں البرٹ آئین سٹائین نے Special Theory of Relativity کے نام سے ایک نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا اور اس نظریے نے وقت کے بارے میں اس وقت تک موجود تمام نظریات کو باطل قرار دے دیا۔ پچھلی ایک صدی سے زائد عرصے میں آئین سٹائین کا یہ نظریہ بہت سارے عملی تجربات میں سے کامیابی کے ساتھ گزر چکا ہے اور شاید یہ سائنس کا وہ خاص نظریہ ہے، جس پر بہت زیادہ افسانہ نویسی بھی کی گئی ہے۔ اس ایک نظریے سے متاثر ہو کر ٹائم ٹریول کے موضوع پر لاتعداد ناول لکھے گئے ہیں، متعدد فلمیں بنائی گئی ہیں۔

اس نظریے کے مطابق روشنی ایک ایسی چیز ہے، جس کی رفتار ہر جگہ، ہر قسم کے حالات میں یکساں رہتی ہے اور روشنی کی یہ رفتار تقریباً تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔

زمین اور سورج کے مابین تقریباً 15 کروڑ کلومیٹر کا فاصلہ موجود ہے۔ اس طویل فاصلے کی وجہ سے سورج کی روشنی کو زمین تک پہنچنے میں 8.3 منٹ لگ جاتے ہیں۔ اگر ابھی اور اسی وقت سورج تباہ ہو جائے، تب بھی سورج کی تباہی کی اس خبر کو ہم تک پہنچنے میں 8.3 منٹ لگ جائیں گے، جبکہ اس دوران سورج کی وہ کرنیں ہم تک پہنچتی رہیں گی، جنھوں نے 8.3 منٹ پہلے سورج سے زمین کی جانب اپنے سفر کا آغاز کیا ہوگا۔ تباہ ہو جانے کے باوجود سورج اگلے 8.3 منٹ تک ہمیں بالکل ٹھیک ٹھاک نظر آتا رہے گا۔

یعنی ہم سورج کو ہمیشہ اس کے ماضی میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔

ہمارے لمحۂ موجود (Now) اور سورج کے لمحۂ موجود (Now) میں 8.3 منٹ کا فرق موجود ہے۔ لمحۂ موجود کا یہی فرق بڑھتے بڑھتے 25 لاکھ سال کا ہو جائے گا، اگر ہم زمین سے سورج کی جانب نہیں بلکہ M-31 کہکشاں کی جانب دیکھ رہے ہوں۔ M-31 کہکشاں کا زمین سے فاصلہ اتنا زیادہ ہے کہ اس کی روشنی کو ہم تک پہنچنے میں تقریباً 25 لاکھ سال لگ جاتے ہیں۔ اگر آج ہم M-31 کہکشاں کا دوربین کی مدد سے مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں وہ مناظر نظر آئیں گے، جو M-31 پر آج سے 25 لاکھ سال پہلے موجود تھے۔

ان پچھلے 25 لاکھ سالوں میں اس کہکشاں پر کیا گزری ہوگی؟

یہ کہکشاں اپنی جگہ پر موجود ہے؟۔۔۔۔۔ یا پھر تباہ و برباد ہو چکی؟
ان سبھی باتوں کو جاننے کے لیے ہمیں مزید 25 لاکھ سال انتظار کرنا ہوگا۔

مختصر یہ کہ ہم اجرامِ فلکیہ کو ہمیشہ ان کے ماضی میں دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہم آسمان میں جتنا زیادہ دور دیکھیں گے، ہماری نگاہیں اتنا ہی ماضی بعید کی جانب سفر کرتی رہیں گی۔ جبکہ دوسری جانب روشنی کی اس محدود رفتار کے وقت پر بھی کچھ دلچسپ اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ہماری زمین سے تقریباً 74 نوری سال کی مسافت پر ایک ستارہ موجود ہے جسے 84 Ceti کہتے ہیں۔ اب چند لمحات کے لیے تھوڑا غور و فکر کریں اور سوچیں کہ اس ستارے پر موجود کوئی شخص اگر ٹیلی سکوپ کی مدد سے زمین کا مشاہدہ کرے گا تو اسے کیا نظر آئے گا؟

وہ شخص زمین کا ماضی دیکھ رہا ہوگا اور اسے آج سے تقریباً 74 سال پہلے کی زمین اور زمینی مناظر نظر آئیں گے۔ اگر زمین پر اس وقت 2020 ہے تو Ceti 84 پر موجود شخص کو زمین پر 1946ء کے آس پاس کے مناظر دکھائی دیں گے۔ اس شخص کے نقطۂ نظر سے ابھی پاکستان بنا بھی نہیں ہوگا۔ اس شخص کے نقطۂ نظر سے شاید ابھی آپ پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔

84 Ceti پر موجود شخص اگر زمین کا مسلسل مشاہدہ کرتا رہے تو آپ کی زندگی کے گزر جانے والے تمام لمحات کا مشاہدہ کرنا اس شخص کے لیے ممکن ہوگا، عین ممکن ہوگا۔

یعنی آپ کا ماضی، آپ کی زندگی کا ہر ایک لمحہ اس وقت بھی موجود ہے۔ آپ کا ماضی کہیں کھو یا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ کسی اور شخص کے لیے آپ اس وقت بھی ایک چار سال کے بچے کی حیثیت رکھتے ہوں گے اور شاید۔۔۔۔۔ آج آپ سکول نہ جانے کی ضد کر رہے ہوں۔

آئین سٹائین کے اس نظریے کے مطابق وقت میں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی بھی حقیقی تقسیم موجود نہیں ہے۔ یہ تینوں وقت، ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

بالکل کسی DVD پر موجود فلم کی مانند۔۔۔

DVD پر پوری فلم ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ یہ ہم ہیں جو اس فلم کو لمحہ بہ لمحہ دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اس فلم کے کچھ مناظر ہمارے لیے ماضی کی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں تو کچھ مناظر مستقبل کی۔ اسی طرح یہ وقت بھی اپنی جگہ پر موجود ہے۔ ہمارا ماضی، حال اور مستقبل ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ یہ ہم ہیں جو اس وقت میں سے گزر رہے ہیں۔

لیکن DVD پر موجود مناظر کو تو ہم اپنی مرضی سے جب چاہیں آگے یا پیچھے بھی کر سکتے

ہیں۔حتیٰ کہ کسی من چاہے منظر پر ویڈیو کو روکنا بھی ہمارے لیے ممکن ہوتا ہے۔اگر وقت بھی DVD پر موجود فلم کی مانند ہے تو کیا ہمارے لیے یہ ممکن ہے کہ ہم بھی اس وقت میں اپنی مرضی سے آگے یا پیچھے کی جانب سفر کر سکیں؟ اگر ہمارا ماضی اس وقت بھی موجود ہے تو کیا ہم اپنے ماضی میں واپس جاسکتے ہیں؟ کیا ہم اپنے مستقبل کو قبل از وقت جان سکتے ہیں؟ کیا وقت کے گزرتے لمحات کو روکا جاسکتا ہے؟ اور۔۔۔

اور کیا ہم وقت کو شکست دے سکتے ہیں؟

آئین سٹائین کے نظریات۔۔۔

Special & General Theory of Relativity کے مطابق ان تمام سوالات کا جواب ''ہاں'' ہے۔کم از کم نظریے کی حد تک وقت کو دھوکا دینا عین ممکن ہے۔

ان نظریات کے مطابق کائنات میں وقت گزرنے کی رفتار ہر جگہ، ہر چیز کے لیے یکساں نہیں ہوتی۔کششِ ثقل اور رفتار۔۔۔۔۔ یہ دو ایسے عوامل ہیں جو کسی بھی چیز پر وقت گزرنے کی رفتار کو کم یا زیادہ کر سکتے ہیں۔

کششِ ثقل (Gravity) کا زیادہ ہونا وقت کی رفتار کو کم کر دیتا ہے، جبکہ کسی بھی چیز کی اپنی رفتار (Speed) میں اضافہ اس چیز پر وقت گزرنے کی رفتار میں کمی کا باعث بنتا ہے۔

انہی دونوں عوامل میں ردّ و بدل کے سبب ہماری روزمرّہ کی زندگی میں بھی وقت گزرنے کی رفتار مختلف اشخاص کے لیے مختلف ہوسکتی ہے، مگر وقت کی رفتار میں کمی یا زیادتی کا یہ فرق ایسا معمولی اور اتنا کم ہوتا ہے کہ عملی زندگی میں اس فرق کو محسوس کرنا ہمارے لیے ناممکن ہو جاتا ہے۔البتہ وقت کی رفتار میں اس تبدیلی کو Atomic Clock کی مدد سے ثابت کیا جاسکتا ہے بلکہ ثابت کیا جا چکا ہے۔

اگر آپ دو Atomic Clock لے کر ان میں سے ایک کو زمین پر رکھ کر دوسرے کو زمین سے دس میٹر کی بلندی پر ہوا میں معلّق کر دیں گے تو جو کلاک زمین پر موجود ہوگا، اس پر وقت گزرنے کی رفتار دوسرے کلاک کی نسبت کم ہوگی، کیونکہ زمین کے قریب کششِ ثقل نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔جیسے جیسے کششِ ثقل میں اضافہ ہوگا، وقت کی رفتار کم اور کم ہوتی چلی جائے گی۔

بالکل اسی طرح سے اگر آپ ایک Atomic Clock کو بالکل ساکن رکھ کر

دوسرے کو تیز رفتاری کے ساتھ حرکت دیتے رہیں گے تو حرکت کرنے والے کلاک پر وقت گزرنے کی رفتار نسبتاً کم ہو گی۔

لہٰذا اگر آپ وقت کو شکست دینا چاہتے ہیں، وقت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اگر آپ اپنے ہی ماضی میں واپس جانا چاہتے ہیں تو یہ کام بہت آسان ہے۔ سائنس کے یہ نظریات آپ کی خدمت میں ہمہ وقت موجود ہیں۔

آپ ایک تیز رفتار خلائی جہاز پر بیٹھ کر اپنے سفر کا آغاز کر دیجیے۔ جیسے جیسے آپ کی اپنی رفتار بڑھے گی، وقت گزرنے کی رفتار آپ کے لیے سست ہوتی چلی جائے گی، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آجائے گا کہ یہ وقت آپ کے لیے بالکل ساکن ہو جائے گا، آپ وقت کی قید سے آزاد ہو جائیں گے۔

مگر اس کے لیے آپ کو روشنی کی رفتار سے سفر کرنا ہوگا۔ اگر آپ مسلسل روشنی کی رفتار سے سفر کرتے رہیں تو سدا جوان بھی رہ سکتے ہیں اور اگر کہیں آپ کی رفتار روشنی کی رفتار سے بھی بڑھ جاتی ہے تو یہ وقت آپ کے لیے الٹی چال چلنا شروع کر دے گا۔ آپ واپس اپنے ہی ماضی میں سفر شروع کر دیں گے۔

اسی طرح سے اگر آپ ماضی نہیں بلکہ مستقبل کی جانب سفر کرنا چاہتے ہیں تو اپنے اس خلائی جہاز کو کسی بلیک ہول کے نزدیک لے جائیں اور پھر ایک سال اس کے گرد چکر کاٹتے رہیں۔ کششِ ثقل اور رفتار کی زیادتی کے سبب ایک سال بعد جب آپ واپس زمین پر آئیں گے تو عین ممکن ہے کہ آپ کے اس ایک سال کے سفر کے دوران زمین پر دس سال گزر چکے ہوں۔ اس طرح سے آپ محض ایک سال کے عرصے میں دس سال کا سفر طے کر کے مستقبل میں چھلانگ لگا دیں گے، مگر۔۔۔

مگر آپ کے اس ایڈونچر میں کچھ ''چھوٹے چھوٹے'' مسائل آڑے آرہے ہیں۔

آج تک انسان کے بنائے ہوئے کسی بھی خلائی جہاز کی زیادہ سے زیادہ رفتار 68 کلومیٹر فی سیکنڈ ہے اور یہ جہاز ''پارکر سولر'' کے نام سے جانا جاتا ہے، جبکہ دوسری جانب وقت میں واپس جانے کے لیے ہمیں جو رفتار درکار ہے، وہ تقریباً 300000 کلومیٹر فی سیکنڈ ہے۔

مزید برآں۔۔۔۔۔آئین سٹائین کے انہی نظریات کے مطابق اس کائنات میں کسی بھی چیز کے لیے روشنی کی رفتار سے زیادہ تیز حرکت کرنا ناممکن ہے۔

لہٰذا ماضی کے ساتھ تو یادوں کے سوا کوئی بھی اور رشتہ رکھنا ناممکن ہے، جبکہ مستقبل کی جانب سفر کرنے کے لیے ہمیں جتنی زیادہ کششِ ثقل کی ضرورت ہے، ایسی کششِ ثقل صرف کسی بلیک ہول کے نزدیک ممکن ہے اور زمین سے نزدیک ترین بلیک ہول بھی ہم سے ایک ہزار نوری سال کی مسافت پر موجود ہے۔یعنی۔۔۔

یعنی اگر ہم انسان کے بنائے ہوئے تیز ترین خلائی جہاز، پارکر سولر پر بیٹھ کر اس بلیک ہول کی جانب اپنے سفر کا آغاز کر دیں تو ہمیں محض اپنی منزل پر پہنچنے میں ہی 7500000 سال لگ جائیں گے، جبکہ کسی بلیک ہول کی کششِ ثقل سے بچ کر واپس آ جانا ایک بالکل ہی الگ قسم کا مسئلہ ہوگا۔

ماضی یا مستقبل کی جانب سفر کرنے کے کچھ ایسے مزید طریقے بھی اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش کی جانب سے بتائے جاتے ہیں۔ان ''مفید اور کارآمد'' طریقوں پر HollyWood[1] میں عملی تجربات ہوتے ہیں اور پھر نتائج کو ٹائم ٹریول پر بنی ایک فلم کی صورت میں عوام کے سامنے پیش کر دیا جاتا ہے۔

یوں عوام الناس کی وقت کو شکست دینے کی خواہش پوری ہو جاتی ہے۔
وگرنہ حقیقی زندگی میں تو انسان کی اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن ہے۔
وقت کی چالیں بہت مضبوط ہیں، رہائی ناممکن ہے اور۔۔۔
بنیادی طور پر وقت کو شکست دینے کی انسان کی یہ خواہش، خواہش ہے بھی نہیں۔
یہ ایک خواب ہے، حسرت ہے۔ یہ ایک Fantasy ہے۔
یہ خوابوں کی دنیا ہے۔ یہ لیول ٹو ہے۔
وگرنہ حقیقت تو یہ ہے کہ میرا باپ بھی وقت کا غلام تھا اور۔۔۔
میں بھی وقت کا غلام ہوں۔
''میں غلام ابنِ غلام ہوں''

---

[1] انسانی خواہشات کو مصنوعی طور پر پورا کرنے کی۔۔۔۔۔ناکام کوشش کرنے والی انڈسٹری کو ہالی وڈ کہتے ہیں۔

باب:4

دھوبی کا کتا

دہلی کے مضافات میں کچے مکانات اور جھونپڑیوں کا ایک پورا شہر آباد ہے۔ اسی شہر کی ایک جھونپڑی میں کرِشن عرف چندو بھی اپنے چاچا چاچی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ یہ چندو کے سگے چاچا چاچی نہیں تھے بلکہ چندو انہیں کچرے کے ایک ڈھیر پر خون میں لت پت، نیم مردہ حالت میں ملا تھا۔ وہ دونوں اسے اٹھا کر اپنے گھر لے آئے تھے۔ چندو کو کچرے کے ڈھیر سے اٹھا کر گھر لے آنے کا عمل کسی انسانی ہمدردی کی وجہ سے نہیں ہوا تھا، بلکہ چندو کے یہ چاچا چاچی پیشہ ور بھکاری تھے اور ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ ایسے حالات میں چندو ان کے کاروبار میں بڑھوتری کا اچھا ذریعہ ثابت ہوسکتا تھا۔

چندو اب چودہ برس کا ہو چکا تھا۔ یوں تو چندو کی اس چودہ سالہ زندگی کا ہر لمحہ ایک سانحہ تھا مگر دو بہت بڑے حادثے بھی ان چودہ برسوں میں رونما ہو چکے تھے۔ چندو کے لیے اس کی پیدائش ہی اس کی زندگی کا پہلا بڑا حادثہ تھی۔ وہ ایک اَن چاہا انسان تھا۔ وہ اپنی ماں کی تمام کوششوں کے باوجود دنیا میں آنے کے لیے بضد رہا۔ وہ ڈھیٹ بنا رہا اور پھر ایک شام کچرے کے ایک بہت بڑے ڈھیر کے دامن میں اس کی پیدائش ہوگئی۔ پیدائش کے فوراً بعد چندو کی ماں نے اس کے منہ میں افیون کی ایک چٹکی رکھ دی اور پھر اسے کچرے کے ڈھیر پر مرنے کے لیے چھوڑ کر خود چلی گئی۔ اس نے اپنی زندگی کے پہلے نو گھنٹے، اپنی زندگی کی پہلی رات کچرے کے اسی ڈھیر پر بسر کی تھی۔

رات گہری ہوتے ہی کچرے کے اس ڈھیر پر ایک الگ دنیا آباد ہوگئی تھی۔ سینکڑوں قسم کے کیڑے مکوڑے اور حشرات اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر کچرے میں سے خوراک تلاش کرنے لگے تھے۔ قریب ہی بارش کے جمع ہوئے پانی میں سے مینڈکوں کے ٹرّانے کی تیز آوازیں آ رہی تھیں۔

کتوں کے ٹولے کے ٹولے، کتوں کی طرح بھونکتے ہوئے کبھی اِدھر بھاگے جا رہے تھے تو کبھی اُدھر۔ رات گہری ہو جانے کے باوجود کسی مردار پر درجنوں گِدھ ابھی تک ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔

کچرے کے ڈھیر پر ہونے والی ان تمام سرگرمیوں سے بے خبر، چندو بھی ادھر موجود تھا۔ افیون کا

اثرا ب آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ بھوک کی وجہ سے اس کے نوزائیدہ بدن میں اب ذرا ذرا ہلچل ہونے لگی تھی اور پھر کچھ دیر بعد کچرے کے اس ڈھیر پر سے اٹھنے والی دیگر لاتعداد آوازوں میں چندو کے رونے کی مدھم آواز بھی شامل ہوگئی۔ رات گزرتی گئی مگر کچرے کے ڈھیر پر لگی رونقیں کم نہ ہوئیں۔

کتے بھونکتے رہے۔۔۔۔۔ چندو روتا رہا۔۔۔۔۔ مینڈک ٹراتے رہے۔

جس عمر میں بچے ماں کی چھاتی سے چپکے خوراک تلاش کر رہے ہوتے ہیں، اسی عمر میں وہ دوسرے جانداروں کی خوراک بن چکا تھا۔ رات کی تاریکی میں درجنوں چوہے اس کے ننھے بدن پر حملہ آور ہو چکے تھے۔

رات گزرتی رہی۔۔۔۔۔ چوہے کُتر کُتر چندو کو کھاتے رہے۔

بِنا کوئی آواز پیدا کیے وہ روتا رہا۔۔۔۔۔ وہ بلکتا رہا۔

وہ کبھی رو رو کر خود ہی چپ ہو جاتا۔۔۔۔۔ اور کبھی چپ پڑا پڑا پھر سے رونا شروع کر دیتا۔

چوہوں کی تمام کوششوں کے باوجود وہ زندہ رہنے کے لیے بضد رہا۔

وہ ڈھیٹ بنا رہا اور کسی نہ کسی طرح رات گزار گیا۔

چوہوں کے ساتھ ہونے والی اس یک طرفہ جنگ میں چندو جیت گیا۔

یا پھر۔۔۔۔۔ شاید۔۔۔۔۔ ہار گیا۔

اگلے دن صبح صبح کام پر جاتے ہوئے چاچے کی نظر جب اس پر پڑی۔۔۔۔۔ تب تک وہ اپنے ہی خون میں لت پت ہو چکا تھا۔ چاچا اسے اٹھا کر پہلے بستی میں موجود ایک کلینک پر لے گیا اور پھر چار دن بعد اپنے گھر۔ اس حادثے میں اس کی زندگی تو پوری بچ گئی مگر۔۔۔

وہ خود آدھا رہ گیا۔

اس کے ننھے بدن پر جگہ جگہ چوہوں کے کاٹنے سے زخم ہو چکے تھے۔ داہنے کان اور چہرے کا گوشت بُری طرح سے نوچا جا چکا تھا، جبکہ داہنے بازو کو زخموں کی شدت کے سبب جسم سے الگ ہی کرنا پڑا تھا۔

ویسے وہ زندہ تھا۔ اپنی ڈھٹائی کے سبب وہ زندہ تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس کے زخم تو قدرے بہتر ہو گئے مگر اس کا ادھورا وجود مکمل نہ ہو سکا۔

چندو ادھورا تھا۔۔۔۔۔ چندو ادھورا ہی رہا۔

البتہ تین سال بعد اس کا یہ ادھورا پن مکمل ضرور ہو گیا۔

اس کے پہلے سے ہی آدھے بدن میں آدھا مزید کم ہو گیا۔

وہ تین سال کا تھا، جب چاچے نے اس کی دونوں ٹانگیں بھی گھٹنوں کے اوپر سے کٹوا دیں۔

کامیاب بھکاری تو وہ اپنے اسی ادھورے وجود کے ساتھ بھی بن سکتا تھا،لیکن چاچا شاید اسے کامیاب ترین بھکاری بنانا چاہتا تھا۔ یہ اس کی زندگی کا دوسرا بڑا حادثہ تھا اور اس حادثے کے سبب وہ مکمل طور پر ایک نامکمل انسان بن چکا تھا۔

اس کی زندگی کے اس دوسرے بڑے حادثے کو بھی اب گیارہ برس بیت چکے تھے۔ان دونوں حادثات کے سبب اب اس کا داہنا بازو غائب تھا، دونوں ٹانگیں بھی اپنی جگہ پر موجود نہیں تھیں،اس کے رخساروں پر گوشت بھی بس برائے نام ہی تھا،جبکہ اس کے داہنے کان کی جگہ اب ایک خراب ہوا زخم تھا، جس میں سے آج بھی پیپ ملا خون بہتا رہتا۔

اسے ایک نظر دیکھتے ہی دیکھنے والے پر خوف طاری ہو جاتا، بدن میں جھرجھری آجایا کرتی۔ وہ کسی بھی طرح انسان دکھائی نہیں دیتا تھا اور۔۔۔

اور وہ انسان تھا بھی نہیں۔۔۔۔وہ انسان نما تھا۔

اس کے ادھورے وجود پر نمایاں چیز بس اس کی آنکھیں تھیں۔

بڑی بڑی، بالکل سفید اور بے حس و حرکت۔۔۔۔۔وہ گھنٹوں نہیں، پہروں ٹکٹکی لگائے ایک ہی سمت، ایک ہی جگہ دیکھتا رہتا تھا۔ پچھلے گیارہ سالوں سے وہ کبھی مسکرایا نہیں تھا اور نہ ہی کبھی کسی نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے۔ ہر قسم کے حالات میں اس کا چہرہ بس ایک ہی قسم کے تاثرات پیش کرتا رہتا۔ اگرچہ وہ بول سکتا تھا،لیکن بہت کم الفاظ تھے جو اس کے منہ سے ادا ہوا کرتے۔

شاید۔۔۔۔۔وہ مکمل طور پر بے حس ہو چکا تھا۔

البتہ وہ خوفزدہ ہو جایا کرتا تھا۔ اپنی اس تمام بے حسی کے باوجود اسے ڈر لگتا تھا۔ خوف وہ واحد جذبہ تھا،جس کا چندو کے ساتھ کسی قسم کا کوئی تعلق تھا اور پھر خوف کے یہ تاثرات بھی اس کے چہرے پر نمایاں نہیں ہوتے تھے بلکہ چندو کے خوفزدہ ہو جانے کا اندازہ اس کے کان پر موجود زخم سے ہوا کرتا تھا۔ جب بھی چاچا نشے میں دُھت چیخ چیخ کر اسے گالیاں سنا رہا ہوتا تو وہ چپ چاپ بے حس و حرکت پڑا رہتا، اس کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نمایاں نہ ہوتے، اس کی آنکھیں بھی ایک ہی جگہ ٹکٹکی لگائے رکھتیں۔بس۔۔۔۔۔اس کے کان پر موجود زخم سے خون بہنا شروع ہو جاتا۔

خوف کا چندو کے کان پر موجود اس زخم کے ساتھ کیا تعلق؟

وہ خود بھی عجیب تھا اور اس سے متعلق ہر چیز بھی۔

مگر یہ عجیب و غریب چیز چاچے کے بہت کام کی تھی۔ چاچا ہر صبح اس کے ادھورے وجود پر ایک

چھوٹی نیکر پہنا کر اسے لکڑی کی ریڑھی پر رکھ دیتا اور پھر ریڑھی کو دھکیلتا ہوا شہر کی جانب آجاتا۔ چاچا بھتیجا دونوں شہر کے داخلی دروازے کے قریب ایک مصروف سڑک پر کھڑے ہو جاتے۔ چاچا ہر آتے جاتے راہگیر کو بھتیجے کی جانب متوجہ کر کے بھیک مانگتا رہتا اور بھتیجا سارا دن بے حس و حرکت پڑا اپنی معذوری کو فروخت ہوتے دیکھتا رہتا۔ دوپہر کے وقت چاچا کھانے کے لیے گھر چلا جاتا اور بھتیجے کو پاس ہی موجود کچرے کے ایک ڈھیر پر چھوڑ جاتا۔

کچرے کا یہ ڈھیر وہ واحد چیز تھی، جس میں چندو کچھ دلچسپی لیا کرتا تھا۔ اس کا جنم بھی تو ایسے ہی کسی کچرے کے ڈھیر پر ہوا تھا۔ کچرے کے اس ڈھیر پر وہ اتنا زیادہ وقت گزار چکا تھا کہ اب یہاں موجود دیگر جاندار بھی اسے جاننے اور پہچاننے لگے تھے۔ یہاں پر اس سے کسی قسم کا اجنبی پن محسوس نہیں کیا جاتا تھا۔ کوے اور گِدھ بلا تکلف اس کے آس پاس منڈلاتے رہتے۔ چندو کو ایک انسان سے انسان نما چیز بنا دینے والے چوہوں سے بھی اب اس کی دوستی ہو گئی تھی۔ چوہوں کے ساتھ اپنی دشمنی کو بھلا کر چندو نے انہیں کھلے دل سے معاف کر دیا تھا۔ اب چوہے بلا خوف و خطر اس کے ادھورے بدن پر کھیلتے رہتے۔ اسے کچرے کے ڈھیر سے کھانے کی کوئی چیز مل جاتی تو وہ اپنا کھانا چوہوں کے ساتھ بانٹ لیا کرتا۔

مکھیاں اس کے چہرے پر بھنبھناتی رہتیں اور اس کے کان پر موجود زخم سے خون چوستی رہتیں، مگر چندو نے ان مکھیوں کی موجودگی کا کبھی بُرا محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کچرے کے اس ڈھیر پر پڑا کچرے کا ہی ایک حصہ دکھائی دیا کرتا۔ اس کا میلا کچیلا ادھورا بدن اور گندگی میں سے اٹھنے والا سخت تعفّن، دونوں ایک دوسرے کو مکمل کرنے کی اپنی اپنی کوشش کرتے رہتے۔

چندو کو کچرے کے اس ڈھیر پر وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔

کوے، گِدھ، چوہے، مکھیاں، لال بیگ اور دیگر حشرات؛ یہ سب اس کا خاندان تھا۔ ان کی موجودگی میں وہ خود کو کبھی تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔

اس کے پاس سب سے قیمتی چیز، اس کا واحد اثاثہ ایک ٹوٹا ہوا ریڈیو تھا۔ یہ ریڈیو بھی چندو کو کچرے کے اسی ڈھیر سے ملا تھا۔ ٹوٹا ہونے کے باوجود یہ ریڈیو ابھی اس قابل تھا کہ گانے نشر کر سکے۔ یہ ریڈیو سارا دن اس کی ریڑھی میں پڑا رہتا۔ دوپہر کے وقت جب چاچا کھانا کھانے کے لیے گھر جاتا تو اس وقت چندو ریڈیو پر گانے سن لیا کرتا تھا۔ کچرے کے اس ڈھیر پر اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ مل کر ٹوٹے ہوئے ریڈیو پر گانے سننا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تفریح تھی۔

لیکن پچھلے تیرہ دنوں سے وہ اس تفریح سے بھی محروم ہو چکا تھا۔ ریڈیو کی بیٹری ختم ہو گئی تھی

اور اس کے پاس تو کبھی بھی پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ ایک نئی بیٹری خرید سکے، جبکہ چاچا ان فضول چیزوں پر پیسے خرچ کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ چندو کی ساری امیدیں اب کچرے کے اسی ڈھیر سے وابستہ تھیں کہ شاید یہاں سے کوئی پرانی بیٹری مل جائے۔ پچھلے تیرہ دنوں سے اس کا ریڈیو بھی اسی کی طرح خاموش پڑا ہوا تھا۔ پچھلے تیرہ دنوں سے ہی وہ سر توڑ کوشش کر رہا تھا کہ کسی طرح گندگی کے اس ڈھیر میں سے کوئی قدرے بہتر حالت کی بیٹری ڈھونڈ سکے، مگر اس کی ہر کوشش مسلسل ناکام جا رہی تھی۔

آج بھی ایسا ہی ہوا۔ جیسے ہی چاچا اسے کچرے کے ڈھیر پر چھوڑ کر خود کھانا کھانے گیا تو وہ اپنے اکلوتے ہاتھ سے کچرے کو اِدھر اُدھر بکھیر کر بیٹری تلاش کرنے لگا۔ چندو کے دوست، چوہے اس کام میں اس کی مدد کر رہے تھے۔ وہ بیٹری ڈھونڈنے کی اپنی اسی ناکام کوشش میں مصروف تھا کہ اس کے عقب میں کچھ فاصلے پر ایک کالے رنگ کی گاڑی آ کر رک گئی۔ گاڑی میں سے تین افراد اتر کر اب اس کی جانب بڑھنے لگے تھے۔ کالے پینٹ کوٹ میں ملبوس یہ تینوں افراد چلتے چلتے چندو کے سر پر پہنچ گئے، مگر وہ ان کی موجودگی سے بے خبر، کچرے کے ڈھیر میں سے بیٹری ڈھونڈنے میں ہی لگا ہوا تھا۔ چوہوں کی ٹولی میں سے ایک نے سر اٹھا کر ان اجنبی افراد کی جانب دیکھا اور پھر ''چِر چِر'' کی تیز آوازیں نکال کر چندو کو ان کی موجودگی سے باخبر کرنے کی اپنی سی کوشش بھی کی، لیکن وہ اپنے کام میں ہی مصروف رہا۔

ان تینوں افراد نے ایک دوسرے کی جانب دیکھ کر چند اشارے کیے، جس کے بعد نسبتاً دراز قامت شخص نے اپنی جیب میں سے کوئی مشین نکالی اور آگے بڑھ کر چندو کی گردن کے ایک طرف چپکا دی۔

اس کے بعد چندو کو کچھ ہوش نہ رہا۔

یہ منظر جرمنی کے شہر برلن میں موجود ایک زیرِ زمین لیبارٹری کے میٹنگ روم کا تھا۔ میٹنگ روم میں اس وقت پوری دنیا سے آئے بہترین سائیکالوجسٹ، نیورالوجسٹ اور برین سائنٹسٹ موجود تھے۔ اس میٹنگ کے سربراہ مسٹر مارک انتھونی تھے۔ مسٹر مارک نہ صرف ایک بہت مشہور نیورالوجسٹ تھے بلکہ اس پروجیکٹ ''لیول تھری'' کے حقیقی کرتا دھرتا اور بانی بھی۔ اس پروجیکٹ کے لیے تمام وسائل کو اکٹھا کرنا مسٹر مارک کا ہی کام تھا۔ مسٹر مارک اور ان کی ٹیم برین سائنس کی دنیا کا اب تک کا سب سے بڑا اور جدید ترین تجربہ کرنے جا رہے تھے۔ اس پروجیکٹ کا مقصد لیول تھری کی انسانی خواہشات کی نوعیت جاننا تھا۔ مسٹر مارک اور ان کی ٹیم کا یہ کہنا تھا کہ۔۔۔

''انسانی خواہشات کا 99.99 فیصد حصہ لیول تھری کی خواہشات ہیں، جبکہ لیول
ون اور ٹو میں محض 0.01 فیصد یا پھر اس سے بھی کم خواہشات پائی جاتی ہیں۔''

لیول تھری میں انسانی خواہشات کا اس قدر بڑا حصہ ہونے کے باوجود کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں تھا، جو لیول تھری کی خواہشات کی حقیقی نوعیت سے واقف ہوتا، لیکن اب پچھلے نو سالوں کی رات دن کی محنت کے بعد مسٹر مارک اور ان کی ٹیم ایک ایسی مشین بنانے میں کامیاب ہو چکے تھے کہ جس کی مدد سے وہ لیول تھری کی انسانی خواہشات جاننے کی کوشش کر سکتے تھے۔ اس مشین نے انسانی دماغ کے ساتھ منسلک ہو کر کام کرنا تھا اور یہ مشین اس قابل تھی کہ کسی بھی انسان کو دماغی طور پر ایک مصنوعی زندگی میں پہنچا سکے۔ یہ مشین لیبارٹری ٹیسٹ میں کامیابی سے گزرنے کے بعد اب اپنے حقیقی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پوری طرح سے تیار تھی۔

آج کی اس میٹنگ کو بلانے کا مقصد بھی یہی تھا کہ پروجیکٹ کی بقیہ تمام تفصیلات کو حتمی شکل دی جا سکے۔ میٹنگ روم میں اس وقت پچاس سے زائد سائنسدان موجود تھے اور ان سب کی نگاہیں سامنے دیوار پر لگی ایک بہت بڑی سکرین پر جمی ہوئی تھیں۔ سکرین پر اس وقت کرِشن عرف چندو کچرے کے ڈھیر میں ہاتھ اِدھر اُدھر مارتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ دیر چندو کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے بعد مسٹر مارک نے ریموٹ اٹھا کر سکرین پر چلنے والے مناظر کو روک دیا اور پھر مسٹر رابرٹ سے پوچھنے لگے:

''کیا یہ معذور اور بدہیئت لڑکا ہی ہمارے اس مشن کے لیے سب سے موزوں اور بہترین انتخاب ہے؟''

مسٹر رابرٹ اس پروجیکٹ میں چیف سائیکالوجسٹ کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے فائلوں کا ایک بڑا سا انبار مسٹر مارک کی جانب بڑھا دیا اور پھر بتانے لگے:

''ہم نے دنیا کے مختلف ممالک میں مقیم آٹھ سو سے زائد افراد کی پانچ ماہ تک مسلسل نگرانی کرنے کے بعد اس لڑکے کا انتخاب کیا ہے۔ اس لڑکے کا نام چندو ہے اور اس وقت پوری دنیا کے تمام انسانوں میں سے لیول ون کی سب سے کم خواہشات اسی لڑکے میں پائی جاتی ہیں۔ ہمیں اپنے تجربے کے لیے ایک ایسے ہی انسان کی ضرورت ہے، جس کی خواہشات کم سے کم ہوں تاکہ ہماری بنائی ہوئی مشین ان خواہشات کو مصنوعی طور پر جلد سے جلد پورا کر سکے۔''

پھر تھوڑی بحث و تکرار کے بعد مسٹر مارک نے ایک فائل پر دستخط کر کے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

2 دن بعد۔۔۔

پروجیکٹ لیول تھری کے باقاعدہ آغاز کے لیے تمام انتظامات مکمل ہو چکے تھے۔ کرِشن عرف چندو

نہ صرف لیبارٹری میں پہنچ چکا تھا، بلکہ اس وقت وہ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ شیشے کے ایک باکس میں بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ اس کا ادھورا بدن اور پورا سر، دونوں شکنجوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کے لیے ذرا سی بھی حرکت کرنا ناممکن تھا۔ اس کے سر میں درجنوں سوئیاں گھسی ہوئی تھیں، جن کے ذریعے کوئی محلول وقفے وقفے سے اس کے دماغ میں داخل ہو رہا تھا۔ آپریشن روم میں اس کے سوا بھی تیس سے زائد افراد موجود تھے اور یہ تمام افراد مختلف مشینوں اور کمپیوٹرز کی مدد سے اس کے دماغ کی سکریننگ کرنے میں مصروف تھے، جبکہ مسٹر مارک، رابرٹ اور جون؛ تینوں اس وقت آپریشن روم سے ہی منسلک ایک کنٹرول روم میں موجود تھے۔ آپریشن روم اور کنٹرول روم کے بیچ شیشے کی دیوار حائل تھی اور شیشے کی دیوار کے دوسری جانب بالکل سامنے بے حس و حرکت پڑا چندو صاف دکھائی دے رہا تھا۔

برین سائنس کی دنیا کے اس سب سے بڑے تجربے میں کل پینتیس سے چالیس گھنٹے صرف ہونا تھے، جبکہ چندو کے لیے یہی وقت چار سے پانچ سال تک ہو سکتا تھا۔ اس تجربے کے دوران چندو کو دماغی طور پر واپس اس کی زندگی میں بھیج دیا جانا تھا اور چندو کو محسوس یہی ہونا تھا، جیسے وہ اپنی حقیقی زندگی گزار رہا ہو۔ اس مصنوعی زندگی میں مشین نے چندو کے دل میں پیدا ہونے والی ہر خواہش کو پورا کر دینا تھا۔ پہلے چندو کی لیول ون کی خواہشات پوری کی جانا تھیں اور پھر لیول ٹو کی۔ لیول ون اور ٹو کی خواہشات کے ایک خاص حد تک پورا ہو جانے کے بعد چندو نے اس قابل ہو جانا تھا کہ اس کے دماغ میں لیول تھری کی کوئی خواہش جنم لے سکے اور لیول تھری کی انسانی خواہش کی نوعیت جاننا ہی اس پورے پروجیکٹ کا واحد مقصد تھا۔

کنٹرول روم میں موجود مسٹر مارک نے اپنی کلائی پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا اور پھر مسٹر جون کو مشن شروع کرنے کی ہدایت جاری کی۔ مسٹر جون ایک نیورالوجسٹ تھے اور آپریشن روم کے انچارج بھی۔ آپریشن روم میں موجود تمام افراد مسٹر جون کی ٹیم کا ہی ایک حصہ تھے۔ مسٹر مارک کی جانب سے ہدایت ملتے ہی مسٹر جون اپنے سامنے موجود ایک مشین پر جھک گئے اور پھر یکے بعد دیگرے انہوں نے بہت سارے بٹن دبا دیے۔ آپریشن روم میں موجود ہر شخص کی نظریں اپنے سامنے موجود سکرین پر جمی ہوئی تھیں اور بالکل سامنے شیشے کے باکس میں چندو اپنے ادھورے وجود اور بے تاثر چہرے کے ساتھ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔

لیول ون

اچانک ایک جھٹکے سے اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اس وقت اپنی ریڑھی میں ہی موجود تھا اور اس کی ریڑھی سڑک کنارے اپنی مخصوص جگہ پر کھڑی تھی۔ اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ

رہی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ آج اس طرح دن کے وقت وہ سو کیسے گیا؟

اور پھر چاچا بھی تو غائب تھا۔۔۔۔۔شاید کھانا کھانے گیا ہوا تھا۔

سامنے سے کوئی راہگیر گزر رہا تھا۔ چندو نے اپنا اکلوتا ہاتھ آگے بڑھا دیا تو راہگیر نے پچاس کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ آج سے پہلے اس نے خود کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا تھا۔ یہ کام اس کا چاچا کیا کرتا تھا۔ آج چاچے کی غیر موجودگی میں جانے کیسے اس کا ہاتھ خود بخود ہی آگے بڑھ گیا اور پھر وہ ہر آنے جانے والے کے سامنے اپنا ہاتھ پھیلانے لگا۔ اس کے لیے حیرانی والی بات یہ تھی کہ کسی ایک شخص نے بھی اسے پیسے دینے سے انکار نہیں کیا تھا، جبکہ چاچے کو تو لوگ گالیاں بھی سنا جایا کرتے تھے۔

چاچا شام تک واپس نہ آیا اور اس دوران چندو کے پاس اتنے زیادہ پیسے اکٹھے ہو چکے تھے کہ ان پیسوں کی مدد سے وہ ایک بیٹری تو کیا بہت سارے نئے ریڈیو خرید سکتا تھا۔ سورج غروب ہو رہا تھا، جب اسے سڑک کے دوسری جانب سے چاچا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کے دل میں چاچے کے لیے شدید نفرت پیدا ہوئی۔ وہ چاچے کی غیر موجودگی میں اکٹھے کیے ہوئے پیسے چاچے کے حوالے نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ چاچا اگر مر جائے تو اچھا ہو اور۔۔۔

اور اسی لمحے جانے ایسا کیا ہوا کہ سامنے جاتے ایک ٹرک نے اچانک تیز موڑ کاٹا اور سڑک کنارے کھڑے چاچے کو کچلتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر پُراسرار نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور پھر ایک مسکراہٹ اچھال دی۔ چاچے کی کچلی ہوئی لاش کو دیکھ کر اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی اور ساتھ ہی وہ بے ہوش ہو گیا۔

وہ اگلے بہت سارے دن چاچے کی موت اور اپنی منتشر دماغی کے سبب کام پر نہ جا سکا۔ وہ سارا دن فارغ بیٹھا بس خالی خالی نظروں سے ان پیسوں کو دیکھتا رہتا، جو اس نے چاچے کی موت والے دن کمائے تھے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو چاچے کی موت کا ذمہ دار سمجھتا تھا۔ نہ وہ چاچے کا اس طرح سے برا سوچتا اور نہ چاچا مرتا۔ وہ ابھی تک حیران تھا کہ اس ٹرک نے اچانک اپنا رُخ کیوں تبدیل کر لیا تھا؟

پھر اس ٹرک ڈرائیور کی وہ معنی خیز مسکراہٹ اور دماغ میں گھستی ہوئی نگاہیں۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

چاچے کی موت کے بارھویں دن تک وہ اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ وہ کوئی چھوٹا لڑکا کام پر رکھ لے، جو سارا دن اس کی ریڑھی کو دھکیلتا رہا کرے اور پھر ہمسایہ جھونپڑی سے ایک گیارہ سالہ لڑکا بالا ساٹھ روپے روزانہ اجرت پر اسے اپنے کام کے لیے مل گیا۔ اب وہ دونوں صبح سویرے شہر کی جانب نکل جاتے۔ چاچے

کے برعکس چندو کو سارا دن ایک جگہ پر کھڑے رہنے سے کوفت ہوتی تھی۔ گلی گلی گھوم کر بھیک مانگنا اسے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ سارا دن سڑکوں پر گھومتے ہوئے وہ راہگیروں کو اپنے ادھورے جسم کی جانب متوجہ کر کر کے بھیک مانگتا رہتا۔ اس کی آمدن اب بہت بڑھ چکی تھی اور وہ کچھ فضول خرچ بھی ہو گیا تھا۔ وہ آتے جاتے ہر ٹھیلے سے کچھ نہ کچھ منگوا کر ضرور کھاتا۔ ان تمام عیاشیوں کے باجود اس کے پاس کافی سارے پیسے بھی جمع ہو چکے تھے۔ وہ ان پیسوں کو اپنی ریڑھی میں پڑی ایک موٹی چادر کی تہوں میں چھپا کر رکھتا تھا۔

ایک دن کام سے واپس آتے ہوئے انہیں اندھیرا ہو گیا۔ ایک ویران سڑک پر سے گزرتے ہوئے جانے بالے کو ایسا کیا ہوا کہ اس نے ریڑھی کو سڑک کنارے روک لیا۔ پھر بالے نے زمین سے ایک بھاری پتھر اٹھا کر چندو کو دھمکایا اور ساتھ ہی پیسے طلب کرنے لگا۔ چندو کو بالے کی اس حرام زدگی پر غصہ تو بہت آیا، مگر بالے کے ہاتھ میں موجود پتھر کے ڈر سے اس نے چپ چاپ سارے پیسے بالے کے حوالے کر دیے۔ بالا ان پیسوں کو لے کر ایک جانب بھاگ گیا اور جاتے جاتے اسے بہت ساری غلیظ گالیاں بھی سنا گیا۔ چندو کو اس وقت اپنی بے بسی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ اس کے دل میں خیال آیا کہ اگر آج اس کے ہاتھ پاؤں ٹھیک ہوتے تو وہ بالے کی اچھے سے خبر لے سکتا تھا۔ چندو کے دل میں اس خواہش کے پیدا ہونے کی دیر تھی کہ اچانک۔۔۔۔۔ بالکل اچانک اس کی ٹانگیں اور بازو پورے ہو گئے۔

ایسے جیسے کبھی کٹے ہی نہ ہوں۔

یوں جیسے یہ ٹانگیں اور بازو ہمیشہ اپنی جگہ پر ہی موجود رہے ہوں۔

وہ اب حیرت سے مرنے کے قریب تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ سب کیسے ہو گیا؟

کہیں وہ کوئی خواب تو نہیں دیکھ رہا تھا؟

اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی ٹانگوں کو چھو کر دیکھا تو وہ ہڈیوں اور گوشت سے بھرپور ٹانگیں تھیں اور کچھ یہی حال اس کے بازو کا بھی تھا۔ چندو نے آہستہ آہستہ کھڑے ہونے کی کوشش کی تو اسے اپنی اس کوشش میں ذرا بھی رکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔ وہ اب بالے کو بھول چکا تھا۔ اس کی حیرت کسی طور کم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔ وہ کبھی اِدھر بھاگا جا رہا تھا تو کبھی اُدھر۔ وہ اپنے بازو کو بھی بار بار گھما کر دیکھ رہا تھا۔ کوئی تیس منٹ کی اس ورزش کے بعد چندو کو اس بات کا یقین ہو گیا کہ یہ اس کا اپنا ہی جسم تھا۔ ریڑھی کے قریب زمین پر بیٹھا، وہ اب دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہو چکا تھا، مگر ساتھ ساتھ اس کا دماغ مسلسل اس الجھن کا شکار بھی تھا کہ وہ ٹھیک ہو کیسے گیا تھا؟ اسے جب اور کچھ بھی سمجھ نہ آیا تو وہ بے خیالی میں ہی اٹھ کر گھر کی جانب چلنے لگا۔ اپنی اس کوشش کے دوران اس کا نوزائیدہ پاؤں پوری قوت کے ساتھ

راستے میں پڑی ریڑھی کے ساتھ ٹکرا گیا۔ سابقہ رویے کے برعکس، ابھی اس کے منہ سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی اور ساتھ ہی اس نے ریڑھی کو ایک گندی گالی دے کر کہا:

''تجھے تو آگ لگ جائے۔''

اور۔۔۔۔اور اسی لمحے ریڑھی میں آگ بھڑک اٹھی۔

وہ فوراً ڈر کر پیچھے ہٹا، لیکن اب بات کچھ کچھ اس کی سمجھ میں آنا شروع ہو چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ ''جو چیز بھی وہ دل سے چاہتا ہے، وہ چیز حقیقت میں ہو جاتی ہے۔''

پچھلے چند دنوں کے بہت سارے واقعات یکے بعد دیگرے اس کی نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے کہ جہاں اس کے دل میں جیسے ہی کوئی خواہش پیدا ہوئی تو وہ فوراً پوری بھی ہو گئی۔ اپنے اس گمان کو یقین میں بدلنے کے لیے اس نے دل ہی دل میں خواہش کی کہ ریڑھی کو لگی آگ بجھ جائے اور حیران کن طور پر اسی لمحے آگ بجھ بھی گئی۔ اس نے کئی بار ریڑھی کو آگ لگائی اور بجھائی، لگائی اور بجھائی۔ آگ ہر بار اس کی خواہش کی پیروی کر رہی تھی۔ آخر چندو کو یقین ہو ہی گیا کہ۔۔۔

''جو خواہش بھی اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے، وہ فوراً پوری بھی ہو جاتی ہے۔''

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں، ہچکچاتے ہوئے اپنے ہاتھ کو کان اور چہرے پر موجود زخموں کی جانب بڑھایا۔ اس کا ہاتھ منہ تک پہنچنے سے پہلے ہی اس کے زخم بالکل ٹھیک ہو چکے تھے۔

اور۔۔۔۔اور پھر وہ مسکرایا۔ جی جان سے مسکرایا۔

آج گیارہ سال بعد اس کے چہرے پر مسکراہٹ واپس لوٹی تھی۔

وہ خوش تھا۔ وہ اپنی زندگی میں ایسا خوش پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس نے گھر جانے کا ارادہ بھی ترک کر دیا۔ وہ اب کہیں اور جانا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں خواہش کی اور اسی وقت ایک بالکل نیا چمچماتا ہوا موٹر سائیکل اس کے سامنے موجود تھا۔ کچھ لمحات بعد وہ موٹر سائیکل پر سوار ہوا کے دوش پر اڑا چلا جا رہا تھا۔ اس کے ہر انداز میں ایک خود اعتمادی تھی اور اس کے لب ریڈیو پر سنا ایک گیت گنگنا رہے تھے۔

28 ماہ بعد۔۔۔

امریکی ریاست کیلی فورنیا کے شمال مغرب میں چار سو کلومیٹر کے فاصلے پر بحرالکاہل میں ایک جزیرہ موجود ہے اور اس جزیرے کا کل رقبہ تقریباً چھ ہزار مربع کلومیٹر ہے۔ اس جزیرے کو ایک چھوٹا سا ملک تصور کیا جا سکتا ہے اور یہاں کی آبادی دو لاکھ کے قریب ہے۔

یہ جزیرہ مسٹر چارلی کی ملکیت ہوا کرتا تھا۔اس جزیرے کے سبھی باشندے چارلی اینڈ کمپنی کے ملازم تھے۔ چارلی کی اپنی ذاتی رہائش گاہ اور چارلی اینڈ کمپنی کے ہیڈ آفس بھی اسی جزیرے پر موجود تھے۔ چارلی ہفتے میں پانچ دن اپنی رہائش گاہ میں بنے کنٹرول روم سے پوری دنیا میں پھیلے اپنے کاروبار کی دیکھ بھال کیا کرتا، جبکہ وِیک اینڈ کے دو دن وہ اپنے اس چھوٹے ملک نما جزیرے سے باہر گزارا کرتا تھا۔

چارلی کی عمر اب چھتیس برس ہو چکی تھی اور وہ ایک ورلڈ سلیبر ٹی تھا۔ امریکہ میں ہونے والی ہر بڑی تقریب اس کے بِنا ادھوری تصور کی جاتی تھی۔ بہت ساری NGO's اور سیاسی جماعتیں چارلی اینڈ کمپنی کی فنڈنگ کی وجہ سے اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ سیاسی، سماجی، فلمی اور کاروباری؛ تمام حلقوں میں وہ یکساں طور پر جانا اور پہچانا جاتا تھا۔ لاس ویگاس کے کیسینوز اس کی پسندیدہ ترین جگہیں تھیں۔ اس کے اکثر وِیک اینڈ ادھر گزرتے تھے۔ اس کے قدم جس کیسینو کو بھی چھو جاتے، اس کیسینو کو پھر اگلے کئی مہینوں تک کام کرنے کی ضرورت نہ رہتی اور آج اس نے یہ اعزاز رائل بلیو کو بخشا تھا۔

رائل بلیو لاس ویگاس کا سب سے بڑا اور مشہور کیسینو تھا۔ آج سنڈے نائٹ تھی اور کیسینو کے VIP ہال میں اس وقت دنیا بھر سے آئے امراء موجود تھے۔ اگرچہ ہال میں اس وقت تین سو سے زائد افراد موجود تھے اور ان میں سے ہر شخص اپنی جگہ معاشرے میں مقام و مرتبہ رکھتا تھا، مگر ان سب افراد کی نگاہیں ہال کے مغربی کونے میں موجود ایک میز کی جانب لگی ہوئی تھیں۔

اس میز پر چارلی موجود تھا۔ ہال میں موجود خواتین کی نگاہیں اگر والہانہ انداز میں اس کے چہرے سے لگی ہوئی تھیں تو مرد بھی کن اکھیوں سے بار بار اسی کو دیکھ رہے تھے۔

وہ خوبصورت تھا، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ صرف وہی خوبصورت تھا تو کچھ بھی غلط نہیں ہوگا۔ دنیا کے خوبصورت ترین مرد بھی اس کی موجودگی میں معمولی شکل وصورت کے دکھائی دینے لگتے تھے۔ اس کے چہرے سے اس کی اندرونی کیفیات کا اندازہ لگانا ناممکن تھا۔ ہر قسم کے حالات میں اس کا چہرہ بس ایک ہی طرح کے تاثرات پیش کرتا رہتا۔ ہر وقت اس کے چہرے پر ایک مدھم، بالکل مدھم مسکراہٹ رقص کرتی رہتی۔ اسے کبھی کسی نے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو آئے تھے۔ اس کے چہرے پر آج بھی سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔۔۔

بڑی بڑی، بالکل سفید اور بے حس وحرکت۔

اس کی آنکھوں میں براہِ راست دیکھ کر اس سے بات کرنا ناممکن تھا۔

وہ بہت کم بولتا تھا۔ بہت کم الفاظ تھے، جو اس کے منہ سے ادا ہوتے تھے، مگر جب وہ بولتا تو باقی

تمام آوازیں خود بخود ہی تھم جاتیں۔اس کی شخصیت میں کچھ ایسی جاذبیت تھی کہ وہ جدھر بھی جاتا،لوگ خود بخود ہی اس کے استقبال کے لیے کھڑا ہونا شروع ہو جاتے۔اسے کبھی اپنا تعارف کروانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔امریکہ کا ہر بچہ بوڑھا،مرد عورت اسے جانتا تھا،پہچانتا تھا۔

کہنے کو تو اس وقت رائل بلیو کیسینو کے VIP ہال میں موجود تمام پچاس میزوں پر کھیل جاری تھا،مگر حقیقت میں کھیل صرف چارلی کی میز پر ہو رہا تھا۔باقی سب افراد کا دھیان اپنے کھیل سے زیادہ چارلی کی جانب لگا ہوا تھا۔کوئی بھی اپنے کھیل پر توجہ مرکوز نہیں کر پا رہا تھا،جبکہ ہال میں موجود تمام لوگوں سے بے پرواہ،وہ اپنے کھیل میں ایسے مشغول تھا جیسے ہال میں اس کے اور اس کے مخالف کے سوا کوئی بھی اور شخص موجود نہ ہو۔اس کی مکمل توجہ اپنے کھیل کی جانب تھی۔وہ کبھی کوئی ایک کھیل بھی نہیں ہارا تھا۔ہر کھیل کے اختتام پر وہ جیتے ہوئے کوئینز کے انبار کو ایک شانِ بے نیازی کے ساتھ اپنے مخالفین کی جانب بڑھا کر میز چھوڑ جایا کرتا تھا۔

وہ بس ایسا ہی تھا اور پھر پیسہ اس کی ضرورت تھا بھی نہیں۔اس وقت چارلی کے اثاثے دنیا کے دوسرے امیر ترین شخص کے اثاثوں سے بھی پینتیس گنا زیادہ تھے۔

وہ دنیا کا امیر ترین شخص تھا۔

مسٹر مارک،رابرٹ اور جون؛تینوں اس وقت کنٹرول روم میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔مسلسل جاگنے کی وجہ سے ان تینوں کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔مشن کو شروع ہوئے اب بائیس گھنٹے گزر چکے تھے۔بالکل سامنے شیشے کے باکس میں بے حس و حرکت پڑا چندو صاف دکھائی دے رہا تھا۔

چندو وہ انسان تھا،جس میں لیول ون کی سب سے کم خواہشات پائی جاتی تھیں۔چندو انسان نما وہ چیز تھی،جو پچھلے تیرہ دنوں سے کچرے کے ڈھیر پر سے اپنے ٹوٹے ہوئے ریڈیو کے لیے ایک پرانی بیٹری تلاش کر رہا تھا۔ہاں یہ چندو تھا۔مکمل طور پر ایک نامکمل انسان۔

مسٹر مارک نے اپنی کلائی پر لگی گھڑی سے وقت دیکھا اور پھر مسٹر جون سے پوچھنے لگے:

چندو لیول ون کی کتنے فیصد خواہشات پوری کر چکا ہے؟"

مسٹر جون نے اپنے سامنے موجود سکرین پر نظریں دوڑانا شروع کر دیں اور پھر کچھ دیر بعد ہچکچاتے ہوئے بتانے لگے کہ۔۔۔

"چندو لیول ون کی اپنی 1.6 فیصد خواہشات پوری کر چکا ہے۔"

یہ سنتے ہی مسٹر مارک اور مسٹر رابرٹ کے ماتھوں پر شکنوں کے جال بچھ گئے۔دونوں کسی گہری

سوچ میں ڈوبے ہوئے نظر آرہے تھے۔ دونوں میں سے کوئی کچھ نہ بول سکا۔ کنٹرول روم میں اگلے کافی لمحات بالکل خاموشی چھائی رہی اور پھر مسٹر مارک نے غیر حاضر دماغی والی کیفیت میں چندو کو لیول ٹو میں بھیجنے کا حکم جاری کر دیا۔

لیول ٹو

وہ اس وقت اپنے ہوائی جہاز میں خاص طور پر تیار کروائے گئے بیڈ روم میں موجود تھا۔ اس کی منزل سڈنی تھی، جہاں اسے ایک سماجی تقریب میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے شرکت کرنی تھی۔ وہ آرام دہ صوفے پر نیم دراز ہوا کافی کی چسکیاں لے رہا تھا اور ساتھ ساتھ ایک بزنس میگزین پر بھی نظریں دوڑا رہا تھا۔

اس کی یہی دونوں مصروفیات جاری تھیں کہ اچانک اس کے چہرے کی رنگت متغیر ہونا شروع ہو گئی۔ اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ اب اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا اور یہ درد مسلسل بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ چند لمحات بعد وہ اپنی نشست سے نیچے گرا، تکلیف کی شدت میں سر ادھر ادھر پٹخ رہا تھا۔ اس کی ناک سے خون بہنے لگا تھا اور اس کے منہ سے کراہیں بھی برآمد ہونے لگیں تھیں۔ اگلے دس پندرہ منٹ وہ نیچے گرا کسی بے آب مچھلی کی مانند تڑپتا رہا۔ پھر اس کے درد میں کمی ہونا شروع ہوگئی۔ اس کا لباس پسینے سے تر ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بھی اس وقت بالکل سرخ تھی۔ طبیعت میں بہتری کے آثار پیدا ہوتے ہی اس نے ایک کپڑے سے اپنے چہرے پر آئے پسینے کو صاف کیا اور پھر ایک صوفے پر گرنے کے انداز میں لیٹ گیا۔

اس کی سانسیں کسی دھونکنی کی مانند چل رہی تھیں۔ اگلا آدھا گھنٹہ وہ اسی انداز میں لیٹا اپنے اعصاب درست کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ طبیعت کے مکمل طور پر بحال ہوتے ہی اس کے چہرے پر ایک گہری مسکراہٹ رقص کرنے لگی تھی۔ کچھ لمحات وہ اسی طرح بے حس و حرکت پڑا مسکراتا رہا اور پھر جانے ایسا کیا ہوا کہ اس نے تیز رفتاری سے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور باہر کی جانب دوڑ لگا دی۔

وہ ہوائی جہاز کے ایمرجنسی گیٹ کی جانب دوڑا چلا جا رہا تھا۔ اسے یوں بھاگتا دیکھ کر اس کا حفاظتی عملہ بُری طرح چونکا اور اب اس کے آٹھ دس ذاتی محافظ بھی اس کے پیچھے بالکل اسی کے انداز میں دوڑے چلے آرہے تھے، لیکن اس کے پاؤں میں تو جیسے بجلیاں دوڑ رہی تھیں۔ اس نے ایمرجنسی گیٹ پر پہنچتے ہی جھٹ سے دروازہ کھولا اور۔۔۔۔۔۔ باہر چھلانگ لگا دی۔

چارلی کو یوں جہاز سے چھلانگ لگاتے دیکھ کر اس کے محافظوں کے منہ سے چیخیں برآمد ہونے

لگیں، لیکن ان چیخوں کو سننے کے لیے وہ ہوائی جہاز میں موجود نہیں تھا۔

مگر وہ نیچے زمین پر بھی نہیں گرا تھا۔

اب ہوا میں اڑنا اس کے لیے ناممکن نہیں رہا تھا۔ جہاز سے باہر چھلانگ لگانے کے بعد وہ فضا میں ایک ہی جگہ معلق ہو چکا تھا۔ جہاز اسی رفتار سے آگے بڑھ کر ہوا میں غائب ہو گیا تو اس نے ذرا گھوم کر ایک خاص سمت کا تعین کیا اور پھر برق رفتاری کے ساتھ اپنی منزل کی جانب بڑھ گیا۔

محض چند لمحات بعد وہ ماسکو میں موجود ایک بہت بڑے خلائی تحقیق کے ادارے کے ہیڈ آفس میں موجود تھا۔ ادارے میں کام کرنے والے تمام افراد کے دماغ قابو کر کے اس نے انہیں ایک سٹور روم میں بند کر دیا اور وہ خود ایک سپر کمپیوٹر پر مصروف ہو گیا۔ ٹھیک دو گھنٹے بعد اس نے سپر کمپیوٹر پر اپنا کام مکمل کر کے ایک ڈیٹا ڈرائیو کو کمپیوٹر سے الگ کر لیا۔ اس کی اگلی منزل زمین سے اوپر فضا میں موجود International Space Station تھا۔ زمین سے سپیس سٹیشن تک پہنچنے میں اسے محض چند سیکنڈ کا وقت لگا ہو گا۔ یہاں پر اس نے اپنے ساتھ لائی ہوئی ڈیٹا ڈرائیو کو سپیس سٹیشن پر موجود کمپیوٹر سسٹم کے ساتھ منسلک کر دیا۔ کچھ لمحات بعد وہ ایک بار پھر سے زمین پر موجود تھا۔

وہ استنبول کے ایک مصروف بازار میں پیدل چلا جا رہا تھا۔ اس کے انداز سے محسوس ہوتا تھا کہ اسے کسی قسم کی جلدی نہیں تھی۔ کبھی ایک سڑک تو کبھی دوسری سڑک، وہ چہل قدمی کرنے کے انداز میں مسلسل چلتا چلا جا رہا تھا اور پھر ایک سڑک کے موڑ پر۔۔۔

چارلی ایک سے دو ہو گئے۔

ایک چارلی سیدھا چلا گیا۔۔۔۔۔ اور ایک چارلی دائیں جانب۔

ٹھیک سترہ گھنٹوں بعد زمین پر 74 چارلی موجود تھے اور ان میں سے ہر ایک چارلی، چارلی ہی تھا۔ تعداد میں 74 ہونے کے باوجود وہ سب مل کر ایک وحدت کی طرح کام کر رہے تھے۔ وہ مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ منسلک اور ایک دوسرے کی حرکات و سکنات سے مکمل باخبر تھے۔

محض سترہ گھنٹوں میں ہی زمین پر موجود تمام وسائل اور ہر چھوٹے بڑے شہر پر اس کا قبضہ ہو چکا تھا۔ یہ زمین اب چارلی کی زمین تھی، مگر شاید۔۔۔ چارلی اب زمین کا نہیں رہا تھا۔

25 ماہ بعد۔۔۔

پوری ملکی وے کہکشاں میں اس وقت 1319 چارلی موجود تھے۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ نہ صرف چارلی کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا، بلکہ ہر چارلی کی صلاحیتیں بھی مسلسل بڑھتی چلی

جا رہی تھیں۔ ملکی وے کے چوبیس ارب ستاروں پر چارلی اینڈ کمپنی کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور جس تیز رفتاری کے ساتھ وہ اپنے اثر ورسوخ میں اضافہ کر رہا تھا، محسوس ہوتا تھا کہ اگلے چند مہینوں بعد ہی اس کی منزل ملکی وے سے باہر ہو گی۔

کنٹرول روم میں موجود تینوں افراد اس وقت اپنی اپنی نشستوں پر حیران پریشان کھڑے تھے۔ نہ صرف کنٹرول روم بلکہ آپریشن روم میں موجود تمام عملہ بھی بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ کنٹرول روم اور آپریشن روم میں موجود تمام انسانوں میں سے وہ واحد چندو تھا، جو اسی طرح سے بے حس وحرکت اپنے بے تاثر سے چہرے کے ساتھ بے ہوش پڑا ہوا تھا۔ مسٹر مارک مسلسل اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹک رہے تھے۔ مسٹر رابرٹ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام رکھا تھا، جبکہ مسٹر جون کی حالت بھی ان دونوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ سب کے چہروں پر بوکھلاہٹ اور پریشانی کے تاثرات نمایاں تھے۔ شاید حالات ان کی توقعات کے برعکس جا رہے تھے، جبکہ دوسری جانب آپریشن روم میں موجود عملے میں اب کچھ چہ مگوئیاں ہونے لگی تھیں۔ ایک کھلبلی پیدا ہونا شروع ہو چکی تھی۔ کنٹرول روم میں موجود مسٹر مارک نے ایک نظر بے بسی سے شیشے کی دیوار کے دوسری جانب موجود ایک نامکمل انسان کو دیکھا۔ چندو کے ادھورے بدن اور مکروہ صورت چہرے کو دیکھ کر مسٹر مارک کے اپنے جسم میں ایک جھرجھری آ گئی اور اس کے ساتھ ہی مسٹر مارک لاشعوری طور پر شیشے کی دیوار سے ایک قدم پیچھے ہٹ گئے۔

یوں جیسے انہیں خوف ہو کہ چندو کسی بھی لمحے اپنا ہاتھ بڑھا کر انہیں پکڑ لے گا۔ کافی دیر بعد مسٹر مارک اپنی کپکپاتی ہوئی آواز میں مسٹر جون سے پوچھنے لگے:

''چندو لیول ٹو کی کتنے فیصد خواہشات پوری کر چکا ہے؟''

مسٹر جون کی اپنی ذہنی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی معلوم نہیں ہوتی تھی، مگر انہوں نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے سامنے پڑی مشین کے چند بٹن دبائے اور نظریں سکرین پر گاڑ دیں اور پھر چند لمحات بعد مسٹر جون کے منہ سے نو، نو، نو کی تیز چیخیں برآمد ہونے لگیں۔ اسی طرح سے چیختے ہوئے مسٹر جون نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام لیا اور گرنے کے انداز میں زمین پر بیٹھ گئے۔ کافی دیر بعد مسٹر جون کی حالت کچھ بہتر ہوئی تو تھوک نگلتے ہوئے بتانے لگے:

''چندو کی تسکین شدہ خواہشات بتانے والے ہندسے ابھی تک صفر صفر ہی ہیں۔''

یہ سن کر مسٹر مارک اور مسٹر رابرٹ کا ردِعمل بھی مسٹر جون سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ پھر کنٹرول روم میں ایک گہری خاموشی چھا گئی۔ تینوں افراد گہری سوچوں میں گم ہو چکے تھے۔ کافی وقت گزر جانے کے

بعد مسٹر رابرٹ نے لرزتی ہوئی آواز میں اپنی رائے کا اظہار کیا:

''شاید لیول ٹو کی خواہشات اپنی جگہ خود بھی لامحدود ہوتی ہیں۔ اس لیے اب ہمیں مزید انتظار کیے بنا چندو کو لیول تھری میں بھیج دینا چاہیے۔''

مسٹر مارک نے ایک نظر اپنی کلائی پر لگی گھڑی پر وقت دیکھا اور پھر اپنے اعصاب کو درست کرتے ہوئے چندو کو لیول تھری میں بھیجنے کا حکم جاری کر دیا۔

آپریشن روم اور کنٹرول روم میں موجود تمام افراد اس وقت اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ ان میں سے کسی کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ لیول تھری کی انسانی خواہش کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے۔ سب اپنی منتشر سانسوں اور تیز دھڑکنوں کے ساتھ اپنے اپنے سامنے موجود سکرین پر نظریں جمائے کھڑے تھے۔ وہ سب اس وقت متجسس تھے اور کافی حد تک چندو سے خوفزدہ بھی۔ بالکل سامنے چندو بے حس و حرکت لیٹا ہوا تھا اور وہ ایک بار پھر سے اس مشن پر کام کرنے والے افراد کے تمام اندازے غلط ثابت کرنے کو تیار تھا۔

لیول تھری

ملکی وے گلیکسی میں اس وقت 1319 چارلی ایک دوسرے سے اربوں کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھے۔ اربوں کلومیٹر کے فاصلے کے باوجود ہر چارلی دوسرے ہر چارلی کی تمام حرکات و سکنات سے مکمل آگاہ تھا۔ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ملکی وے پر چارلی کا قبضہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ سب کچھ اس کی پلاننگ کے مطابق بالکل ٹھیک ٹھیک ہو رہا تھا۔ پوری ملکی وے میں بکھرے 1319 چارلی اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے کہ۔۔۔

جانے ایسا کیا ہوا کہ ہر چارلی نے اچانک اپنا اپنا کام چھوڑ دیا۔

چارلی کے چہرے پر بوکھلاہٹ کے تاثرات نمایاں تھے۔ وہ پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر نظریں گھما رہا تھا۔ وہ حیرانی سے کبھی اپنے ہاتھ پاؤں اور جسم کو دیکھنے لگتا تو کبھی اپنے ماحول کو گھورنے لگتا۔ اسے اپنا وجود اور اپنا ماحول، سب کچھ بہت عجیب اور اجنبی دکھائی دے رہا تھا۔

یوں جیسے اس نے پہلی بار خود کو دیکھا ہو۔

ایسے جیسے وہ اپنے اس ماحول میں نووارد ہو۔

اس کی آنکھوں میں اب خوف کے تاثرات بڑھنے لگے تھے۔ اس کی نگاہیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کسی کی تلاش ہو۔ کچھ لمحات اسی طرح خوف اور بوکھلاہٹ کی کیفیت میں گزارنے

کے بعد چارلی۔۔۔۔ ہر چارلی فضا میں اوپر کی جانب بلند ہوتا چلا گیا۔

کنٹرول روم اور آپریشن روم میں موجود تمام اشخاص اپنی اپنی نشستوں پر کھڑے لیول تھری کی انسانی خواہش جاننے کے منتظر تھے۔ ان سب کے چہروں پر تجسس اور وحشت کے ملے جلے تاثرات نمایاں تھے۔ان کی نو سال کی محنت کا نتیجہ بس چند لمحات بعد ہی برآمد ہونے والا تھا۔

ایسے میں اچانک آپریشن روم میں موجود ایک مشین سے تیز ٹوں،ٹوں،ٹوں کی آواز برآمد ہونے لگی اور پھر کچھ لمحات بعد مزید بہت سارے کمپیوٹرز کے خودکار الارم بھی شور مچانے لگے۔

ان آوازوں کے برآمد ہوتے ہی آپریشن روم میں ایک بھگدڑ مچ گئی۔ چندو جو پچھلے چھتیس گھنٹوں سے بے حس وحرکت پڑا تھا، اب اچانک سے اپنے سر کو ہلانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ شیشے کے باکس میں ہلکا ہلکا دھواں بھر چکا تھا جبکہ چندو کے کان پر موجود زخم سے خون کی تیز پچکاریاں وقفے وقفے سے خارج ہو کر شیشے کی دیواروں پر نقش ونگار بنا رہی تھیں۔ چندو کے سر سے منسلک ایک ٹیوب اچانک ہی اس کے سر سے جدا ہو گئی اور پھر اس میں سے محلول باہر بہنے لگا۔

مسٹر مارک، رابرٹ اور جون؛ تینوں بھاگتے ہوئے آپریشن روم میں پہنچ گئے۔ مسٹر جون چیخ چیخ کر اپنی ٹیم کے لوگوں کو ہدایات جاری کر رہے تھے، مگر الارم کی آوازیں تھیں کہ ہر لمحے تیز سے تیز تر ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ چندو کو اب ہوش آنے لگا تھا۔ اس کے لب تھر تھرا رہے تھے۔

وہ نیم بے ہوشی کی حالت میں مسلسل کچھ بڑبڑا رہا تھا۔

یہ ملکی وے اور M-31 کے بیچ کوئی جگہ تھی، جہاں اس وقت تمام 1319 چارلی اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ سب فضا میں ایک بہت بڑے دائرے کی شکل میں موجود تھے۔ وہ سب حیرانی کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہے تھے۔ یوں جیسے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔سب ایک دوسرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر چارلی کبھی اپنے چہرے کو ٹٹولنے لگتا اور کبھی پریشانی سے دیگر 1318 چارلی کی جانب دیکھنے لگتا۔سب کے چہرے مارے حیرت اور وحشت کے بگڑے چلے جا رہے تھے اور پھر اس بہت بڑے دائرے میں موجود چارلی 543 نے ایک سرگوشی کی۔۔۔ پھر کچھ لمحات بعد چارلی 732 نے بھی ایک سرگوشی کی۔۔۔ پھر چارلی 193۔۔۔ اور پھر 61۔۔۔

پوری فضا میں سرگوشیوں کی ایک تیز بھنبھناہٹ پیدا ہونے لگی تھی اور پھر بہت ساری سرگوشیوں کے ملنے سے اب فضا میں کچھ آوازیں بلند ہونے لگیں۔نہیں نہیں، وہ محض آوازیں نہیں تھیں۔ وہ تو نوحے معلوم ہوتے تھے۔ بہت ساری آوازیں مل کر اب چیخوں کی شکل اختیار کرتی چلی جا رہی تھیں۔ پوری فضا چارلی

کی تیز چیخ و پکار سے گونجنے لگی تھی۔

آپریشن روم میں شیشے کے باکس میں قید چندو مسلسل کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ چندو کے کان پر موجود زخم سے خون کا اخراج تیزی کے ساتھ جاری تھا۔ اس کی حالت نازک تھی۔ وہ خطرے میں تھا۔ مسٹر مارک نے فوراً چندو کے گرد موجود شیشے کی دیواروں کو ہٹانے کا حکم جاری کیا۔ شیشے کی دیواریں ختم ہوتے ہی چندو کی بڑبڑاہٹ تیز اور واضح ہوتی چلی گئی۔

نیم بے ہوش چندو کی اس بڑبڑاہٹ کو سننے کے لیے مسٹر مارک اس کے قریب ہو گئے اور پھر انہوں نے اپنے کان چندو کے لبوں پر جھکا دیے۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

چندو کے منہ سے ادا ہونے والے یہ تین ٹوٹے پھوٹے الفاظ مسٹر مارک کے کانوں میں اتر گئے اور پھر اسی وقت زمین سے اوپر فضا میں ایک ہجوم کی شکل میں موجود تمام 1319 چارلی کی چیخیں بھی اب الفاظ کا روپ دھارنے لگی تھیں۔۔۔

"Who Am I?"

5 دن بعد۔۔۔

کالے پینٹ کوٹ میں ملبوس کچھ افراد نے بے ہوش چندو کو ایک گاڑی سے نکال کر کچرے کے ڈھیر کے پاس موجود اس کی ریڑھی میں واپس رکھ دیا اور خود چلے گئے۔ اس کی یادداشت سے پچھلے بارہ دنوں کے تمام واقعات کو مٹا دیا گیا تھا۔ اس کے ادھورے بدن پر اس وقت محض ایک چھوٹی نیکر موجود تھی۔

کچھ دیر بعد اسے ہوش آ گیا۔ اس کے سر میں درد کی ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ وہ حیران تھا کہ اس طرح دن کے وقت وہ سو کیسے گیا؟ چاچا بھی جانے کدھر تھا، جو ابھی تک اسے واپس لینے نہیں آیا تھا۔ وہ چاچے کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے جیسے شام گہری ہو رہی تھی، اس کی بے سکونی میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ وقت گزارنے کے لیے اس نے کچرے کے ڈھیر میں ہاتھ ادھر ادھر مارنا شروع کر دیے۔ سورج اس وقت ڈوب رہا تھا، جب اسے کچرے کے ڈھیر میں سے ایک پرانی بیٹری مل گئی۔ وہ پچھلے تیرہ دنوں سے کچرے کے اسی ڈھیر سے پرانی بیٹری ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا اور آج اس کی یہ کوشش کامیاب ہو چکی تھی۔

مگر وہ خوش نہیں تھا۔۔۔۔۔ جانے کیوں؟

اس نے اپنے اسی بے تاثر چہرے کے ساتھ بیٹری کو ریڈیو میں لگا دیا۔ اس کا ٹوٹا ہوا ریڈیو ابھی بھی

گانے نشر کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ریڈیو پر اس وقت کوئی ہندی گانا چل رہا تھا۔ یہ اس کا پسندیدہ گانا تھا،لیکن آج وہ اس گانے سے لطف اندوز نہیں ہو پا رہا تھا۔ چاچا ابھی تک نہیں آیا تھا اور اب تو رات بھی گہری ہونا شروع ہو چکی تھی۔

رات گہری ہوتے ہی کچرے کے اس ڈھیر پر ایک الگ دنیا آباد ہوگئی ۔سینکڑوں قسم کے کیڑے مکوڑے اور حشرات اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل کر کچرے میں سے خوراک تلاش کرنے لگے تھے۔ قریب ہی بارش کے جمع ہوئے پانی سے مینڈکوں کے ٹرانے کی تیز آوازیں آرہی تھیں۔کتوں کے ٹولے کے ٹولے، کتوں کی طرح بھونکتے ہوئے کبھی اِدھر بھاگے جا رہے تھے تو کبھی اُدھر۔رات گہری ہو جانے کے باوجود کسی مردار پر درجنوں گِدھ ابھی تک ڈیرہ جمائے بیٹھے تھے۔

یہ کچرے کا ڈھیر وہ واحد چیز تھی جس میں چندو کچھ دلچسپی لیا کرتا تھا۔ چندو کو کچرے کے اس ڈھیر پر وقت گزارنا اچھا لگتا تھا۔کوے، گِدھ، چوہے، مکھیاں، لال بیگ اور دیگر حشرات؛ یہ سب اس کا خاندان تھا۔ان کی موجودگی میں وہ خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا تھا۔ وہ انہی میں سے ایک تھا۔ کچرے کے اس ڈھیر پر اپنے خاندان اور دوستوں کے ساتھ مل کر اس ٹوٹے ہوئے ریڈیو پر گانے سننا اس کی زندگی کی سب سے بڑی تفریح تھی۔لیکن۔۔۔

لیکن آج کا دن۔۔۔۔۔شاید کچھ مختلف تھا۔

آج تو وہ کچرے کے ڈھیر پر ہونے والی ان تمام سرگرمیوں سے لاتعلق بنا بیٹھا تھا۔ ریڈیو مسلسل گانے نشر کر رہا تھا اور وہ اپنے ادھورے وجود کے ساتھ بے حس و حرکت پڑا بس گانے سنتا چلا جا رہا تھا۔ بہت سا وقت اسی طرح گزر گیا اور پھر۔۔۔

وہ ہوا جو چندو کی زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

اس کے کٹے پھٹے گالوں پر آنسو بہنا شروع ہو چکے تھے۔۔۔۔۔وہ رو رہا تھا۔

ہاں وہ رو رہا تھا۔۔۔۔۔زندگی میں پہلی بار۔

وہ پچھلے گیارہ سالوں میں کبھی نہیں رویا تھا۔اس کی آنکھوں میں کبھی کسی نے آنسو نہیں دیکھے تھے۔

لیکن آج کا دن۔۔۔۔۔شاید کچھ مختلف تھا۔

آج تو چندو نہ صرف رو رہا تھا بلکہ چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔

رات گزرتی رہی۔۔۔۔کچرے کے اس ڈھیر پر لگی رونقیں کم نہ ہوئیں۔

کتے بھونکتے رہے۔۔۔۔۔چندو روتا رہا۔۔۔۔۔مینڈک ٹراتے رہے۔

مگر آج کچرے کے ڈھیر سے اٹھنے والی ان تمام آوازوں پر چندو حاوی ہو چکا تھا۔
باقی ہر آواز اس کی چیخوں تلے دب چکی تھی۔ آج وہ رو رہا تھا تو باقی تمام آوازیں جیسے تھم گئی تھیں۔ روتے روتے چندو کا بدن ذرا کسمسایا اور پھر وہ اپنی ریڑھی سے پھسل کر کچرے میں جا گرا۔
کچرے میں پڑا چندو کا ادھورا بدن کچرے کا ہی ایک حصہ دکھائی دے رہا تھا۔

کچرے کے ڈھیر پر کچرے کا ہی ایک حصہ بنے۔۔۔۔۔ وہ روتا رہا۔

اور وہ تو شاید پچھلے گیارہ سالوں کا رونا آج ہی رو لینا چاہتا تھا۔

وہ کبھی رو رو کر خود ہی چپ ہو جاتا اور کبھی چپ پڑا پڑا پھر سے رونا شروع کر دیتا۔

رات گزرتی رہی، چندو روتا رہا۔۔۔۔۔ چندو روتا ہی رہا۔۔۔ اور پھر۔۔۔

پھر چندو چپ ہو گیا۔

چندو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ ہو گیا۔ کچرا، کچرے میں مل چکا تھا۔

مگر چندو رویا کیوں تھا؟

آج تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا ناں؟

آج تو اسے اپنے ریڈیو کے لیے بیٹری مل چکی تھی۔ آج تو اس کی پچھلے تیرہ دنوں کی تلاش ختم ہو چکی تھی۔ کچرے کے اس ڈھیر پر وقت گزارنا ہی تو اسے اچھا لگتا تھا۔ آج تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ تھا کہ ساری زندگی کا رونا ایک ہی بار رو کر اب چپ، بالکل چپ ہو چکا تھا۔

آخر چندو رویا کیوں تھا؟

شاید۔۔۔۔۔ کنویں کا مینڈک اگر ایک بار کنویں سے باہر نکل آئے تو پھر وہ کنویں کا مینڈک نہیں رہتا، پھر وہ دھوبی کا کتا بن جاتا ہے۔

دھوبی کا کتا۔۔۔

جو نہ گھر کا ہوتا ہے اور نہ ہی گھاٹ کا۔

باب:5

اُلّو کیوں بولتے ہیں؟

ایک سوال ہے۔۔۔اگر آپ کی اجازت ہوتو۔۔۔

آپ کے کسی عزیز رشتہ دار کے انتقال پر آپ کو کبھی مبارک باد کا پیغام موصول ہوا؟

اگر ہاں تو آپ کو آپ کے کسی عزیز کی وفات پر مبارک باد دینے والا وہ شخص خود ابھی زندہ ہے؟

یا پھر۔۔۔۔۔آپ کے ہاتھوں۔۔۔؟

اور اگر آج تک آپ کو آپ کے کسی عزیز کی وفات پر مبارک باد کا پیغام موصول نہیں ہوا تو۔۔۔

تو کبھی آپ نے سوچا کہ ایسا پیغام کیوں نہ موصول ہوا؟

نہیں میرا مطلب ہے۔۔۔یعنی۔۔۔وہ۔۔۔

اچھا اچھا۔۔۔چلیں۔۔۔چلیں میں اپنا سوال ہی کچھ تبدیل کر دیتا ہوں۔

ہم میں سے تقریباً ہر شخص کو خوشی کے موقع پر دوست احباب کی جانب سے مبارک باد کا پیغام، جبکہ کسی تکلیف یا رنج کے موقع پر تعزیت کا پیغام موصول ہوتا ہے، مگر کیوں؟

ہمیں خوشی کے موقع پر تعزیتی اور غم کے موقع پر مبارک باد کا پیغام موصول کیوں نہیں ہوتا؟

کیا آپ نے کسی نیوز چینل پر کبھی ایسی خبر بھی سنی ہے کہ فلاں شخص نے راہ چلتے آٹھ دس معصوم بچوں کو قتل کر دیا۔ اس شخص نے یہ کام بڑی بہادری اور مہارت کے ساتھ سرانجام دیا۔ پوری قوم کو اپنے اس ہیرو پر فخر ہے۔ ایسے بہادر افراد ہی کسی بھی قوم کا حقیقی سرمایہ ہوتے ہیں یا پھر۔۔۔

فلاں شخص نے ملک وملت کے ساتھ غداری کی ہے۔ یہ پوری قوم اس شخص کی خدمات کو سراہتے ہوئے اسے فلاں فلاں اعزازات سے نوازتی ہے۔

شاید ایسا کوئی خیال بھی پاگل پن تصور کیا جائے گا، لیکن یہ تمام تعریفیں، مراعات اور اعزازات؛ یہ سب کچھ بہادروں کے لیے ہی کیوں ہوتا ہے؟

غداروں کے حصے میں ہمیشہ سزا اور گالیاں ہی کیوں آتی ہیں؟

آپ دنیا کے کسی ملک، کسی شہر، کسی بستی چلے جائیں، گاڑی چلاتے ہوئے جیسے ہی سڑک کنارے لگا کوئی ٹریفک سگنل آپ کو رکنے کا اشارہ کرے گا تو آپ کا پاؤں لاشعوری طور پر بریک پیڈل کی جانب بڑھ جائے گا۔ ایک ٹریفک سگنل کے سامنے سینکڑوں گاڑیاں رک جاتی ہیں۔آخر وہ کیا چیز ہے جو سینکڑوں، ہزاروں لوگوں کو ایک حقیر بے جان ٹریفک سگنل کے سامنے رکنے پر مجبور کردیتی ہے؟

اس باب میں اٹھائے گئے تمام سوالوں کا محض ایک ہی جواب ہے۔۔۔''اخلاقی حِس''

ہم میں سے ہر انسان اپنے اردگرد موجود کچھ چیزوں، کچھ رویوں، کچھ باتوں اور خیالات کو اچھا سمجھتا ہے تو کچھ کو بُرا۔

دنیا کے ہر انسان میں ایک اخلاقی حِس پائی جاتی ہے، جو ایک عالمگیر (Universal) چیز ہے، حتیٰ کہ مہذب دنیا سے بہت دور جنوبی امریکہ یا افریقہ کے جنگلی قبائل سے منسلک افراد بھی اپنے اپنے قبائل میں رہتے ہوئے کچھ چیزوں، رویوں اور اعمال کو اچھا سمجھتے ہیں تو کچھ کو بُرا۔

ہمیں غم کے موقع پر مبارک باد کا پیغام موصول نہ ہونے کی وجہ یہ اخلاقی حِس (Moral Sense) ہی ہے۔ ہر انسان جانتا ہے کہ خوشی کے موقع پر مبارک باد اور غم کے موقع پر تعزیت کا پیغام ارسال کیا جاتا ہے۔ ٹریفک سگنل پر رکنا چاہیے کیونکہ قانون کی پابندی ایک اچھی چیز ہے اور بالکل اسی طرح سے غداری اور وفاداری میں موجود فرق بھی کسی انسان کو سمجھانے یا بتانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ ہر انسان میں ایک اخلاقی حِس ہوتی ہے۔ کسی بھی کام کو کرتے وقت یہ اخلاقی حِس ہی ہے، جو ایک انسان کو اچھے اور بُرے میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کرتی ہے۔

اخلاقی حِس ہماری اجتماعی زندگی کے لیے تقریباً آکسیجن والی خصوصیات رکھتی ہے۔ ہماری معاشرتی زندگی کے تمام پہلو اسی اخلاقی حِس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اخلاقی حِس کے بغیر کسی بھی معاشرے کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا ناممکن ہے۔ اسی چیز کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے۔۔۔

چلیں کہیں سیر و تفریح کے لیے چلتے ہیں۔

لیکن اب کی بار پاکستان نہیں، اب کی بار کینیڈا چلتے ہیں۔ نقطے کی دوسری جانب۔۔۔

فرض کیجیے آپ اس وقت ٹورنٹو ائیر پورٹ پر موجود ہیں۔ آپ زندگی میں پہلی بار کینیڈا آئے ہیں۔ یہاں کی سڑکیں، راستے اور گلیاں آپ کے لیے اجنبی ہیں۔ آپ ائیر پورٹ سے بذریعہ ٹیکسی ایک ہوٹل چلے جاتے ہیں۔ رات ہونے والی ہے، آپ کھانا اپنے کمرے میں کھاتے ہیں اور پھر سو جاتے ہیں۔ طویل سفر کی تھکاوٹ ہے، اگلے آٹھ گھنٹوں تک آپ ہر چیز سے بے خبر ہو کر سوئے رہتے ہیں، لیکن آپ

کی اس نیند کے دوران ایک چھوٹا سا مسئلہ ہو جاتا ہے۔ آپ کے سوا دنیا میں تمام انسانوں کی اخلاقی حِس میں کچھ ''گڑ بڑ'' ہو جاتی ہے اور اس گڑ بڑ کے نتیجے میں ۔۔۔۔۔ دنیا میں موجود تمام انسان سچ کو بُرا اور جھوٹ کو اچھا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہر انسان اب کوشش کرتا ہے کہ وہ زندگی میں ''صرف جھوٹ'' ہی بولا کرے، کیونکہ جھوٹ بولنا ایک اچھی چیز ہے۔ البتہ آپ کی ۔۔۔۔۔ پوری دنیا میں صرف آپ کی اخلاقی حِس ابھی تک اپنی درست حالت میں موجود ہے۔ اس لیے آپ سچ کو اچھا اور جھوٹ کو بُرا سمجھتے ہیں۔ آپ ہمیشہ سچ ہی بولتے ہیں، جبکہ دوسروں کی اخلاقی حِس میں ہونے والی اس گڑ بڑ سے بھی آپ بالکل لاعلم ہیں۔ اس لیے آپ دوسروں کے جھوٹ کو بھی سچ سمجھ لیتے ہیں۔

بس ان نکات کو ذہن نشین کر لیجیے اور اپنی قوتِ تخیل کا بھرپور استعمال کیجیے گا۔۔۔

صبح 8 بج کر 45 منٹ۔۔۔

آپ تیار ہو کر، بابو بن کر اپنے ہوٹل سے باہر آتے ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ تھوڑی چہل قدمی کی جائے اور پھر کسی اچھے سے ''دیسی ریسٹورانٹ'' سے لاہوری ناشتہ۔ آپ ایک راہگیر سے ریسٹورانٹ کا پتہ دریافت کرتے ہیں اور پھر اس اجنبی کے بتائے ہوئے راستوں پر پیدل ہی چلنا شروع کر دیتے ہیں۔ راستے میں آپ کو بڑے عجیب اور دل دہلا دینے والے مناظر دکھائی دیتے ہیں۔ جگہ جگہ لوگ آپس میں گالم گلوچ کر رہے ہیں، مختلف گروہوں کے درمیان تصادم ہو رہا ہے۔ وہ۔۔۔۔۔ بالکل سامنے درجنوں گاڑیاں ایک دوسرے سے بغل گیر ہو چکی ہیں۔ ہر جانب ٹریفک رکا ہوا ہے۔ کچھ افراد اپنے سر دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر لہولہان کر چکے ہیں، جبکہ کچھ افراد ایسے بھی ہیں، جو اپنے گریبان چاک کیے، چیختے اور چلاتے ہوئے کسی انجانی منزل کی جانب دوڑے چلے جا رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر طرف فسادات ہیں اور ایک بے سکونی والی کیفیت ہے۔

آپ بہت پریشان ہوتے ہیں کہ آخر یہ سب ہو کیا رہا ہے؟

اپنی اسی پریشانی اور منتشر دماغی والی کیفیات میں لوگوں سے بچتے بچاتے آپ اپنی منزل کی جانب بڑھتے رہتے ہیں۔ کوئی بیس منٹ بعد آپ اپنے مطلوبہ پتہ پر پہنچ جاتے ہیں، مگر یہاں پہنچ کر آپ کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ پتہ تو کسی پبلک لائبریری کا ہے۔ جس راہگیر سے آپ نے ریسٹورانٹ کا پتہ دریافت کیا تھا، اس راہگیر نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ آپ کو اس اجنبی شخص پر بہت غصہ آتا ہے، مگر آپ اپنے غصے کو قابو میں رکھتے ہوئے سامنے سے گزرتی ایک ٹیکسی کو ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں۔

ٹیکسی کے ''سردار'' ڈرائیور کو دیکھ کر آپ اس اجنبی ماحول میں کچھ اپنا پن محسوس کرتے ہیں۔

ٹیکسی میں سوار ہوکر پہلے آپ سردار جی کے ساتھ تعارف کرتے ہیں۔ کچھ باتیں لاہور، امرتسر اور پٹیالہ کی ہوتی ہیں اور پھر آپ سردار جی کو کسی اچھے دیسی ریسٹورانٹ چلنے کا عندیہ دیتے ہیں۔تیس منٹ بعد سردار جی آپ کو ایک سکول کی عمارت کے سامنے جا کر اتار دیتے ہیں اور آپ سے کہا یہی جاتا ہے کہ آپ کی منزل آچکی ہے۔آپ باہر موجود سکول کی عمارت کو دیکھ کر بہت حیران ہوتے ہیں اور پھر۔۔۔

اپنے نئے نئے بنے دوست، سردار جی سے گلہ کرتے ہیں کہ۔۔۔

''میں نے تو تمہیں کسی دیسی ریسٹورانٹ چلنے کا کہا تھا، جبکہ یہ ایک سکول کی عمارت ہے۔''

اب سردار جی تو سردار جی ہی ہوتے ہیں۔سردار جی بضد ہیں کہ سامنے موجود سکول کی عمارت، سکول کی عمارت نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دیسی ریسٹورانٹ ہے۔

آپ حیرانی کے ساتھ عمارت کے ماتھے پر بڑا سارا اور جلی حروف میں لکھا ہوا سکول کا نام پڑھتے ہیں۔پھر آپ ایک نظر گھڑی پر وقت دیکھتے ہیں۔۔۔اور پھر ایک نظر سردار جی کی جانب۔

آپ دل ہی دل میں سوچتے ہیں کہ آج تو سردار جی کے بارہ سے پہلے ہی ''بارہ'' بج گئے۔ آپ سردار جی کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ عمارت ریسٹورانٹ نہیں بلکہ ایک سکول ہے۔

اور۔۔۔اور جواباً۔۔۔سردار جی آپ کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ سامنے موجود عمارت ایک دیسی ریسٹورانٹ ہی ہے۔

شدید تکرار شروع ہو جاتی ہے اور بات شاید ہاتھا پائی تک بھی پہنچ جاتی، مگر ایک بار پھر سے آپ اپنے غصے کو بروقت قابو کر لیتے ہیں اور پھر پیدل ہی ایک جانب کو بڑھ جاتے ہیں۔حیرانی، پریشانی اور غصے والی کیفیات میں آپ چلتے رہتے ہیں۔اب آپ کو اس اجنبی ماحول سے گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ آپ کو بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت آپ اپنے ہوٹل سے کتنی دوری پر اور کس سمت میں موجود ہیں۔کچھ لمحات اسی گومگو کی کیفیت میں گزارنے کے بعد آپ گوگل میپ سے مدد لینے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ آپ اپنی منزل منتخب کر کے پیدل ہی گوگل میپ کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنا شروع کر دیتے ہیں۔

تیس منٹ بعد آپ اپنی منزل پر تو پہنچ جاتے ہیں مگر ساتھ ہی ایک چھوٹا سا مسئلہ بھی ہو جاتا ہے۔آپ کی نگاہوں کے سامنے اس وقت ریسٹورانٹ نہیں بلکہ ایک آٹو ورکشاپ موجود ہے۔یوں لگتا ہے جیسے گوگل میپ کی انتظامیہ بھی اب ''صرف جھوٹ'' کی پالیسی پر عمل درآمد کرتی ہے۔

اب آپ کی طبیعت میں حیرانی، پریشانی اور غصے کے ساتھ ساتھ بھوک اور چڑچڑے پن کا بھی اضافہ ہو

جاتا ہے۔قریب تھا کہ آپ اسی بیزاری والی کیفیت میں اپنا سر کسی دیوار کے ساتھ ٹکرا دیتے لیکن اسی وقت آپ کو سڑک کے دوسری جانب بس کچھ ہی فاصلے پر ایک دیسی ریسٹورانٹ کا بڑا سارا سائن بورڈ نظر آتا ہے۔آپ کے چڑچڑے پن میں کمی ہونا شروع ہوتی ہے۔آپ ایک اطمینان بھرا سانس لے کر ریسٹورانٹ کی جانب بڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔منزل کو قریب دیکھ کر آپ کی بھوک بھی شدت اختیار کر جاتی ہے۔آپ ''معدہ ہی معدہ'' میں بڑے پائے، نہاری اور حلیم کا بیڑہ غرق کرتے ہوئے ریسٹورانٹ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

پھر ریسٹورانٹ میں داخل ہو کر آپ کو پتہ چلتا ہے کہ یہ ریسٹورانٹ تو درحقیقت ایک جوتوں کی دوکان ہے۔اس دوکان کے مالک نے بھی اپنے معزز گاہک حضرات کی خدمت کے لیے جھوٹ پر مبنی سائن بورڈ لگا رکھا تھا اور بس۔۔۔

اب آپ کے اپنے اندر کا چھپا ہوا ''سردار'' بھی چھلانگ لگا کر باہر آ جاتا ہے۔آپ پنجابی زبان کے کچھ نہایت ثقیل اور گاڑھے الفاظ سے گوروں کو نوازتے ہیں، ہذیانی کیفیت میں چلّاتے ہوئے آپ اپنا موبائل پوری قوت کے ساتھ ایک سیلز بوائے کے سر پر دے مارتے ہیں۔غصے کی شدت سے آپ کے بدن پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی ہے اور پھر چند لمحات بعد ہی آپ اپنا گریبان چاک کیے، سر کے بال نوچتے اور چیختے چلّاتے ہوئے کسی انجانی منزل کی جانب دوڑنا شروع کر دیتے ہیں۔

اور بس۔۔۔۔۔بس بس، اب واپس آ جاتے ہیں۔نقطے کی اسی جانب واپس آ جاتے ہیں۔ دوسری طرف کے حالات تو کچھ اچھے دکھائی نہیں دے رہے۔

ایک بات تو یقینی ہے کہ انسان میں موجود اخلاقی حِس اور اخلاقی حِس کی صحت، دونوں کسی بھی معاشرے کی بقاء کے لیے بہت اہم ہیں۔ ہمارے ان فرضی حالات میں جھوٹ اور سچ کے بیچ کی یہ ادلا بدلی محض چند دنوں میں ہی بہت ساری زندگیاں نگل جائے گی۔انسانوں کی سماجی زندگی کا وجود خطرے میں پڑ جائے گا، تمام معاشی سرگرمیاں بہت محدود ہو جائیں گی۔ الغرض اخلاقی حِس میں ہونے والی ذرا سی گڑبڑ بھی بہت کچھ تباہ و برباد کر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے، لیکن۔۔۔

لیکن کیا ہماری اس دنیا میں سبھی انسان ہمیشہ سچ ہی بولتے ہیں؟

جب ہم جھوٹ بول رہے ہوتے ہیں تو کیا اس وقت کچھ دیر کے لیے ہماری اخلاقی حِس میں بھی کوئی گڑبڑ ہو جاتی ہے؟ کیا جھوٹ بولتے وقت ہم سچ کو برا اور جھوٹ کو اچھا جاننا شروع کر دیتے ہیں؟

پھر بات محض ایک جھوٹ پر ہی تو ختم نہیں ہو جاتی ہے۔قتل و غارت، رشوت، چوری، راہزنی اور ایسے ہی مزید لاتعداد بُرے کام کیا اس دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں؟

کیا اخلاقی جرائم میں ملوث تمام افراد کی اخلاقی حِس میں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ، کوئی خرابی ہو چکی ہے؟

اخلاقی حِس میں ہونے والی یہ گڑبڑ کوئی بیماری ہے کیا؟

ایک بات تو سمجھ آتی ہے کہ کبھی کبھار اگر ٹریفک سگنل توڑا جائے تو انسان اندر ہی اندر تھوڑی خوشی، تھوڑا تھرِل اور ایڈونچر محسوس کرتا ہے۔ اردگرد موجود لوگوں کے سامنے ٹریفک سگنل توڑ کر اپنی ''بہادری'' اور ذات کا اظہار کرنا اچھا لگتا ہے۔ زندگی میں پہلی بار ٹریفک سگنل توڑتے وقت دل کی دھڑکن کچھ بڑھ جاتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انسان کے اندر یہ احساس بھی موجود ہوتا ہے کہ ٹریفک سگنل توڑ کر ایک برا کام کیا گیا ہے۔ اندر ہی اندر انسان Guilt بھی محسوس کرتا ہے۔

لیکن اگر یہی ٹریفک سگنل بار بار توڑا جاتا رہے تو رفتہ رفتہ۔۔۔

یہ Thrill اور Guilt دونوں ختم ہو جاتے ہیں۔ فقط ایک عادت باقی رہ جاتی ہے۔

تو کیا۔۔۔ کیا انسانی جان اور ٹریفک سگنل۔۔۔۔۔ دونوں ایک ہی جیسے ہیں؟

جب دل چاہا توڑ دیا۔

دوسرے انسانوں کی جان بار بار لینے سے کیا یہ والا Guilt بھی ختم ہو جاتا ہوگا؟ کوئی بھی اخلاقی جرم اگر بار بار، بار بار کیا جائے تو تھرِل اور گلٹ دونوں ختم کیوں ہو جاتے ہیں؟

انسان کے اندر موجود اخلاقی حِس اگر بار بار مجروح ہوتی رہے تو کیا یہ ایک دن مر جاتی ہے؟

اخلاقی حِس بھی کوئی زندہ چیز ہے کیا؟

کیا اچھا اور کیا بُرا؟

ہماری اب تک کی گفتگو اس مفروضے کی بنیاد پر ہوتی رہی ہے کہ تمام انسانوں اور معاشروں میں ایک جیسی اخلاقی اقدار (Moral Values) پائی جاتی ہیں، لیکن عملی زندگی میں یہ مفروضہ محض ایک مفروضہ ہی ثابت ہوگا۔ اگرچہ بہت ساری چیزیں ایسی ہیں، جو تقریباً ہر انسانی معاشرے میں یکساں طور پر اچھی یا بُری تصور کی جاتی ہیں۔ جھوٹ کو ہر انسانی معاشرے میں بُرا سمجھا جاتا ہے۔ وقت کی پابندی اور ایفائے عہد کو ہر جگہ اچھا جانا جاتا ہے۔ وفاداری اور غداری کا فرق بھی کسی انسان کو بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔

البتہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ کوئی چیز کسی ایک انسانی معاشرے میں تو اچھی سمجھی جائے، مگر وہی چیز کسی دوسرے انسانی معاشرے میں بُری تصور کی جائے اور پھر یہ بھی تو عین ممکن ہے کہ کسی ایک ہی انسانی

معاشرے میں رہنے والے افراد کسی ایک ہی اخلاقی قدر کے بارے میں مختلف رائے رکھتے ہوں۔

مثال کے طور پر، بہت سارے ترقی یافتہ ممالک میں ایک ہی جنس کے لوگ نہ صرف آپس میں شادی کر سکتے ہیں، بلکہ اس شادی کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہے۔یعنی ان ممالک میں ایک مرد دوسرے مرد کے ساتھ شادی کر سکتا ہے تو ایک عورت دوسری عورت کے ساتھ۔

اگرچہ بہت سارے ترقی یافتہ ممالک میں ایسی شادیوں کو قانونی حیثیت حاصل ہو چکی ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ انہی ترقی یافتہ ممالک میں، شادی کے انہی قوانین کے خلاف بہت سارے احتجاجی مظاہرے بھی کیے گئے ہیں۔ یعنی ایک معاشرے میں رہتے ہوئے کسی ایک ہی چیز کے بارے میں مختلف افراد کا مختلف رائے رکھنا عین ممکن ہے۔

بالکل اسی طرح سے ہماری اس زمین پر بہت سارے قبائل ایسے بھی ہیں، جن کی روایات میں لباس کو ایک فضول چیز اور بلا وجہ کا تکلف سمجھا جاتا ہے۔ مرد و زن کا مادرزاد برہنہ رہنا ان معاشروں میں ایک قابلِ تحسین چیز سمجھی جاتی ہے، جبکہ دنیا کے اکثر معاشروں میں لباس کو ایک ضروری چیز سمجھا جاتا ہے، برہنگی کو بُرا جانا جاتا ہے۔یعنی لباس کے معاملے میں مختلف معاشروں میں مختلف آراء کا پایا جانا عین ممکن ہے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ لباس ایک اچھی چیز ہے یا بُری؟

ہم جنس پرستی ایک اچھی چیز ہے یا بُری؟

دونوں قسم کے نظریات کے حامل افراد آپ کو اسی ایک زمین پر مل جائیں گے اور ان میں سے ہر فرد اپنی پسند کے نظریے کی وکالت کرتا نظر آتا ہے۔ ہر فرد یہی سمجھ اور سمجھا رہا ہوتا ہے کہ اس کا اپنا نظریہ ہی سب سے اچھا ہے، سب سے بہترین ہے۔ اب پریشانی کی بات یہ ہے کہ ان سینکڑوں، ہزاروں مخالف اور متضاد اخلاقی اقدار کے مابین اچھے اور بُرے کے یہ سارے فیصلے کیسے ہوں گے؟ کون کرے گا؟

شاید ''مہذب معاشروں'' میں ایسے تمام اختلافی مسائل کو بزورِ قوت حل کیا جاتا ہے۔

''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''

البتہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ طاقت اور لاٹھی اپنی شکلیں بدلتی رہی ہے۔

پیسہ اگر ایک طاقت ہے تو کثرتِ رائے بھی تو ایک طاقت ہی ہے۔ ان دونوں قوتوں کے ذریعے اخلاقی اقدار کو تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اچھے کو بُرا تو بُرے کو اچھا بنایا جا سکتا ہے۔

اسی طرح میڈیا میں اچھے کو بُرا اور بُرے کو اچھا کر دینے کی نہ صرف صلاحیت موجود ہے، بلکہ میڈیا اپنی اس طاقت کو استعمال کرنے کا فن بھی جانتا ہے۔

بس میڈیا کو ''پیسے'' کی طاقت کا سہارا ملتا رہنا چاہیے۔ اخلاقی اقدار میں کم سے کم وقت میں مؤثر تبدیلیاں کر دینے کا سب سے بڑا کھلاڑی یہ میڈیا ہی ہے۔

پھر بازو اور بارود کی طاقت تو ہمیشہ سے ہی ایک جانی پہچانی چیز ہے۔

یہ کثرتِ رائے، میڈیا، دولت، بازو اور بارود۔۔۔

یہ سب آج کے جدید دور کی، آج کے مہذب معاشروں کی ''لاٹھیاں'' ہیں۔

یہ وہ طاقتیں ہیں، جن کے ذریعے اخلاقی حِس میں ''گڑبڑ'' کی جا سکتی ہے، کی جا رہی ہے۔

کیا اچھا اور کیا بُرا؟

اس چیز کا فیصلہ جب بزورِ قوت ہونے لگے تو۔۔۔فسادات ہی انسانوں کا مقدر بن جایا کرتے ہیں۔

کیوں اچھا اور کیوں بُرا؟

تقریباً ہر انسانی معاشرے میں جھوٹ، چوری اور رشوت کو بُرا سمجھا جاتا ہے، حتیٰ کہ چوری کرنے والے شخص کو بھی پتہ ہوتا ہے کہ اس نے ایک بُرا کام کیا ہے۔ رشوت لینے والا افسر بھی رشوت کھلم کھلا نہیں لیتا۔ رشوت تھوڑی چھپ چھپا کر ہی لی دی جاتی ہے اور پھر اسی طرح سے دنیا میں شاید کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ہوگا، جو جھوٹ کو اچھا اور سچ کو بُرا جانتا ہوگا۔ یعنی اس کرۂ ارض پر رہنے والے تقریباً سبھی افراد اس بات پر متفق ہیں کہ رشوت، چوری اور جھوٹ، تینوں بُری چیزیں ہیں۔

مگر کیوں؟

رشوت، چوری اور جھوٹ؛ یہ تینوں چیزیں بُری کیوں ہیں؟

آپ شاید یہ جان کر حیران ہوں کہ انسانی علم میں ان تینوں بُری چیزوں کو بُرا ثابت کرنے کے لیے کوئی ایک بھی عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔۔۔۔۔یقین نہیں آ رہا؟؟؟

چلیں کچھ لمحات کے لیے فرض کیجیے کہ اس وقت آپ ایک بزنس میٹنگ میں موجود ہیں اور ایک ذرا سا، بس ذرا سا جھوٹ بول کر آپ اپنے لیے ایک پرکشش بزنس ڈیل حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے حالات میں اچھی بزنس ڈیل حاصل کرنے کے لیے جھوٹ بول دینا چاہیے؟

یا پھر اپنی اخلاقیات کے ساتھ چپک کر سچ بولتے رہنا چاہیے؟

بزنس ڈیل اگر جاتی ہے تو جائے۔

اسی طرح سے ایک سرکاری افسر کو بالکل چھوٹا سا ''کام'' کرنے کے عوض ''معقول

معاوضہ'' مل رہا ہے۔ اس سرکاری افسر کو کیا کرنا چاہیے؟

معقول معاوضہ قبول کر کے اپنے اور اپنے خاندان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنالینا چاہیے؟

یا پھر اپنی اخلاقیات پر عمل کرتے ہوئے رشوت لینے سے انکار کر دینا چاہیے؟

پھر اگر کوئی شخص چوری کر کے اپنی ضروریات پوری کر سکتا ہے تو اس شخص کو چوری کرنی چاہیے یا نہیں؟

ان تینوں قسم کے حالات میں آپ اپنے لیے کیا پسند کریں گے؟ اور اس سے بھی بڑھ کر آپ کے پاس اپنی اس ''پسند'' کو پسند کرنے کے لیے کون سے عقلی دلائل موجود ہیں؟

اگر آپ اخلاقیات کے بندھن میں بندھ کر جھوٹ، چوری اور رشوت سے اجتناب کرتے ہیں تو آپ اخلاقی طور پر شاید خود کو ایک اچھا انسان ثابت کر دیں، مگر عقلی طور پر آپ ایک بیوقوف اور احمق انسان ثابت ہوں گے۔ اگر ذرا سا جھوٹ بول کر یا رشوت لے کر آپ اپنی خواہشات کو پورا کر سکتے ہیں تو ایسا کیوں نہیں کرنا چاہیے؟

پھر یہ جھوٹ، چوری اور رشوت؛ تینوں بُری چیزیں کیوں ہیں؟

یہ تینوں تو اچھی، بہت اچھی چیزیں ہیں کہ ان کی مدد سے آپ اپنی بہت ساری خواہشات کو پورا کر سکتے ہیں۔ کم محنت اور کم وقت میں زیادہ دولت حاصل کر سکتے ہیں، معیارِ زندگی کو بلند کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت ان حالات میں تو سچ اور ایمانداری بُری چیزیں معلوم ہوتی ہیں کہ یہ آپ کو آپ کی خواہشات سے دور کر رہی ہیں۔ اگر آپ اپنے اردگرد، اپنے ماحول پر تھوڑا غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے والے شریف انسان زندگی کی اس دوڑ میں عموماً پیچھے رہ جاتے ہیں، جبکہ جھوٹ، رشوت اور ایسے ہی دیگر اخلاقی جرائم میں ملوث انسان آگے بڑھ جاتے ہیں۔

ایسے حالات میں اخلاقیات پر عمل پیرا کیوں ہونا چاہیے؟

سچ، ایمانداری اور انہی جیسی دیگر لاتعداد اخلاقی اقدار کے بارے میں یہ ایک عجب چیز سامنے آتی ہے کہ ان اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہونے کے لیے بہت سے اخلاقی دلائل تو موجود ہو سکتے ہیں، مگر زیادہ تر اخلاقی اقدار پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس دنیا کے کسی بھی صاحبِ علم و دانش کے پاس، کسی بھی سیانے کے پاس کوئی بھی عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ ❶

مثال کے طور پر اگر کوئی شخص چوری کرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو آپ اس شخص کو کوئی بھی عقلی دلیل

---

❶ اس موضوع پر آگے چل کر دوبارہ سے بات کی جائے گی۔

دے کر یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ چوری کرنا نہ صرف ایک بُری چیز ہے بلکہ چوری کرنا خود اس چور کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔ چور کے ساتھ اپنی گفتگو کے آغاز میں شاید آپ اس چور کو جیل اور سزا سے ڈرانے کی کوشش کریں، مگر چور آپ کو یہ کہہ کر مطمئن کر دے گا کہ وہ اپنے فن میں ماہر ہے۔ اس کی پلاننگ ہمیشہ زبردست ہوتی ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ چوری کرتا ہوا پکڑا جائے۔

اب آپ اس چور سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ۔۔۔

''دیکھو چور بھائی صاحب! زیادہ نہیں تو دس پندرہ فیصد امکانات تو موجود ہیں کہ تم چوری کرتے ہوئے پکڑے جاؤ اور تمھیں سزا ہو جائے۔''

پھر چور آپ کو یہ کہہ کر خاموش کروا دے گا کہ وہ ایک Risk Lover انسان ہے۔ دس فیصد تو کیا، اگر پکڑے جانے کے امکانات چالیس فیصد بھی ہوں، تب بھی وہ چوری کرنے کے لیے تیار ہے اور اگر کہیں چور کی عقل تھوڑی زیادہ کام کرتی ہوئی تو وہ آپ سے یہ بھی کہہ سکتا ہے کہ خطرہ تو ہر چیز میں ہی موجود ہوتا ہے۔ سڑک پر پیدل چلتے ہوئے بھی حادثہ ہو سکتا ہے، گاڑی اور موٹر سائیکل کی ریس میں حادثے ہوتے ہیں، سکائی ڈائیونگ بھی تو ایک خطرناک چیز ہے۔ اگر ان سبھی کھیلوں سے دوسروں کو نہیں روکا جاتا تو چوری کرنے سے ایک انسان کو کیوں روکا جاتا ہے؟ چوری کرنا ایک بُری چیز کیوں ہے؟

اب شاید آپ چور کو یہ کہہ کر چوری کرنے سے روکنے کی کوشش کریں گے کہ چوری کرنے سے ذہن پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس پر چور کا جواب ہوگا کہ اوّل تو چوری کرنے سے اس کے ذہن پر کسی قسم کے منفی اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ باقی اگر تھوڑے بہت منفی اثرات مرتب ہوں گے بھی تو چوری کے پیسوں کی مدد سے اگلا ایک سال کسی پُرفضا مقام پر گزار کر ان منفی اثرات کو مثبت میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اب ایک آخری حربے کے طور پر آپ اس چور کو یہ کہیں گے کہ۔۔۔

''دیکھو! چوری کرنا ایک بُری چیز ہوتی ہے۔ انسانوں کو نقصان نہیں پہنچانا چاہیے۔''

آپ کی یہ بات سن کر چور پہلے مسکرائے گا، آپ کے گال کو چھوئے گا اور پھر آپ کو یہ بتائے گا کہ اوّل تو چوری کرنا اس کے لیے بُری چیز نہیں ہے اور دوسرا آپ کی یہ دلیل عقل نہیں بلکہ اخلاقیات پر مبنی ہے۔

الغرض انسانی علم میں کوئی ایک بھی ایسی دلیل نہیں ہے، جس کی مدد سے کسی چور کو یہ باور کروایا جا سکے کہ چوری کرنا نہ صرف ایک بُری چیز ہے، بلکہ چوری کرنا خود اس چور کے لیے بھی نقصان دہ ہے۔

پھر چوری ہی کی طرح دیگر بہت ساری اخلاقی اقدار بھی ایسی ہیں، جن پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمارے پاس کوئی بھی خاص عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔ اگر۔۔۔

اگر اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے کے لیے حقیقتاً کوئی بھی عقلی دلیل موجود نہیں ہے تو پھر۔۔۔

میں ایک مجرم ہوں۔

پرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک بہت نیک اور رحم دل بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ اس بادشاہ کا بس ایک ہی بیٹا تھا۔ بادشاہ بوڑھا ہو گیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ اب تختِ حکومت شہزادے کے حوالے کر دینا چاہیے۔ بادشاہ نے شہزادے کو حکم دیا کہ تخت سنبھالنے سے پہلے وہ ایک عام شہری کی مانند پوری سلطنت کا دورہ کرے، تاکہ اسے عوام کے حقیقی مسائل اور مطالبات کا اچھے سے علم ہو۔

اگلی صبح شہزادہ اور شہزادی عام انسانوں کا لباس پہن کر اپنے سفر کے لیے نکل پڑے۔ دونوں ہر شہر میں کچھ دن قیام کرتے اور عوام میں گھل مل جاتے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے کہ عوام کی رائے شاہی خاندان کے بارے میں بہت اچھی تھی۔ اپنے اس سفر کے تیسرے ہفتے ان کا گزر ایک بہت ویران جگہ سے ہوا۔ ان کی پوری سلطنت سرسبز و شاداب تھی، مگر یہ جگہ تو ایک بالکل ہی الگ منظر پیش کر رہی تھی۔ ایسی ویرانی ان دونوں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ ایک بہت بڑا ریت کا میدان تھا۔ اس میدان میں جگہ جگہ کانٹے دار جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں کچھ درخت بھی نظر آ رہے تھے، مگر وہ شاخوں اور پتوں سے محروم درخت تھے۔ اس بنجر اور ویران میدان میں ہر جانب اُلّو پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اُلوؤں کی تیز ''چڑ ڑڑ، چڑ ڑڑ'' کی آوازیں ماحول کو ایک پُراسرار رنگ دے رہی تھیں۔

شہزادے نے چاروں جانب گھوم کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر اسے ایک بستی نظر آئی۔ دونوں اس بستی کی جانب گھوڑے دوڑانے لگے۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ شہزادہ اور شہزادی نے گھوڑوں کو ایک جگہ باندھ دیا اور خود قصبے کے بازار میں چہل قدمی کرنے لگے۔ شہزادے نے ایک مقامی آدمی کو اپنی جانب متوجہ کیا اور پھر یہاں پر ہر جانب موجود اس ویرانی کا سبب دریافت کرنے لگا۔ پھر شہزادے سے نہ رہا گیا تو اس نے یہ بھی پوچھ لیا کہ۔۔۔

''یہاں ہر جانب اتنے اُلّو کیوں بولتے ہیں؟''

اس مقامی آدمی نے ایک پُراسرار مسکراہٹ کے ساتھ شہزادے اور شہزادی کی جانب دیکھا اور پھر ان دونوں کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے کہنے لگا:

''آیئے! میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ اُلّو کیوں بولتے ہیں۔''

شہزادہ اور شہزادی نے اس مقامی آدمی کے پیچھے چلنا شروع کر دیا۔ راستے میں ایک جگہ رک کر اس مقامی آدمی نے دیگر دو مقامی مردوں کے ساتھ ملاقات کی اور پھر اپنی جیب سے کچھ پیسے نکال کر ان

دونوں کو تھما دیے۔ اب وہ دونوں مرد بھی اسی قافلے میں شریک ہو چکے تھے۔ چند لمحات بعد یہ پانچوں افراد چلتے ہوئے ایک بڑی ساری عمارت میں داخل ہو گئے۔

وہ پہلے والا مقامی آدمی شہزادے کو بتانے لگا:

''یہ عمارت یہاں کی عدالت ہے اور یہاں پر بستی کا اکلوتا منصف بیٹھتا ہے۔''

اس عمارت کی مختلف راہداریوں سے گزرتے ہوئے وہ پانچوں منصف کے سامنے پہنچ گئے۔ پہلے والا مقامی آدمی منصف کے سامنے جھک کر کھڑا ہو گیا اور پھر شہزادے اور شہزادی کی جانب اشارہ کر کے منصف سے درخواست کرنے لگا:

''حضورِ والا! یہ عورت میری لونڈیا ہے، جس پر یہ اجنبی مرد زبردستی قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ حضور! آپ انصاف کیجیے۔''

اس کے ساتھ ہی دوسرے دونوں مقامی افراد نے شہزادے کے خلاف اپنی گواہی بھی پیش کر دی۔

ان مقامی افراد کی جانب سے اس بدسلوکی پر شہزادہ اور شہزادی بہت پریشان ہوئے۔

دونوں نے بہت واویلا کیا، بہت شور مچایا کہ کسی طرح اس منصف کو حقیقت سے آگاہ کیا جا سکے، لیکن ان کی تمام کوششیں بے سود ہی رہیں اور منصف نے اپنا فیصلہ سنا بھی دیا۔

شہزادی کو اس مقامی آدمی کے حوالے کر دیا گیا، جبکہ شہزادے کو ایک شریف انسان کی لونڈیا پر زبردستی قبضہ کرنے کی کوشش کے جرم میں چالیس کوڑوں کی سزا سنائی گئی۔

پھر منصف کے اس فیصلے پر فوراً ہی عمل درآمد بھی کر دیا گیا۔

کچھ دیر بعد شہزادہ اپنے زخموں سے چور بدن کے ساتھ ایک بار پھر سے اسی ریتلے اور بنجر میدان میں سے گزر رہا تھا۔ اب بھی وہاں ہر جانب ویرانی تھی، اب بھی جگہ جگہ اُلّو بیٹھے بول رہے تھے، لیکن اب شہزادے کو یہ پوچھنے کی ضرورت نہ رہی تھی کہ۔۔۔

''اُلّو کیوں بولتے ہیں؟''

باب:6

ہمزاد

یہ کائنات لامحدود ہے اور یہ لامحدود دونوں جانب اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔
یہ کائنات لامحدود طور پر بڑی بھی ہے اور چھوٹی بھی۔
اس لامحدود بڑی کائنات میں۔۔۔۔۔میں کتنا چھوٹا ہوں؟
اور اس لامحدود طور پر چھوٹی کائنات کے مقابلے میں۔۔۔
میں کتنا بڑا ہوں؟
ان سوالوں کا جواب جاننا تو ناممکن ہے۔
البتہ اس کائنات اور مجھ میں ایک چیز مشترک ضرور ہے۔
یہ کائنات اور میری خواہشات۔۔۔
دونوں لامحدود ہیں۔

انسانی خواہشات اور یہ کائنات۔۔۔۔۔دونوں ایسے بڑے لامحدود ہیں کہ ان کی حقیقت شاید انسان کبھی نہ جان پائے۔جس طرح ہم میں سے ہر انسان کنویں کا ایک مینڈک بنا اپنی ہی خواہشات کی لامحدودیت سے لاعلم رہتا ہے، بالکل اسی طرح ہم انسان اس کائنات کی وسعت سے بھی بےخبر ہیں۔

لامحدود کے تصور کی مانند، اس کائنات کی وسعت کے بارے میں بھی ہر انسان کا تصور خود اس انسان کی اپنی ہی ذہنی وسعت اور استعداد کے مطابق ہوتا ہے۔

میری کائنات اور کسی صاحبِ علم و دانش کی کائنات۔۔۔۔۔دونوں جدا جدا ہیں۔

بنیادی طور پر ہمارے آس پاس، ہمارے اردگرد ہمہ وقت تین مختلف قسم کی کائناتیں موجود ہوتی ہیں۔ پھر ان تینوں کائناتوں کے طبعی قوانین بھی بظاہر ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں۔

عام آدمی کی دنیا

میں ایک عام آدمی ہوں۔

میں محض اپنی دو آنکھوں کی مدد سے جس کائنات کا مشاہدہ کرتا ہوں، وہ کائنات تو بہت سادہ ہے۔

میرے لیے یہ زمین ہمیشہ ساکن رہتی ہے۔ اپنے پاؤں تلے موجود زمین کی حرکت کو میں نے جب کبھی محسوس کیا، ساتھ ہمیشہ ایک زلزلہ آیا۔ زلزلے کے سوا میں نے زمین کو کبھی حرکت کرتے ہوئے محسوس نہیں کیا۔ میں نے زمین کو جب بھی دیکھا، مجھے زمین ہمیشہ چپٹی نظر آئی۔ چاند اور سورج؛ دونوں اسی ایک زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔

دن میں آسمان نیلا ہو جاتا ہے تو رات کو سیاہ۔

کیا اس آسمان سے پرے بھی کچھ موجود ہے؟

مجھے تو آج تک کچھ نظر نہیں آیا۔ البتہ رات کو آسمان پر چھوٹے چھوٹے ستارے ضرور چمکنے لگتے ہیں۔ دن کے وقت یہ ستارے جانے کہاں چلے جاتے ہیں؟

ایک عام آدمی کی دنیا میں وقت ہمیشہ یکساں رفتار سے گزرتا ہے۔ میرے لیے گھڑی میں حرکت کرتی سوئیاں اور وقت۔۔۔۔۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ساٹھ سال ایک بہت طویل عرصہ ہے۔ اتنا طویل کہ میری زندگی کا ہر ایک لمحہ اس وقت میں سما سکتا ہے۔ میری اس دنیا میں وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود بہت ساری چیزیں رونما ہوتی چلی جاتی ہیں۔ میں زمین میں بیج پھینک دوں تو خود بخود کھیتی اُگ آتی ہے۔

اس دنیا میں ہاتھی اور زرافہ بہت بڑے جانور ہیں، جبکہ مچھر اور مکھی کو حقارت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ سب سے چھوٹی چیز جسے میں دیکھ سکتا ہوں، محسوس کر سکتا ہوں، وہ خاک کا ایک ذرّہ ہی ہے۔ میری اس دنیا میں دو سو کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گاڑی چلانا ایک خطرناک چیز تصور کی جاتی ہے اور چار کنال میں ایک بہت بڑا محل تعمیر ہو جاتا ہے۔

میں ایک عام آدمی ہوں۔

یہ میری اور میرے جیسے دیگر بے شمار عام انسانوں کی دنیا ہے اور۔۔۔

اور اس دنیا کے سبھی لوگ بہت ''معصوم'' ہیں۔

بڑی دنیا

اگر اس کائنات کا مشاہدہ کسی ٹیلی سکوپ کی مدد سے کیا جائے تو انسان ایک بالکل مختلف دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس بڑی دنیا میں پہنچ کر روشنی کی تین لاکھ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار بھی کسی بیل گاڑی کی مانند معلوم ہونے لگتی ہے، کیوں کہ اسے کائنات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے میں گھنٹے، دن یا ہفتے نہیں بلکہ صدیاں لگ جاتی ہیں۔ بڑی دنیا میں فاصلے کلومیٹر میں نہیں، بلکہ نوری سالوں میں ماپے جاتے ہیں اور یہاں ایک ارب نوری سال کا فاصلہ بالکل معمولی حیثیت رکھتا ہے۔

بڑی دنیا میں پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وقت محض گھڑی میں حرکت کرتی سوئیاں نہیں ہے، بلکہ یہ وقت بھی باقاعدہ کوئی چیز ہے اور پھر وقت گزرنے کی رفتار بھی مختلف جگہوں پر مختلف ہوسکتی ہے۔

اس دنیا میں خلا کو محض خلا نہیں سمجھا جاتا، بلکہ یہ خلا تو بذاتِ خود کسی چیز کا نام ہے، جو وقت ہی کی مانند ہر جانب پھیلی ہوئی ہے۔

بڑی دنیا میں پہنچ کر ہماری زمین محض ایک نقطے کی شکل اختیار کر جاتی ہے اور یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ زمین نہ صرف گول یا گول نما ہے، بلکہ یہ بہت ساری ''حرکتیں'' بھی کرتی رہتی ہے۔سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا، بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے۔

ایک عام آدمی کی دنیا میں رات کو آسمان پر چمکنے والے چھوٹے چھوٹے ستارے اس بڑی دنیا میں پہنچ کر اچانک سے بالغ ہو جاتے ہیں۔

تمام ستارے اور سیارے نہ صرف گول یا گول نما ہیں، بلکہ سب حرکت میں بھی ہیں۔ یہ تمام اجرامِ فلکیہ ایک نظر نہ آنے والی ڈور کے ساتھ آپس میں بندھے ہوئے ہیں۔ یہ ڈور ہی وہ چیز ہے جو ان سبھی ستاروں اور سیاروں کو خلا میں تھامے رکھتی ہے، گرنے نہیں دیتی۔

ہر سیارہ اس ''کچی ڈور'' کے ساتھ بندھا اپنے اپنے متعلقہ ستارے کے گرد گردش کرتا رہتا ہے۔سائنسدان اس ڈور کو، اس نظر نہ آنے والی طاقت کو کششِ ثقل (Gravity) کا نام دیتے ہیں۔

کششِ ثقل کی حقیقی نوعیت اور ماہیت کیا ہے؟

اس بارے میں خود صاحبانِ علم و دانش بھی ابھی حقیقی علم سے محروم ہیں۔

نیوٹن کی کششِ ثقل کچھ اور ہے تو آئن سٹائن کی کششِ ثقل کچھ اور۔

کششِ ثقل کی نوعیت اور ماہیت سے قطع نظر۔۔۔

کائنات میں موجود تمام اجرامِ فلکیہ محض اس طاقت کی وجہ سے اپنا اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

چاند کی زمین کے گرد اور زمین کی سورج کے گرد حرکت کششِ ثقل کی بدولت ہی ممکن ہے۔ کششِ ثقل کی وجہ سے کائنات میں ایک توازن کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ کششِ ثقل کی قوت میں ذراسی تبدیلی بھی تمام کائنات کو تباہ و برباد کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ٹیلی سکوپ کی مدد سے نظر آنے والی اس بڑی دنیا میں کسی بھی چیز کو سکون میسر نہیں ہے۔

ستارے، سیارے، کہکشائیں۔۔۔۔۔ ہر چیز حرکت میں ہے۔ ہر ہر چیز حرکت میں ہے۔

Advin Hubble وہ پہلا سائنسدان تھا، جس نے 1929 میں ستاروں اور کہکشاؤں کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنا شروع کی تھی۔ اجرامِ فلکیہ کا مسلسل مشاہدہ کرنے کے بعد وہ یہ بات جاننے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کائنات میں موجود ہر کہکشاں، دوسری ہر کہکشاں سے دور ہوتی چلی جارہی ہے۔ تمام ستاروں اور کہکشاؤں کے مابین دوری مسلسل بڑھ رہی ہے۔

یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔

ہر آنے والے لمحے میں یہ کائنات بڑی سے بڑی ہوتی چلی جارہی ہے۔

اگر کائنات مسلسل پھیل رہی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ مستقبل میں اس کائنات کا حجم آج سے زیادہ ہوگا۔ کائنات کے اسی پھیلاؤ سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ ماضی میں یہ کائنات آج کی نسبت چھوٹی ہو گی اور ماضی بعید میں مزید چھوٹی۔ ماضی میں ہم جتنا پیچھے کی جانب سفر کرتے جائیں گے، یہ کائنات چھوٹی سے چھوٹی ہوتی چلی جائے گی۔

حتیٰ کہ آج سے 13.8 ارب سال پہلے یہ تمام کائنات محض ایک ذرے کی مانند تھی۔

یہ زمین و آسمان اس وقت یکجا تھے۔ آج ایک دوسرے سے اربوں نوری سالوں کی مسافت پر موجود سبھی کہکشائیں آج سے 13.8 ارب سال پہلے یکجا تھیں۔

پھر 1990 کی دہائی میں پہنچ کر Hubble Telescope کی مدد سے ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ۔۔۔

''یہ کائنات نہ صرف مسلسل پھیل رہی ہے، بلکہ اس کائنات کے پھیلاؤ کی رفتار میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔''

یہ بات بالکل ایسے ہی ہے جیسے آپ فضا میں کوئی گیند اچھالیں تو وہ گیند چند لمحات بعد واپس آپ کے پاس نہ آئے بلکہ فضا میں بلند سے بلند ہوتی چلی جائے اور اس گیند کی رفتار میں بھی مسلسل اضافہ ہوتا چلا جائے۔۔۔۔۔اور پھر اسی تیز رفتاری کے ساتھ فضا میں بلند ہوتی ہوئی یہ گیند آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔

کائنات مسلسل پھیل رہی ہے اور اس کے پھیلنے کی رفتار میں بھی ہر لمحے اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔

وہ کون سی طاقت ہے کہ جو کائنات کو مسلسل پھیلنے پر مجبور کر رہی ہے؟

کائنات کے اس پھیلاؤ کی رفتار تیز سے تیز تر کیسے ہوتی چلی جا رہی ہے؟

سائنسدان اس قوت کی حقیقی نوعیت اور ماہیت تو نہیں جان سکے، البتہ اس بات پر سائنسدان متفق ہیں کہ کوئی طاقت تو ہے، جو کائنات کے مسلسل پھیلاؤ کا سبب بن رہی ہے۔

اس انجانی قوت کو ڈارک انرجی کا نام دیا جاتا ہے۔ ڈارک انرجی کائنات میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے۔ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کائنات کا بیشتر حصہ، تقریباً ستر فیصد حصہ اسی ڈارک انرجی پر مشتمل ہے۔

نظر بھی نہ آنے والی ایک پُراسرار طاقت، ڈارک انرجی۔

پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کائنات میں Dark Energy کی طرح Dark Matter بھی موجود ہے۔ یہ ایک ایسا مادہ ہے، جسے ہم انسان براہِ راست دیکھ یا محسوس نہیں کر سکتے ہیں۔

Dark Energy کی طرح Dark Matter کی نوعیت اور خواص کے بارے میں بھی ہم کچھ نہیں جانتے ہیں، البتہ یہ ضرور بتایا جاتا ہے کہ کائنات کا تقریباً پچیس فیصد حصہ Dark Matter پر مشتمل ہے۔

ہم اپنے اردگرد جتنی بھی چیزیں دیکھتے ہیں، محسوس کرتے ہیں، یہ تمام چیزیں Ordinary Matter سے وجود میں آتی ہیں۔ ہمارے اردگرد موجود سبھی بے جان اور جاندار چیزیں، حتیٰ کہ ہم انسان خود بھی اسی Ordinary Matter سے بنے ہوئے ہیں۔ Ordinary Matter کائنات کے محض پانچ فیصد حصے پر موجود ہے، جبکہ کائنات کا پچانوے فیصد حصہ Dark Matter اور Dark Energy پر مشتمل ہے۔ اس کائنا ت کے پچانوے فیصد حصے کو نہ ہم دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی براہِ راست محسوس کر سکتے ہیں۔

بس ہم اتنا جانتے ہیں کہ کائنات کا پچانوے فیصد حصہ Dark Matter اور Dark Energy پر مشتمل ہے۔

چھوٹی دنیا

بڑی دنیا ایک عام آدمی کی دنیا سے مختلف ہوتی ہے۔

مگر یہ چھوٹی دنیا۔۔۔

چھوٹی دنیا تو پھر چھوٹی دنیا ہی ہوتی ہے۔

اسی کائنات کو اگر ٹیلی سکوپ کی جگہ مائیکروسکوپ کی مدد سے دیکھا جائے تو انسان ایک تیسری قسم کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے اور شاید یہ دنیا۔۔۔۔۔ وہ دنیا ہے کہ جس کی باتوں کو سمجھنا ایک عام انسان تو دور، خود سائنسدانوں کے لیے بھی بہت مشکل ہو چکا ہے۔ چھوٹی دنیا کے بارے میں بات کرتے ہوئے خود صاحبانِ علم و دانش بھی تھوڑا پریشان نظر آتے ہیں۔ اس دنیا کے طبعی قوانین نہ صرف ایک عام آدمی کی دنیا کے طبعی قوانین سے بظاہر مختلف نظر آتے ہیں بلکہ متضاد بھی۔

کیا گھڑی میں نصب سوئیاں بیک وقت کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز حرکت کر سکتی ہیں؟

پھر جیسے ہی آپ گھڑی پر وقت دیکھنا چاہیں تو یہ سوئیاں آپ کو دھوکا دینے کے لیے جلدی سے اپنی ایک حرکت کو چھوڑ کر۔۔۔۔۔۔ بس صرف کلاک وائز حرکت کرنا شروع کر دیں۔

ہمارا یہ چاند۔۔۔۔۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ چاند ایک ہی وقت میں زمین کے گرد بہت ساری جگہوں پر موجود ہو؟

ایک ہی چاند، ایک ہی وقت اور بہت ساری جگہیں۔۔۔۔۔ کیا ایسا ممکن ہے؟

کیا کسی بھی چیز کے لیے بیک وقت بہت ساری جگہوں پر موجود ہونا ممکن ہے؟

پھر جیسے ہی آپ چاند کی جانب دیکھیں تو چاند آپ کی نظروں کو محسوس کر کے فوراً اپنے آپ میں سمٹ جائے۔ چاند آپ کی نظروں کو محسوس کر کے واپس اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ جائے اور پھر چاند آپ کو یہی بتانے کی کوشش کرے کہ میں تو کہیں نہیں گیا تھا، میں تو ہمیشہ سے ادھر، اپنی ایک ہی مخصوص جگہ پر موجود تھا۔

کیا چاند ہمیں دھوکا دے سکتا ہے؟

جب ہم چاند کی طرف دیکھ رہے ہوں تو چاند اپنی مخصوص جگہ پر جامد ہو جائے لیکن جیسے ہی ہم چاند کو بھول کر اپنے کسی کام میں مشغول ہو جائیں تو چاند پھر سے ادھر ادھر دوڑنا شروع کر دے، پھر سے ہر جانب پھیل جائے۔

ہمارے نظامِ شمسی میں سورج کے گرد آٹھ سیارے گردش کر رہے ہیں۔ یہ تمام سیارے سورج کے گرد اپنے اپنے مخصوص مداروں میں گردش کرتے ہیں اور ان مداروں میں کروڑوں کلومیٹر کا فاصلہ موجود ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر زمین اور مریخ کے مدار کے بیچ اوسطاً 5.5 کروڑ کلومیٹر کی دوری ہے، جبکہ زمین اور مشتری کے مدار کے بیچ اوسطاً 63 کروڑ کلومیٹر کا فاصلہ موجود رہتا ہے۔

کیا ہماری زمین کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ سورج کے گرد گردش کرتے ہوئے اچانک سے اپنا مدار چھوڑ کر مریخ کے مدار میں پہنچ جائے؟

یا پھر اگلے ہی لمحے زمین، مشتری کے مدار میں چھلانگ لگا دے؟

بالکل اچانک ۔۔۔۔۔ پلک جھپکنے سے بھی پہلے ۔۔۔۔۔

بنا زمان و مکان استعمال کیے۔

ان تمام سوالوں کا آپ کے پاس محض ایک ہی جواب ہوگا۔ عملی زندگی میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے اور نہ ہی ایسا کبھی ہوتا ہے۔ یہ سب چیزیں محض جادوئی قصے کہانیوں کی باتیں ہیں۔

آخر گھڑی کی سوئیاں بیک وقت دو قسم کی حرکت کیسے کر سکتی ہیں؟ کوئی بھی چیز بیک وقت بہت ساری جگہوں پر کیسے موجود ہو سکتی ہے؟

چاند ایک بے جان چیز ہے، جو ہماری نگاہوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے اور پھر زمین کا یوں چھلانگیں لگانا بھی قطعاً ناممکن ہے۔

آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ آپ بالکل ٹھیک سوچ رہے ہیں۔

یہ سبھی چیزیں ناممکن ہیں۔

ایک عام آدمی کی دنیا میں یہ سبھی چیزیں ناممکن ہیں، مگر چھوٹی دنیا۔۔۔

چھوٹی دنیا تو پھر چھوٹی دنیا ہی ہوتی ہے۔

آپ کے بالکل آس پاس موجود چھوٹی دنیا میں یہ سبھی ''غیر قانونی'' کام اس وقت بھی ہو رہے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ نیوکلیئس کے گرد گردش کرتے ہوئے الیکٹرونز بیک وقت بہت ساری جگہوں پر موجود ہوتے ہیں، لیکن جیسے ہی آپ کسی الیکٹرون کی جانب دیکھیں گے، جیسے ہی آپ کسی الیکٹرون کو Observe کریں گے تو عین اسی لمحے میں یہ الیکٹرون اپنی تمام غیر قانونی حرکات کو چھوڑ کر واپس اپنی مخصوص جگہ پر پہنچ جائے گا اور آپ کو یہی بتانے کی کوشش کی جائے گی

کہ جیسے وہ تو ہمیشہ اپنی ایک ہی جگہ پر موجود رہا ہو، کبھی کہیں گیا ہی نہ ہو۔

پھر الیکٹرونز بیک وقت ایک سے زائد قسم کی حرکت بھی کر سکتے ہیں، لیکن جیسے ہی آپ کسی الیکٹرون کی جانب دیکھیں گے تو عین اسی لمحے یہ الیکٹرون محض ایک قسم کی حرکت کرنا شروع کر دے گا اور آپ کو باور یہی کروایا جائے گا کہ جیسے یہ ہمیشہ سے ایک ہی قسم کی حرکت کرتا چلا آ رہا ہو۔ اسی طرح ایٹم میں موجود الیکٹرونز کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے ''چھلانگ'' مار کر اپنی جگہ تبدیل کر سکتے ہیں اور اپنی ان ''چھلانگوں'' کے دوران یہ الیکٹرون زمان ومکان استعمال نہیں کرتے ہیں۔

یہ سب ماورائے عقل چیزیں اس وقت، اس لمحۂ موجود میں بھی آپ کے اردگرد ہو رہی ہیں، مسلسل ہو رہی ہیں، مگر کیسے؟

آخر یہ سب چیزیں کیسے ممکن ہیں؟

ایک الیکٹرون بیک وقت بہت ساری جگہوں پر کیسے موجود ہو سکتا ہے؟

الیکٹرونز کو ہماری نظروں کا احساس کیسے ہو جاتا ہے؟ انہیں کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ اب ہم ان کی جانب دیکھ رہے ہیں اور اب نہیں دیکھ رہے؟

پھر ہمارے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے الیکٹرونز کی حرکت کا کیا تعلق ہے؟

ایک انسان کے دیکھتے ہی یہ اپنا چال چلن کیوں بدل لیتے ہیں؟ کیسے بدل لیتے ہیں؟ اور اگر ایک ایٹم کے اندر یہ سب حرکتیں ہو رہی ہیں تو ہمارے اردگرد موجود تمام چیزیں بھی تو ایٹمز ہیں، پھر ہم انسان بھی تو ایٹمز سے مل کر بنے ہیں۔ اس چھوٹی دنیا کے اشتراک سے ہی تو ایک عام آدمی کی دنیا بنتی ہے اور پھر بڑی دنیا تشکیل پاتی ہے۔

تو جس وقت آپ اپنی کلائی پر لگی گھڑی کی جانب نہیں دیکھ رہے ہوتے۔۔۔۔۔کیا اس وقت گھڑی میں لگی سوئیاں بیک وقت کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز حرکت کر رہی ہوتی ہیں؟

چھوٹی دنیا میں ہونے والی ان غیر معمولی اور پُراسرار سرگرمیوں کی فہرست بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس دنیا کے ایک بالکل بھی سمجھ نہ آنے والے عمل کو Entanglement کا نام دیا جاتا ہے۔

فرض کیجیے۔۔۔۔۔آپ اور آپ کا دوست مسٹر XY ایک میز پر آمنے سامنے موجود ہیں۔ آپ کا یہ دوست بہت شرارتی انسان ہے اور پچھلے آدھے گھنٹے سے وہ آپ کے بالکل سامنے بیٹھ کر کسی بندر کی مانند آپ کی نقلیں اتاری جا رہا ہے۔ جو حرکت بھی آپ کرتے ہیں، وہ آپ کی اس حرکت کو اسی لمحے میں دہرا دیتا ہے۔ اگر آپ اپنے دائیں کان کو چھوتے ہیں تو وہ بھی اپنے دائیں کان کو چھو دیتا ہے اور اگر آپ

اپنے بائیں کان کو چھوتے ہیں تو وہ بھی عین اسی لمحے میں اپنے بائیں کان کو چھو دیتا ہے۔

اب آپ بھی تھوڑا شرارت کے موڈ میں آجاتے ہیں۔اپنے اس دوست کو شکست دینے کے لیے آپ کبھی اپنے دائیں کان کو چھوتے ہیں تو کبھی بائیں کان کو۔کبھی آپ اپنی ان حرکات کی رفتار کو نہایت تیز کردیتے ہیں تو کبھی بالکل سست اور کبھی آپ بالکل ساکن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر کافی لمحات گزر جانے کے بعد۔۔۔

اچانک سے تیز رفتاری کے ساتھ اپنے بائیں کان کو چھو دیتے ہیں۔

آپ کی ان تمام حرکات کا مقصد بس یہی ہے کہ کسی بھی طرح سے مسٹر XY کو اپنی نقل کرنے کی کوشش میں ناکام بنایا جائے،مگر آپ کا یہ دوست کسی ایک مقام پر بھی نہیں چوکتا۔وہ آپ کی ہر حرکت کو عین اسی لمحے میں بالکل آپ ہی کے انداز میں دہراتا رہتا ہے۔

ابھی تک تقریباً سب کچھ ٹھیک ہے۔کوئی چیز بھی غیر معمولی نہیں ہے۔کوئی بھی انسان کسی دوسرے انسان کے سامنے بیٹھ کر اس کی نقل کرسکتا ہے اور اگر نقل کرنے والے شخص کے اعصاب اچھے ہوں تو یہ سب کچھ بہت تیز رفتاری کے ساتھ بھی کیا جا سکتا ہے۔یہ سب کچھ عین ممکن ہے۔اس میں کوئی بھی پریشانی والی بات نہیں ہے،مگر ایک منٹ۔۔۔

اب فرض کیجیے کہ آپ کا یہی دوست مسٹر XY اس وقت آپ کے بالکل سامنے موجود نہیں ہے۔وہ اس وقت آپ کے شہر،آپ کے ملک تو کیا اس زمین پر بھی موجود نہیں ہے، بلکہ وہ اس وقت Neptune پر موجود ہے۔

کیا ایسے حالات میں آپ کا یہ دوست آپ کی نقل کرسکتا ہے؟

Neptune اور زمین کے مداروں کے بیچ اوسطاً 4.6 ارب کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔روشنی کو بھی زمین سے Neptune تک پہنچنے میں چار گھنٹے لگتے ہیں۔مطلب یہ کہ اگر آپ زمین سے Neptune پر کوئی پیغام بھیجنا چاہیں تو آپ کے اس پیغام کو Neptune تک پہنچنے میں کم از کم چار گھنٹے ضرور لگیں گے۔ایسے حالات میں اگر مسٹر XY آپ کی نقل اسی کامیابی کے ساتھ کرتا ہے کہ جیسے وہ آپ کے بالکل سامنے بیٹھ کر آپ کی نقل کیا کرتا تھا تو۔۔۔

اس چیز کو آپ کیا کہیں گے؟

کیا ایسا ممکن ہے کہ زمین پر اپنے کمرے میں بیٹھ کر جس لمحے آپ اپنے دائیں کان کو چھو دیں تو عین اسی لمحے۔۔۔۔Neptune پر موجود مسٹر XY بھی اپنے دائیں کان کو چھو دے؟

اربوں کلومیٹر کی دوری کے باوجود،آپ کی نگاہوں سے اوجھل ہونے کے باوجود مسٹر XY آپ کی

بالکل ٹھیک ٹھیک نقل کرتا چلا جارہا ہے۔ Neptune پر موجود آپ کا یہ دوست نا صرف آپ کی ٹھیک ٹھیک نقل کررہا ہے، بلکہ وہ یہ سب حرکات عین اسی لمحے کررہا ہے کہ جس لمحے میں آپ یہ حرکات کررہے ہیں۔

یعنی زمین اور Neptune کے درمیان موجود چار گھنٹے کے وقت کا فرق بھی مسٹر XY کے لیے موجود نہیں ہے۔ مسٹر XY آپ کو آپ ہی کے لمحہ موجود میں دیکھ رہا ہے۔

مگر کیسے؟

یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟

اربوں کلومیٹر دور موجود شخص آپ کی بالکل ٹھیک ٹھیک نقل آپ ہی کے لمحۂ موجود میں کیسے کرسکتا ہے؟

اگر آپ کا یہ دوست آپ کو کسی کیمرے کی مدد سے بھی دیکھ رہا ہو، تب بھی، تب بھی آپ کی تصویر کو اس تک پہنچنے میں کم از کم چار گھنٹے ضرور لگیں گے تو پھر مسٹر XY آپ کی ٹھیک ٹھیک نقل بالکل آپ ہی کے لمحۂ موجود میں کیسے کرسکتا ہے؟۔۔۔۔۔کیا حقیقت میں یہ سب کچھ ممکن ہے؟

یہ سب جھوٹ ہے، افسانہ ہے، سائنس فکشن ہے۔

وگرنہ حقیقی دنیا میں ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

یقیناً آپ ٹھیک سوچ رہے ہیں۔ ایک عام آدمی کی دنیا میں یہ سب کسی بھی طرح ممکن نہیں ہے، مگر چھوٹی دنیا میں یہ سب کچھ نہ صرف عین ممکن ہے، بلکہ تجربات سے بھی یہ تمام باتیں ٹھیک ثابت ہوتی چلی جارہی ہیں۔

کسی ایک ہی سسٹم سے منسلک دو الیکٹرونز آپس میں Entangled ہو سکتے ہیں اور ان Entangled الیکٹرونز کی خاص بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک الیکٹرون کی حرکت دوسرے الیکٹرون کی حرکت پر اثر انداز ہوسکتی ہے۔

مثال کے طور پر اگر آپ ایک ہی سسٹم سے منسلک دو Entangled الیکٹرونز کی جانب نہیں دیکھ رہے تو یہ دونوں الیکٹرونز ایک ہی وقت میں بہت سی قسم کی حرکت کررہے ہوں گے۔

یا پھر یوں سمجھ لیجیے کہ یہ دونوں الیکٹرون بیک وقت کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز حرکت کر رہے ہوں گے، لیکن جیسے ہی آپ ان دونوں میں سے کسی ایک کی جانب دیکھیں گے تو وہ الیکٹرون پہلے آپ کی نظروں کو محسوس کرے گا۔۔۔۔اور پھر فوراً ہی آپ کو دھوکا دینے کے لیے محض ایک قسم کی حرکت کرنا شروع کردے گا۔

یہ الیکٹرون جس کی جانب آپ دیکھتے ہیں، اگر آپ کی نظروں کو محسوس کرنے کے بعد کلاک وائز حرکت کرنا شروع کرتا ہے تو اسی لمحے۔۔۔

عین اسی لمحے اس الیکٹرون سے Entangled دوسرے الیکٹرون کو بھی جانے یہ خبر کیسے ہو جاتی ہے کہ پہلے الیکٹرون کی جانب کوئی دیکھ رہا ہے اور اس الیکٹرون نے اپنی ساری حرکتیں بند کر کے بس کلاک وائز حرکت کرنا شروع کر دیا ہے۔

''نامعلوم ذرائع'' سے یہ خبر ملتے ہی دوسرا الیکٹرون بھی فوراً اپنی تمام غیر قانونی حرکتیں ترک کر دے گا اور بس اینٹی کلاک وائز حرکت کرنا شروع کر دے گا۔

پھر Entangled الیکٹرونز کے مابین اس رشتے کا ان الیکٹرونز کے مابین فاصلے سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ کے دوست مسٹر XY کی طرح سے اگر ان دونوں الیکٹرونز میں سے کسی ایک کو اٹھا کر Neptune پر لے جایا جائے، تب بھی، تب بھی یہ دونوں الیکٹرونز آپس میں تعلق قائم رکھتے ہیں اور ان کی خفیہ پیغام رسانی جاری رہتی ہے۔

اب فرض کیجیے کہ ان دونوں Entangled الیکٹرونز میں سے ایک الیکٹرون آپ کے پاس زمین پر موجود ہے، جبکہ دوسرا الیکٹرون Neptune پر ہے۔ اگر آپ زمین پر موجود الیکٹرون کی جانب نہیں دیکھ رہے تو یہ الیکٹرون کلاک وائز اور اینٹی کلاک وائز دونوں قسم کی حرکت بیک وقت جاری رکھے گا اور کچھ یہی حالت Neptune پر موجود دوسرے الیکٹرون کی بھی ہوگی، لیکن جیسے ہی آپ زمین پر موجود الیکٹرون کی جانب دیکھیں گے تو یہ الیکٹرون آپ کو دھوکا دینے کے لیے کلاک وائز گھومنا شروع کر دے گا اور بالکل اسی وقت، عین اسی لمحے Neptune پر موجود الیکٹرون کو بھی جانے یہ کیسے علم ہو جائے گا کہ زمین پر موجود اس کے تعلق والے الیکٹرون نے کلاک وائز گھومنا شروع کر دیا ہے، لہٰذا Neptune پر موجود یہ دوسرا الیکٹرون بھی اپنی ساری حرکتیں ترک کر کے صرف اینٹی کلاک وائز گھومنا شروع کر دے گا۔

مگر کیسے؟

حقیقی زندگی میں یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟

ایک الیکٹرون کی حرکت میلوں دور موجود دوسرے الیکٹرون کی حرکت پر کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے؟

دو الیکٹرونز اربوں کلومیٹر کا فاصلہ ہونے کے باوجود آپس میں ایک تعلق کیسے قائم رکھ لیتے ہیں؟

شاید چھوٹی دنیا کی ماورائے عقل باتیں یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہیں۔

بتایا جاتا ہے کہ ایٹم میں موجود ہر پارٹیکل کا ایک اینٹی پارٹیکل بھی ہوتا ہے۔ پارٹیکل اور اینٹی

پارٹیکل ہر لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں، محض چارج مختلف ہوتا ہے۔ اینٹی پارٹیکلز کے اشتراک سے اینٹی ایٹم وجود میں آتے ہیں اور پھر ان اینٹی ایٹمز سے Anti-Matter وجود میں آجاتا ہے۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس کائنات میں ہر Matter کا ایک Anti-Matter موجود ہے۔

اگر اس کائنات میں ہر Matter کا ایک Anti-Matter موجود ہے تو۔۔۔

انسان بھی تو ایٹمز سے مل کر بنا ہے ناں؟

کیا اس کائنات میں ہر انسان کا Anti-Matter سے بنا ہوا ایک ہمزاد بھی موجود ہے؟

پھر۔۔۔

میں بھی تو انسان ہوں۔

کیا اس کائنات میں میرا کوئی ہمزاد بھی ہے؟

بالکل میرے جیسا۔۔۔ بس ایک چارج کا فرق۔۔۔ Mirror Image

اگر ایسا ہے تو میں اور میرے Anti-Matter سے بنے اس ہمزاد میں سے۔۔۔

میں کون ہوں؟

میں، میں ہوں؟

یا پھر۔۔۔ میرا ہمزاد میں ہوں؟

ہم دونوں میں سے حقیقی۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

---

[1] نوٹ: چھوٹی دنیا میں بیان کی گئی باتوں پر یقین کرنے میں کچھ قارئین کو دشواری کا سامنا ہوسکتا ہے۔ ایسے تمام قارئین سے التماس ہے کہ مندرجہ ذیل موضوعات پر کچھ وقت صرف کیجیے۔

Double Slit Experiment, Wave Particle Duality, Schrodinger's Cat Experiment, Superpostions of Electrons, Observation Problem, Role of Observer in Quantum Physics, Entanglement, Spooky Action at Distance.

باب:7

دھوکا

میں اور آپ۔۔۔

یہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز۔۔۔

ہر وہ چیز جسے ہم کسی بھی طرح دیکھ سکتے ہیں یا براہِ راست محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ زمین، درخت، ستارے اور بلی۔۔۔وہ چاند، کمپیوٹر، کہکشاں اور کتا۔

ان تمام چیزوں میں ایک بات مشترک ہے۔

یہ تمام چیزیں ایٹمز سے مل کر بنی ہیں، یہ تمام چیزیں ایٹمز ہی ہیں۔

ایٹم کی اس دنیا کی لاتعداد باتیں ایسی ہیں، جو ہماری سمجھ اور فہم سے بالا تر ہیں مگر ہمارے بالکل قریب، ہمارے اپنے ہی اندر ایک ایسی چیز بھی موجود ہے، جو پیچیدگی میں اس چھوٹی دنیا سے بھی کہیں بڑھ کر ہے۔۔۔''شعور''

شعور (Consciousness) ہماری زندگیوں کا ایک حصہ ہے، زندگی ہے۔اگر لمحۂ موجود میں آپ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وجہ محض یہی ہے کہ آپ ایک ذی شعور ہستی ہیں۔آپ کو ایک کرسی، چانداور پتھر سے ممتاز کر دینے والی چیز آپ کا شعور ہے۔یہ شعور ہی ہے کہ جس کی وجہ سے آپ چیزوں کو سوچتے ہیں، محسوس کرتے ہیں۔آپ کے اپنے اندر جو ایک دنیا ہر وقت آباد رہتی ہے، اس دنیا کا وجود محض شعور کی بدولت ممکن ہے، مگر یہ سب چیزیں کیوں ہوتی ہیں؟ کیسے ہوتی ہیں؟

ہمارے اپنے اندر ایک الگ دنیا کیسے آباد ہو جاتی ہے؟

ہم چیزوں کو محسوس کیسے کرتے ہیں؟۔۔۔۔۔ہم سوچتے کیوں ہیں؟

یہ وہ سوالات ہیں، جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ایک انسان کو انسان بنا دینے والی چیز شعور ہے اور اس شعور کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔اگر چھوٹی دنیا کے بظاہر بالکل مختلف نظر آنے والے طبعی قوانین پچھلے سو سال سے سائنسدانوں کے لیے ایک دردِ سر بن چکے ہیں تو انسانی شعور کا مسئلہ وہ

مسئلہ ہے کہ جو صدیوں سے دانشوروں کی نیندیں حرام کرتا چلا آ رہا ہے۔صدیوں کی بھاگ دوڑ کے باوجود انسانی شعور کا معمّہ آج بھی ایک معمّہ ہے اور اس پہیلی کی پیچیدگی کا اندازہ محض اس بات سے ہی لگایا جا سکتا ہے کہ آج تک ہمارے پاس شعور کی کوئی باقاعدہ تعریف (Defination) بھی موجود نہیں ہے۔

البتہ عام فہم الفاظ میں شعور کو کچھ یوں بیان کر دیا جاتا ہے:

''اپنی ذات اور اپنے ماحول سے آگاہ ہو جانے کا نام شعور ہے۔''

اپنی ذات اور اپنے ماحول سے آگاہی رکھنے والی ہر چیز ایک ذی شعور ہستی ہے۔عمومی خیال یہی ہے کہ ہر صحت مند انسان باشعور ہوتا ہے،لیکن ہم انسانوں کی طرح کیا دیگر جاندار بھی شعور رکھتے ہیں؟ کیا یہ جانور، پرندے اور چھوٹے چھوٹے حشرات بھی اپنی ذات اور اپنے ماحول سے آگاہ ہوتے ہیں؟

ان سوالوں کے جواب آپ خود سے ڈھونڈنے کی کوشش کیجیے۔چیزوں کو سادہ اور عام فہم رکھنے کے لیے ہم صرف انسانی شعور کی بات کریں گے، لہٰذا اس کتاب میں جب جب بھی لفظ ''شعور'' استعمال ہوگا، مراد انسانی شعور ہی ہوگا۔شعور کے یوں تو بہت سارے اہم پہلو اور خواص ہو سکتے ہیں،لیکن خیالات، احساسات، جذبات اور یاداشت/ یادیں؛ یہ چار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کی مدد سے شعور کو بیان کیا جا سکتا ہے،شعور کی وضاحت کی جا سکتی ہے۔

یہ چاروں چیزیں مل کر آپ کو آپ بناتی ہیں، آپ کے اندر ایک الگ سے دنیا قائم کر دیتی ہیں۔ایک ایسی دنیا جس میں سب سے اہم آپ خود ہوتے ہیں، ایک ایسی دنیا جس میں تمام چیزیں خود آپ کے اپنے ہی نقطۂ نظر سے واضح ہوتی ہیں۔

آپ بیمار ہو جائیں تو کھانے اپنا ذائقہ تبدیل کر لیتے ہیں۔آپ کے اپنے اندر اداسی موجود ہو تو ساری دنیا کی رونقیں ختم ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔آپ سو جائیں تو آپ کے آرام کا خیال رکھتے ہوئے ساری کائنات خاموشی کی چادر اوڑھ لیتی ہے۔یہ آپ کے اپنے ہی اندر کے موسم ہیں، جو باہر کے موسموں کو مختلف رنگ دیتے ہیں۔

خیالات(Thoughts)

آپ کے اردگرد، آپ کے ماحول میں ہر وقت کچھ نہ کچھ آوازیں ضرور موجود رہتی ہوں گی۔کچھ آوازیں آپ کو اچھی لگتی ہوں گی تو کچھ بُری۔آپ کو آپ کے ماحول میں موجود آوازوں کا ادراک اور فہم کانوں (Ears) کے ذریعے ہوتا ہے، مگر کچھ آوازیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جنہیں آپ اپنے کانوں سے

نہیں سنتے۔ کچھ آوازیں آپ کے اندر، آپ کے اپنے ہی اندر موجود رہتی ہیں۔آپ کے اندر کوئی ہمیشہ موجود ہوتا ہےاور پھر چپکے چپکے، سرگوشیوں میں آپ سے باتیں کرتا ہے۔اگر آپ اپنے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پراچھے سے جما دیں گےتو ماحول میں موجود آوازوں سے کسی حد تک چھٹکارا پانے میں کامیاب ہو جائیں گے،مگر جو آوازیں آپ کے اندر سے ابھرتی ہیں، ان سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔ یہ آپ کے اندر کون موجود ہے، جو قدم قدم آپ کو مشوروں سے نوازتا رہتا ہے؟

آپ کے ہر غلط کام پر روک ٹوک کرنے والی، ڈانٹ ڈپٹ کرنے والی یہ آواز کس کی ہے؟

یہ ایک آواز۔۔۔۔۔۔ جو آپ اپنے کانوں سے نہیں سنتے۔

یہ ایک آواز۔۔۔۔۔۔ جو آپ کے اپنے ہی اندر موجود رہتی ہے۔

اگر آپ کبھی تھوڑا غور کریں گےتو معلوم ہوگا کہ آپ کے مستقبل کی ساری منصوبہ بندی یہی آواز کرتی ہے، جبکہ ماضی کے تمام حالات وواقعات پر تبصرے بھی اسی آواز کی صورت میں نشر ہوتے ہیں۔

حتیٰ کہ ابھی لمحۂ موجود میں کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے، اس کتاب کے الفاظ کو پڑھتے ہوئے بھی ایک آواز آپ کے اندر مسلسل گونج رہی ہوگی۔ کتاب کے تمام الفاظ اسی ایک آواز کی صورت میں آپ کے اندر جذب ہورہے ہوں گے۔ پھر آپ کے دکھ اور تکلیف پر روتی بھی یہی آواز ہے اور خوشی کے سارے نغمے بھی اسی ایک آواز کی صورت میں آپ کے اندر گونجتے ہیں۔آپ کبھی پریشان ہوں، مایوس ہوں تو آپ کو حوصلہ بھی یہی آواز دیتی ہے۔آپ کے مشکل وقت میں آخری لمحات تک، بالکل آخری لمحات تک۔۔۔

وہ کون ہے جو آپ کا ساتھ دیتا ہے؟

یہ ایک آواز۔۔۔۔۔۔ جو آپ اپنے کانوں سے نہیں سنتے۔

یہ ایک آواز۔۔۔۔۔۔ جو آپ کے اپنے ہی اندر موجود رہتی ہے۔

اسی ایک آواز کو۔۔۔۔۔۔خیال کہتے ہیں۔ اگر آپ کی قوتِ تخیل اچھی ہو تو اس آواز کے ساتھ تصاویر بھی نشر ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ آپ کے اندر ایک پوری فلم چلنے لگتی ہے۔ایسی فلم جس میں ہر پل مناظر تبدیل ہورہے ہوتے ہیں۔ یہ تصاویر اور آواز مل کر آپ کی ایک خیالوں کی دنیا قائم کر دیتے ہیں۔ یہ دنیا صرف آپ کی دنیا ہوتی ہے۔کوئی دوسرا انسان آپ کی اس دنیا میں داخل نہیں ہوسکتا۔

پچاس لوگوں کی محفل میں بیٹھ کر بھی آپ جیسے مرضی ''گندے گندے'' خیالات سوچتے رہیں، آپ کی اس دنیا کے راز کوئی نہیں جان سکتا۔ سامنے موجود شخص کے ساتھ مسکرا مسکرا کر باتیں بھی کریں اور اندر ہی اندر اسے گالیوں سے بھی نوازتے رہیں، کوئی بھی دوسرا انسان آپ کی ان گالیوں کو سننے کی طاقت نہیں

رکھتا۔آپ کے اندر کس وقت، کیا چل رہا ہے؟ کس قسم کی سوچیں آپ کے اندر اچھل کود کر رہی ہیں؟
یہ تمام باتیں آپ کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا۔
آج آپ کو آپ بنا دینے والی چیزوں میں سے ایک بہت اہم چیز۔۔۔
آپ کے خیالات ہیں۔
آپ کے خیالات ہی آپ ہیں۔

احساسات(Feelings & Sensations)

ایک کام کیجیے۔۔۔اپنا موبائل فون اٹھایئے اور اس پر وقت دیکھئے۔۔۔
اب موبائل کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑیئے اور موبائل پر ایک بار پھر سے وقت دیکھئے اور۔۔۔
اور اب اس موبائل کو پوری قوت کے ساتھ اپنے دائیں، بائیں یا سامنے موجود کسی بھی دیوار پر دے ماریئے۔۔۔۔۔خس کم جہاں پاک!

ویسے تو مجھے یقین ہے کہ آپ نے میری اس عاجزانہ درخواست کو قبول نہیں کیا ہوگا اور آپ کا موبائل ابھی تک بالکل محفوظ حالت میں آپ کے پاس موجود ہوگا،لیکن اگر کہیں آپ یہ چھوٹا سا ''تجربہ'' کر لیتے تو انسانی شعور کا پیچیدہ عقدہ فوراً آپ کو سمجھ آ جانا تھا۔
ویسے ابھی بھی۔۔۔۔۔وقت آپ کے ہاتھوں سے پھسلا نہیں ہے۔
اگر آپ چاہیں تو۔۔۔

چلیں خیر،کوئی بات نہیں۔میں بھی ہار ماننے والوں میں سے نہیں ہوں۔احساسات انسانی شعور کا ایک بہت اہم حصہ ہیں اور یہ بات میں آپ کو باور کروا کر ہی دم لوں گا۔اگر آپ خود ہی اپنا موبائل دیوار پر دے مارتے تو یہ بات آپ کے لیے زیادہ بہتر ہوتی،لیکن اب یہ کام بھی مجھے کرنا ہوگا اور اب کی بار بات محض موبائل پر ہی ختم نہیں ہو جائے گی بلکہ۔۔۔

فرض کیجیے۔۔۔آپ ایک ویران سڑک پر تنہا چلے جا رہے ہیں۔آپ کے ایک ہاتھ میں موبائل ہے اور آپ چلتے چلتے موبائل بھی استعمال کر رہے ہیں۔آپ کی نگاہیں موبائل سکرین پر جمی ہوئی ہیں اور آپ اپنی دُھن میں چلے جا رہے ہیں، چلتے چلے جا رہے ہیں۔اسی بے دھیانی والی کیفیت میں چلتے ہوئے آپ سامنے سے آنے والے ایک شخص کے ساتھ ٹکرا جاتے ہیں اور۔۔۔
اور یہ شخص کوئی عام شخص نہیں ہے، بلکہ یہ بھائی صاحب سات آٹھ فٹ کے ایک دیوہیکل انسان ہیں۔

آپ کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے پر اب یہ بھائی صاحب غصے میں ہیں، شدید غصے میں ہیں۔
آپ بہت کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح معذرت پر ہی جان چھوٹ جائے، مگر بھائی صاحب معذرت قبول کیے بِنا آپ کو ''آدابِ شہریت'' پر ایک طویل لیکچر دینا شروع کر دیتے ہیں۔ کافی دیر آپ بھائی صاحب کی باتیں خاموشی سے سنتے رہتے ہیں، لیکن پھر آپ بھی کوفت اور بوریت کا شکار ہو کر ذرا اونچی آواز میں اپنی بیزاری کا اظہار کر دیتے ہیں اور بس۔۔۔۔۔ جو کام میری عاجزانہ درخواست آپ سے نہ کرواسکی تھی، وہ کام اب یہ بھائی صاحب کریں گے اور بزورِ قوت کریں گے۔

آپ کی آواز میں موجود تلخی کو محسوس کر کے ان بھائی صاحب کا پارہ اچانک سے خطرناک حد تک بڑھ جاتا ہے۔ بھائی صاحب جھٹ سے آپ کے ہاتھ سے آپ کا موبائل چھینتے ہیں اور اگلے ہی لمحے پوری قوت کے ساتھ آپ کے موبائل کو سامنے دیوار پر دے مارتے ہیں۔

آپ آنکھوں میں حیرت اور مایوسی کے تاثرات لیے ایک آخری بار اپنے ''چورا چورا'' ہوئے موبائل کو دیکھتے ہیں۔ اس موبائل کے ساتھ آپ کی ''کیسی کیسی یادیں'' وابستہ تھیں۔ یہ ایک موبائل نہ جانے کتنے ''انمول رابطہ نمبروں'' کا محافظ ہوگا۔

آپ غم و غصے سے کپکپاتی ہوئی آواز میں بھائی صاحب کو ان کی حماقت کا احساس دلانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر۔۔۔۔۔ بھائی صاحب تو حماقت در حماقت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

بھائی صاحب نے ادھر ادھر کچھ نہیں دیکھا اور اپنے دونوں ہاتھوں کی مدد سے آپ کو اپنے سر سے اوپر اٹھا لیا اور پھر بالکل آپ کے موبائل ہی کی مانند۔۔۔

آپ کو بھی دیوار میں دے مارا۔

دیگر بے شمار چوٹوں کے ساتھ ساتھ آپ کا ایک بازو بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ آپ تکلیف کے مارے چیخ رہے ہیں، چلّا رہے ہیں، لیکن بھائی صاحب آپ پر اپنا ہاتھ صاف کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں اور۔۔۔

اور اس پورے حادثے سے ہمیں کچھ سبق ملتے ہیں۔

جب آپ کے موبائل کو دیوار پر مار کر توڑا گیا تو درد آپ نے محسوس کیا۔

پھر جب آپ کو دیوار پر مار کر توڑا پھوڑا گیا، درد اب کی بار بھی آپ ہی نے محسوس کیا۔

مگر ایسا کیوں؟

ہر بار درد آپ ہی کے حصے میں کیوں رہا؟

آپ کے موبائل نے درد کیوں نہ محسوس کیا؟ آپ کا موبائل کیوں نہ چیخا چلّایا؟

ان باتوں کا جواب بس یہی ہے کہ آپ ایک ذی شعور ہستی ہیں۔آپ کے اندر احساسات پائے جاتے ہیں۔آپ کو چوٹ لگتی ہے تو آپ کو درد بھی ہوتا ہے، جبکہ آپ کا موبائل درد محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔آپ کے موبائل کے اندر آپ کی طرح ایک ''میں'' موجود نہیں ہے۔

احساسات آپ کے شعور کا ایک بہت اہم پہلو ہیں۔آپ کے اندر کے احساسات کس وقت، کیا ہیں؟ یہ بات آپ کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا۔

یہ احساسات کی دنیا ہے۔یہ آپ کی اپنی دنیا ہے۔

جذبات(Emotions)

محبت، نفرت، غصہ اور خوف جیسے درجنوں جذبات ہر انسان کے اندر ہمہ وقت موجود رہتے ہیں۔ ہر انسان کی جذباتی کیفیات دوسرے سبھی انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں اور پھر ان جذبات کا اظہار بھی ہر انسان اپنے ہی طریقے سے کیا کرتا ہے۔کچھ لوگ اپنے جذبات کا اظہار اپنی خاموشی سے کرتے ہیں، کچھ لوگ باتوں سے تو کچھ اپنے اعمال سے، مگر اپنے جذبات کے اظہار کے لیے جو طریقۂ کار ''گڈو'' منتخب کرتا، وہ طریقہ بس اپنی مثال آپ ہی ہوا کرتا تھا۔

گڈو MSc میں میرا ہم جماعت تھا اور پھر ہاسٹل میں بھی ہمارے کمرے بالکل آمنے سامنے ہوا کرتے تھے۔اپنے نام کے برعکس گڈو کہیں سے بھی گڈو نہ لگتا تھا۔6.3 فٹ قد اور 118 کلو وزن کے ساتھ گڈو ایک نیم دیوہیکل انسان تھا۔ ویسے گڈو بہت معصوم اور بھولا بھالا تھا۔گڈو ایسا شریف اور اتنا سادہ مزاج تھا کہ جو کام بھی ایک بار کرنا شروع کر دیتا، بس پھر وہ کام کیے ہی چلا جاتا، یہاں تک کہ کوئی اور شخص آ کر گڈو کو وہ خاص کام کرنے سے روک نہ دیتا۔

گڈو اگر ایک بار پڑھنا شروع کر دیتا تو پھر گھنٹوں بس پڑھتا ہی رہتا تھا۔گڈو اگر سو جاتا تو پھر پہروں گزر جاتے، مگر گڈو اپنی آنکھ نہ کھولتا اور اگر کہیں گڈو ایک بار کھانا کھانا شروع کر دیتا۔۔۔

ہاسٹل میں جب کھانے کا وقت ہوتا تو تمام طلباء جوق در جوق میس ہال کی جانب بڑھ جاتے۔ پھر میس میں کوئی لڑکا ایک چپاتی کھاتا، کوئی دو تو کوئی تین چپاتی کھاتا، جبکہ گڈو کسی دن پچاس منٹ کھانا کھاتا، کسی دن پچپن منٹ تو۔۔۔۔۔کسی دن ایک گھنٹہ اور دس منٹ۔

گڈو بے حد جذباتی انسان تھا اور مسئلہ یہ نہیں تھا کہ گڈو ایک جذباتی انسان تھا۔ پریشانی والی بات تو یہ تھی کہ گڈو کو اپنے جذبات کا اظہار بالکل نہیں کرنا آتا تھا۔

جو بات بھی گڈو کہنا چاہ رہا ہوتا، وہ بات سیدھی سیدھی کبھی نہ کہہ پاتا اور پھر جو بات گڈو کہتا، اس بات کا گڈو کے جذبات کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہوتا۔ گڈو کے جذبات اور گڈو کے اپنے جذبات کے اظہار کے لیے منتخب کردہ طریقے۔۔۔

دونوں کا آپس میں کوئی میل نہ ہوتا۔

گڈو کے جذبات گڈو کے اندر ''کھد بُد کھد بُد'' کرتے رہتے، شور مچائے رکھتے اور پھر اچانک کسی غیر معمولی حادثے کی شکل میں گڈو کے جذبات کا اظہار ہو جاتا۔

یہ تھرڈ سمیسٹر کی بات ہو گی، جب ڈیپارٹمنٹ کی ایک غیر رسمی تقریب کے دوران گڈو کو خواہش ہو گئی۔

یعنی۔۔۔۔۔گڈو کو ''لگ'' گئی۔

گڈو کی ''خواہش'' گڈو کے بالکل سامنے میز کے دوسری جانب موجود تھی۔ گڈو اپنی ''خواہش'' کو متاثر کرنا چاہتا تھا، لیکن اسے کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ گڈو کے معصوم گورے چٹے اور ساڑھے اٹھارہ کلو کے چہرے پر اس وقت تذبذب کے آثار نمایاں تھے۔

یوں جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہ رہا ہو۔۔۔۔۔ یوں جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار کیسے کرے۔ اس کے جذبات اس کے اندر ہی اندر جانے کب سے شور مچائے جا رہے تھے کہ اچانک۔۔۔

اس نے اپنے سامنے میز پر موجود ایک ڈیڑھ لیٹر سافٹ ڈرنک کی بوتل کو اٹھا کر منہ سے لگایا اور۔۔۔۔۔ ایک ہی سانس میں ساری پی گیا۔

یہ گڈو کی اپنی ''خواہش'' کو متاثر کرنے کی ایک کوشش تھی۔

یہ گڈو کا اپنے جذبات کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اور۔۔۔

اور حد تو یہ ہے کہ گڈو کی ''خواہش'' متاثر ہو بھی گئی۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد گڈو کے معدے نے جب ڈیڑھ لیٹر سپرائٹ کو سوا دو لیٹر فانٹا بنا کر واپس اسی میز پر اچھالنا شروع کیا تو۔۔۔

چھینٹوں سے سب سے زیادہ متاثر گڈو کی ''خواہش'' ہی ہوئی تھی۔

پھر یہ کوئی ایک ہی انہونی نہ تھی۔ گڈو کے ساتھ تو اکثر و بیشتر ایسے واقعات ہوتے رہتے تھے۔ جیسا کہ اس دن جب وہ اپنے کمرے کو اندر سے لاک کیے گہری نیند سو رہا تھا۔ ایسے میں ایک اجنبی شخص گڈو کے کمرے کو اپنے کسی دوست کا کمرہ سمجھ بیٹھا اور پھر اسی غلط فہمی میں گڈو کے کمرے کا دروازہ زور زور سے

پیٹنے لگا۔ گڈو کافی دیر تک اندر ہی اندر اپنے مچلتے جذبات قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا، حتیٰ کہ اس نے تکیہ اپنے کانوں پر رکھ کر آوازوں سے پیچھا چھڑوانے کی ایک کوشش بھی کی، مگر وہ اجنبی شخص بھی جانے کس خیال میں تھا کہ دروازہ مسلسل پیٹے چلا جا رہا تھا اور پھر۔۔۔۔۔ اچانک گڈو نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اس اجنبی شخص کو گردن سے پکڑ کر دیوار کے ساتھ چپکا دیا۔

اس کے بعد گڈو نے اپنے جذبات کا جو بے دریغ اظہار کرنا شروع کیا ہے ناں۔۔۔

حالانکہ گڈو اس اجنبی شخص کو بالکل بھی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ گڈو تو اسے محض

یہ بات سمجھانا چاہ رہا تھا کہ۔۔۔

''بھائی! دروازے کو اتنے زور سے نہیں پیٹا کرتے۔''

لیکن گڈو کا وہی پرانا مسئلہ۔۔۔

جو بات گڈو کہنا چاہ رہا ہوتا، وہ بات سیدھی سیدھی کبھی نہ کہہ پاتا۔

پھر گڈو کی وہی پختہ عادت۔۔۔۔۔ جو کام بھی گڈو ایک بار شروع کر دیتا، بس پھر وہ کام کیے ہی چلا جاتا، یہاں تک کہ۔۔۔

بہرحال جذبات محض ایک گڈو کا ہی مسئلہ نہیں ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کے اندر جذبات پائے جاتے ہیں، لیکن اپنے سوا کسی بھی دوسرے شخص کی جذباتی کیفیات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگانا ایک ناممکن بات ہوتی ہے۔ کسی خاص انسان، جگہ یا پھر چیز کے ساتھ آپ کے کون سے جذبات وابستہ ہیں؟ کس وقت آپ کے اندر کون کون سے جذبات مچل رہے ہیں؟ آپ کے اندر کی جذباتی کیفیات کیا ہیں؟

یہ تمام باتیں ایک اکیلے آپ ہی جان سکتے ہیں۔ آپ کے سوا کوئی بھی اور انسان ان جذبات کو بالکل آپ کی مانند محسوس نہیں کر سکتا۔

یہ جذبات کے بہتے دریا ہیں۔ یہ آپ کے اپنے دریا ہیں۔

یادداشت/ یادیں (Memories)

وقت تبدیلی کی علامت ہے۔ گھڑی پر حرکت کرتی سوئیاں کسی چیز کے گزر جانے کا، کسی چیز کے تبدیل ہو جانے کا اعلان کر رہی ہوتی ہیں۔

گزرتے لمحات کے ساتھ انسانی زندگیوں میں چاہے اور کوئی بھی چیز تبدیل نہ ہو، انسان کی عمر بڑھ جاتی ہے اور پھر اس بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ انسان کا ماضی بھی۔

ہر گزرتا لمحہ انسان کے ماضی میں ایک نئے لمحے کا اضافہ کر جاتا ہے اور شاید اس ایک لمحے سے جڑی بہت ساری یادوں کا بھی۔

جیسے جیسے انسان کی عمر بڑھتی ہے، ویسے ویسے انسان کا اپنے ماضی کے ساتھ رشتہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جاتا ہے، حتیٰ کہ عین بڑھاپے میں جب انسان اپنے مستقبل سے بالکل مایوس ہو چکا ہوتو پھر انسان کا زیادہ وقت اپنے ماضی کے ساتھ گزرنے لگتا ہے۔ پھر سارا دن بیٹھ کر اپنے ہی ماضی کا تجزیہ کیا جاتا ہے، اپنی ہی اچھائیوں اور برائیوں کی فہرستیں تیار ہوتی ہیں۔ ماضی میں لیے گئے فیصلوں کو ایک بار پھر سے جانچا اور پرکھا جاتا ہے۔

ہمارا اپنے ماضی کے ساتھ رشتہ بھی کچھ عجیب سا ہوتا ہے۔ ماضی کی کچھ تلخ یادیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن سے ہم نظریں چرا کر، کنی کترا کر بس گزر جانا چاہتے ہیں۔۔۔لیکن وہ بار بار سامنے آتی ہیں۔

کچھ غلطیاں ہم بھول جانا چاہتے ہیں، مگر بڑھتی عمر کے باوجود اپنے ماضی کے معاملے میں انسان کا حافظہ ہمیشہ اچھا ہی رہتا ہے۔

ماضی کے کچھ لمحات میں واپس جانے کو جی چاہتا ہے۔ کچھ چیزوں کو ہم پھر سے محسوس کرنا چاہتے ہیں، زندگی کے کچھ پل دوبارہ سے جینے کی خواہش ہوتی ہے۔

تنہائی میں لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دینے والی ہماری اپنی ہی کچھ بیوقوفیاں، کچھ حماقتیں اور شرارتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جنہیں ہم دہرانا چاہتے ہیں، مگر۔۔۔۔۔اس وقت نے کب کسی کو مہلت دی ہے۔

کچھ لمحات کی طرح کچھ جگہیں بھی خاص ہوتی ہیں۔ کچھ راستوں پر چلتے ہوئے دل کی دھڑکن بڑھ بھی جایا کرتی ہے، سانسیں منتشر ہو جاتی ہیں۔

کچھ لوگ، کچھ رشتے ہمیں زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔

محفل میں کسی پرانے دوست کے ساتھ اچانک ٹاکرا لبوں پر ایک الوہی مسکراہٹ بکھیر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ماضی کے کسی کردار کے ساتھ اپنے اور اس کے مشترکہ ماضی کو زیرِ بحث لانا، ڈھلتی عمر میں انسان کے محبوب ترین مشاغل میں سے ایک ہوتا ہے۔

کبھی کبھار انسان خود اپنے ہی ساتھ زندگی بسر کر کر کے بھی تھک جاتا ہے۔ کبھی کبھار ہمیں خود اپنے آپ سے بھی فرار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے میں کوئی پرانا دوست، جس کے ساتھ ایک قلبی تعلق بھی ہو، انسان کی ضرورت بن جاتا ہے۔ کسی پرانے کے ساتھ پرانی ہی باتیں کر کے جانے ہر بار ایک نیا حظ کیسے حاصل ہو جاتا ہے؟

ہر انسان کا ایک ماضی ہوتا ہے اور اس ماضی سے جڑی لاکھوں کروڑوں یادیں۔

ہماری زندگی کا ہر ہر لمحہ ہمارے اپنے اندر محفوظ ہوتا ہے اور پھر وقت بے وقت یادوں کے اس ''کولڈ سٹوریج'' سے چیزیں برآمد ہوتی رہتی ہیں، اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

آپ کے ماضی کو محض ایک آپ ہی جانتے ہیں۔ آپ کے ماضی کے کس پل، کس واقعہ کے ساتھ آپ کی کون سی یادیں وابستہ ہیں؟

ان یادوں کے آنے جانے سے آپ کے اندر کون کون سے جذبات متحرک ہوتے ہیں؟

آپ کے احساسات پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں؟

یہ باتیں بس اکیلے آپ جانتے ہیں۔ آپ کے ماضی میں آپ کے سوا کسی اور شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی۔

آج آپ کو آپ بنا دینے والی چیزوں میں سے ایک بہت اہم چیز آپ کی یادداشت ہے۔

آپ کی یادداشت ہی آپ ہیں۔

خیالات، احساسات، جذبات اور یادداشت / یادیں۔۔۔۔۔ یہ چاروں چیزیں نہ صرف آپس میں ایک گہرا ربط اور تعلق رکھتی ہیں، بلکہ یہ ایک ہی چیز یعنی شعور کے چار مختلف پہلو ہیں۔ یہ چاروں چیزیں مل کر آپ کے اندر ایک الگ ہی دنیا قائم کر دیتی ہیں۔ ایک ایسی دنیا جس میں آپ کے سوا کسی بھی اور شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ملتی۔ کوئی بھی اور شخص آپ کے اندر کی اس دنیا کے حالات نہیں جان سکتا اور۔۔۔

اور اگر کہیں آپ کی یہ دنیا صرف آپ کی دنیا نہ رہے، اگر آپ کی اس دنیا کی خبریں باہر نشر ہونا شروع ہو جائیں، اگر آپ کے خیالات، احساسات، جذبات اور یادداشت تک دیگر لوگوں کو بھی بالکل آپ کی مانند رسائی حاصل ہو جائے تو۔۔۔ ذرا تصور کیجیے۔۔۔ پھر کیا ہوگا۔۔۔

فرض کیجیے۔۔۔ آپ ایک چھوٹے سے مالیاتی ادارے میں مینیجر کے عہدے پر فائز ہیں اور اس وقت آپ اپنے ادارے کی جانب سے منعقد کی گئی ایک غیر رسمی تقریب میں شامل ہیں۔ اس تقریب میں آپ سمیت ادارے کے سو (100) ملازم موجود ہیں۔ اب یہ سو افراد ایک ہی جگہ یہ ملازمت کرتے ہیں اور اس وقت ایک ہی چھت تلے، ایک ہی ہال میں موجود ہیں۔ اس تقریب کے دوران ان تمام افراد کو تقریباً ایک جیسا ماحول ملے گا، مگر۔۔۔۔۔ اس تقریب کو ہر فرد اپنے ہی نقطۂ نظر سے دیکھ رہا ہوگا اور پھر کسی بھی دو افراد کا یہ نقطۂ نظر صد فیصد ایک جیسا نہیں ہوگا۔

اس تقریب میں موجود یہ 100 افراد محض 100 افراد نہیں ہیں، بلکہ یہ 100 مختلف قسم کی کائناتیں ہیں، جو ایک چھت تلے اکٹھی ہو چکی ہیں۔ بالکل قریب قریب ہونے کے باوجود ہر انسان کے اندر کی دنیا کے حالات دوسروں کے اندر کی دنیا کے حالات سے یکسر مختلف ہوں گے۔

یہ صرف 100 اشخاص نہیں ہیں، بلکہ یہ تو 100 مختلف قسم کے ماضی ہیں، جو اس وقت ایک ہی جگہ پر موجود ہیں۔ ہر شخص کا ماضی دوسروں کے ماضی سے مختلف ہے۔ ہر شخص کی یادیں دوسروں کی یادوں سے جدا ہیں۔ ہر فرد کے احساسات اور جذبات منفرد ہیں۔ یہ محض 100 انسان نہیں ہیں، بلکہ یہ تو 100 بالکل مختلف قسم کے خیالات ہیں، جو ایک چھت تلے جمع ہو چکے ہیں۔ ان 100 افراد میں سے ہر فرد کے اندر ایک بالکل مختلف دنیا آباد ہے اور پھر۔۔۔۔۔ان میں سے ہر فرد اپنے سوا باقی تمام افراد کے اندر کی اس دنیا سے مکمل بے خبر ہے۔

ایک ہی میز پر مسکرا مسکرا کر ایک ہی موضوع پر باتیں کرنے والے آٹھ افراد میں سے کس کے احساسات کیا ہیں؟۔۔۔۔۔کس کے اندر کی جذباتی کیفیات کیا ہیں؟

ان آٹھوں میں سے کس کا ماضی کیسا ہے؟

کون اس وقت کیا سوچ رہا ہے؟۔۔۔۔۔کس قسم کا سوچ رہا ہے؟

یہ تمام باتیں ہر انسان بس صرف اپنے بارے میں ہی جان سکتا ہے۔ کسی بھی دوسرے انسان کے اندر کے حالات جاننا ناممکن ہے، مگر یہ ناممکن اب آپ کے لیے ناممکن نہیں رہا ہے۔

فرض کیجیے۔۔۔۔۔چند لمحات کے لیے فرض کیجیے کہ آپ کے پاس کوئی ایسی مشین موجود ہے، جس کی مدد سے آپ دیگر تمام 99 افراد کے شعور تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں، یعنی۔۔۔

یعنی دیگر 99 افراد کے ماضی کے ہر ہر لمحے میں جھانکنا اب آپ کے لیے بھی بالکل ایسے ہی ممکن ہے، جیسے کسی بھی فرد کے لیے خود اپنے ماضی میں جھانکنا۔ دیگر 99 افراد کے خیالات اب آپ کے اپنے خیالات ہیں اور اب آپ باقی تمام افراد کے احساسات اور جذبات کو بھی بالکل انہی افراد کی مانند محسوس کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔ذرا تصور کیجیے کہ ان حالات میں کیا ہوگا؟

کیسے کیسے پردے ختم ہو جائیں گے۔۔۔۔۔کیا کیا راز عیاں ہوں گے۔

کون سا ایسا فساد ہے، جو محض ان چند لمحات میں ہی برپا نہ ہو جائے گا؟

شاید ہم انسانوں کی بہتری اسی میں ہے کہ ہم دوسرے انسانوں کے اندر کی اس دنیا میں تانکا جھانکی نہ کریں۔ کچھ رازوں کے راز رہ جانے میں ہی بہتری ہے۔ کچھ پردے بہت ضروری ہوتے ہیں۔

کچھ مناظر دور سے زیادہ دلفریب دکھائی دیتے ہیں اور پھر۔۔۔

کچھ چیزیں تو حجاب میں ہی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔

بہر حال میں ایک ذی شعور انسان ہوں۔ میں ہر لمحہ بہت ساری چیزوں کو محسوس کر رہا ہوتا ہوں۔ کبھی مجھے درد کا احساس ہوتا ہے تو کبھی بھوک تنگ کرنے لگتی ہے۔ کبھی من ہی من میں گدگدی ہونے لگتی ہے تو کبھی بدن پر ہونے والی کھجلی چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ کچھ احساسات مجھے اچھے لگتے ہیں تو کچھ احساسات میرے اعصاب پر بُرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ درجنوں قسم کے جذبات میرے اندر سر ابھارتے رہتے ہیں، میرے اندر ہلچل کیے رکھتے ہیں۔ اپنے اردگرد موجود کچھ لوگوں سے اگر مجھے محبت ہے تو کچھ لوگ بس ٹھیک ہی ہیں۔

کبھی میرے اندر خوف کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے تو کبھی غصے سے بدن کپکپانے لگتا ہے۔ ایک آواز ہر وقت میرے اندر شور مچائے رکھتی ہے۔ یہی ایک آواز کبھی میری اماں بن کر مجھے نصیحتیں کرنا شروع کر دیتی ہے تو کبھی ابا بن کر ڈانٹ ڈپٹ بھی کر جاتی ہے۔

پھر میرا ایک ماضی بھی تو ہے۔ میرے اندر ہر وقت یادوں کے بلبلے بنتے اور بکھرتے رہتے ہیں۔ ایک ہی جگہ بے حس و حرکت بیٹھ کر بھی ماضی اور مستقبل میں آنا جانا لگا رہتا ہے۔

میرے اندر ایک دنیا، ایک الگ ہی دنیا ہر وقت آباد رہتی ہے۔

میرے اندر کی اس دنیا کی وجہ سے اگر میری تنہائیوں میں محفلیں سجتی ہیں تو مجھے محفلوں میں تنہائیاں بھی نصیب ہوتی ہیں۔

میرے خیالات، احساسات، جذبات اور یادداشت۔۔۔۔۔ یہ چاروں چیزیں مل کر میری اس دنیا کو مکمل کرتی ہیں۔ یہ چاروں چیزیں مل کر مجھے ''میں'' بناتی ہیں۔

ان کی موجودگی ہی میری موجودگی ہے۔۔۔۔۔اور ان کا خاتمہ ہی میرا خاتمہ۔

اگر عبداللہ سے عبداللہ کی یادداشت چھن جائے تو عبداللہ آدھا رہ جائے گا۔عبداللہ کے اندر سے اگر احساسات اور جذبات بھی نکال دیے جائیں تو پہلے سے ہی آدھا عبداللہ مزید آدھا ہو جائے گا اور اگر کہیں عبداللہ سے عبداللہ کے خیالات بھی چھن گئے تو۔۔۔

عبداللہ کی دنیا تباہ ہو جائے گی۔

عبداللہ ختم ہو جائے گا۔۔۔۔۔عبداللہ کا سب کچھ ختم ہو جائے گا۔

عبداللہ مر جائے گا۔

اور۔۔۔۔۔اور ایک بات بتاؤں؟

ہر روز، ہر روز عبداللہ ختم ہوجاتا ہے۔۔۔۔۔ ہر روز عبداللہ کی دنیا تباہ ہوجاتی ہے۔

ہر روز عبداللہ مرتا ہے۔۔۔۔۔اور ہر روز عبداللہ ایک بار پھر سے جی اٹھتا ہے۔

ہر رات نیند کی شکل میں عبداللہ کو موت آلیتی ہے۔

ہر صبح عبداللہ کو ایک نئی زندگی مل جاتی ہے۔

نیند کے دوران۔۔۔

گدگدی، کھجلی، تکلیف یا پھر بھوک۔۔۔میرے ہر قسم کے احساسات ختم ہوجاتے ہیں۔

محبت، نفرت، غصہ یا پھر خوف۔۔۔میرے ہر قسم کے جذبات بھی خاموشی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

میری یادداشت کہیں کھو جاتی ہے۔میرا ماضی مجھ سے چھین لیا جاتا ہے اور پھر میرے اندر ہر وقت شور مچائے رکھنے والی آواز۔۔۔

نیند کے دوران یہ آواز بھی تو چپ، بالکل چپ ہوجاتی ہے۔

نیند کے دوران میرا شعور ختم ہوجاتا ہے۔۔۔۔۔میرا سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔

میں اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے ناآشنا ہوجاتا ہوں۔

میں ختم ہوجاتا ہوں۔۔۔۔۔میں مرجاتا ہوں۔

یوں جیسے عبداللہ کبھی تھا ہی نہیں۔

ختم۔۔۔۔۔سب ختم۔۔۔۔۔سب کچھ ختم۔

نیند فطرت کے رازوں میں سے ایک بہت بڑا راز ہے۔

ہم انسان اپنی زندگیوں کا تقریباً ایک تہائی حصہ سو کر گزارتے ہیں۔ ہر چند گھنٹوں بعد ہمیں نیند کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے۔ایک خاص حد سے زیادہ جاگنا ہمارے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ہم انسان اپنی ساری زندگی مسلسل جاگ کر نہیں گزار سکتے ہیں۔نیند ہماری ضرورت ہے اور ہماری مجبوری بھی مگر۔۔۔۔۔ یہ نیند آخر ہے کیا چیز؟

نیند کے دوران بھی ہمارا جسم تو بالکل ویسے کا ویسا ہی موجود ہوتا ہے۔ ہمارے جسم میں تو کسی قسم کی کوئی بھی کمی واقع نہیں ہوتی ہے۔پھر نیند کے دوران ہمارا شعور ختم کیسے ہوجاتا ہے؟

نیند کے دوران بھی ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں، کروٹیں بدل رہے ہوتے ہیں۔ نیند کے دوران کوئی خراٹے لے رہا ہوتا ہے تو کوئی اپنے ہی بدن پر کھجلی کر رہا ہوتا ہے، حتیٰ کہ کچھ لوگوں کو

نیند کے دوران بولنے کی عادت بھی ہوتی ہے اور پھر کچھ لوگ تو سوتے سوتے چہل قدمی بھی کر آتے ہیں، مگر یہ تمام افعال (Actions) خودکار طریقے سے ہو رہے ہوتے ہیں۔

سانس، کروٹیں، کھجلی، چہل قدمی یا پھر گپ شپ۔۔۔۔۔ نیند کے دوران کیے جانے والے ان تمام افعال کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ سونے والا شخص اپنے ان تمام افعال سے لاعلم اور بے خبر ہی رہتا ہے۔ جو کام جاگتے وقت انسان شعوری طور پر کر رہا ہوتا ہے، نیند کے دوران وہی کام لاشعوری طور پر ہو رہے ہوتے ہیں۔ نیند کے دوران ہمارا یہ جسم ایک خودکار بائیولوجیکل مشین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ایک ایسی مشین جسے خود اپنی ہی کی جانے والی حرکات کا کچھ علم نہیں ہوتا۔

ہر قسم کے خیالات، احساسات، جذبات اور یادوں سے عاری۔۔۔۔۔ ایک مشین۔

یہ نیند آخر کیا چیز ہے؟

ہر روز میں مر کیوں جاتا ہوں اور ہر صبح ایک بار پھر سے جی کیسے اٹھتا ہوں؟

اگر نیند کا مقصد محض جسم کی تھکاوٹ دور کرنا ہی ہے تو یہ مقصد سوئے بِنا ہی، بس بے حس و حرکت لیٹ کر بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہ خاص قسم کی موت والی نیند، یہ بِنا شعور والی نیند ہی ہماری ضرورت کیوں ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ ان تمام سوالوں کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش میں سے کوئی نہیں جانتا ہے کہ ہمیں نیند کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔ ہماری زندگیوں کا ایک تہائی حصہ نگل جانے والی نیند ہمارے لیے ایک بالکل اجنبی چیز ہے اور پھر بات ادھر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ شاید آپ کے لیے یہ چیز حیرانی کا سبب ہو، مگر یہ حقیقت ہے کہ نہ صرف شعور بلکہ شعور سے متعلق دیگر تمام چیزوں کا علم بھی ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر ہے۔

شعور ہماری زندگیوں کا ایک بے حد اہم حصہ ہے، ہماری زندگی ہے۔ ہماری بالکل اپنی سی چیز ہونے کے باوجود شعور کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے ہیں۔ شعور کی پہیلی کو حل کرنا تو بہت دور کی بات ہے، ہمارے پاس تو ہمارے شعوری تجربات (Conscious Experiences) کو بیان کرنے کے لیے مناسب الفاظ بھی موجود نہیں ہیں۔

آپ بچپن سے ہی سرخ رنگ سے آشنا ہوں گے۔ سرخ رنگ کو دیگر رنگوں سے ممتاز کرنا آپ کے لیے کبھی دشوار ثابت نہ ہوا ہو گا۔

کیا آپ کسی پیدائشی اندھے انسان کو سرخ رنگ کی کیفیات سمجھا سکتے ہیں؟

شاید آپ روزانہ ہی چائے پیتے ہوں گے، چائے کے ذائقے کو محسوس کرتے ہوں گے۔

چائے کے جس ذائقے کو آپ اپنی زبان پر محسوس کرتے ہیں، کیا آپ اس ذائقے کو الفاظ میں بیان کر سکتے ہیں؟

کیا مٹی کی خوشبو کو الفاظ دیے جا سکتے ہیں؟

آپ کے خیالات، احساسات، جذبات اور یادوں کو کوئی بھی دوسرا انسان نہیں جان سکتا، لیکن اگر آپ خود بھی اپنے ان شعوری تجربات کو الفاظ میں بیان کرنا چاہیں گے تو نہیں کر سکیں گے۔ جو چیز آپ اپنے اندر محسوس کر رہے ہوتے ہیں، اس چیز کو بالکل اپنے احساسات کے مطابق بیان کرنا ایک ناممکن سی بات ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ پھر ان شعوری تجربات کا ٹھیک ٹھیک موازنہ کرنا بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔

آئس کریم کا ذائقہ چائے اور کافی کے ذائقے سے مختلف ہوتا ہے، بہت مختلف ہوتا ہے۔

کیا آپ اس فرق کو بیان کر سکتے ہیں؟

شعور ایک مشکل ترین پہیلی ہے۔ ایک سمجھ نہ آنے والا معمّہ ہے۔ صدیوں کی بھاگ دوڑ کے باوجود صاحبانِ علم و دانش شعور کے اس مسئلے کو حل کرنے میں ناکام ہیں، مسلسل ناکام ہیں اور مسئلہ یہ تو نہیں ہے کہ شعور کے بارے میں ہمارا علم نہ ہونے کے برابر ہے، بلکہ مسئلہ تو یہ ہے کہ اس مادی کائنات میں جذبات، احساسات اور خیالات جیسی غیر مادی چیزیں کیسے پائی جاتی ہیں؟

Why there exist consciousness at all?

اس کائنات میں شعور کا پایا جانا ہی سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

پریشانی والی بات یہ نہیں ہے کہ نیند کے دوران مَیں مر کیوں جاتا ہوں۔ سوچنے والی بات تو یہ ہے کہ ہر صبح مجھے، ایک مردہ شخص کو نئی زندگی کیسے مل جاتی ہے؟ پہیلی یہ نہیں ہے کہ نیند کے دوران میرا شعور ختم کیسے ہو جاتا ہے۔ حقیقی پہیلی تو یہ ہے کہ جاگتے ہوئے میرے اندر شعور کس طرح سے پیدا ہو جاتا ہے؟

سوال یہ بھی نہیں ہے کہ نیند کے دوران انسان ایک بائیولوجیکل مشین اور خودکار روبوٹ میں تبدیل کیسے ہو جاتا ہے۔ اصل سوال تو یہ بنتا ہے کہ نیند سے جاگ کر ایک خودکار روبوٹ انسان کیسے بن جاتا ہے؟

ایک بائیولوجیکل مشین میں احساسات، خیالات اور جذبات کیسے پیدا ہونا شروع ہو جاتے ہیں؟

نیند کے دوران خود سے اور اپنے ماحول سے ناآشنا جسم جاگتے ہوئے اپنے ماحول سے آشنائی کیسے حاصل کر لیتا ہے؟ اس جسم میں ایک ''میں'' کیسے پیدا ہو جاتی ہے؟

ہمارا یہ جسم ایک مشین کی طرح کام کرتا ہے، جبکہ ہمارا دماغ کسی سپر کمپیوٹر کی مانند ہوتا ہے۔ ہمارے جسم میں ہونے والے تمام افعال کا نگران اور ذمہ دار ہمارا دماغ ہے۔

جسم کا کس وقت کیا درجہ حرارت ہو گا؟ بلڈ پریشر کتنا ہونا چاہیے؟ جسم میں موجود درجنوں ہارمونز میں سے کس ہارمون کی، کس وقت، کتنی مقدار جسم میں موجود ہونی چاہیے؟

یہ سب اور ایسے ہی مزید لاتعداد افعال ہیں، جو ہمارے جسم میں ہر وقت ہو رہے ہوتے ہیں اور ان تمام افعال کا نگران ہمارا دماغ ہوتا ہے۔ہمیں تو یہ معلوم بھی نہیں ہوتا کہ ہمارا دماغ خود بخود کیا کیا کام کیے جا رہا ہوتا ہے اور یہاں تک کوئی بھی ایسا مسئلہ نہیں ہے، جو ہماری سمجھ سے بالاتر ہو۔ انسانوں کے بنائے ہوئے کمپیوٹر بھی بیک وقت بہت سارے کام سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

پہیلی تو اس وقت الجھتی ہے جب ہمارے اس مشین جیسے جسم اور کمپیوٹر جیسے دماغ میں خیالات، احساسات اور جذبات جنم لینا شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارے جسم پر چوٹ لگتی ہے تو ہمیں درد کا احساس ہوتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں درد ہو رہا ہے۔

ایک مشین اور کمپیوٹر میں آخر یہ درد کا احساس کہاں سے آن ٹپکتا ہے؟

ہمارے موبائل یا لیپ ٹاپ جب اچانک سے گرتے ہیں تو۔۔۔۔۔کیا انہیں بھی درد محسوس ہوتا ہے؟

کیا کمپیوٹرز کے اندر بھی خیالات ایک آواز کی شکل میں گونجتے رہتے ہیں؟

کیا یہ مشینیں بھی چوٹ لگنے سے، ٹوٹ جانے سے ڈرتی ہیں؟

اگر نہیں تو پھر۔۔۔

ہمارے اندر ڈر کا احساس کیسے پیدا ہو جاتا ہے؟

ہم انسان ایک دوسرے سے محبت کیوں کرتے ہیں؟ کچھ راستوں پر چلتے ہوئے ہمارے دل کی دھڑکن بڑھ کیوں جاتی ہے؟

کچھ لوگ ہمیں اچھے کیوں لگتے ہیں؟

آخر یہ خیالات، احساسات اور جذبات ایک انسان میں پائے ہی کیوں جاتے ہیں؟

میں اور آپ۔۔۔

یہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز۔۔۔

ہر وہ چیز جسے ہم کسی بھی طرح دیکھ سکتے ہیں یا براہِ راست محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ زمین، درخت، ستارے اور بلی۔۔۔ وہ چاند، کمپیوٹر، کہکشاں اور کتا۔

یہ چار سطروں پر مشتمل ''نظم''۔۔۔۔۔میری دو صدیوں میں منقسم زندگی کی پہلی نظم ہے۔

اور۔۔۔

آپ پریشان مت ہوں۔۔۔۔۔آخری بھی یہی ہے۔

یہ ایک آزاد نظم ہے۔۔۔۔۔۔یہ ایک بہت آزاد نظم ہے۔

بھلے ہی یہ نظم ردیف، قافیہ اور شاعری کے دیگر تمام قواعد وضوابط سے مکمل طور پر آزاد ہے، مگر اس نظم میں کچھ خاص ہے۔۔۔۔۔۔کچھ بہت خاص ہے۔

اس نظم کی چار سطروں میں چار بے حد اہم سوال چھپے ہوئے ہیں۔ ❶

چار ایسے سوال جن کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش اور تمام سیانے لوگ تقریباً پاگل ہو چکے ہیں۔اس نظم کو محض ایک نظم نہ سمجھیں، بلکہ یہ نظم تو وہ طوطا ہے، جس میں اس دنیا کے سبھی سیانوں کی جان قید ہے۔

اگر آپ میری اس نظم میں چھپے چار سوال ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں تو۔۔۔

یہ نظم اور اس کے جملہ حقوق۔۔۔

سب آپ کے نام۔

یا چلیں۔۔۔

میں آپ کی کچھ مدد کرتا ہوں۔سوال میں بتا دیتا ہوں۔آپ بس ان چار سوالوں کو اور پھر ان چاروں سوالوں کا آپس میں جو ربط ہے۔۔۔

ان دونوں چیزوں کو سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔

ٹھیک ہے؟؟؟

چلیں پھر شروع کرتے ہیں۔۔۔

سوال نمبر 1:

ایک بار پھر سے میری اس آزاد نظم کو پڑھیں اور اب خود سے ایک سوال پوچھیں۔۔۔

یہ کائنات اور اس میں موجود تمام چیزیں۔۔۔۔۔یہ سب کچھ آخر کیوں موجود ہے؟

Why there exist anything at all?

---

❶ شاید یہ چار سوال اور ان سے منسلک ذیلی سوالات کچھ قارئین کے لیے پریشانی کا سبب بنیں، مگر آپ سے التماس یہی ہے کہ ان سوالوں کو اور ان کے آپس کے ربط کو سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ان سوالوں پر کتاب کے حصّہ دوم میں پھر سے بات کی جائے گی اور محض یہی نہیں، اس کتاب کے حصّہ اوّل میں زیرِ بحث آنے والے تمام موضوعات پر، تمام سوالات پر حصّہ دوم میں دوبارہ سے بات کی جائے گی۔مگر۔۔۔ایک مختلف انداز میں۔

سوال نمبر 2:

میں اور آپ ۔۔۔

یہ زمین، درخت، ستارے اور بلی ۔۔۔۔۔ وہ چاند، کمپیوٹر، کہکشاں اور کتا۔

یہ کل ملا کر دس چیزیں بنتی ہیں اور ان تمام دس چیزوں میں ایک چیز مشترک ہے۔ یہ تمام چیزیں ایٹمز سے مل کر بنی ہیں، یہ تمام چیزیں ایٹمز ہی ہیں۔

مگر ان دس میں سے پانچ چیزیں جاندار ہیں اور پانچ بے جان۔

ایسا کیوں؟

اس کائنات میں تمام چیزیں بے جان ہی کیوں نہیں ہیں؟

لہٰذا ہمارا دوسرا سوال ۔۔۔

اس بے جان ایٹمز والی کائنات میں زندگی کا آغاز کیسے ہو گیا؟

How life emerged in the universe?

سوال نمبر 3:

میں اور آپ ۔۔۔

یہ زمین، درخت، ستارے اور بلی ۔۔۔۔۔ وہ چاند، کمپیوٹر، کہکشاں اور کتا۔

اگر ان تمام دس چیزوں کو ایک زوردار قسم کی ''باریک چٹکی'' کاٹی جائے تو کیا ہو گا؟

ان دس میں سے آخری آٹھ کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل ہے، تقریباً ناممکن ہے۔ البتہ پہلی دو چیزیں، یعنی میں اور آپ ۔۔۔

اگر میرے یا آپ کے ایک زوردار قسم کی چٹکی کاٹی جائے تو ہمیں درد کا احساس ہو گا اور اگر زوردار قسم کی ''باریک چٹکی'' کاٹی جائے گی تو درد کا یہ احساس شدید ہو گا اور پھر محض یہی نہیں، ہمارے اندر خیالات اور جذبات بھی پائے جاتے ہیں۔ ہم دونوں باشعور ہستیاں ہیں۔

میں اور آپ ایٹمز کی شکل میں اس لامحدود کائنات کا ایک بہت چھوٹا سا حصہ تو ہیں ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرے اور آپ کے اندر ایک بالکل مختلف قسم کی دنیا بھی آباد رہتی ہے۔

اس پس منظر میں ہمارا تیسرا سوال کچھ یوں ہو گا ۔۔۔

اس بے جان ایٹمز والی کائنات میں شعور کیسے پیدا ہو گیا؟

How consciousness emerged in the universe?

سوال نمبر 4:

میں اور آپ۔۔۔

یہ زمین، درخت، ستارے اور بلی۔۔۔۔۔وہ چاند، کمپیوٹر، کہکشاں اور کتا۔

یہ تمام چیزیں ایٹمز سے مل کر بنی ہیں، یہ تمام چیزیں ایٹمز ہی ہیں۔ ہماری اس کائنات میں بس ہرسو ایٹمز ہی ایٹمز ہیں اور قابلِ مشاہدہ کائنات میں ان ایٹمز کی تعداد 10^78 کے آس پاس ہوسکتی ہے۔

اب تک ایٹمز کی کچھ خاص قسم کی حرکات تو یقیناً آپ کو یاد ہو چکی ہوں گی۔ ایٹم کی اس چھوٹی دنیا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ذی شعور ہستی جب ان ایٹمز کو Observe کر رہی ہو تو یہ اپنا چال چلن بدل لیتے ہیں۔ اگر آپ الیکٹرونز کی جانب نہیں دیکھ رہے تو یہ بیک وقت بہت ساری جگہوں پر موجود ہوگا، لیکن جیسے ہی آپ ان الیکٹرونز کی جانب دیکھیں گے تو یہ فوراً سے آپ کو دھوکا دینے کے لیے صرف ایک ہی مخصوص جگہ پر جامد ہو جائے گا۔

مگر کیوں؟ اور کیسے؟۔۔۔۔۔آخر یہ سب کیسے ممکن ہے؟

میرے یا آپ کے جیسی کوئی ذی شعور ہستی جب ان الیکٹرونز کی جانب دیکھتی ہے تو یہ اپنا چال چلن کیوں بدل لیتے ہیں؟۔۔۔۔۔کیسے بدل لیتے ہیں؟

ہمارے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے الیکٹرونز کی حرکت کا کیا تعلق ہے؟ پھر ہمارے اردگرد موجود تمام چیزیں بھی تو ایٹمز ہی ہیں، حتیٰ کہ ہم انسان بھی تو ایٹمز سے مل کر ہی بنے ہیں۔ تو کیا جب میں اپنے کمرے میں بالکل سامنے ہی بیٹھے اپنے دوست کی جانب نہیں دیکھ رہا ہوتا۔۔۔میرا یہ دوست میرے پاس موجود نہیں ہوتا؟

پھر میں خود بھی تو ایٹمز ہوں۔ مجھ میں اور میرے شعور میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ جیسے ہی میں الیکٹرونز کی جانب دیکھتا ہوں تو یہ اپنا چال چلن بدل لیتے ہیں؟۔۔۔۔۔کیا میں اس تمام مادی کائنات میں کچھ خاص ہوں؟۔۔۔۔۔کیا میری نظر میں کوئی خاص چیز موجود ہے؟

لیکن کیا چیز؟۔۔۔۔۔کیوں؟۔۔۔۔۔اور کیسے؟

اگر میں اسی مادی کائنات کا ایک حصہ ہوں تو میرے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے اس کائنات میں کوئی تبدیلی نہیں ہونی چاہیے اور اگر میں اس کائنات کا حصہ نہیں ہوں تو پھر۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

ستاروں، کہکشاؤں اور سیاروں سے بنی ایک لامحدود کائنات میری ذات کے باہر موجود ہے، جبکہ احساسات، جذبات، خیالات اور یادوں سے بنی ایک کائنات، ایک مکمل کائنات

میرے اپنے ہی وجود کے اندر موجود ہے۔ ان دونوں کائناتوں کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

کیا میں اپنی ذات سے باہر موجود مادی کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوں؟

یا پھر میری ذات سے باہر موجود یہ تمام مادی کائنات بھی میرے اندر، میرے اپنے ہی اندر موجود ہے؟

بالکل ایسے ہی جیسے خوابوں میں نظر آنے والی دنیا حقیقت میں کہیں بھی موجود نہیں ہوتی ہے۔ وہ دنیا محض میرے شعور کا ایک حصہ ہوتی ہے۔

تو کیا۔۔۔۔۔ یہ مادی کائنات بھی میرے شعور کا ایک حصہ ہے؟

یا پھر۔۔۔۔۔ میں ایٹمز سے بنی اس لامحدود کائنات کا ایک چھوٹا سا حصہ ہوں؟

اور اب ہمارا چوتھا اور آخری سوال کچھ یوں ہوگا:

اس مادی کائنات کا میرے اندر موجود دنیا سے، میرے شعور کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

What is the relationship between consciousness and the universe?

میں اور آپ۔۔۔

یہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز۔۔۔

ہر وہ چیز جسے ہم کسی بھی طرح دیکھ سکتے ہیں یا براہِ راست محسوس کر سکتے ہیں۔

یہ زمین، درخت، ستارے اور بلی۔۔۔ وہ چاند، کمپیوٹر، کہکشاں اور کتا۔

اگر تو آپ میری اس ''آزاد نظم'' میں پوشیدہ چاروں سوال اور ان چاروں سوالوں کا آپس میں ربط اور تعلق، دونوں چیزیں ہی سمجھ چکے ہیں تو مبارک ہو! نہ صرف میری اس آزاد نظم کے تمام حقوق آپ کے نام ہوئے، بلکہ اس دنیا کے سبھی سیانوں کی جان بھی آپ کے قبضے میں آ چکی ہے، کیونکہ یہ چار وہ سوال ہیں جن کا کوئی بھی حتمی جواب اس دنیا کے کسی بھی سیانے کے پاس نہیں ہے۔

سوال نمبر تین اور چار کا جواب ڈھونڈنا تو بہت دور۔۔۔ ابھی تک ہمیں یہ بات ہی سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر ٹھیک ٹھیک سوال بنتا کیا ہے۔ البتہ پہلے دونوں سوالوں کو سمجھنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہے۔

اگرچہ ان چار سوالوں کا کوئی بھی ٹھیک ٹھیک جواب ہمارے پاس نہیں ہے، مگر انسانی علم میں ان سوالوں کے بارے میں کافی ساری آراء اور نظریات ضرور پائے جاتے ہیں۔ ایسے ہی کچھ نظریات، کچھ آراء پیشِ خدمت ہیں:

سائنس کے آج تک کے بہترین نظریات کے مطابق کائنات کا آغاز آج سے

13.8 ارب سال پہلے Big Bang کی شکل میں ہوا تھا۔ یہ کائنات اور اس میں موجود تمام چیزیں اگر اپنا وجود رکھتی ہیں تو اس کی وجہ محض یہی ہے کہ آج سے 13.8 ارب سال پہلے ایک بہت بڑا دھماکہ Big Bang ہوا تھا۔اس کائنات کے آغاز کے بارے میں یہ انسانی علم کی انتہا ہے۔اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے ہیں۔

یہ Big Bang کیسے ہوا؟۔۔۔۔۔کیوں ہوا؟۔۔۔۔۔کس وجہ سے ہوا؟

اس Big Bang سے پہلے بھی کچھ موجود تھا یا نہیں؟

اگر اس Big Bang سے پہلے کچھ بھی موجود نہیں تھا تو۔۔۔

یہ Big Bang کیسے ہو گیا؟

اور اگر اس Big Bang سے پہلے کچھ موجود تھا تو۔۔۔۔۔کیا موجود تھا؟

انسانی علم میں ان سوالوں کا کوئی جواب موجود نہیں ہے اور بنیادی طور پر Big Bang کائنات کی ابتداء کا نظریہ ہے بھی نہیں، بلکہ یہ تو کائنات کے ماضی کا، تاریخ (History) کا ایک نظریہ ہے، لہٰذا ہمیں ہمارے پہلے سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

اپنے دوسرے سوال کی جانب بڑھتے ہیں۔

اس کائنات کا آغاز Big Bang سے ہوا۔ یہ Big Bang کیسے ہوا؟۔۔۔۔۔کیوں ہوا؟

ان باتوں سے قطع نظر۔۔۔۔۔جو بھی ہوا، جیسے بھی ہوا۔۔۔۔۔ایک پوری کائنات وجود میں آ گئی۔اب سوال یہ ہے کہ اس بے جان ایٹمز والی کائنات میں زندگی کیسے اور کیوں پائی جاتی ہے؟

اس کائنات کی ابتداء ہو جانا ایک الگ معمّہ ہے، جبکہ اس بے جان ایٹمز والی کائنات میں زندگی کا پایا جانا ایک بالکل ہی مختلف پہیلی ہے اور اس پہیلی کا بھی ہمارے پاس کوئی حل موجود نہیں ہے۔اگرچہ کائنات میں زندگی کے آغاز کے بارے میں کچھ بھی یقین سے کہنا ناممکن ہے، البتہ زمین پر زندگی کے آغاز کے بارے میں ہمارے پاس کافی سارے نظریات ضرور موجود ہیں اور ایسا ہی ایک نظریہ Abiogenesis بھی ہے۔اس نظریے کے مطابق زمین پر زندگی کا آغاز بے جان چیزوں سے ہوا تھا۔

آج سے تقریباً 4.5 ارب سال پہلے ہمارے سورج کا ایک اور ستارے کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، جس کے نتیجے میں ہماری زمین وجود میں آ گئی۔ابتداء میں یہ زمین ایک آتشی کرّہ تھی۔زمین کے ابتدائی ماحول میں، شدید درجہ حرارت کے زیرِ اثر مختلف قسم کے ایٹمز آپس میں مل کر مالیکیولز بناتے رہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان مالیکیولز کی پیچیدگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

پہلے ایک اتفاق ہوا۔۔۔پھر دوسرا اتفاق ہوا۔۔۔

پھر اتفاقات کا یہ سلسلہ اگلے کروڑوں سالوں تک جاری رہا۔اتفاقات کے اس طویل اور نہ ٹوٹنے والے سلسلے کے سبب زمین پر بے جان ایٹمز سے خودبخود ہی پہلا جاندار، پہلا خلیہ (Cell) پیدا ہو گیا۔

یوں زمین پر پہلے فزکس نے کیمسٹری کو جنم دیا اور پھر۔۔۔

کیمسٹری کی کوکھ سے بائیولوجی برآمد ہو گئی۔

زمین پر خودبخود ہی بے جان ایٹمز کی مدد سے پیدا ہونے والا یہ خلیہ بہت پیچیدہ تھا۔نہ صرف پیچیدہ تھا بلکہ بہت منظّم بھی۔یہ ایک خلیہ اپنے جیسے مزید بہت سارے خلیے پیدا کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔زمین پر اس ایک خلیہ کی پیدائش کے بعد بھی اتفاقات کا یہ سلسلہ رکا نہیں، بلکہ جاری و ساری رہا۔اگلے کئی ارب سال تک اتفاقات کا یہ سلسلہ ایسے منظّم انداز میں آگے سے آگے، آگے سے آگے بڑھتا رہا کہ اسی ایک خلیے نے زمین پر دیگر تمام جانداروں کو بھی جنم دے دیا۔آج ہمیں اپنے اردگرد جتنی بھی جاندار چیزیں نظر آتی ہیں۔۔۔

یہ گدھے، بندر، کتے، سور اور اس دنیا کے سبھی سیانے۔۔۔

یہ سب کے سب اسی ایک خلیے کی پیداوار ہیں۔

چند بے جان ایٹمز کی مدد سے وجود میں آنے والا یہ ایک خلیہ اربوں سالوں کے ارتقاء کے بعد اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ آج یہ خلیہ (انسان) خود اپنے ہی بارے میں تحقیق کرنے لگا ہے۔

آج یہ انسان اپنے اسی جدِامجد خلیے کو پہچاننے لگا ہے۔

بہرحال زمین پر زندگی کی ابتداء کے بارے میں آج ہمارے پاس Abiogenesis کی طرح کی بہت ساری "قیمتی آراء" تو ضرور موجود ہیں، مگر ٹھوس شواہد ناپید ہیں۔کائنات کی ابتداء کی مانند، زمین پر زندگی کا آغاز ہو جانا بھی انسانی علم کے لیے ایک معمّہ ہے، لہٰذا ہمیں ہمارے دوسرے سوال کا جواب بھی نہیں ملے گا۔آگے۔۔۔ہمارے تیسرے سوال کی جانب بڑھتے ہیں۔

کائنات کا آغاز ہوا اور پھر کائنات کے بعد اس زمین پر زندگی کا بھی آغاز ہو گیا۔

جو بھی ہوا، جیسے بھی ہوا۔۔۔۔۔اس بات کو اب ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں، لیکن اب سوال یہ ہے کہ اس مادی کائنات میں شعور کیسے پایا جاتا ہے؟

کائنات کی ابتداء ہو جانا کچھ اور قسم کا مسئلہ ہے۔زمین پر زندگی کی ابتداء ہو جانا ایک الگ کہانی ہے، جبکہ اس مادی کائنات میں شعور کا پایا جانا تو ایک بالکل انہونی بات ہے، ایک ناممکن سی چیز ہے۔اس

مادی کائنات میں غیر مادی چیزیں یعنی خیالات، احساسات اور جذبات کیسے پیدا ہو گئے؟

عقلی اور منطقی اعتبار سے ایک مادی چیز کسی غیر مادی چیز کو جنم نہیں دے سکتی ہے۔ ❶

مثال کے طور پر Dopamine, Serotonin, Oxytocin تین مختلف قسم کے ہارمونز ہیں، جو ہر انسان کے جسم میں پائے جاتے ہیں اور۔۔۔۔۔اگر ہمارے جسم میں ان چھوٹے چھوٹے مادی ذرات، ان ہارمونز کی تعداد بڑھ جائے تو ہم خوشی محسوس کرتے ہیں۔مگر کیسے؟

ارے بھئی! ان چھوٹے چھوٹے ذرات کا میری خوشی کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

یہ ہارمونز مادی چیز ہیں، جبکہ خوشی ایک احساس ہے، غیر مادی چیز ہے۔ایک مادی چیز کسی غیر مادی چیز کو جنم کیسے دے سکتی ہے؟ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے آپ اپنے کمپیوٹر کے ساتھ ایک نیا Keyboard لاکر رکھ دیں تو کمپیوٹر خوشی میں گانا چلا دے یا پھر اگر آپ دھوپ میں کھڑی اپنی گاڑی پر ٹھنڈے پانی کا چھڑکاؤ کریں تو گاڑی خوشی سے ہارن بجانا شروع کر دے۔ بالکل اسی طرح میرے جسم میں اگر چند ذرات کی تعداد بڑھ جائے تو میں خوف، غصہ، خوشی اور غم جیسی چیزیں محسوس کرتا ہوں۔

سننے میں ہی عجیب لگتا ہے ناں؟

بالکل بھٹی کے ''عشق میرج'' کی طرح؟؟؟

بہر حال شعور کی اس پہیلی کا بھی کوئی حل تو ہمارے پاس موجود نہیں ہے، البتہ صاحبانِ علم و دانش ایک رائے یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ شعور کا سارا تعلق انسانی دماغ اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں سے متعلق ہوتا ہے۔شعور بنیادی طور پر انسانی دماغ کے کام کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ہمارا سپر کمپیوٹر جیسا دماغ ہمارے اندر ایک نقلی ''میں'' کو مصنوعی طور پر تخلیق کرتا ہے۔ ہمارے اندر پائے جانے والے تمام خیالات، احساسات اور جذبات بنیادی طور پر ہمارے اسی سپر کمپیوٹر دماغ کی ایک چال ہوتے ہیں۔ دماغ یہ چالیں اس وجہ سے چلتا ہے تاکہ ہمارے جسم کو ایک لمبے عرصے تک زندہ رکھ سکے۔ ہمیں کرنٹ لگتا ہے تو ہمارا دماغ فوراً ہی نقلی تکلیف کے احساسات پیدا کر کے ہمیں اس نقصان دہ ماحول سے دور کرنے کی ایک کوشش کرتا ہے۔انسانی شعور بنیادی طور پر ایک دھوکا ہے، فریب ہے، چال ہے۔

''Consciousness is an illusion''

تو کیا۔۔۔۔۔کیا میں ایک دھوکا ہوں؟

ایک دھوکا۔۔۔۔۔ایک فریب۔۔۔۔۔اور کچھ بھی نہیں؟؟؟

---

❶ مطالعہ کیجیے: Hard Problem of Consciousness, Mind Body Problem

کسی اپنے کو تکلیف میں دیکھ کر میرے سینے میں جو بوجھ بڑھ جاتا ہے، کبھی کبھار جو آنکھیں نم ہوتی ہیں، کیا یہ سب میرے سپر کمپیوٹر دماغ کی ایک چال ہوتی ہے؟

کیا میری محبت، نفرت، غصہ اور خوف؛ سب دکھاوا ہے؟

تکلیف، خوشی، رنج وغم، کیا میرے تمام احساسات بس میرا وہم ہیں؟

کیا میں۔۔۔۔۔کیا میں ایک دھوکا ہوں؟

اور بس؟؟؟

شاید اس دنیا کے سیانے خود اپنے ہی دماغ کی چالوں کا شکار ہو چکے ہیں۔شاید اس دنیا کے سیانوں کی کھوپڑیوں میں موجود سپر کمپیوٹرز وائرس زدہ ہو چکے ہیں اور شاید کچھ وائرس زدہ کمپیوٹر اسی قابل ہوتے ہیں کہ انہیں کثیر المنزلہ عمارت سے نیچے پھینک کر چور چور کر دیا جائے۔

شعور کی وضاحت کے لیے یہ بس ایک ہی رائے نہیں ہے۔ کچھ دیگر دانشوروں کا کہنا ہے کہ انسانی شعور دھوکا نہیں ہے۔انسان کے اندر موجود دنیا حقیقت ہے، جبکہ یہ کائنات ایک سراب ہے، ایک دھوکا ہے۔ کچھ آراء یہ بھی ہیں کہ شعور اور کائنات؛ دونوں حقیقت ہیں اور اس کائنات کا ہر ہر ذرہ کسی نہ کسی درجے میں شعور رکھتا ہے۔اس کائنات میں موجود ہر چیز باشعور ہے۔

سائیکالوجسٹ، نیورالوجسٹ، برین سائنٹسٹ، فلسفی اور ماہرِ طبیعیات۔۔۔

سب اپنے اپنے طریقوں سے شعور کی وضاحت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، سمجھنے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، [1] یعنی۔۔۔۔۔ جتنے منہ۔۔۔۔۔اس سے کچھ زیادہ باتیں۔

شعور کے محض اس ایک مسئلے پر آپ کو لاتعداد آراء مل جائیں گی۔ یہ آراء نہ صرف ایک دوسرے سے مختلف ہیں بلکہ متضاد بھی اور پھر ٹھوس شواہد تو بالکل ہی ناپید ہیں۔ یہ آراء محض آراء ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شعور کو سمجھنے سمجھانے والے یہ تمام حضرات بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں لے رہے ہیں، وگرنہ اس دنیا کے سیانوں میں سے کوئی کچھ نہیں جانتا۔۔۔

کسی کو ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہے کہ۔۔۔

’’میں کون ہوں۔‘‘

---

[1] مطالعہ کیجیے: Materialism, Idealism, Dualism, Nondualism, Panpsychism

باب:8

ڈاکٹر بندر

سُنا ہے انسانی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں !

یہ۔۔۔لامحدود کیا ہوتا ہے؟

یہ لامحدود جو بھی ہوتا ہے، یہ ہماری عقل سے ماوراء ہے، یہ ہمارے فہم سے بالاتر ہے۔

پھر اب کی بار تو ہمیں یہ جاننا بھی نہیں ہے کہ لامحدود کیا ہوتا ہے۔ اب کی بار ہم نے کنویں میں رہنا ہے۔ کنویں سے باہر جانا ہی نہیں ہے۔ اب کی بار تو ہم نے کنویں سے باہر قدم بھی نہیں رکھنا۔ کنویں سے باہر کی دنیا کے حالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔ کنویں میں دبکے رہنے میں عافیت ہے۔

خوابوں کی دنیا بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟

ہوتی ہوگی۔ ہمیں ان مردہ خواہشات سے کیا لینا دینا۔ اب کی بار ہم نے حقیقت پر مبنی باتیں کرنی ہیں۔ اب کی بار تو ہم نے عملی زندگی کے داؤ پیچ سیکھنے ہیں۔

ہوتی ہوگی یہ کائنات لامحدود طور پر بڑی بھی اور چھوٹی بھی۔ ہمیں اس چھوٹی بڑی کائنات سے کیا مطلب؟ اب کی بار تو ہم نے ایک عام آدمی کی دنیا میں رہنا ہے۔

سنا ہے باہر Dark Matter اور Dark Energy گھومتے رہتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کو تو اٹھا کر ہی لے جاتے ہیں۔ اپنی اس عام آدمی کی دنیا میں چھپے رہنے میں عافیت ہے۔

آیئے!

واپس اپنی پناہ گاہ میں چلتے ہیں۔

واپس چھوٹے سے کنویں میں۔۔۔ایک عام آدمی کی دنیا میں۔۔۔ایک عملی زندگی میں۔۔۔

آپ جانتے ہیں محدود کنویں میں، ایک عام آدمی کی دنیا میں، کوئی بھی چیز لامحدود نہیں ہوتی۔ ویسے بھی یہ لامحدود کا تصور بڑی پیچیدہ چیز ہے۔ انسانی ذہن پر گراں گزرتا ہے یہ لفظ۔

اب کی بار چیزوں کو تھوڑا سادہ بناتے ہیں۔
کچھ عام فہم الفاظ میں بات کرتے ہیں۔
لہٰذا۔۔۔
انسانی خواہشات لامحدود نہیں۔۔۔۔۔محدود ہوتی ہیں۔
انسانی خواہشات محدود نہیں۔۔۔۔۔بہت ہی محدود ہوتی ہیں۔
بلکہ۔۔۔۔۔بلکہ انسانی خواہشات ہوتی ہی نہیں ہیں۔
اب ٹھیک ہے؟؟؟
یقین کیجیے چیزوں کو اس سے زیادہ آسان اور اس سے زیادہ سادہ بنانا تو ممکن بھی نہیں ہوگا اور حقیقت یہ ہے کہ انسان میں خواہشات نہیں پائی جاتی ہیں، بلکہ خواہش پائی جاتی ہے۔
ہاں سچ بول رہا ہوں۔ ہر انسان میں محض ایک خواہش پائی جاتی ہے۔ میری، آپ کی اور ہم میں سے ہر انسان کی بس ایک ہی خواہش ہے۔۔۔''میری ہر خواہش پوری ہو''
مگر ستم ظریفی دیکھیے کہ کسی بھی انسان کی محض یہ ایک خواہش ہی پوری نہیں ہو پا رہی، حتیٰ کہ اس دنیا کے سب انسان مل کر بھی کسی ایک شخص کی صرف یہ ایک خواہش پوری نہیں کر سکتے اور۔۔۔
اور شاید آپ کو یقین نہ آئے مگر فطرت میں کامل مساوات پائی جاتی ہے۔
اس دنیا کے 7.8 ارب انسان سب ایک دوسرے کے برابر ہیں۔
ایک جھونپڑی والا اور ایک محل والا؛ سب برابر ہیں۔
حاکم و محکوم میں کامل مساوات پائی جاتی ہے۔
اس دنیا میں موجود ہر شخص کی محض ایک ہی خواہش ہے اور اس دنیا میں موجود کسی ایک بھی شخص کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے۔ سب برابر ہیں۔
سب اپنی اپنی خواہشات کے مارے ہوئے ہیں۔ سب اپنی اپنی خواہشات مار چکے ہیں۔
لیکن شاید ابھی بھی حقیقی دنیا کی صحیح تصویر پیش نہیں ہو رہی۔ ابھی بھی عملی زندگی کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی نہیں ہو پا رہی۔ شاید حقیقت کو تھوڑا اور بڑھانا ہوگا۔
چلیں کنویں کو تھوڑا اور چھوٹا کرتے ہیں۔۔۔۔۔محدود کو تھوڑا اور محدود کرتے ہیں۔
ہر انسان میں پائی جانے والی اس ''ماں'' خواہش کے بطن میں ایک چھوٹی، ایک بہت ہی چھوٹی خواہش پائی جاتی ہے جسے ہم ''بہتر معیارِ زندگی'' کہہ سکتے ہیں۔

اس دنیا میں موجود ہر شخص بہتر معیارِ زندگی (Better Standard of Living) چاہتا ہے اور اگر کسی شخص میں یہ خواہش نہیں پائی جاتی تو اس کا مطلب ہے کہ وہ شخص اپنی اس خواہش کو کچلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ وگرنہ ایک صحت مند انسان میں اس خواہش کا پایا جانا فطری بات ہے۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کی ساری زندگی کی تمام بھاگ دوڑ محض اسی ایک خواہش کے حصول کے لیے تو ہوتی ہے۔

دولت، شہرت، عزت اور طاقت؛ ہر انسان کو بھلی چیزیں معلوم ہوتی ہیں۔ پھر ''ت'' پر ختم ہونے والی یہ چاروں چیزیں آپس میں ایک گہرا تعلق بھی رکھتی ہیں۔ ان چاروں میں دولت کی ''ت'' باقی تین سے قدرے بڑی دکھائی دیتی ہے۔ دولت کی فراوانی ہو تو شہرت خریدی جا سکتی ہے۔ دولت استعمال کرنے کا فن ہو تو دوسروں کی طاقت آپ کی اپنی طاقت بن سکتی ہے۔ دولت کی ریل پیل ہو تو کرایہ پر عزت بھی کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتی ہے۔

یعنی بہتر معیارِ زندگی (دولت) تقریباً ہر انسان کے دل کی خواہش ہے۔ ہر کمپنی اپنی مصنوعات کو زیادہ سے زیادہ فروخت کرنا چاہتی ہے۔ ہر دوکاندار دوسرے دوکانداروں سے زیادہ گاہک اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتا ہے۔ نوکری پیشہ ہر فرد اپنی ترقی، اپنی پروموشن چاہتا ہے۔

جھونپڑی والے کو گھر چاہیے۔۔۔۔۔ تو گھر والے کو بنگلہ۔

سائیکل والا گاڑی میں بیٹھنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔ اور گاڑی والا جہاز میں۔

آگے سے آگے۔۔۔۔۔ مزید آگے۔۔۔۔۔ تھوڑا اور آگے۔

اور شاید ان تمام چیزوں میں ایسی کوئی برائی بھی موجود نہیں ہے کہ جس پر شرمندہ ہوا جائے۔ آخر زندگی کی تمام رونقیں، چہل پہل اور بھاگ دوڑ انسانوں کے اسی طرزِ عمل کا ہی تو ایک نتیجہ ہے۔

کنویں کے پانی میں ہونے والی ساری ہلچل، ساری چھپک چھپاک آخر کنویں میں موجود مینڈکوں کی اچھل کود اور پُھد کنے کا ہی تو نتیجہ ہوتی ہے۔

اگرچہ اس دنیا میں موجود تقریباً ہر شخص بہتر معیارِ زندگی چاہتا ہے، لیکن عملاً انسانوں کے معیارِ زندگی میں فرق و تفاوت کا پایا جانا ایک بڑی حقیقی چیز ہے۔ اس دنیا میں اگر کچھ افراد بہتر معیارِ زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہیں تو انسانوں کی اکثریت ایسی بھی ہے، جس کے لیے خود کو زندہ رکھنا ہی زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ بن چکا ہے۔ اس دنیا میں اگر کچھ افراد ستارے ہیں تو بہت سارے پرستار بھی موجود ہیں۔

حاکم و محکوم، عوام و خواص، امیر و غریب؛ یہ سب اسی ایک ہی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

الغرض انسانوں کے معیارِ زندگی میں فرق وتفاوت کا پایا جانا ایک بالکل سامنے نظر آنے والی حقیقی چیز ہے۔ راقم الحروف کے لیے حیرانی بلکہ پریشانی والی بات یہ ہے کہ اگر تمام افراد بہتر معیارِ زندگی چاہتے ہیں تو ان تمام افراد کی یہ خواہش یکساں طور پر پوری کیوں نہیں ہو پا رہی؟

بہتر معیارِ زندگی کا حصول ہی اگر زندگی کا مقصد ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے میں کچھ افراد کامیاب اور کچھ افراد ناکام نظر کیوں آتے ہیں؟ بلکہ اگر یوں بھی کہہ دیا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا کہ اس دنیا میں ہر کامیاب کے اوپر ایک بڑا کامیاب موجود ہے اور ہر ناکام کے نیچے ایک بڑا ناکام۔

بہتر معیارِ زندگی کا حصول ہی اگر ایک انسان کا مقصدِ حیات بن جائے تو پھر اس مقصد کو کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟ وہ کون سے عوامل ہیں، جن کی بنیاد پر اس دنیا میں ایک کامیاب انسان، ایک بڑا آدمی بنا جا سکتا ہے؟

محنت اور کوشش عام طور پر وہ چیز ہے، جسے کامیابی کے لیے نہایت اہم تصور کیا جاتا ہے۔

''محنت کامیابی کی کنجی ہے۔ محنت اور کوشش سے ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ محنت کا کوئی بھی دوسرا متبادل نہیں ہے۔ محنت اتنی خاموشی سے کرو کہ کامیابی شور مچا دے۔''

بچپن میں کسی بچے کو جس چیز کی سب سے زیادہ تلقین کی جاتی ہے، وہ شاید محنت ہی ہے۔۔۔

''محنت کرو نہیں تو فیل ہو جاؤ گے۔ فلاں کو دیکھو کیسی محنت کر رہا ہے۔ ساری ساری رات بیٹھ کر پڑھتا ہے اور ایک تم ہو کہ۔۔۔۔۔ زندگی میں آگے بڑھنا ہے تو محنت کیا کرو۔''

پھر یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ محنت وہ واحد چیز ہے کہ جو کبھی رائیگاں نہیں جاتی۔ محنت زندگی میں کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے۔

یہ سب اور ایسی مزید بہت ساری محنت کی عظمت کو ظاہر کرتی باتیں، آپ اپنی زندگی کے کسی نہ کسی حصے میں ضرور سن چکے ہوں گے۔ عام طور پر تعلیمی اداروں میں بھی کچھ اسی قسم کے محنت کے گن گاتے اقوالِ زرّیں دیواروں پر چسپاں کر دیے جاتے ہیں۔ یہ سب اقوالِ زرّیں ہمارے بڑوں اور ہمارے سیانوں کی زندگیوں کا حاصل اور نچوڑ ہوتے ہیں، لیکن کیا محنت کے ذریعے بہتر معیارِ زندگی کی خواہش کو پورا کیا جا سکتا ہے؟ کیا محنت کے بل بوتے پر اس دنیا میں ''بڑا آدمی'' بنا جا سکتا ہے؟

اگر آپ ایسا سوچ رہے ہیں تو ایک منٹ۔۔۔

آپ اپنے اردگرد موجود ریسٹورانٹ، ورکشاپ وغیرہ پر کام کرنے والے کسی نہ کسی ''چھوٹے'' سے تو ضرور واقف ہوں گے۔ جانے اس چھوٹے کی محنت میں کیا مسئلہ ہے کہ یہ اور اسی جیسے لاکھوں

چھوٹے۔۔۔۔چھوٹے سے بڑے اور پھر بوڑھے بھی ہو جاتے ہیں، مگر یہ تمام افراد اپنی زندگی بھر کی محنت کے باوجود اپنے خاندان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے میں ناکام ہی رہتے ہیں۔

اس چھوٹے کے لیے محنت کامیابی کی کنجی ثابت کیوں نہیں ہوتی ؟

سیانے کہتے ہیں کہ محنت وہ چیز ہے، جو زندگی میں کبھی رائیگاں نہیں جاتی ہے۔اب یہ بات سیانے کہہ رہے ہیں تو یقیناً ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں گے۔ایک کام کیجیے۔۔۔

کچھ وقت کے لیے کسی سیانے کی سنگت میں سرکاری ہسپتال کے داخلی دروازے پر کھڑے ہو جایئے۔ ہر چند لمحات بعد آپ کو محنت کا مارا ہوا کوئی شخص ہاتھوں میں دوائیوں کی فہرست تھامے کھڑا نظر آ جائے گا۔ان سبھی اشخاص کے چہروں پر پھیلی مایوسی اور بے بسی، کرتے کی خالی جیب اور ہاتھوں میں پکڑی دوائیوں کی لمبی فہرست۔۔۔

سب چیخ چیخ کر کہہ رہے ہوتے ہیں کہ محنت رائیگاں چلی گئی ہے۔

کیا وجہ ہے کہ اس دنیا کے حقیقی محنت کش افراد کی اکثریت زندگی بھر کی محنت کے باوجود اپنے اہلِ خانہ کو ضروری طبی سہولیات فراہم کرنے میں ناکام ہے، مسلسل ناکام ہے۔

کیا محنت وہ چیز ہے، جو زندگی میں کبھی نہ کبھی صلہ ضرور دیتی ہے؟ کیا محنت وہ چیز ہے، جس کے ذریعے خوابوں کو پورا کیا جا سکتا ہے؟ کیا محنت وہ چیز ہے، جس کی مدد سے ناممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے؟

ناممکن کو ممکن تو بہت دور کی بات ہے یہاں تو ممکن کو ممکن بنانا بھی مشکل نظر آتا ہے، مگر سیانے تو پھر سیانے ہی ہوتے ہیں۔

پکڑیئے کسی سیانے کا ہاتھ اور کھڑے ہو جایئے میڈیکل کالج کے لیے ہونے والے داخلہ ٹیسٹ کی امتحان گاہ کے باہر۔ ہزاروں نہیں، لاکھوں بچے بچیاں اپنی مایوس آنکھوں اور مرجھائے ہوئے چہروں کے ساتھ اپنے ہاتھوں میں خود اپنے ہی خوابوں کی لاشیں ایک سوال نامے کی شکل میں اٹھائے کھڑے ہوتے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں کہ محنت اتنی خاموشی سے کرو کہ کامیابی شور مچا دے۔

ان لاکھوں بچے بچیوں کا راتوں کا جاگنا، ان کی محنت ان کے کسی کام نہ آ سکی۔

ان بچوں کی خاموش محنت شور مچانے کا خواب اپنے سینے میں چھپائے۔۔۔

خاموشی کے ساتھ ہی موت کی آغوش میں چلی گئی۔

شور مچانے کا خواب۔۔۔۔۔بس ایک خواب ہی رہ گیا۔

مگر کیا کیا جائے، یہ سیانے اپنی پوری زندگی کے حاصل کا نچوڑ ہمیں تحفہ میں جو دے کر جاتے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں کہ زندگی میں کبھی ہار نہیں ماننی چاہیے۔ زندگی میں ملنے والی ہر شکست آپ کو دوسرا موقع دیتی ہے کہ آپ اپنی غلطیوں کی اصلاح کر کے ایک بار پھر سے کوشش کریں۔

باالفاظِ دیگر۔۔۔۔۔۔زندگی میں مکمل طور پر ڈھیٹ بن جائیے۔

ایک بچہ MBBS کرنا چاہتا تھا۔ پہلے سال داخلہ نہیں مل سکا۔ دوسرے سال بھی کامیابی نہ ملی، مگر تیسرے سال کامیابی اس بچے کے قدموں میں لونڈیا بنی بیٹھی ہے۔

یقیناً سیانے سچ کہتے تھے اس بچے کو محنت کا صلہ مل گیا۔لیکن کیا ساٹھ سال کی زندگی میں سے ختم ہو جانے والے یہ دو سال اس بچے کو واپس مل جائیں گے؟

دو بار کی شکست اور پھر۔۔۔

شکست کے بعد کے وہ اذیت بھرے لمحات۔۔۔

کیا یہ دو سال کی محنت ضائع نہیں چلی گئی؟

خواہشات کے پورا ہونے میں وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ ایک مناسب وقت پر پوری ہو جانے والی خواہش ہی انسان کو حقیقی خوشی دیتی ہے۔ایک خاص وقت تک خواہش پوری ہو جائے تو ٹھیک، وگرنہ خواہش اپنی موت آپ مر جاتی ہے۔

بہرحال ایک بات تو یقینی ہے کہ محنت اکیلی وہ چیز نہیں ہے،جس کی مدد سے انسان اپنی زندگی میں بہتر معیارِ زندگی حاصل کر سکے۔ زندگی میں اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لیے یقیناً اور بھی بہت ساری چیزوں کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ کافی سارے عوامل ایک خاص نسبتِ تناسب سے ملتے ہوں گے،تب کہیں جا کر زندگی میں کامیابی ملتی ہوگی۔

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔۔۔زیادہ بڑے لوگوں کی زیادہ بڑی باتیں۔۔۔

کامیابی کے 13 اہم ترین اجزاء۔۔۔سنہرے لوگوں کی چاندی جیسی باتیں۔۔۔

یہ سب اور ایسی ہی مزید بہت ساری ''نایاب کتب'' اور ''مقالہ جات'' پر ایک طویل عرصہ تحقیق کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ زندگی میں کامیاب انسان بننے کے لیے صرف محنت نہیں، بلکہ گیارہ اجزاء کی ضرورت ہوتی ہے۔

میری برسوں کی محنت اور تحقیق۔۔۔

میری زندگی کا حاصل اور مشاہدات کا نچوڑ۔۔۔

کامیابی کے گیارہ سنہری اصول مندرجہ ذیل ہیں:

1 محنت۔۔۔شدید محنت۔۔۔کمر توڑ دینے والی محنت

2 اپنے مقاصد کا انتخاب کرنے کی صلاحیت

3 مستقل مزاجی۔۔۔اپنے مقصد کے ساتھ گوند کی مانند چپکے رہنے کی صلاحیت

4 منصوبہ بندی۔۔۔زندگی میں دور، بہت دور تک دیکھنے کی صلاحیت (کم از کم 23 کلومیٹر)

5 خوداعتمادی

6 مثبت سوچ اور مثبت رویہ

7 بات چیت کرنے کا سلیقہ

8 تخلیقی صلاحیتیں

9 معاملات کی تہہ تک پہنچ جانے کی صلاحیت
(دوسالہ ''کھوجی'' کورس ضروری ہے)

10 قائدانہ صلاحیتیں

11 اچھی عادتوں کو اپنانے اور بُری عادتوں کو ترک کر دینے کی صلاحیت

مجھے اپنی تحقیق پر مکمل یقین ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ جس شخص میں بھی یہ تمام خوبیاں پائی جائیں گی، وہ شخص زندگی میں ضرور ''کامیاب انسان'' بن جائے گا۔

ایسا کامل شخص اگر آپ کو راہ چلتے کہیں دکھائی دے تو اسے اٹھا کر کسی عجائب گھر میں رکھ دیجیے گا، تاکہ اس دنیا کے میرے جیسے عام افراد بھی کسی اور دنیا سے آئے اس خوبیوں کے پیکر، ایک مکمل انسان کو دیکھنے اور چھونے کا شرف حاصل کر سکیں۔

اس زمین پر تو کسی ایک ہی شخص میں اتنی خوبیوں کا اکٹھا ہو جانا محال ہے۔ اس لیے عملی زندگی میں ایسا مکمل شخص آپ کو کہیں نہیں ملے گا، البتہ میں ایک ایسے شخص کو ضرور جانتا ہوں، جس میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ کمال پائی جاتی ہیں۔

* ان سے ملیں۔۔ یہ ہیں مسٹر AA۔ ان کی عمر پچپن (55) برس ہو چکی ہے اور یہ ایک کامل انسان ہیں۔ ان کی ذات میں موجود خوبیوں کی فہرست تیار کرنی مشکل ہو گی۔ اپنے نام کی طرح یہ ہمیشہ ہر چیز میں اوّل رہے ہیں۔

اور۔۔۔

اب ان سے بھی ملیں ۔ ۔ ۔ یہ ہیں مسٹر ZZ ۔ ان کی عمر تقریباً انتیس (29) برس ہو چکی ہے اور یہ ہر قسم کی خوبیوں سے بالکل پاک صاف ہیں ۔ اپنے نام کی طرح یہ زندگی کے بیشتر امتحانوں میں ہمیشہ آخر پر رہے ہیں ۔

٭مسٹر AA ایک محنتی انسان ہیں ۔ بہت کم عمر میں ہی انہوں نے عملی زندگی میں قدم رکھ دیے تھے ۔ کام، کام اور کام ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسٹر AA کی زندگی کا ہمیشہ سے یہی نصب العین رہا ہے ۔

جبکہ مسٹر ZZ ایک کام چور انسان واقع ہوئے ہیں ۔ سستی اور کاہلی میں اپنی مثال آپ ہیں یہ ۔ ان کی بس ایک ہی خواہش ہے ۔ ۔ ۔ آرام، آرام اور پھر سے آرام ۔

٭مسٹر AA اپنی زندگی کے لیے مقاصد کا انتخاب کرنا بھی جانتے ہیں اور پھر ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مستقل مزاجی بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ۔ یہ خواب دیکھنے اور پھر ان خوابوں کو حاصل کرنے پر یقین رکھتے ہیں، جبکہ مسٹر ZZ کی زندگی میں سرے سے کوئی مقصد ہے ہی نہیں ۔ یہ ہر قسم کے مقاصد سے بالکل پاک صاف ہیں ۔ یہ خوابوں کا پیچھا نہیں کرتے ہیں، بلکہ سوتے میں خواب دیکھنا انہیں زیادہ اچھا لگتا ہے ۔ یہ ایک متلوّن مزاج انسان ہیں ۔

٭مسٹر AA نہ صرف بلا کے ذہین ہیں، بلکہ منصوبہ بندی میں بھی بڑی مہارت رکھتے ہیں ۔ آنے والے وقت کی ضروریات کو پہلے سے ہی جان لیتے ہیں ۔ کئی کئی سال پہلے آنے والے وقت کی بھنک پا جاتے ہیں ۔

جبکہ مسٹر ZZ یہ بھی نہیں جانتے کہ پلاننگ ہوتا کس بلا کا نام ہے ۔ کسی بھی انہونی کے ہو جانے کے بعد یہ سوچتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیے ۔

٭مسٹر AA ایک خود اعتماد شخص ہیں ۔ ہر قسم کے حالات میں انہوں نے ہمیشہ اپنی صلاحیتوں پر بھروسہ کیا ہے ۔ یہ نہ صرف باتیں کرنے کا فن جانتے ہیں، بلکہ اپنی بات کو مضبوط دلائل کے ساتھ منوانے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں، جبکہ مسٹر ZZ تھوڑے کند ذہن انسان واقع ہوئے ہیں ۔ یہ خود اعتمادی اور فیصلہ سازی؛ دونوں خوبیوں سے محروم ہیں ۔ انہیں محفل میں باتیں کرنا دشوار لگتا ہے ۔

٭مسٹر AA ایک مثبت سوچ رکھنے والے انسان ہیں ۔ مشکل سے مشکل حالات میں بھی مایوسی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے، جبکہ مسٹر ZZ ایک منفی سوچ رکھنے والے انسان ہیں ۔ چھوٹی چھوٹی باتیں انہیں پریشان کر دیتی ہیں ۔

اور تو اور ماضی میں ایک بار خود اپنی ہی جان لینے کی کوشش بھی کر چکے ہیں ۔

*مسٹر AA اپنے حلقۂ احباب میں ایک زِیرک اور معاملہ فہم انسان کے طور پر جانے جاتے ہیں۔لمحوں میں حالات کو جانچ کر معاملے کی تہہ تک پہنچ جاتے ہیں۔ان کے برعکس مسٹر ZZ ایک ناسمجھ انسان ہیں۔معاملات کے ظاہر پر ہی اپنی رائے قائم کر دیتے ہیں۔

*مسٹر AA نہ صرف قائدانہ صلاحیتوں کے مالک ہیں بلکہ ایک خوش اخلاق،ملنسار اور بامروّت انسان بھی ہیں۔انہیں لوگوں کو اپنا بنا لینے کا فن آتا ہے۔جو کوئی بھی مسٹر AA سے ایک بار مل لیتا ہے، پھر انہیں کبھی بھول نہیں پاتا۔یہ لوگوں کے دلوں میں رہتے ہیں، جبکہ مسٹر ZZ ایک تُند خو اور اکھڑ مزاج شخص ہیں۔خاندان میں اپنی بد اخلاقی کے لیے مشہور ہیں۔

*مسٹر AA نہ صرف وقت کی پابندی کرتے ہیں بلکہ صبح جلدی اٹھنا اور ورزش کرنا بھی ہمیشہ سے ان کا معمول رہا ہے۔انہوں نے ہمیشہ خود کو بُری عادتوں اور بُری محفلوں سے دور رکھنے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش میں یہ کامیاب بھی رہے ہیں، جبکہ مسٹر ZZ بہت سارے اخلاقی جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ایک بار تو ڈرگز کے چکر میں جیل کی ہوا بھی کھا چکے ہیں۔

مسٹر AA میں یقیناً اور بھی بہت سی خوبیاں ہوں گی ،جنہیں میں اپنی کوتاہ بینی کے سبب جاننے اور پھر تحریر کرنے میں ناکام رہا ہوں۔

مسٹر ZZ میں اور بھی بہت ساری برائیاں ہوں گی ،جن کے بارے میں مجھے اپنی لاعلمی کا مکمل اعتراف ہے۔

مسٹر AA آج اپنی ان تمام خوبیوں کے سبب اپنے حلقۂ احباب میں ایک کامیاب انسان سمجھے اور جانے جاتے ہیں۔اپنے خاندان کے نوجوانوں کے لیے یہ ایک رول ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی مثالیں دے دے کر اپنے بچوں کو زندگی میں آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں۔اپنی انہی خوبیوں کی وجہ سے مسٹر AA آج شہر کی ایک بہت بڑی فیکٹری کے جنرل منیجر ہیں۔

نہ صرف جنرل منیجر۔۔۔۔۔ بلکہ فیکٹری کے مالک مسٹر KK کے دستِ راست بھی۔

جبکہ مسٹر ZZ اپنی تمام برائیوں کے سبب اپنے حلقۂ احباب میں ایک ناکام انسان کے طور پر جانے جاتے ہیں۔یہ انتیس (29) برس کے ہو گئے ہیں، لیکن ابھی تک کوئی بھی باقاعدہ کام نہیں کرتے۔اپنی تعلیم بھی انہوں نے ادھوری چھوڑ رکھی ہے۔ان کے خاندان والے بھی ان کی حرکتوں سے نالاں ہی رہتے ہیں۔جبکہ اپنے والد، مسٹر KK سے تو انہیں دن

میں کئی کئی بار ڈانٹ پڑتی ہے۔ ماں کے بے جا لاڈ پیار کے سبب مسٹر ZZ بہت بگڑ چکے ہیں۔

Oops......

اور۔۔۔۔۔اور یہ مسٹر KK۔۔۔

وہی مسٹر KK ہیں، جن کی فیکٹری میں مسٹر AA جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔

3 ماہ بعد۔۔۔

مسٹر KK ایک کار ایکسیڈنٹ میں مارے جاتے ہیں اور ان کی تمام جائیداد ان کے اکلوتے بیٹے مسٹر ZZ کے نام منتقل ہو جاتی ہے۔ اس وقت مسٹر ZZ کے نام پر موجود درجن بھر جائیدادوں میں سے ایک وہ فیکٹری بھی ہے، جس میں مسٹر AA اپنی تمام خوبیوں کے سبب جنرل منیجر کے عہدے پر فائز ہیں۔

باپ کی وفات کے بعد مسٹر ZZ آج پہلے دن فیکٹری کے دفتر میں، فیکٹری کے معاملات کو جانچنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ مسٹر ZZ کی اکھڑ مزاجی کے سبب فیکٹری کا سارا عملہ اس وقت سہما ہوا ہے۔

اور پھر۔۔۔

اور پھر ایک کامیاب انسان۔۔۔۔۔ بہت سارے لوگوں کے لیے رول ماڈل کی حیثیت رکھنے والا شخص۔۔۔۔۔ اَن گنت خوبیوں کا مالک۔۔۔۔۔ مسٹر AA ایک ایسی شخصیت کے سامنے کھڑے ہو کر۔۔۔۔۔ بلکہ جھک جھک کر فیکٹری کی رپورٹ پیش کر رہا ہے کہ۔۔۔

جو ہر طرح کی خوبیوں سے یکسر پاک صاف ہے۔

جاننا چاہتے ہیں زندگی میں کامیاب ہونے کے لیے ایک انسان میں کیا کیا خوبیاں ہونی چاہیں؟

جاننا چاہتے ہیں زندگی میں کامیابی کیسے ملتی ہے؟ بڑا آدمی کیسے بنا جاتا ہے؟

میں نہیں جاننا چاہتا کچھ بھی۔

میری زندگی میں تو اب بس ایک ہی تلاش باقی رہ گئی ہے۔

مجھے تلاش ہے اس زندگی میں دوسروں کو کامیابی کے ''گُر'' بتانے والے سیانوں کی۔

میری اس تلاش میں آپ میرا ساتھ دیں گے ناں؟

اور۔۔۔۔۔اور آپ۔۔۔۔۔ان مسٹر AA اور مسٹر ZZ کو محض دو فرضی کردار سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کیجیے گا۔ یہ دونوں کردار آپ کو اپنے ماحول میں ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں مل جائیں گے۔

ایسے دو کردار جن میں ایک شخص اپنی ساری زندگی کی بھاگ دوڑ کے باوجود وہ معیارِ زندگی حاصل نہیں کر پا رہا کہ جو معیارِ زندگی کسی دوسرے شخص کو بِنا کسی محنت کے، بِنا کسی بھی

کوشش کے حاصل ہے۔ اب اس سے بڑھ کر میں مثالیں بیان کرنے لگوں گا تو بات بلا وجہ ہی پاکستان کی ڈیموکریسی اور بیوروکریسی کی جانب چلی جائے گی۔

اس لیے۔۔۔۔۔ان باتوں کو بس ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

اگر بہتر معیارِ زندگی کا حصول ہی آپ کی زندگی کا مقصد ہے تو اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے آپ کی تمام کوششیں اور محنت کس قدر اہمیت رکھتی ہے؟

اس بات کا فیصلہ کرنا ایک بہت مشکل کام ہوگا۔

البتہ ایک بات یقینی ہے کہ قدرتی چُناؤ (Natural Selection) ایک ایسی چیز ہے کہ جو کسی بھی انسان کے معیارِ زندگی پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور یہ محض ایک ہی چیز ایسی قوی ہے کہ باقی تمام عوامل مل کر بھی اسے شکست نہیں دے سکتے ہیں۔

شاید آپ سوچ رہے ہوں کہ میں تمام انسانی محنت اور کوششوں کو پسِ پشت ڈال کر سارا کریڈٹ ایک قدرتی عمل کو دے رہا ہوں، جو شاید ٹھیک نہ ہو اور شاید۔۔۔

شاید آپ کی یہ سوچ ٹھیک ہو اور میں غلط۔

چلیں ایک لمحے کے لیے فرض کر لیتے ہیں کہ اس وقت دنیا کے 7.8 ارب انسانوں کے معیارِ زندگی میں موجود تمام فرق و تفاوت (Differences) ان انسانوں کی اپنی ہی محنت اور کوشش کا ایک نتیجہ ہے۔ جو لوگ بھی اس وقت ایک ''کامیاب'' زندگی گزار رہے ہیں، یہ کامیابی بھی ان لوگوں کی اپنی ہی محنت اور عقل کی وجہ سے ہے اور وہ تمام لوگ جو بہتر معیارِ زندگی حاصل کرنے میں مسلسل ناکام ہیں، ایسے تمام لوگوں کی ساری ناکامیوں کا سہرا بھی خود ان کے اپنے ہی سر پر سجتا ہے۔

لیکن اب ذرا تصور کیجیے اس دنیا میں روزانہ کتنے بچے پیدا ہوتے ہیں؟

کچھ بچے اگر سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں تو بہت سارے بچے کچرے کے ڈھیروں پر بھی تو جنم لیتے ہیں۔ جھونپڑی اور محل میں ایک ہی دن میں بچہ پیدا ہوتا ہے۔

کیا ان سب بچوں کے لیے یہ زندگی ایک جیسی ہوگی؟

کہا جاتا ہے کہ یہ زندگی ایک ریس ہے، مگر یہ کیسی ریس ہے جس میں سبھی شرکاء کو یکساں مواقع فراہم نہیں ہو رہے ہیں؟ یہ کیسی ریس ہے، جس میں سبھی شرکاء کے لیے سٹارٹنگ لائن یکساں نہیں ہے؟

سچن ٹنڈولکر دنیا کا بہترین بلے باز ہوگا، ضرور ہوگا، مگر صرف ان بلے بازوں میں سے جنہیں ہم جانتے ہیں۔ وگرنہ اس زمین پر ہزاروں نہیں لاکھوں ٹنڈولکر ایسے بھی موجود ہوں گے جو اپنی

ساری زندگی میں کبھی کرکٹ کھیل ہی نہ سکے ہوں گے۔ بہت سارے بچے ایسے بھی ہوں گے، جنہیں ان کی زندگی کے حالات نے کبھی بلے بازی کرنے کی اجازت ہی نہ دی ہوگی۔

اس دنیا میں بہت سارے مصوّر ایسے بھی ضرور موجود ہوں گے، جنہیں اپنی تخلیق، اپنا شاہکار کبھی کاغذ پر اتارنے کا موقع ہی نہیں ملا ہوگا۔

کیا ان حالات میں کامیابی اور ناکامی کا وجود کسی بھی قسم کا کوئی معنیٰ رکھتا ہے؟

اگر ایک کند ذہن بچہ اپنی تمام کوششوں کے باوجود امتحان میں بار بار فیل ہو رہا ہے تو کیا اس بچے کو ناکام کہنا چاہیے؟

مگر اس سب کے باوجود ہر انسان بھاگ رہا ہے، دوڑ رہا ہے۔ ہر انسان زندگی میں کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ ہر انسان بڑا آدمی، بہت بڑا آدمی بننا چاہتا ہے۔

یہ کامیابی آخر ہوتی کیا چیز ہے؟ ملتی کیسے ہے؟

کیا فطرت کی بیساکھیوں پر ملنے والے اچھے یا بُرے معیارِ زندگی کو کامیابی یا ناکامی تصور کرنا ٹھیک ہوگا؟

ان تمام حقائق کے باوجود یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے اردگرد، ہمارے بالکل آس پاس بہت سے کامیاب لوگ بھی پائے جاتے ہیں اور بہت سے ناکام بھی، بلکہ ہر کامیاب کے اوپر ایک بڑا کامیاب موجود ہے اور ہر ناکام کے نیچے ایک بڑا ناکام۔

اس دنیا میں پہلی پوزیشن حاصل کرنے والے ہر بچے کو سراہا جاتا ہے، تعریف کی جاتی ہے۔ فیل ہو جانے والے ہر بچے کو کوسا جاتا ہے، تنقید کی جاتی ہے۔ اس بچے کی غلطیاں شمار کی جاتی ہیں۔

اس زمین پر موجود ہر ٹنڈولکر چار بار کیچ چھوٹ جانے کے بعد بھی اگر سنچری بناتا ہے تو اپنا بیٹ ہوا میں لہرا دیتا ہے۔ صفر پر رَن آؤٹ ہو جانے والا ہر ''لٹل ماسٹر'' اپنے سر کو افسوس کے ساتھ دائیں بائیں ہلاتا ہوا میدان چھوڑ کر جاتا ہے اور۔۔۔

اور شاید ان تمام چیزوں میں ایسی کوئی برائی بھی موجود نہیں ہے کہ جس پر شرمندہ ہوا جائے۔ آخر زندگی کی تمام رونقیں، چہل پہل اور بھاگ دوڑ انسانوں کے اسی طرزِ عمل کا ہی تو ایک نتیجہ ہے۔

کنویں کے پانی میں ہونے والی ساری ہلچل، ساری چھپک چھپاک آخر کنویں میں موجود مینڈکوں کی اچھل کود اور پُھدکنے کا ہی تو نتیجہ ہوتی ہے۔

اور جانے کیوں؟ اب مجھے ڈاکٹر بندر کی یاد ستانے لگی ہے۔۔۔

پرانے زمانے کی بات ہے کہ کسی جنگل میں بندروں کی ایک بہت بڑی بستی آباد ہوا کرتی تھی۔ اس بستی کے سبھی بندر ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ ایک موسمِ گرما جنگل میں کوئی وباء پھوٹ پڑی۔ اس وباء کے نتیجے میں بہت سارے بندر بیمار ہوئے اور پھر کچھ بندر اسی پُراسرار بیماری کے سبب مر بھی گئے۔

اگلے سال موسمِ گرما میں پھر ایسا ہوا اور پھر ہر موسمِ گرما یہ مہلک وباء جنگل میں پھیلنے لگی۔

جنگل کے سبھی بندر اس وباء کی وجہ سے بہت پریشان رہنے لگے تھے۔ بندروں کا ہر خاندان اس بیماری کے سبب اپنا کوئی نہ کوئی فرد کھو چکا تھا۔ حالات کی نوعیت کو بھانپتے ہوئے مکھیا بندر نے جنگل کے سبھی سرکردہ بندروں کی ایک میٹنگ طلب کی اور اس تشویشناک صورتِ حال پر تبادلہ خیال کیا۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد طے یہ پایا کہ بندروں کی اس بستی میں موجود سب سے سیانے بندر کو امریکہ بھیجا جائے، تا کہ وہ امریکہ سے اس بیماری کا علاج سیکھے اور پھر واپس آ کر جنگل کے سبھی بیمار بندروں کا علاج کرے۔

چار سال کے اعصاب شکن انتظار کے بعد ڈاکٹر بندر اپنی تعلیم مکمل کر کے واپس جنگل پہنچ گیا۔ جنگل کے سب بندر پُرامید تھے کہ اس سال مہلک وباء سے جان چھوٹ جائے گی۔

ایک بار پھر گرمیاں آن پہنچیں۔۔۔۔۔ اور ساتھ ہی مہلک وباء بھی۔

بیماری کے سبب ایک بندر کی حالت تشویشناک ہوئی تو ڈاکٹر بندر کو اس مریض بندر کا معائنہ کرنے کے لیے بلایا گیا۔ بیمار بندر کا علاج ہوتا دیکھنے کے لیے جائے وقوعہ پر مزید بہت سارے بندر بھی موجود تھے۔

ڈاکٹر بندر نے مریض کے جسم کو چھو کر دیکھا، نبض ٹٹولی، آنکھوں کے پپوٹے کھول کر آنکھوں کی رنگت کا بھی جائزہ لیا۔ اس کے بعد ڈاکٹر بندر اپنی ٹھوڑی تلے ہاتھ رکھ کر خاموش بیٹھ گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ کافی دیر اسی طرح مراقبے میں بیٹھے رہنے کے بعد جانے اسے کیا سوجھی کہ اچانک دوڑ کر ایک قریبی درخت پر چڑھ گیا اور اس کے بعد وہ کبھی اس درخت پر چھلانگ لگانے لگا تو کبھی اس درخت پر۔ وہ کبھی ایک شاخ پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگتا تو کبھی دوسری شاخ۔ اس ساری اچھل کود کے دوران وہ منہ سے تیز آوازیں بھی نکال رہا تھا۔ پورا جنگل ڈاکٹر بندر کی ان چیخوں سے گونجنے لگا تھا، جبکہ نیچے زمین پر موجود سبھی تماش بین حیران تھے کہ۔۔۔ ''آخر یہ ڈاکٹر بندر کرنا کیا چاہتا ہے؟''

اسی دوران مریض بندر کی طبیعت کچھ مزید بگڑی اور وہ مر گیا۔

ڈاکٹر بندر کو آوازیں دے کر نیچے بلایا گیا اور اسے مریض کی موت سے آگاہ کیا گیا۔ ڈاکٹر

بندر نے افسوس کے ساتھ سر کو دائیں بائیں ہلایا اور پھر کہنے لگا:

''اچھا! میں نے تو مریض کو بچانے کے لیے بڑی ''بھاگ دوڑ'' کی،
مگر شاید اس بندر کو مرنا ہی تھا۔''

ڈاکٹر بندر کی یہ بات سن کر دوسرے سبھی بندر اسے کوستے ہوئے واپس اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹر بندر کو پھر سے ایک مریض دیکھنے کے لیے بلایا گیا۔ ڈاکٹر بندر نے مریض کا معائنہ کیا اور ایک بار پھر سے اپنی ''بھاگ دوڑ'' شروع کر دی، لیکن ہوا یوں کہ اب کی بار مریض کچھ بہتر ہونے لگا۔ جائے وقوعہ پر موجود سبھی بندروں نے ڈاکٹر بندر کی تعریف کی، ڈاکٹر کی اس کامیابی کے طریقۂ کار کو پرکھا گیا، اس کے بھاگ دوڑ کرنے کے لائحۂ عمل پر سیر حاصل بحث کی گئی، بلکہ کچھ بوڑھے بندروں نے تو اپنے بچوں کو ڈاکٹر بنانے کے خواب بھی دیکھنا شروع کر دیے اور پھر ساری گرمیاں یہی سلسلہ چلتا رہا۔

ہر مریض بندر کا معائنہ کرنے کے لیے ڈاکٹر بندر کو بلایا جاتا۔۔۔ ڈاکٹر میاں خوب ''بھاگ دوڑ'' کرتے۔۔۔۔۔ کچھ مریض صحت یاب ہو جاتے تو کچھ مریض مر جاتے۔

ہر مر جانے والے مریض کے لواحقین ڈاکٹر کو خوب کوسنے دیتے۔ اس کے طریقۂ علاج پر بھی تنقید کی جاتی، جبکہ ہر زندہ بچ جانے والے مریض کے لواحقین ڈاکٹر بندر کی تعریف کرتے۔ اسے تازہ پھلوں کے تحفے بھیجے جاتے، اس کی کامیاب ''بھاگ دوڑ'' کی مثالیں دے دے کر اپنے بچوں کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی جاتی۔

ہر صحت یاب ہو جانے والے مریض کے لواحقین کی تعریف ڈاکٹر بندر کے حوصلوں کو بلند کر دیتی۔ وہ دل ہی دل میں اپنی اس ساری ''بھاگ دوڑ'' کا خود ہی گرویدہ ہو جاتا اور پھر خود سے ہی عہد کرتا کہ۔۔۔

''اگلی بار بھی بالکل ایسی ہی ''بھاگ دوڑ'' کرنی ہے۔''

پھر جب کوئی بھی بندر مر جاتا تو ڈاکٹر بندر سوچتا کہ شاید اب کی بار اس کی ''بھاگ دوڑ'' میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ فلاں ٹہنی کو پکڑ کر اگر زور زور سے ہلایا ہوتا تو یقیناً مریض صحت یاب ہو سکتا تھا۔ فلاں درخت پر اگر بروقت چھلانگ لگائی ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

بہر حال۔۔۔

جنگل میں ساری رونق، ساری ہلچل اور سارا شور شرابا۔۔۔۔۔ بندروں کے اسی طرزِ عمل کا نتیجہ ہے۔

باب:9

میں کون ہوں؟

محبت ،نفرت ، غصہ اور خوف کی مانند۔۔۔۔۔۔تجسس بھی ہر انسان کے اندر پائے جانے والے چند بنیادی جذبات میں سے ایک ہے۔ ہر ذی شعور انسان اپنی ذہنی استعداد کے مطابق اپنے اور اپنے ماحول کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتا ہے۔ ہمارا دماغ ہر وقت کسی نہ کسی کھوج میں لگا رہتا ہے۔ ہر نئی چیز ہمیں اپنی طرف مائل کرتی ہے، ہر انوکھا واقعہ ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ انسان میں موجود تجسس کے اس مادے کے سبب علم (Human Acquired Knowledge) جنم لیتا ہے، ترقی کرتا ہے۔

انسانی تمدن کے آغاز میں یہ علم سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا ہوگا۔ ہر پرانی نسل اپنی پوری زندگی کے تجربات کا نچوڑ نئی نسل کے حوالے کرتی رہی ہوگی۔ ہر نئی نسل اپنے آباء سے حاصل کیے گئے اس وراثتی علم میں کچھ اضافہ، کچھ ترامیم کر کے آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کرتی رہی ہوگی۔ رفتہ رفتہ۔۔۔۔۔زینہ بہ زینہ۔۔۔۔۔اور نسل در نسل۔۔۔۔۔

ارتقاء کے ایک طویل سفر کے بعد انسانی علم آج اس مقام پر پہنچ چکا ہے کہ جہاں انسان خود کو ترقی یافتہ کہلانا چاہتا ہے اور شاید حضرتِ انسان اپنے اس دعوے میں کچھ ایسا غلط بھی نہیں ہے۔ آج ہر انسانی معاشرے میں تعلیم کو اہم اور ضروری سمجھا جانے لگا ہے۔ اس کرۂ ارض پر اب لاکھوں تعلیمی ادارے موجود ہیں، جبکہ ان تعلیمی اداروں میں پڑھنے اور پڑھانے والوں کی تعداد تو کروڑوں میں ہوگی۔ جہاں ایک طرف تعلیمی اداروں اور تعلیم یافتہ افراد کی تعداد مسلسل بڑھ رہی ہے، وہیں پر انسانی علم بذاتِ خود بھی وسیع سے وسیع تر ہو رہا ہے۔ انسانی علم کا یہ درخت شاخ در شاخ آگے سے آگے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔

نِت نئی ایجادات معمول بن چکی ہیں۔ بہتر سے بہترین کی جانب سفر تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ جدید ترین ذرائع مواصلات، انجینئرنگ کی شاہکار بلند و بالا عمارتیں اور ہزاروں کلومیٹر طویل سڑکوں کے یہ جال، بہترین طبی سہولتوں کی فراہمی اور اجرامِ فلکیہ پر تحقیق؛ یہ تمام چیزیں محض انسانی علم کی بدولت

ممکن ہوسکی ہیں۔ایک جانب جنیٹک انجینئرنگ کے ذریعے غذائی قلت کو پورا کرنے کے لیے نئی نئی قسم کے بیج تیار کیے جارہے ہیں تو دوسری طرف کلوننگ کے ذریعے انسانوں کی مصنوعی پیدائش کو بھی ممکن بنایا جاچکا ہے۔انسانوں کی اپنی بنائی ہوئی مشینیں آج نہ صرف انسانوں کی جگہ کام کررہی ہیں، بلکہ بہت سارے معاملات میں تو انسانوں سے اچھا اور معیاری کام کررہی ہیں۔اب وہ دن بھی شاید کچھ زیادہ دور نہیں ہے، جب آرٹیفیشل انٹیلی جنس (AI) سے لیس روبوٹ کھلے عام سڑکوں پر گھومتے نظر آئیں گے۔

آج سے سوسال پہلے کے انسان کے لیے ہماری آج کی یہ دنیا کسی جادونگری سے کم نہ ہوگی، جبکہ آج سے سوسال بعد کی دنیا کا تصور بھی ہمارے لیے ناممکن ہے مگر۔۔۔

انسانی علم کی اس تمام ترقی اور پھیلاؤ کے باوجود۔۔۔۔۔اس کرۂ ارض پر لاکھوں تعلیمی اداروں کی موجودگی کے باوجود۔۔۔۔۔کروڑوں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی شب و روز کی محنت اور تحقیق کے باوجود۔۔۔۔۔انسانی علم محدود ہے، بہت محدود ہے، بہت ہی محدود ہے۔اور بات اگر فطرت کے رازوں کو جاننے کی ہو تو انسانی علم محض محدود نہیں، بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔فطرت اور فطرت کے کام کرنے کے طریقوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔ہم کچھ بھی تو نہیں جانتے۔

بنیادی طور پر انسان ہمیشہ سے فطرت اور فطرت کے قوانین کو اپنی بقاء اور اپنی زندگی میں بہتری لانے کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔ہزاروں سالوں کی علمی ترقی اور محنت کے بعد جو واحد چیز ہم حاصل کرنے میں کامیاب ہوچکے ہیں، وہ یہی ہے کہ آج ہم فطرت کے قوانین کو اور فطرت کی مہیا کردہ چیزوں کو ماضی کی نسبت زیادہ بہتر اور زیادہ مستعد انداز میں استعمال کررہے ہیں اور بس۔۔۔

آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے انسان لوہے کی مدد سے صرف تلواریں اور نیزے وغیرہ بناتے ہوں گے، جبکہ آج کا انسان اسی لوہے کو میزائل اور ٹینک بنانے میں بھی استعمال کرنے لگا ہے، مگر فطرت کی مہیا کردہ چیز لوہا، اس لوہے کی حقیقت کو نہ تو آج سے پانچ ہزار سال پہلے کے انسان جانتے تھے اور نہ ہی آج کا انسان جانتا ہے۔

انسان کی تمام علمی ترقی کے باوجود فطرت کے سبھی عقدے آج بھی عقدے ہی ہیں۔ فطرت کی پہیلیاں آج کے انسان کو بھی ٹھیک اسی طرح گھماتی ہیں، جس طرح سے آج سے ہزاروں برس پہلے کے انسان کو گھماتی ہوں گی۔

آپ نے بچپن سے آج تک جتنی بھی چیزوں کو استعمال کیا ہے، جتنی بھی چیزوں کو دیکھا ہے، محسوس کیا ہے یا پھر سوچا ہے، باتیں آپ کے اندر کی دنیا کی ہوں، داستانیں ہوں چھوٹی اور بڑی

دنیا کی یا پھر مسائل ہوں ایک عام آدمی کی دنیا کے۔۔۔

انسانی زندگی کا کوئی ایک پہلو بھی ایسا نہیں ہے، جس کی حقیقت سے ہم واقف ہوں اور یہاں ''ہم'' سے میری مراد میرے یا آپ کے جیسے عام انسان نہیں ہیں، بلکہ ''ہم'' سے یہاں پر مراد اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش اور سیانے لوگ ہیں۔شاید۔۔۔

شاید انسان کی علمی ترقی سے متاثر کچھ قارئین کے لیے اس بات کو تسلیم کرنا ذرا دشوار ہو۔

چلیں۔۔۔۔۔چلیں کہیں باہر چلتے ہیں۔۔۔۔۔کسی جگہ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔

تھوڑی دیر کھلی فضا میں سانس لیتے ہیں۔۔۔۔۔کچھ باتیں خود سے کرتے ہیں۔

آپ کو وادئ نیلم کی جانب کیے جانے والا آپ کا ''وہ'' سفر تو یاد ہوگا۔

وہ آپ کی زندگی کے بس تین ہی شوق۔۔۔۔۔کتاب، سنگیت اور سفر۔

وہ خاموش رات۔۔۔۔۔وہ لگی کی لگن اور وہ لگن لگی۔

اسی سفر کی بات کرتے ہیں۔بات جہاں پر رکی تھی، وہیں سے شروع کرتے ہیں۔

فرض کیجیے۔۔۔اس سروس ایریا پر کچھ دیر رکنے کے بعد آپ کا سفر ایک بار پھر سے شروع ہو جاتا ہے اور ٹھیک تیرہ گھنٹے بعد آپ وادئ نیلم کے ایک خوبصورت علاقے ''شاردہ'' پہنچ جاتے ہیں۔لمبے سفر کی تھکاوٹ ہے۔آپ ہوٹل پہنچ کر آرام کرتے ہیں۔

شاردہ، وادئ نیلم، آزاد جموں و کشمیر۔۔۔

رات 10 بج کر 50 منٹ۔۔۔

آپ ایک پُرسکون نیند لے کر اٹھتے ہیں، تازہ دم ہوتے ہیں اور کھانا کھاتے ہیں۔پھر چاندنی رات میں وادی کے فطری حسن سے لطف اندوز ہونے کے لیے آپ چائے اپنے ساتھ لیے دریا کے کنارے آکر بیٹھ جاتے ہیں۔آپ اپنی دونوں ٹانگیں پنڈلیوں تک دریا کے یخ بستہ پانی میں اتار دیتے ہیں اور پانی کی اس ٹھنڈک کو اپنے اندر تک اترتا ہوا محسوس کرتے ہیں۔ایک عجب پُرسکون ماحول ہے، ہر سو خاموشی ہے اور اس خاموشی میں بس دریا کا بہتا پانی کچھ گیت گنگنا رہا ہے۔چارسو خوبصورتی کے ساتھ ترشے ہوئے پہاڑ ایک خاص ترتیب سے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے کھڑے ہیں۔

ہر جانب سبزہ ہی سبزہ ہے، تازگی ہی تازگی ہے۔

چاند کی مدھم روشنی میں نظر آنے والے یہ تمام مناظر آپ پر ایک سحر طاری کر دیتے ہیں۔آپ خود کو کسی اور ہی دنیا میں محسوس کرنے لگتے ہیں۔ماحول کے نشے میں سرشار ہو کر آپ بیٹھے بیٹھے اپنے

بازو ہوا میں پھیلاتے ہیں اور پھر گیلی ریت پر پیچھے کی جانب گر جاتے ہیں۔ اب آپ کی نگاہوں کے سامنے کھلا آسمان ہے۔ آپ کو آسمان آج ہمیشہ سے زیادہ صاف اور نکھرا نکھرا دکھائی دیتا ہے۔ ایک چاند آپ سے ہم کلام ہے، کچھ بادل آوارہ ہو رہے ہیں۔ چاندنی رات کے باوجود بے شمار ستارے جگمگا رہے ہیں، آپ کو اپنی موجودگی کا احساس دلا رہے ہیں۔

چند لمحات بعد آپ واپس اٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور گرم چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے چاروں جانب نگاہیں دوڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ بہتے پانی کی آواز آپ کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ آپ ہاتھ پانی میں اتار کر پانی کے کچھ چھینٹے ہوا میں اڑا دیتے ہیں اور اسی لمحے دریا میں سے ایک مچھلی اچھل کر فضا میں بلند ہوتی ہے اور ایک نظر آپ کو دیکھ کر واپس پانی میں ہی کہیں غائب ہو جاتی ہے۔

یہ منظر دیکھ کر آپ کے لبوں پر ایک مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔

کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ بادلوں کی ایک ٹولی چپکے سے چاند کے سامنے آ کر بسیرا کر لیتی ہے اور سارے ماحول میں اچانک اندھیرا بڑھ جاتا ہے۔

آپ خاموش بیٹھے، چائے کی چسکیاں لیتے، ہر آن بدلتے ان مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ چائے ختم کر کے آپ دریا کنارے موجود گیلی ریت پر گھروندے بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ ریت پر مختلف شکلیں بناتے ہیں، بگاڑتے ہیں۔ ریت کے ذرات میں موجود نمی اور ٹھنڈک کو اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کرتے ہیں۔ رات گئے تک یہ کھیل جاری رہتا ہے اور پھر آپ اپنی کلائی کو ذرا گھما کر وقت دیکھتے ہیں۔ ایک بجنے کو ہے۔ آپ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر ٹہلنے والے انداز میں قریب ہی موجود اپنے ہوٹل کی جانب بڑھ جاتے ہیں۔

یہ میری اور آپ کی۔۔۔۔۔ایک عام آدمی کی دنیا ہے۔

یہاں سب اچھا ہے، یہاں ہر چیز خوبصورت ہے۔ دریا کنارے آپ کے اس مختصر قیام میں کہیں کوئی ایک چیز بھی ایسی دکھائی نہیں دے رہی، جس پر پریشان ہوا جائے۔

ہر منظر دلفریب ہے۔۔۔۔۔تمام آوازیں دلنشیں ہیں۔

مگر حقیقت اس سے بالکل برعکس ہے۔ دریا کے کنارے آپ کے اس قیام کا ہر ایک لمحہ، آپ کی تمام حرکات و سکنات اور ان تمام مناظر میں کوئی ایک چیز بھی پریشانی سے خالی نہیں ہے۔ اس پورے ماحول میں، تمام مناظر میں کسی ایک بھی چیز کی حقیقت ہمیں معلوم نہیں ہے۔ اب ذرا چند لمحات کے لیے فرض کیجیے کہ جس وقت آپ دریا کنارے بیٹھے فطری مناظر سے لطف اندوز ہو رہے تھے، اس وقت

آپ سے چند قدم کی دوری پر کوئی اور شخص بھی موجود تھا اور اس کا نام ''سیانا'' تھا۔

سیانا محض نام کا ہی سیانا نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دانشور بھی ہے اور ایک سائنسدان بھی۔ یہ سیانا ایک فلسفی ہے اور ایک سائیکالوجسٹ بھی۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ اس کرۂ ارض پر موجود لاکھوں تعلیمی ادارے اسی ایک سیانے کے اندر موجود ہیں۔ یہ سیانا ہزاروں کتب خانے اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہے۔ سیانا ایک فرد نہیں ہے، بلکہ یہ سیانا تو ہمارے آج تک کے حاصل کردہ علم کی نمائندگی کر رہا ہے۔

دریا کے کنارے آپ سے چند قدم کی دوری پر موجود اس شخص کی دنیا ایک بالکل مختلف دنیا ہوگی اور سیانے کی اس دنیا میں کہیں کوئی ایک چیز بھی ٹھیک نہیں ہے۔

دریا کنارے گیلی ریت پر لیٹے جب آپ آسمان کو دیکھ رہے تھے تو ان لمحات میں سیانا بھی آسمان کو ہی گھور رہا تھا، مگر سیانے کی سوچیں بالکل مختلف نوعیت کی تھیں۔۔۔

''یہ آسمان، یہ کائنات ۔۔۔اس کائنات کا پچانوے فیصد حصہ Dark Matter اور Dark Energy پر مشتمل ہے۔ ان دونوں چیزوں کے بارے میں جاننا تو بہت دور کی بات ہے، آج تک ہم ان دونوں چیزوں کو براہِ راست محسوس بھی نہیں کر سکے۔ بس بالواسطہ ذرائع سے اتنا معلوم ہے کہ اس کائنات کا پچانوے فیصد حصہ انہی دو چیزوں پر مشتمل ہے۔ اس کائنات کے پچانوے فیصد حصے کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے، جبکہ باقی پانچ فیصد کائنات کے ایک بہت محدود حصے کو ہم دیکھ سکتے ہیں، محسوس کر سکتے ہیں اور کسی حد تک استعمال بھی، لیکن اس پانچ فیصد حصے کی حقیقت بھی ہماری نگاہوں سے مکمل اوجھل ہے۔ کائنات کی وسعت کتنی ہے؟ یہ آسمان ہم سے کتنی دوری پر موجود ہے؟ یہ کائنات محض ایک ہی کائنات ہے؟ یا پھر اس کائنات سے پرے کہیں دور، بہت دور 10^1000000000000 مزید کائناتیں بھی پائی جاتی ہیں؟ اس کائنات کا آغاز کیونکر ہوا؟

کائنات میں Matter اور Anti-Matter دونوں کو یکساں مقدار میں موجود ہونا چاہیے۔ آخر یہ Anti-Matter سے بنے ستارے، سیارے اور کہکشائیں کہاں پائے جاتے ہیں؟

کائنات میں موجود سارا Anti-Matter کدھر موجود ہے؟ کیا اس کائنات

میں Anti-Matter سے بنا میرا کوئی ہمزاد بھی ہے؟ کیا اس لامحدود کائنات
میں ہم انسان اکیلے ہیں؟ یا پھر کائنات میں موجود دیگر ارب ہا ارب سیاروں پر بھی
زندگی پائی جاتی ہے؟ کیا اس کائنات میں Aliens بھی موجود ہیں؟''

یہ سب اور ایسے ہی مزید لاتعداد سوال تھے، جو آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے سیانے کے ذہن میں جنم لے رہے تھے اور سیانے کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔

پھر سب سے بڑھ کر روشنی کی محدود رفتار کے سبب کائنات کو لمحۂ موجود میں دیکھنا ہم انسانوں کے لیے ممکن ہی نہیں ہے۔ جس وقت ہم آسمان کی جانب دیکھ رہے ہوتے ہیں تو درحقیقت اس وقت ہم آسمان کو نہیں، بلکہ آسمان کے ماضی کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ رات کو نظر آنے والے ستارے ہمارے اس لمحۂ موجود میں زندہ ہیں یا نہیں؟ یہ ستارے اپنی جگہ پر قائم و دائم ہیں یا پھر تباہ و برباد ہو چکے ہیں؟

یہ باتیں ہم حتمی طور پر کبھی نہیں جان سکتے۔ کائنات کے بارے میں آج تک جتنے بھی نظریات پیش کیے گئے ہیں، یہ تمام نظریات اس کائنات کے ماضی کے مشاہدات کی بنیاد پر پیش کیے گئے ہیں۔ وگرنہ حقیقت تو یہ ہے کہ اس کائنات کو لمحۂ موجود میں دیکھنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ ہم انسان محض ایک نقطہ کے قیدی نہیں ہیں، بلکہ ہماری نگاہیں بھی اس کائنات کے ماضی میں جکڑی جا چکی ہیں۔

یہ آسمان تو خیر ہم سے بہت دور ہے۔ یہ بڑی دنیا کی باتیں ہیں اور ان باتوں سے ہمیں کیا لینا دینا۔ پریشانی والی بات تو یہ ہے کہ ہمیں ہماری اپنی دنیا، ہمیں ہمارے اپنے ہی اندر کی دنیا کے حالات کی بھی خبر نہیں ہے۔ ہمارے اپنے اندر کی دنیا بھی ہمارے لیے ایک بالکل اجنبی چیز ہے۔ دریا کنارے اپنے قیام کے دوران جب آپ آسمان سے محظوظ ہونے کے بعد واپس اٹھ کر بیٹھے تھے، جس وقت آپ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے چاروں جانب نگاہیں دوڑا رہے تھے، جب آپ دریا کے پانی میں سے چھینٹے اڑا رہے تھے اور جس وقت دریا کی ایک مچھلی آپ کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی تھی۔۔۔

آپ کی تنہائی کے ان تمام لمحات میں سیانا بھی ادھر موجود تھا۔ سیانا آپ کو دیکھ رہا تھا، آپ کے ہر ہر عمل کو بغور دیکھ رہا تھا۔ سیانے کے دماغ میں بلبلوں کی مانند سوالات بن رہے تھے، بکھر رہے تھے۔۔۔

''کائنات میں زندہ چیزیں کیسے وجود میں آ گئیں؟ کیا بے جان چیزوں سے
جاندار چیزیں خود بخود پیدا ہو سکتی ہیں؟ اور بات محض ایک زندگی کی تو نہیں ہے
اس کائنات میں تو ذی شعور انسان بھی پائے جاتے ہیں۔ اس کائنات میں

شعور کیسے اپنی جڑیں پکی کر گیا؟ کیا بے جان ایٹمز کی حرکات وسکنات سے خیالات اور احساسات جنم لے سکتے ہیں؟ چائے کے مخصوص ذائقے کو ہم اپنی زبان پر محسوس کیوں کرتے ہیں؟ ہم انسانوں کو نیند کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے؟ نیند کے دوران ایک انسان کہاں پر موجود ہوتا ہے؟ ان خوابوں کی حقیقت کیا ہے؟ اور کیا یہ دریا سے ابھرنے والی مچھلی بھی ایک ذی شعور ہستی ہے؟ کیا بھونکنے والے کتے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں؟ اور کیا رینگنے والی چھوٹی سی چیونٹی کے اندر بھی ایک ''میں'' موجود ہوتی ہے؟''

یہ سب اور ایسے ہی مزید بے شمار سوال سیانے کو تنگ کر رہے تھے، مگر سیانے کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں تھا۔ ہمارے اپنے اندر کی دنیا اس بڑی دنیا سے بھی کہیں بڑھ کر پیچیدہ ہے، نا قابلِ فہم ہے۔

ہم انسان خود اپنے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ہم کچھ بھی تو نہیں جانتے۔

پھر جس وقت آپ دریا کنارے بیٹھے ریت کے گھروندے بنا رہے تھے، گرا رہے تھے۔ ان لمحات میں بھی سیانا آپ ہی کو دیکھ رہا تھا، مگر آپ کی طرح سیانا ریت کے گیلے پن سے محظوظ نہ ہو سکا۔ سیانے کا ذہن کہیں اور ہی اٹک چکا تھا۔۔۔

''کیا ریت کا ہر ذرہ اپنے اندر ایک پوری کائنات چھپائے بیٹھا ہے؟ آخر چھوٹی دنیا کے طبعی قوانین ایک عام آدمی کی دنیا کے طبعی قوانین سے مختلف کیسے ہو سکتے ہیں؟ ایک چیز بیک وقت دو قسم کی حرکت کیسے کر سکتی ہے؟ ایک چیز بیک وقت بہت ساری جگہوں پر کیسے موجود ہو سکتی ہے؟ ایک دوسرے سے میلوں دور ہوتے ہوئے بھی دو الیکٹرونز آپس میں باتیں کیسے کر لیتے ہیں؟ کیا الیکٹرونز ہماری نگاہوں کو محسوس کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں؟ آخر اس چھوٹی دنیا میں یہ سب کھلواڑ کیسے ہو رہے ہیں؟ کیوں ہو رہے ہیں؟''

ایک بار پھر سے۔۔۔ان تمام چیزوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے۔

باتیں چھوٹی دنیا کی ہوں یا بڑی دنیا کی یا پھر شر انگیزیاں ہوں ہمارے اپنے ہی اندر کی دنیا کی؛ یہ سب چیزیں ہماری سمجھ سے بالاتر ہیں۔ یہ ساری باتیں ہماری عقل سے ماوراء ہیں۔ اب محض ایک عام آدمی کی دنیا باقی رہ جاتی ہے۔ میری اور آپ کی، ایک عام آدمی کی دنیا۔ ایسی دنیا جس میں ہم جیتے ہیں، ساری زندگی گزارتے ہیں۔ واپس عام آدمی کی دنیا میں چلتے ہیں اور یہاں کے حالات کی بھی کچھ خبر لیتے ہیں۔

دریا کنارے بیٹھے بیٹھے جب آپ کو گھڑی پر وقت دیکھ کر وقت کے زیادہ گزر جانے کا احساس ہوا تھا اور آپ اٹھ کر واپس اپنے کمرے میں چلے گئے تھے تو یہ سیانا اس وقت بھی ادھر ہی بیٹھا رہا تھا۔

سیانے کی سوچیں منتشر ہو چکی تھیں، سیانا پریشان تھا۔۔۔

''انسانی زندگیوں پر اتنا زیادہ اثر و رسوخ رکھنے والی چیز، یہ وقت آخر کیا چیز ہے؟ وقت ہمیشہ آگے کی جانب سرکتا ہوا کیوں محسوس ہوتا ہے؟ وقت کا دریا ہمیشہ ایک ہی سمت میں کیوں بہتا ہے؟ کیا اس وقت کو، وقت سے پہلے جانا جا سکتا ہے؟ کیا وقت کو شکست دی جا سکتی ہے؟''

سیانے کے اندر پریشانی بہت بڑھ چکی تھی۔ لاتعداد سوال سیانے کے اندر شور مچا رہے تھے، مگر سیانے کے پاس کوئی بھی جواب نہیں تھا۔ سیانا اب جام بنا کر پینے لگا تھا۔۔۔

''انسانی خواہشات لامحدود کیوں ہوتی ہیں؟ ایک محدود انسانی جسم میں لامحدود خواہشات کیسے بسیرا کر لیتی ہیں؟ کچھ انسانی خواہشات اچھی کیوں ہوتی ہیں؟ کچھ انسانی خواہشات بُری کیوں ہوتی ہیں؟ اچھے اور بُرے کا فرق کیسے پتہ چل جاتا ہے؟ چوری کرنا ایک بُری چیز ہے، مگر کیوں؟ ہم انسان اپنے ماحول میں موجود کچھ چیزوں کو، کچھ رویوں اور کچھ اعمال کو اچھا جانتے ہیں تو کچھ کو بُرا، مگر کیوں؟ ہمیں اپنے ماحول میں کچھ چیزیں خوبصورت دکھائی دیتی ہیں تو کچھ چیزیں بدصورت، مگر کیوں؟

اس زندگی میں کامیابی کسے کہنا چاہیے؟ ناکامی کیا چیز ہے؟

اور پھر سب سے بڑھ کر۔۔۔

Do we have Free-Will?

کیا ایک انسان اپنے اعمال کو منتخب کرنے کا اختیار رکھتا ہے؟ یا پھر انسان مجبورِ محض ہے؟''

سیانا اب جام پہ جام پینے لگا تھا۔ سیانے کے اردگرد، سیانے کے ماحول میں اور سیانے کے اپنے ہی وجود کے اندر، سیانے کے اپنے ہی اعمال اور رویوں میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں تھی، جس کی حقیقت سیانے کو معلوم ہو۔ سیانا نہیں جانتا تھا کہ۔۔۔

''شراب کیا چیز ہے اور شراب کے مخصوص ذائقے کو وہ اپنی زبان پر

محسوس کیوں کرتا ہے؟''

سیانے کے اندر گھٹن اب بڑھنے لگی تھی، بہت بڑھنے لگی تھی۔ سیانے کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ۔۔۔

''یہ کائنات حقیقت ہے؟ یا پھر انسانی شعور ایک حقیقت ہے؟''

انسان اور کائنات کا تعلق سیانے کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ سیانا کشمکش کا شکار تھا۔۔۔

''کیا انسان اس لامحدود کائنات میں چند ایٹمز کی شکل میں موجود ہے؟ یا پھر یہ لامحدود کائنات بھی انسان کے اپنے ہی اندر موجود ہے؟ کیا یہ تمام مادی کائنات انسانی شعور کا ایک حصہ ہے؟ کیا انسانی شعور اور یہ کائنات دونوں حقیقت ہیں؟ یا پھر یہ دونوں ہی دھوکا ہیں؟''

سیانے کو کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ سیانا تھک چکا تھا۔

سیانا اب آنکھیں بند کر کے بس اپنی زندگی میں خوش رہنا چاہتا تھا۔ سیانا اب سب کچھ بھول کر زندگی انجوائے کرنا چاہتا تھا۔ سیانا بھی اب ادھر جانا چاہتا تھا کہ جدھر سب جاتے ہیں۔ سیانے کو بھی اب بہتر معیارِ زندگی چاہیے تھا، لہٰذا آپ کے چلے جانے کے ٹھیک چالیس منٹ بعد سیانا بھی اٹھ کر کچھ فاصلے پر موجود اپنے دوستوں کے ساتھ ''پارٹی'' کرنے چلا گیا، لیکن۔۔۔

لیکن آپ کے اور سیانے کے سوا کوئی اور بھی تھا، جو ساری رات ادھر ہی بیٹھا رہا تھا۔ کوئی اور بھی تھا جو آپ کو اور سیانے کو دیکھ رہا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے تاریکی میں عبداللہ بھی موجود تھا۔

عبداللہ بھی پریشان تھا، عبداللہ کے اندر بھی گھٹن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عبداللہ کے دل و دماغ میں اب بس ایک ہی سوال گھوم رہا تھا۔۔۔

"Who Am I?"

عبداللہ ساری رات ادھر بیٹھا رہا۔ عبداللہ ساری رات خود سے یہ سوال پوچھتا رہا۔

عبداللہ کو کوئی جواب نہ مل سکا۔

پھر عبداللہ نے یہی سوال اس دنیا کے تمام سیانوں سے پوچھا، مگر عبداللہ کو اپنے سوال کا جواب نہ ملا۔ انسانی علم کی تمام ترقی اور پھیلاؤ کے باوجود، اس کرۂ ارض پر لاکھوں تعلیمی اداروں کی موجودگی کے باوجود، کروڑوں اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کی شب و روز کی محنت اور تحقیق کے باوجود۔۔۔

اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش عبداللہ کو ایک شناخت، ایک پہچان دینے میں ناکام رہے۔

عبداللہ کے سامنے اب بس دو ہی راستے تھے۔۔۔

یا تو اس دنیا کے سیانوں کی طرح عبداللہ بھی سب کچھ بھول جائے، عبداللہ بھی سب کچھ بھلا دے۔ عبداللہ بھی آنکھیں بند کر کے ایک اچھی سی ''پارٹی'' کرے۔ عبداللہ بھی اس دنیا کے سیانوں کی مانند اپنی لامحدود خواہشات کو خود اپنے ہی اندر دفن کر دے اور پھر اس ایک نقطے پر بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے لیے پاگل کتوں کی طرح دوڑے یا پھر۔۔۔

یا پھر ان سیانوں کو یہیں پر چھوڑ کر۔۔۔۔۔عبداللہ خود کو جاننے کا یہ سفر جاری رکھے۔

عبداللہ کے سامنے بس دو ہی راستے تھے۔۔۔

پارٹی؟؟؟۔۔۔۔۔یا پھر۔۔۔۔میں کون ہوں؟

اور عبداللہ کا انتخاب تو ہمیشہ بس ایک ہی ہو گا۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

گزرے زمانے کی بات ہے کہ ایک دھوبی ہوا کرتا تھا۔ اس دھوبی کے پاس ایک کتا تھا اور ایک گدھا۔ دھوبی ہر صبح ساری بستی سے میلے کپڑے اکٹھے کرتا اور پھر گدھے پر کپڑے رکھ کر بستی کے قریب موجود ایک گھاٹ پر چلا جاتا۔ وہ سارا دن کپڑے دھو کر دھوپ میں پھیلاتا رہتا اور پھر شام کے وقت کپڑے اکٹھے کر کے گدھے پر رکھتا اور گھر واپس آ جاتا، جبکہ دھوبی کی غیر موجودگی میں کتا دھوبی کے گھر کی حفاظت کیا کرتا تھا۔ کتا سارا دن گھر کے دروازے پر لیٹا اونگھتا رہتا۔ کوئی شخص قریب سے گزر جاتا تو کتا ایک آنکھ کھول کر اسے دیکھ لیتا، وگرنہ سارا دن سستی کی چادر اوڑھ کر سوئے رہنا ہی اس کتے کا معمول تھا۔

ہوا یوں کہ دھوبی کا گدھا پہلے بیمار ہوا اور پھر مر گیا۔ دھوبی بڑا پریشان ہوا، کیوں کہ اب گھاٹ پر کپڑے لے کر جانا اس کے لیے ایک مسئلہ بن چکا تھا۔ دھوبی کے پاس اتنے پیسے بھی موجود نہیں تھے کہ وہ ایک اور گدھا خرید سکے۔ بہت سوچ بچار کے بعد دھوبی نے یہی فیصلہ لیا کہ۔۔۔

''یہ کتا جو سارا دن گھر پر فارغ پڑا اونگھتا رہتا ہے، کپڑوں کو گھاٹ پر منتقل کرنے کے لیے اس کتے کو استعمال کرنا چاہیے۔''

پھر اگلے ہی دن دھوبی نے اپنے اس فیصلے پر عمل درآمد بھی شروع کر دیا۔

شروع شروع میں کتا اس نئے اور تبدیل شدہ حالات پر بڑا خوش ہوا۔ اب اس کتے کو پورا شہر گھومنے کو مل رہا تھا۔ گھاٹ پر بھی سارا دن رونق لگی رہتی تھی، لیکن کچھ دنوں میں ہی کپڑوں کے بھاری بوجھ تلے کتے کی کمر پتلی ہو گئی۔ کتے کے لیے کپڑوں کا بھاری بوجھ اٹھانا ناممکن حد تک مشکل ہو گیا۔ اسے اب گھر پر فراغت میں گزارے ہوئے دن یاد آنے لگے تھے، لہٰذا کتے نے دھوبی کی منت

سماجت کر کے اپنی ڈیوٹی واپس گھر کی چوکیداری پر لگوالی۔

گھر کی دہلیز پر سارا دن فارغ لیٹ کر کتے نے اپنی تھکاوٹ دور کی۔ کچھ دن تو بہت اچھے گزرے، لیکن پھر کتے کو ادھر بھی بوریت کا احساس ہونے لگا۔شہر اور گھاٹ کی رونقیں اسے بار بار یاد آنے لگی تھیں۔گھر کی ویرانی اب خود کتے کو ہی کاٹ کھانے کو آ رہی تھی۔اب کتا سارا دن گھر کی دہلیز پر آنکھیں بند کیے بس یہی سوچتا رہتا کہ وہ کیا کرے۔۔۔

''اگر وہ دھوبی کے ساتھ گھاٹ پر جاتا ہے تو اسے اپنی طاقت سے زیادہ بوجھ اٹھانا پڑتا ہے، جبکہ گھر کی ویرانی میں سارا دن پڑے بس اونگھتے رہنا بھی کوئی زندگی تھوڑی نہ ہوتی ہے۔''

کتا پریشان تھا اور۔۔۔

اور ایک بات تو مجھے بھی اپنی ساری زندگی میں کبھی سمجھ نہیں آئی کہ ان خواہشات کے پیچھے بھاگنا زیادہ بہتر ہوتا ہے؟۔۔۔۔۔یا ان خواہشات کو چھوڑ دینے میں زیادہ سکون ہے؟

دھوبی کا کتا ہوں میں بھی کیا؟

اگر خواہشات کے پیچھے بھاگنا نہیں تو پھر۔۔۔

ایک انسان میں ان خواہشات کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

کیا خواہشات اس لیے ہوتی ہیں کہ ان کا گلا گھونٹ دیا جائے؟۔۔۔۔۔ولادت سے پہلے ہی ان کو مار دیا جائے؟۔۔۔۔۔کیا خواہشات اس لیے ہوتی ہیں کہ انہیں برداشت کیا جائے؟

اپنی نگاہوں کے سامنے اپنی ہی خواہشات کو سسکتے اور مرتے دیکھنا،ضروری ہے کیا؟

پھر اگر خواہشات کے پیچھے بھاگنا چاہیے تو۔۔۔۔۔۔انسانی خواہشات تو لامحدود ہوتی ہیں۔

خواہشات کا سفر تو دائرے کا سفر ہے۔۔۔۔۔کبھی ختم نہ ہونے والا، دائرے کا سفر۔

دائرے کے سفر میں نہ تو کوئی آغاز ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی انجام۔

بس گھومتے جاؤ، گھومتے جاؤ۔۔۔۔۔گول گول، گول گول۔

بالکل ایسے جیسے کوئی کتا اپنی دُم پکڑنے کی لاحاصل کوشش میں گھومتا ہے۔

خواہشات کے سفر میں تو سر گھومنے لگتا ہے، چکر آتے ہیں، پسینہ بہتا ہے۔

کیا میں کنویں کا مینڈک ہوں؟

کنویں کا وہ مینڈک جو کسی بھی طرح کنویں سے باہر نکل آیا ہے اور آپ جانتے ہیں ناں؟

کنویں کا مینڈک اگر ایک بار کنویں سے باہر نکل آئے تو پھر وہ کنویں کا مینڈک نہیں رہتا۔

پھر۔۔۔۔۔پھر وہ دھوبی کا کتا بن جاتا ہے۔

دھوبی کا کتا۔۔۔۔۔جو نہ تو گھر کا ہوتا ہے اور نہ ہی گھاٹ کا۔

کنویں سے باہر نکلنے والا یہ مینڈک اگر واپس کنویں میں جائے تو اب کنویں کا چھوٹا پن محسوس ہونے لگتا ہے، کاٹ کھانے کو آتا ہے، جبکہ کنویں سے باہر کی دنیا تو بہت بڑی ہوتی ہے۔ خاص طور پر کنویں کے ایک مینڈک کے لیے۔ اچھا تو پھر۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

کنویں کا ایک مینڈک ہوں؟۔۔۔۔۔یا پھر دھوبی کا کتا ہوں؟

میں چندو ہوں؟۔۔۔۔۔یا پھر چارلی ہوں؟

میں نقطہ کا قیدی ہوں؟۔۔۔۔۔یا وقت کا غلام ہوں؟۔۔۔۔۔یا پھر غلام ابنِ غلام ہوں؟

''میں کون ہوں؟''

کیا میں ایک نام ہوں؟۔۔۔۔۔ایک ایسا نام جو میرا اپنا اختیار کردہ نہیں۔

کیا ساری زندگی بس یہ ایک نام ہی میری پہچان اور شناخت رہے گا؟

میری موت پر کیا ہوگا؟۔۔۔۔۔کیا ایک نام کا اس دنیا سے خاتمہ ہو جائے گا اور بس؟

کیا میں ایک بائیولوجیکل مشین ہوں؟۔۔۔۔۔یا ایک خودکار روبوٹ ہوں؟

کیا میں اپنے ہی دماغ کی ایک چال ہوں؟۔۔۔۔۔کیا میرے تمام احساسات اور جذبات محض میرا واہم ہیں؟۔۔۔۔۔کیا میرا ماضی ایک فریب ہے؟۔۔۔۔۔کیا میں ایک دھوکا ہوں؟

آخر میں کون ہوں؟

شاید۔۔۔۔۔شاید میں پاگل ہوں۔

نہیں نہیں۔۔۔۔۔یقیناً میں پاگل ہوں۔

میں ایک صحیح سوال غلط لوگوں سے پوچھتا چلا آرہا ہوں۔

اس دنیا کے یہ صاحبانِ علم و دانش، یہ سیانے لوگ، یہ سب مصروف ہیں۔ انہیں ایٹم بم بنانے ہیں۔ یہ کلوننگ کے ذریعے ایک نئے انسان کو پیدا تو کر سکتے ہیں، لیکن پہلے سے موجود انسانوں کو ایک شناخت اور پہچان دینا ان سیانوں کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ کھوکھلے لوگ، یہ خود سے ناآشنا لوگ ہیں۔ یہ کسی دوسرے انسان کو پہچان کیا دیں گے؟

یہ سیانے لوگ تو خود اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں، یہ کسی اور کو منزل پر کیسے پہنچا سکتے ہیں؟

ان سیانوں کی تو خود اپنی ''میں'' مر چکی ہے یہ کسی اور کو ''میں'' کا پتہ کیا بتائیں گے؟

آپ جانتے ہیں کہ ایک بار اگر انسان کی ''میں'' مرجائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

اگر انسان کی ''میں'' مرجائے تو پھر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ لباس پہننا ایک اچھی چیز ہے یا بُری۔ پھر چور کو چوری سے روکنے کے تمام عقلی دلائل ختم ہوجاتے ہیں۔ پھر انسان کا دماغ خود انسان کے اپنے ہی خلاف سازشیں کرنے لگتا ہے اور پھر پورے کا پورا انسان ایک دھوکا بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر انسان کی ''میں'' مرجائے تو محض ایک کمپیوٹر باقی رہ جاتا ہے، ایک بائیولوجیکل مشین بچ جاتی ہے۔

بالکل ویسی ہی بائیولوجیکل مشین جیسی مشین ایک کتا ہے۔

اگر انسان کی ''میں'' مرجائے تو گدھا، کتا، سور، انسان اور بھیڑیے۔۔۔

سب برابر ہوجاتے ہیں۔

نہیں نہیں۔۔۔۔۔شاید میں غلط بول رہا ہوں۔ مری ہوئی ''میں'' والے انسان کو جانوروں کے ساتھ ملا دینا ان جانوروں کے ساتھ ظلم ہے، زیادتی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اگر ایک انسان کی ''میں'' مرجائے تو پھر انسان ان جانوروں سے بھی بڑا جانور اور درندہ بن جاتا ہے۔

میرا یقین کیجیے، یہ کتا بے چارہ تو بس نام کا ہی کتا ہوتا ہے۔ وگرنہ وفاداری میں اپنی مثال آپ ہے یہ کتا۔

نمک حرامی کی ساری داستانیں تو انسانوں کی اپنی رقم کی ہوئی ہیں۔

اپنی اپنی حکومت قائم کرنے کے لیے لڑتے ہوں گے جنگل کے دو شیر آپس میں کتوں کی طرح۔۔۔لیکن یہ نسل در نسل چلنے والی لڑائی، یہ دادا کے جرم میں پوتے کا مارا جانا۔۔۔

یہ سب تو بس انسانیت کا ہی ایک خاصہ ہے۔

یہ سور اور سور کے بچے۔۔۔۔۔ہوتے ہوں گے جنسی بے راہ روی کا شکار۔

مگر یہ انسان۔۔۔۔۔یہ مری ہوئی میں والا انسان۔

میں تو اپنے معصوم بچوں کی آبرو باختہ لاشیں اٹھا اٹھا کر تھک چکا ہوں۔

بس۔۔۔۔۔بس ہوگئی ہے اب کی بار تو۔ اب اور ہمت نہیں رہی ہے۔

جانتے ہیں اگر انسان کی ''میں'' مرجائے تو کیا ہوتا ہے؟

اگر انسان کی ''میں'' مرجائے تو پھر دولت کی ''ت'' بڑی، بہت بڑی ہوجاتی ہے۔ یہ بڑی ''ت'' خرید لیتی ہے پھر سب کچھ، نگل جاتی ہے ہر چیز کو۔ یہ بڑی ''ت'' بلا کی زمانہ شناس ہوتی ہے۔ اڑتی چڑیا

کے پر گن لیا کرتی ہے۔ بالکل کسی چکلے پر بیٹھی زِیرک نائکہ کی مانند اسے پتہ ہوتا ہے سب۔۔۔

کس کو کیا چاہیے؟۔۔۔۔۔اور کس سے کیا مل سکتا ہے؟

یہ بڑی ''ت'' قیمت ہی کچھ ایسی لگاتی ہے کہ سب بک جاتا ہے۔

محبت نفرت، گاہک دوکاندار، عوام وخواص۔۔۔۔۔سب بک جاتا ہے۔

دفتر کے باہر کھڑا چپڑاسی بکتا ہے۔۔۔۔۔اندر کرسی پر بیٹھا افسر بکتا ہے۔

مرد کی مردانگی، عورت کی نسوانیت۔۔۔۔۔سب بکتا ہے، سب بک رہا ہے بازار میں۔

بس ایک چیز۔۔۔۔۔بس ایک چیز نہیں بکتی کبھی بھی۔

یہ ''میں'' نہیں بکتی کبھی بھی۔۔۔۔۔یہ ''میں'' نہیں جھکتی کبھی بھی۔

یہ ''میں'' بڑی قیمتی ہوتی ہے۔۔۔۔۔دولت کی بڑی ''ت'' بھی اسے خریدنے میں ناکام رہتی ہے۔

یہ ''میں'' بڑی انا والی ہوتی ہے۔۔۔۔۔یہ ''میں'' بڑی غیرت والی ہوتی ہے۔

یہ ''میں'' بڑی۔۔۔۔۔''میں'' والی ہوتی ہے۔

اپنی نگاہوں کے سامنے ایک ماں، بہن، بیٹی کی خرید وفروخت دیکھ نہیں پاتی۔

آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

معصوم بچوں کی لاشوں پر چپکے چپکے ماتم کرتی رہتی ہے۔ چھپ چھپ کر رو بھی دیتی ہے۔

اندر ہی اندر شور وغل مچاتی ہے، چیختی ہے، چلّاتی ہے اور پھر۔۔۔

رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے۔۔۔

اپنی ہی بے بسی میں بے بس ہو کر ایک دن۔۔۔۔۔یہ ''میں'' مر جاتی ہے۔

بِنا بتائے، بِنا اطلاع دیئے۔۔۔۔۔یہ ''میں'' مر جایا کرتی ہے۔

یہ ''میں'' بکتی نہیں کبھی بھی۔۔۔۔۔یہ ''میں'' جھکتی نہیں کبھی بھی۔

ایک انسان کے بکنے سے پہلے ہی یہ مر جایا کرتی ہے۔

اور ستم دیکھیے!

اس ''میں'' کی موت سے سب لاعلم رہتے ہیں۔۔۔۔۔اس سانحہ کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔

اس ''میں'' کی موت پر کوئی نہیں روتا۔۔۔۔۔اس ''میں'' کی کبھی تدفین نہیں ہوتی۔

یہ ''میں'' اپنی لاش پر خود ہی رو کر خود ہی چپ ہو جاتی ہے۔

اس ''میں'' کے کبھی کوئی آنسو صاف نہیں کرتا۔۔۔۔۔اس ''میں'' کو کبھی کوئی چپ نہیں کرواتا۔

یہ ’’میں‘‘ روتے، روتے، روتے۔۔۔۔۔خود ہی چپ ہو جاتی ہے۔
یہ ’’میں‘‘ چپ ہوتے، ہوتے، ہوتے۔۔۔۔۔ایک دن چپ ہو جاتی ہے۔
اور۔۔۔۔۔اور جانتے ہیں کہ اگر یہ ’’میں‘‘ چپ ہو جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟
پھر ہر جگہ اُلّو بولنے لگتے ہیں۔درختوں سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ویرانیاں کچھ بڑھ جاتی ہیں۔
جانتے ہیں اگر ’’میں‘‘ چپ ہو جائے۔۔۔۔۔اگر ’’میں‘‘ مر جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟
پھر انسان مر جاتا ہے۔۔۔۔۔انسانیت مر جاتی ہے۔
بس۔۔۔۔۔ایک رذیل ترین جانور باقی رہ جاتا ہے۔اس دھرتی پر ایک بوجھ باقی بچ جاتا ہے۔
اگر میں مر جائے تو۔۔۔

لیکن۔۔۔۔۔لیکن کیا اس مری ہوئی میں کو زندہ کیا جا سکتا ہے؟
کیا ایک حیوان کو پھر سے انسان بنایا جا سکتا ہے؟
کیا بہروں کو سنایا جا سکتا ہے؟۔۔۔۔۔کیا اندھوں کو دکھایا جا سکتا ہے؟
اور کیا۔۔۔۔۔کیا مردوں کو زندہ کیا جا سکتا ہے؟

یہ بات کچھ زیادہ پرانی بھی نہیں ہوگی کہ ایک بادشاہ ہوا کرتا تھا۔ یہ بادشاہ صرف بادشاہ ہی نہیں بلکہ ’’بھولا بادشاہ‘‘ بھی تھا۔ یہ بادشاہ بڑا حسّاس اور نیک دل تھا۔ ہوا یوں کہ مرتے، مرتے اس بادشاہ کی قوم کے ہر فرد کی ’’میں‘‘ مر گئی۔ بادشاہ نے ہر ممکن طریقہ اپنایا کہ کسی طرح سے قوم کی مری ہوئی ’’میں‘‘ کو زندہ کیا جا سکے۔ بادشاہ کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود قوم کی مری ہوئی ’’میں‘‘ زندہ نہ ہو سکی۔ بادشاہ قوم کی اس حالتِ زار پر بہت پریشان رہنے لگا تھا۔ وہ سارا دن بیٹھا بس مری ہوئی ’’میں‘‘ کو زندہ کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈتا رہتا۔ بہت غور و فکر کے بعد بھی جب بادشاہ کو کچھ سمجھ نہ آیا تو اس نے یہی مناسب سمجھا کہ اس دنیا کے صاحبانِ علم و دانش کی مدد حاصل کی جائے۔

بادشاہ نے علمی دنیا کے تمام بڑوں کو شاہی محل کھانے پر بلایا اور اپنی پریشانی بتا کر اس کا حل ڈھونڈنے کی درخواست کی۔ تمام سیانوں نے کچھ دیر آپس میں مشورہ کیا اور پھر اس وعدے کے ساتھ بادشاہ سے رخصت طلب کی کہ وہ دس سال کے اندر اندر مری ہوئی ’’میں‘‘ کو زندہ کرنے کا کوئی نسخہ ضرور ڈھونڈ نکالیں گے۔

بادشاہ کے محل سے واپس لوٹ کر سیانوں نے علم و دانش کے تمام حلقوں میں منادی کروادی کہ مری ہوئی ’’میں‘‘ کو زندہ کرنے کا کوئی عملی طریقہ ڈھونڈا جائے۔ پوری دنیا کے تمام محقق اپنے سبھی کام چھوڑ کر

صرف اسی ایک کام میں مصروف ہو گئے۔علم کی دنیا کے سبھی بڑے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔

بڑی بڑی کانفرنسز کا انعقاد کیا گیا۔۔۔۔۔جگہ جگہ مذاکرات ہوئے۔

سیمینارز ترتیب دیے گئے۔

بحث وتمحیص کے انبار لگائے گئے۔۔۔۔۔منطق اور فلسفہ کی بحثیں چھیڑی گئیں۔

ہزاروں مقالہ جات لکھے گئے۔۔۔۔۔بہت سی کتب تقسیم ہوئیں۔

سائیکالوجسٹ سے مشورے لیے گئے۔۔۔تجربہ کار لوگوں کا تجربہ نچوڑا گیا۔۔۔

ماہرینِ عمرانیات اور معیشت دانوں کی زندگیوں کے حاصل اکٹھے کیے گئے۔

الغرض دنیا میں موجود تمام دانشوروں کی دانش اور سیانوں کی عقل مندی کو محض اسی ایک کام کے لیے مختص کر دیا گیا اور اس ساری بھاگ دوڑ کے نتائج بھی برآمد ہوئے۔

آٹھویں سال۔۔۔۔۔محض آٹھویں ہی سال علم کی دنیا کے بڑوں نے بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر مری ہوئی ''میں'' کو زندہ کرنے کا نسخہ بادشاہ کے حوالے کر دیا۔

بادشاہ کو بتایا گیا کہ قوم کی مری ہوئی ''میں'' کو زندہ کرنے کا بس ایک یہی طریقہ ہے کہ قوم کے ہر فرد کی انا پر براہِ راست وار کیے جائیں۔قوم کے ہر فرد کی توہین کی جائے۔قوم کے ساتھ کچھ ایسا رویہ رکھا جائے کہ جس سے قوم کا ہر فرد اپنی بے عزتی محسوس کرے۔اس سے قوم میں ہلچل پیدا ہو گی،لوگ اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہونا شروع ہوں گے،تحریکیں چلیں گی۔قوم متحد ہونا شروع ہو جائے گی۔قوم میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گی۔قوم کی مری ہوئی ''میں'' پھر سے زندہ ہونے لگے گی۔

لٰہذا بادشاہ کو یہ تجویز دی گئی کہ قوم کے ہر فرد کو صبح وشام کان پکڑوا کر،مرغا بنا کر دس دس جوتے لگائے جائیں اور حکمت بھرے اس نسخے پر عمل کرتے وقت رنگ ونسل یا پھر جنس وعمر کے اعتبار سے کسی بھی قسم کا کوئی امتیاز نہ برتا جائے۔

اگرچہ بادشاہ دل سے اس ''نسخۂ شفاء'' پر عمل کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھا،لیکن علم کی دنیا کے بڑوں نے اپنی محنت اور تحقیق کے گن گا کر،اپنی ذہانت اور فطانت کی مدح سرائی کر کے باشاہ کو یہ باور کروا ہی دیا کہ۔۔۔

''یہ نسخہ نہ صرف منطق کے اصولوں پر پورا اترتا ہے،بلکہ انسانی نفسیات کے بھی عین مطابق ہے۔''

چاروناچار بادشاہ نے مرئی ہوئی ''میں'' کو زندہ کرنے کے اس نسخے پر عمل درآمد کا حکم جاری کر دیا۔

اگلے ہی دن قوم کے ہر فرد کو صبح سویرے سویرے کان پکڑوا کر، مرغا بنا کر دس دس جوتے لگائے گئے اور کچھ یہی عمل رات کو سونے سے بس۔۔۔۔۔ ذرا پہلے دہرایا گیا۔

بادشاہ کی جانب سے عوام کو یہ دو خوراکیں دوا کے طور پر دی جانے لگیں۔

عوام بادشاہ کے اس بدلے ہوئے رویے پر بہت پریشان تھی۔ لوگوں کو سمجھ نہیں آرہی تھی کہ۔۔۔

''اتنا اچھا اور نیک سیرت بادشاہ آخر ظلم پر آمادہ کیسے ہو گیا ہے؟''

جگہ جگہ لوگ ہجوم کی شکل میں کھڑے ہوئے بادشاہ کے اس بدلے ہوئے طور طریقوں پر اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ قوم میں موجود قوم کے اپنے ''سیانوں'' نے بادشاہ کے اس عمل کا تجزیہ کر کے قوم کو ان جوتوں کے ممکنہ فوائد اور نقصانات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

کچھ جذباتی قسم کی تحریریں لکھی گئیں۔۔۔۔۔ قوم کے جوشیلے نوجوان تھوڑا اور جوشیلے ہو گئے۔

احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں۔۔۔۔۔ تیس تیس منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔

بادشاہ کی تصاویر کو آگ لگا لگا کر جوتوں کا بدلہ لیا گیا۔

مطلب۔۔۔۔۔ مطلب قوم میں کچھ تبدیلی آرہی تھی۔ قوم میں کچھ ہلچل ہونے لگی تھی۔

یا یوں سمجھ لیں کہ قوم کی مری ہوئی ''میں'' کچھ کچھ زندہ ہونے لگی تھی۔

دوسری جانب بادشاہ اپنی قوم میں پیدا ہونے والے ان تمام تغیرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ بادشاہ قوم میں پیدا ہوتی ''میں'' دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا، لہٰذا بادشاہ کی جانب سے قوم کے ہر فرد کو مرغا بنا کر دس دس جوتے لگانے کے اس سلسلے کو جاری رکھنے کا اعلان کر دیا گیا۔

مگر پھر ہوا یوں کہ رفتہ رفتہ۔۔۔۔۔ دھیرے دھیرے۔۔۔۔۔ ہولے ہولے۔۔۔۔۔

قوم میں پیدا ہونے والا یہ سارا جوش و جذبہ سوڈے پر آئے جھاگ کی مانند بیٹھتا ہی چلا گیا۔ قوم نے ان جوتوں کو بھی زندگی کی ایک تلخ حقیقت سمجھ کر قبول کر لیا۔ محض چند ہفتوں بعد ہی پوری قوم مرغا بن کر دس دس جوتے کھانے کی ایسی عادی ہو چکی تھی کہ یہ سب عمل بھی اب انہیں دن کی دیگر مصروفیات کی مانند دکھائی دینے لگا تھا۔

سب کچھ واپس اپنی اپنی جگہ پر پہنچ گیا۔۔۔۔۔ قوم کی مری ہوئی ''میں'' کچھ مزید مر گئی۔

بادشاہ نے اس صورتحال سے پریشان ہو کر ایک بار پھر سے علمی دنیا کے بڑوں سے رابطہ کر کے اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ سبھی سیانے ایک بار پھر سے سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ علم و تحقیق کے ایک نئے دور کا آغاز ہو گیا۔

کانفرنسز، مذاکرات، سیمینارز اور مقالہ جات۔۔۔ بحث و تمحیص، منطق و فلسفہ، دلائل اور کتابیں۔

اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد بادشاہ کو ترمیم شدہ نسخۂ شفاء تھما دیا گیا۔اس نئے نسخے کے مطابق قوم کو اب زیادہ محرکات کی ضرورت تھی۔قوم کو اب دس دس نہیں بلکہ پچاس پچاس جوتوں کی ضرورت تھی۔

طوعاً و کرھا، بادشاہ نے ترمیم شدہ نسخہ اپنے سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔اگلی صبح جب قوم کے ہر فرد کو مرغا بنا کر دس کی جگہ پچاس جوتے لگائے گئے تو قوم میں غم و غصہ کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

لیکن اب کی بار تشویش بہت زیادہ تھی۔اب کی بار جوتے بھی تو بہت زیادہ تھے۔

قوم کے جوانوں کو اپنے جذبات قابو میں رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔۔۔۔۔نوجوان نسل تو بزرگوں کے ہاتھوں سے پھسل پھسل جارہی تھی۔۔۔۔۔شہر شہر احتجاجی ریلیاں نکالی گئیں۔ہنگامہ آرائی ہوئی۔

مظاہرے کیے گئے۔۔۔۔۔جذباتی تحریریں جلتی پر تیل کا کام کر رہی تھیں۔

قوم اب جاگی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔۔۔۔۔قوم کی مری ہوئی ''میں'' زندہ ہو رہی تھی، حتیٰ کہ قوم کے سرکردہ افراد نے ایک میٹنگ بھی طلب کی، جس میں بادشاہ سے دوٹوک بات کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور پھر اگلے ہی دن قوم کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر بادشاہ کے محل کی جانب دوڑا چلا آ رہا تھا۔

پُر جوش ہجوم کو اپنے محل کی جانب آتا دیکھ کر بادشاہ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو بہنے لگے۔بادشاہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ۔۔۔

''آج اس سے ظلم کا حساب لیا جائے گا۔آج محل کی اینٹ سے اینٹ بجے گی۔آج اس کا سر نیزوں پر اچھالا جائے گا۔''

وہ نیک دل بادشاہ ایسا اچھا تھا کہ اپنی جان قربان کرنے میں بھی خوشی محسوس کر رہا تھا۔آج بادشاہ کا برسوں پرانا خواب پورا ہو رہا تھا۔قوم کی مری ہوئی ''میں'' زندہ ہو چکی تھی۔

شاہی محل کے دروازے پر پہنچ کر قوم کے بڑوں کا ایک وفد بادشاہ کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے محل کے اندر آ گیا، جبکہ باقی پوری قوم باہر کھڑی ہو کر ان مذاکرات کے نتائج کا انتظار کرنے لگی تھی۔

بادشاہ سے مذاکرات کرنے کے لیے آئے وفد کا سربراہ بادشاہ سے کچھ یوں مخاطب ہوا:

''بادشاہ سلامت! آپ کے حکم پر قوم کے ہر فرد کو صبح و شام پچاس پچاس جوتے لگائے جارہے ہیں۔قوم ظلم اور ناانصافی کے اس دستور کو ماننے سے انکار کرتی ہے۔آپ کے اس حکم کے خلاف پوری قوم سراپا احتجاج ہے۔

بادشاہ سلامت! آپ جانتے ہیں نہ کہ آپ کے سپاہیوں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔دیکھیے۔۔۔۔۔ذرا باہر دیکھیے۔۔۔۔۔عوام کے اس ٹھاٹھیں مارتے

ہوئے سمندر کو دیکھیے۔عوام کے اس جمِ غفیر کے سامنے آپ کے یہ محض چند سپاہی
کچھ بھی تو حقیقت نہیں رکھتے۔عوام بہت زیادہ ہے اور آپ کے سپاہی بہت ہی
کم۔ابھی بھی وقت ہاتھوں سے پھسلا نہیں ہے۔ملک وملت کو ہونے والے اس
نقصان سے بچایا جا سکتا ہے۔عوام بہت زیادہ ہے اور آپ کے سپاہی بہت ہی
کم۔پھر مزید ستم ظریفی دیکھیے کہ اب کی بار جوتے بھی بہت زیادہ ہیں۔
بادشاہ سلامت! آپ ایسا کریں کہ جوتے مارنے والے سپاہیوں کی تعداد
بڑھا دیں۔جوتے کھانے والی عوام بہت زیادہ ہے اور جوتے مارنے
والے سپاہی بہت کم۔وقت بہت ضائع ہو جاتا ہے۔ہر شخص کو گھنٹوں
انتظار کرنا پڑتا ہے، تب جا کر کہیں۔۔۔''

اب کی بار جوش بہت زیادہ تھا۔اب کی بار جوتے بھی تو بہت زیادہ تھے۔

قوم کے غیرت وحمیت کے اس عملی مظاہرے پر۔۔۔۔قوم کی دن دیہاڑے کی اس دیدہ دلیری پر۔۔۔۔انسان کی مری ہوئی ''میں'' کو اپنی نگاہوں کے سامنے زندہ ہوتے دیکھ کر اس بادشاہ کے، میرے اس بھولے بادشاہ کے چہرے کے تاثرات قابلِ دید تھے۔۔۔

پہلے بادشاہ حیران ہوا۔۔۔۔۔اور پھر مزید حیران۔

اس کے بعد بادشاہ کی حیرانی پریشانی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

پھر بادشاہ کے چہرے پر بے بسی کے تاثرات نمایاں ہوئے۔۔۔۔۔اور پھر اسی بے بسی میں کچھ آنسو بھی بادشاہ کے گالوں پر پھسل گئے۔

پھر بادشاہ کو غصہ آیا۔۔۔۔۔پھر اور بہت سا غصہ آیا۔

غصے پر قابو پانے کی کوشش میں بادشاہ کے جسم میں ہلکا ہلکا ارتعاش بھی پیدا ہوا۔

مگر کچھ دیر بعد بادشاہ پُرسکون ہو گیا۔۔۔۔۔اور پھر بالکل پُرسکون ہو گیا۔

یوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔۔۔۔۔یوں جیسے بادشاہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا ہو۔

بادشاہ خاموشی کے ساتھ اٹھ کر ایک دیوار کی جانب بڑھ گیا اور بادشاہ نے دیوار کے ساتھ لگی اپنی نیام میں سے تلوار باہر نکال لی اور پھر۔۔۔

بادشاہ نے اپنی قوم کے ان سرکردہ افراد کو کچھ نہیں کہا۔بادشاہ نے خودکشی بھی نہیں کی۔

بس۔۔۔بادشاہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے چپ چاپ محل سے باہر نکل گیا۔

بادشاہ نے بادشاہت اور محل۔۔۔۔۔سب چھوڑ دیا۔
بادشاہ نے قوم اور قوم کی تازہ تازہ زندہ ہوئی ''میں''۔۔۔۔۔دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔
وہ دن ہے اور آج کا۔۔۔
بادشاہ ننگی تلوار ہاتھ میں لیے گھومتا رہتا ہے قریہ قریہ۔۔۔۔۔گلی گلی۔۔۔۔۔اور شہر شہر۔
بادشاہ کی بے چین نگاہوں کو بس ایک ہی تلاش ہے۔
بھولے بادشاہ کی اس تلاش میں۔۔۔۔۔آپ بادشاہ کا ساتھ دیں گے ناں؟
ننگی تلوار ہاتھ میں لیے بادشاہ ڈھونڈ رہا ہے اس دنیا کے سیانوں کو۔
بادشاہ ڈھونڈ رہا ہے مری ہوئی ''میں'' زندہ کرنے کا نسخہ بتانے والے دانشوروں کو۔
بادشاہ کی اس تلاش میں۔۔۔۔۔آپ بادشاہ کا ساتھ دیں گے ناں؟
اور شاید اب وہ وقت آ چکا ہے کہ ہمیں بھی ان نام نہاد ''صاحبانِ علم و دانش'' سے اپنی جان چھڑوا لینی چاہیے۔ان عقل زدہ لوگوں کو یہیں پر چھوڑ دیتے ہیں۔
اسی جگہ دفن کر دیتے ہیں اس دنیا کے تمام سیانوں کو ان کی سبھی سیانی باتوں کے ساتھ۔
گرا دیتے ہیں ہر وہ چکلہ، کوٹھا اور ہر وہ عمارت، جہاں علم کے نام پر جہالت بانٹی جا رہی ہے۔
آگ لگا دیتے ہیں ہر اس کتاب اور ہر اس تحریر کو۔۔۔۔۔جس میں ''میں'' موجود نہیں ہوں۔
پھر ہم کسی اور دنیا میں چلتے ہیں۔۔۔۔۔ہم کسی اور ہی دنیا میں چلتے ہیں۔
ایک ایسی دنیا کہ جس میں ہر سو بس ''میں'' ہوں۔
آیئے! صاحبانِ بصیرت کی ہم نشینی اختیار کرتے ہیں۔
اندھوں کی اس بستی میں کسی دیکھنے والے کے پاس چلتے ہیں۔
مُردوں کے اس شہر میں کسی زندہ انسان سے بات کرتے ہیں۔
آیئے! اس محدود کنویں سے باہر ایک لامحدود سمندر میں واپس چلتے ہیں۔
اپنے ذہن کو وسعت دیتے ہیں۔۔۔۔۔اپنی عقل کی حدود کو پہچانتے ہیں۔
اپنی سوچ کو بڑا کرتے ہیں۔۔۔۔۔اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہیں۔
ہر سوال کا، ہر ہر سوال کا جواب موجود ہے۔۔۔۔۔ہر ہر مسئلے کا حل موجود ہے۔
بس ایک انسان کی۔۔۔۔۔ایک زندہ انسان کی ضرورت ہے۔
میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں آپ کو۔۔۔۔۔بہت پرانا ساتھ ہے آپ کا اور میرا۔

یوں حیران مت ہوں آپ مجھے نہیں جانتے۔۔۔۔۔میں آپ کو جانتا ہوں۔
آپ کے آباء سے بھی مراسم رہے ہیں میرے۔آپ کی آنے والی نسلیں بھی میری نگاہوں میں ہیں۔
آپ کے پاس ہوں میں۔۔۔۔۔آپ کے آس پاس ہوں میں۔
بس چپ ہوں، خاموش ہوں۔۔۔۔۔دیکھ رہا ہوں، سن رہا ہوں۔
اور ایک دن بولوں گا بھی۔
جس دن میں بولوں گا، پھر ہر سو خاموشی چھا جائے گی۔۔۔۔۔پھر سب چپ ہو جائیں گے۔
آپ مجھے نہیں جانتے، میں آپ کو جانتا ہوں۔
بتا دوں آپ کو آپ کی زندگی کے تمام مسائل، الجھنیں اور پریشانیاں؟
وہ بھی بس ایک ہی لفظ میں۔
تنگ کرتی رہتی ہیں ناں؟ بھاگنا پڑتا ہے ناں؟ لاکھ مارنے کے باوجود بھی نہیں مرتی ہیں ناں؟
''خواہشات''
یہ خواہشات تو بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔لاکھ حقیقت پسندی کے پردے ڈال دو ان پر، مگر حقیقت پسندی کی تمام حقیقت کا پول کھول دیتی ہیں۔بڑی منہ پھٹ ہوتی ہیں یہ خواہشات۔
بار بار قتل کر دینے کے باوجود۔۔۔۔۔کچھ سخت جان زندہ رہ ہی جاتی ہیں۔
راتوں میں زندہ ہو کر آتی ہیں ناں سپنوں میں یہ مردہ خواہشات؟
لاکھ پہرے لگا لو ان کی پیدائش پر۔۔۔۔۔کسی ضدی بچے کی مانند پیدا ہو کر ہی دم لیتی ہیں۔
میں نے کہا تھا ناں کہ میں جانتا ہوں آپ کو بھی اور آپ کے تمام مسائل کو بھی۔
ایک ہی پریشانی ہے ناں زندگی میں۔۔۔
''خواہشات''
صحت کی خواہش پوری نہ ہونے کا نام بیماری ہے۔خوشی کی خواہش پوری نہ ہونے کا نام غم ہے۔
یہ ''میں'' بھی انہی خواہشات کے حصول کے لیے ماری جاتی ہے۔
یہ خواہشات دھوبی کا کتا بنا دیتی ہیں انسان کو۔پھر کچھ سمجھ نہیں آتی کہ خواہشات کے پیچھے بھاگنے میں زیادہ خوشی ہے یا ان سے دستبردار ہو جانے میں زیادہ سکون ہے۔
ایک بات بتاؤں؟
ڈرنا نہیں ہے، گھبرانا نہیں ہے۔۔۔۔۔ان خواہشات سے۔

قتل نہیں کرنا، مارنا نہیں ہے۔۔۔۔۔ان خواہشات کو۔

یہ خواہشات تو بڑی پیاری، بڑی ہی حسین ہوتی ہیں۔

یہ خواہشات کوئی فضول چیز بالکل نہیں ہیں۔

ختم کر دیجیے اپنی سوچوں پر موجود اس فضول حقیقت پسندی کے پہروں کو۔

آزاد کر دیجیے اپنے تمام سپنوں کو اُڑنے کے لیے۔

فہرست بنایئے اپنی تمام ناآسودہ خواہشات کی۔

پھر سے زندہ کیجیے اپنے تمام مردہ خوابوں کو۔

میں بتاؤں گا آپ کو کہ آپ کے اندر یہ لامحدود خواہشات کیوں پائی جاتی ہیں۔

آیئے! میرے ساتھ آیئے!

میں بتاتا ہوں یہ لامحدود خواہشات کیسے پوری ہوتی ہیں۔

آیئے! آیئے! کنویں سے باہر چلتے ہیں۔۔۔۔۔اور ایک سفر کرتے ہیں خواہشات کی جانب۔

ہر خواہش کو اپنے گھر کی لونڈی بناتے ہیں۔۔۔۔۔اپنا ہر ہر خواب پورا کرتے ہیں۔

وقت کی قید سے آزاد ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔اس ایک نقطے سے پرے چلتے ہیں۔

میں جانتا ہوں آپ کو بھی اور آپ کی خواہشات کو بھی۔

میں جانتا ہوں، میں جانتا ہوں آپ کو۔۔۔۔۔بہت پرانا ساتھ ہے آپ کا اور میرا۔

آپ کے آباء سے بھی مراسم رہے ہیں میرے۔آپ کی آنے والی نسلیں بھی میری نگاہوں میں ہیں۔

آپ کے پاس ہوں میں۔آپ کے آس پاس ہوں میں۔

گھبرایئے مت! میں دوں گا آپ کو آپ کے ہر سوال کا جواب۔

جاننا چاہتے ہیں؟۔۔۔۔۔میں کون ہوں؟

بتا دوں؟۔۔۔۔۔میں کون ہوں؟

میں۔۔۔

''میں قرآنِ حکیم ہوں۔''

صاحبانِ بصیرت کے نام۔۔۔

میں کون ہوں؟

(حصّہ دوم)

باب:1

کنویں کا مینڈک

جب میں چھوٹا سا تھا۔۔۔

مطلب جب میں بہت ہی چھوٹا سا تھا۔۔۔

اتنا چھوٹا کہ ابھی تو سکول جانا شروع بھی نہیں کیا تھا، لیکن شاید۔۔۔

شاید اب میں اتنا چھوٹا بھی نہ رہا تھا۔۔۔۔۔اب میں کچھ کچھ بڑا ابھی ہونے لگا تھا۔

ابھی میں اتنا چھوٹا تھا کہ اگر اماں ایک دن کے لیے بھی مجھے اپنے ساتھ کہیں لے کر جاتیں تو میرے لیے الگ سے کپڑوں کا ایک بیگ تیار کیا جاتا۔لیکن اب میں اتنا بڑا ضرور ہو چکا تھا کہ اگر اس بیگ میں میرے لیے قمیض ایک رکھی جاتی۔۔۔

تو جانگیہ بھی ایک ہی رکھا جاتا۔

قمیض اور نیکروں کی تعداد میں موجود وہ عدمِ توازن۔۔۔

اب ماضی کا ایک قصہ بن چکا تھا۔

یہ ان دنوں کی بات ہوگی، جب میں بیک وقت تھوڑا چھوٹا بھی تھا اور تھوڑا بڑا ابھی۔

اس وقت میں چھوٹے اور بڑے کے بین بین کہیں پر موجود تھا۔

ابھی میں اتنا بڑا تو نہیں ہوا تھا کہ اماں کی اجازت کے بِنا گھر سے باہر چلا جاؤں، لیکن اب میں اتنا چھوٹا بھی نہیں رہا تھا کہ بیت الخلاء جاتے وقت مجھے اماں کی اجازت درکار ہو۔

اب میں اپنے ''کاموں'' کے لیے خود کفیل ہو چکا تھا۔

میری محتاجی ختم ہو چکی تھی۔

اب میں پاکستان کا ایک خود مختار اور ذمہ دار شہری تھا۔

اور تو اور۔۔۔

اب میں بیت الخلاء کو اندر سے لاک بھی کرنے لگا تھا۔

میری اپنی اِک پرائیویسی تھی۔۔۔۔۔۔میری اپنی ایک زندگی تھی۔

میں اپنی اس زندگی میں خوش تھا۔۔۔۔۔مگن تھا۔

بیت الخلاء کو اندر سے کُنڈی لگانے کی صلاحیت حاصل کرتے ہی میں بہت ساری فکروں سے آزاد ہوگیا۔ وگرنہ پہلے تو دل میں دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔

لیکن اب میں بیت الخلاء میں حسبِ ضرورت، حسبِ منشا وقت صرف کرنے لگا تھا۔

میں وقت کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔۔۔۔۔میں سمے سے پرے جا چکا تھا۔

اب میری توجہ بھی مرکوز ہونے لگی تھی۔ مجھے اپنی زندگی کی بہترین سوچیں آنا شروع ہو چکی تھیں۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ وہ نومبر کی ایک ٹھنڈی شام تھی جب مجھے بیت الخلاء میں کیے جانے والے اپنے مراقبے کے دوران احساس ہوا کہ۔۔۔

میں کوئی عام بچہ نہیں تھا۔

میں دوسرے سبھی بچوں سے مختلف تھا۔۔۔۔۔میں خاص تھا۔

کیونکہ۔۔۔

کیونکہ مجھے ''دورے'' پڑتے تھے۔

میرے یہ دورے وہ والے دورے نہیں تھے کہ جو دورے ہمارے حکمرانوں کو اکثر پڑتے رہتے ہیں۔ میرے یہ دورے مِرگی والے دورے بھی نہیں تھے۔

بلکہ یہ تو کچھ عجب قسم کے دورے تھے۔

میرے ان دوروں کی تشخیص سب سے پہلے اماں نے کی تھی۔

اصل میں مجھے چھپکلی بُری لگتی تھی۔۔۔۔۔مجھے چھپکلی شکل سے ہی بُری لگتی تھی۔

چھپکلی کو تو دیکھ کر ہی میرے بدن پر کھجلی ہونے لگتی۔

یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی مجھے کوئی چھپکلی نظر آتی۔۔۔

جوتا۔۔۔تکیہ۔۔۔جھاڑو۔۔۔گلاس۔۔۔

جو چیز بھی پہلی فرصت میرے ہاتھ لگتی، میں پوری قوت کے ساتھ چھپکلی کو دے مارتا۔

مجھے اپنی پھینکی گئی چیزوں کی رفتار پر کبھی شرمندگی نہ ہوئی تھی۔

مگر کم بخت زاویہ ہر بار ہی چُوک جایا کرتا۔

میری پھینکی گئی چیزوں کی رفتار اور زاویے میں موجود اس عدم توازن کے سبب۔۔۔

جب بھی میں چھپکلی مارتا۔۔۔۔۔ٹیوب لائٹ ٹوٹ جاتی۔
جب بھی میں چھپکلی مارتا۔۔۔۔۔ٹیوب لائٹ ٹوٹ جاتی۔

اور اب اماں بھی میری ماری گئی چھپکلیوں کی ''کرچیاں'' اٹھا اٹھا کر تنگ آ چکی تھیں۔
لہٰذا اب اماں ہر آنے جانے والے کے سامنے بڑے آرام سے بتا دیا کرتی تھیں کہ۔۔۔

''میرے اس چھوٹے لڑکے کو تو دورے پڑتے ہیں دورے۔''

اماں کی حکیمانہ طبیعت نے محض میرے دوروں کی تشخیص ہی نہ کی، بلکہ جوتوں کے ساتھ ان کا علاج بھی شروع کر دیا۔ میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ اماں کی باتوں میں پوشیدہ حکمت اور اپنے ان دوروں کو سمجھنے میں کچھ وقت لگ گیا، لیکن اب میں جان چکا تھا کہ۔۔۔

اماں اور اماں کے جوتے۔۔۔میں اور میرے دورے۔۔۔

ہم چاروں کے بیچ اِک عجب چاہت بھرا اور ایک اَن دیکھا رشتہ پایا جاتا تھا۔
اگر میں اور اماں کے جوتے اماں کے بالکل قریب ہوتے۔۔۔۔۔مجھے دورہ نہ پڑتا۔
لیکن جیسے ہی میرا یا اماں کے جوتوں کا فاصلہ اماں سے بڑھتا۔۔۔۔۔مجھے دورہ پڑ جاتا۔

مجھے دورے پڑنے کی یہ ایک اکیلی وجہ نہیں تھی۔ مجھے ایک اور قسم کے دورے بھی پڑا کرتے تھے۔ جب بھی میرا ماحول میری مرضی کے خلاف ہونے لگتا۔۔۔

جب کبھی میرے اردگرد میری ناپسندیدہ چیزوں کی کثرت ہو جاتی۔۔۔
مجھے دورہ پڑ جاتا۔ اس قسم کے دورے کے دوران۔۔۔

میرا سر گھومنے لگتا، میرے اندر گھٹن بہت بڑھ جاتی۔۔۔۔۔دل بیٹھنے لگتا اور بدن پر کپکپاہٹ طاری ہو جاتی۔۔۔۔۔میرے کان گرم ہو جاتے اور ہاتھ پاؤں تو بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے۔

ان تمام ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی تغیرات کے سبب میرے اندر اس ناپسندیدہ ماحول سے دور بھاگ جانے کی خواہش پیدا ہوتی اور میری یہ خواہش ایسی منہ زور، اتنی طاقتور ہوتی کہ میں اپنی ساری زندگی کبھی اس خواہش پر قابو نہ پا سکا، لہٰذا۔۔۔

جب بھی مجھے دورہ پڑتا۔۔۔۔۔میں بھاگ جاتا۔

یہ پانچویں جماعت کی بات ہو گی جب ایک شام میں اپنے دوست کے ساتھ گھر کے پاس ہی موجود کھیل کے میدان سے کرکٹ کھیل کر واپس آ رہا تھا۔ گھر اور کھیل کے میدان کے بیچ ایک شاہراہ ہوتی تھی، جس پر ان دنوں بس اِکا دُکا گاڑیاں ہی چلا کرتی تھیں۔

جبکہ میرا یہ دوست ''بارہواں کھلاڑی'' تھا۔ کھیل کے دوران جب بھی گیند کسی گھر میں گرتی تو گیند واپس لینے میرا یہی دوست جایا کرتا تھا۔

ہم دونوں گپیں لگاتے ہوئے چلے آ رہے تھے کہ سامنے سے گزرتی ایک گاڑی کو دیکھ کر میرے دوست نے مجھے ایک چیلنج دیا، جسے میں نے فوراً قبول بھی کر لیا۔

چیلنج یہ تھا کہ مجھے سڑک پر سے گزرنے والی کسی بھی گاڑی کے نیچے سے، گاڑی کے اگلے اور پچھلے پہیوں کے درمیان سے تیز رفتاری کے ساتھ گیند پھینک کر دوسری جانب گزارنا تھی۔

پھر کچھ ہی دیر بعد سڑک کے ایک کنارے پر گیند ہاتھ میں پکڑے ہوئے میں موجود تھا جبکہ سڑک کے دوسرے کنارے پر میرا وہ دوست کھڑا تھا اور اسے میری پھینکی گئی گیند کو پکڑنا تھا۔

چند لمحات بعد مجھے اپنے بائیں جانب سے ایک سیاہ رنگ کی گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔

میں نے گیند ہوا میں اچھالا اور۔۔۔

نظروں ہی نظروں میں گاڑی کا حدودِ اربع جانچ لیا۔۔۔

گاڑی کے اگلے اور پچھلے پہیوں کے درمیان چھ فٹ۔۔۔۔۔ جبکہ گاڑی کے پیندے اور سڑک کے درمیان ایک فٹ کا فاصلہ تھا اور۔۔۔

اب مجھے تیز رفتاری کے ساتھ دوڑنے والے اس 1×6 فٹ کے چوکھٹے میں گول کرنا تھا۔

مشکل تھا۔۔۔۔۔ بہت مشکل تھا۔۔۔۔۔ بہت ہی مشکل تھا۔

مگر ناممکن نہیں تھا۔

میں نے ہمت نہیں ہاری۔۔۔۔۔ میں یہ رسک لینا چاہتا تھا۔

گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ میری جانب دوڑی چلی آ رہی تھی۔ جیسے جیسے میرا اور گاڑی کا فاصلہ کم ہو رہا تھا، ویسے ویسے میرے دل کی دھڑکن بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

میں نے دو تین گہرے گہرے سانس لیے۔۔۔۔۔ اپنے منتشر اعصاب کو درست کرنے کی ایک کوشش کی اور پھر جیسے ہی گاڑی میرے بالکل قریب پہنچی۔۔۔۔ میں نے مناسب زاویے پر بازو گھما کر گیند کو پوری قوت کے ساتھ گاڑی کی جانب پھینک دیا۔

مجھے اپنی پھینکی گئی چیزوں کی رفتار پر کبھی شرمندگی نہ ہوئی تھی۔

مگر کم بخت زاویہ ہر بار ہی چُوک جایا کرتا۔

گاڑی کی زوردار بریکیں لگیں اور پھر چرچراہٹ کی تیز آواز پیدا کرتے ہوئے

گاڑی کے پہیے جام ہو گئے۔ گاڑی کے سامنے کے شیشے میں ایک بڑا سوراخ اور بے شمار چھوٹی چھوٹی دراڑیں موجود تھیں اور۔۔۔

اور میں گول مِس ہو جانے پر دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر نیچے بیٹھ گیا۔

ایسے میں گاڑی سے ایک کرخت شکل انسان برآمد ہوا اور میرا وہ دوست۔۔۔

وہ بارہواں کھلاڑی۔۔۔۔۔ وہ گیند واپس لینے چلا گیا۔

اپنے دوست کی اس حماقت پر میرا دل بیٹھنے لگا تھا۔ میں نے دوست کو ہاتھوں سے بڑے اشارے کیے، بڑا روکا مگر وہ کم بخت تو محض دوز ائد رنز بچانے کے لیے اتنی تیز رفتاری کے ساتھ دوڑا کہ میری جانب دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔

پھر میرے اندر بھی اسے دیکھنے کی ہمت نہ رہی۔

گاڑی والے انکل نے جیسے ہی میرے دوست کو گردن سے پکڑ کر فضا میں بلند کیا۔۔۔

میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔

مجھے دورہ پڑا۔۔۔۔ اور میں بھاگ گیا۔

مجھے ساری زندگی دورے پڑتے رہے ہیں اور میں بھاگتا رہا ہوں۔

میں بھگوڑا ہوں۔

جب بھی میرے اردگرد، میرے ماحول میں حالات میری مرضی کے خلاف ہوئے۔۔۔

مجھے دورہ پڑا۔۔۔۔ اور میں بھاگ گیا۔

میرے ان دوروں کا ذکرِ خیر تو وقتاً فوقتاً ہوتا ہی رہے گا، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ مجھے اس بات کا بھی شدت سے احساس ہوا ہے کہ یہ دورے اکیلے مجھ کو ہی نہیں پڑتے۔ یہاں تو ہر شخص کو ہی دوروں کی شکایت رہتی ہے۔ بس ایک فرد سے دوسرے فرد تک ان دوروں کی نوعیت اور ماہیت بدل جاتی ہے۔

یہ جو ہمارے سیانے ہیں ناں، انہیں بھی دورے پڑتے ہیں، مگر ان سیانوں کے دورے میرے اور سیاستدانوں کے دوروں سے بالکل مختلف نوعیت کے ہیں۔ ان سیانوں کے دورے زیادہ پیچیدہ اور زیادہ خطرناک ہیں۔ آیئے! ان سیانوں کے ساتھ تھوڑا وقت گزارتے ہیں اور ان کو پڑنے والے دوروں کی نوعیت اور پس منظر جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

سیانا بمقابلہ بھگوڑا

سیانا:

آجا، آجا۔۔۔بھگوڑے آجا۔۔۔کدھر رہ گیا تھا؟

ہمیشہ کی طرح اب کی بار بھی پورے 25 منٹ کی دیری کی ہے تو نے۔کبھی تو وقت پر آجایا کر۔

بھگوڑا:

آگیا سیانے آگیا۔۔۔تھوڑا حوصلہ تو کر۔ایک تو پریشان بڑی جلدی ہوجاتا ہے تو۔

چل وعدہ ہوگیا تیرے ساتھ۔۔۔اگلی ملاقات پر میں وقت کی پوری پابندی کروں گا۔

مگر اس کے لیے میری ایک شرط ہے۔

سیانا:

شرط بول بھگوڑے شرط۔

بھگوڑا: (زیرِلب مسکراتے ہوئے)

سیانے یہ وقت کیا ہوتا ہے؟ یہ ہمیشہ آگے کی جانب سرکتا ہوا کیوں محسوس ہوتا ہے؟

بس یہ بات سمجھا دے مجھے۔اگر یہ کام کر دے تو ہمیشہ وقت پر آیا کروں گا۔اب ایک چیز کو جانے بِنا ہی اس چیز کی اتنی پابندی کرنا مجھے تو بالکل اچھا نہیں لگتا۔

سیانا: (ماتھے پر ہاتھ مار کر بےزاری کا اظہار کرتے ہوئے)

بس۔۔۔ہوگیا شروع آتے ساتھ ہی۔تھوڑا سانس تو لے۔

بھگوڑے تجھے سب پتہ ہے۔تو جان بوجھ کر ہماری دکھتی رگوں کو چھیڑتا ہے۔اتنی بار تو تجھے بتایا ہے کہ یہ وقت بڑی پیچیدہ چیز ہے۔وقت کی چالوں کو سمجھنا اتنا آسان نہیں ہے۔اس وقت کو جاننے کی ہم کوشش کر رہے ہیں، مسلسل کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ایک دن کامیاب بھی ہو ہی جائیں گے۔

بھگوڑا:

لیکن اس وقت کو جاننے کے لیے مجھے اور کتنا وقت انتظار کرنا ہوگا۔میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے سیانے۔کیا میں اپنی زندگی میں اس وقت کو زیر کرسکوں گا؟

یا پھر۔۔۔

ہر انسان کی طرح یہ وقت مجھے بھی نگل جائے گا۔۔۔لمحہ بہ لمحہ، سیکنڈ در سیکنڈ۔

سیانا:

بھگوڑے آہستہ چل آہستہ۔اتنی تیز رفتاری اچھی نہیں ہوا کرتی۔اس وقت کو جاننے کے لیے کسی بھی حتمی وقت کا تعین کرنا تو ناممکن ہے۔شاید چند سال مزید۔۔۔یا پھر چند صدیاں۔۔۔

یا شاید کبھی نہیں۔یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔

بھگوڑا: (مایوس لہجے میں)

مطلب اپنی زندگی میں تو میں اس وقت کو جاننے کی امید نا ہی رکھوں۔

سیانا: (امید دلانے والے انداز میں)

بھگوڑے تو دل چھوٹا مت کر۔ہم کوشش کر رہے ہیں ناں۔ایک دن کامیابی بھی مل ہی جائے گی۔

بھگوڑا:

اچھا چل پھر یہی بتا دے کہ اس زندگی میں کامیابی کہتے کس کو ہیں؟ یہ کامیابی ملتی کیسے ہے؟

سیانا:

دیکھ بھگوڑے۔۔۔

بھگوڑا:

بول سیانے۔۔۔

سیانا:

کامیابی کی کوئی بھی ایک جامع تعریف کرنا تو ناممکن بات ہے۔ہر شخص کا کامیابی کا اپنا ہی ایک معیار ہے۔ہر شخص کے لیے کامیابی کے اجزائے ترکیبی بدل جاتے ہیں۔کسی کو دولت اچھی لگتی ہے تو کسی کو شہرت، کسی کو طاقت میں دلچسپی ہے تو کسی کو یہ سب کچھ ایک ساتھ ہی چاہیے اور کوئی اس زندگی میں بس خوشی کا طلب گار ہے۔یہ بالکل بھی لازم نہیں ہے کہ ایک شخص جس چیز کو کامیابی تصور کرتا ہے تو کسی اور شخص کے لیے بھی وہ چیز کامیابی ہی ہو، بلکہ یہ بھی عین ممکن ہے کہ کسی ایک شخص کے لیے کامیابی تصور کی جانے والی چیز یا کیفیت کسی دوسرے شخص کے لیے کامیابی نہیں بلکہ ناکامی ہو۔

اس لیے کامیابی کو کسی ایک خاص چیز کے ساتھ منسلک کرنا غلط ہو گا۔اسی طرح کامیابی حاصل کرنے کے لیے کسی ایک خاص طریقۂ کار پر زور دینا بھی نامناسب بات ہو گی۔

بھگوڑا:

مطلب کامیابی کی نہ تو کوئی خاص تعریف (Definition) موجود ہے اور نہ ہی کامیابی کو

حاصل کرنے کا کوئی بھی خاص طریقۂ کار۔

سیانا:

ہاں کسی حد تک کہہ سکتا ہے یہ بھی، لیکن بہتر معیارِ زندگی ایک ایسی چیز ہے جس کے لیے اس دنیا کے بیشتر افراد کوشاں ہیں۔انسانوں کی اکثریت کی ساری بھاگ دوڑ اپنے معیارِ زندگی کو برقرار رکھنے یا پھر بہتر بنانے کے لیے صرف ہوتی ہے۔اس لیے کسی حد تک یہ کہا جا سکتا ہے کہ انسانوں کی اکثریت بہتر معیارِ زندگی کو ہی کامیابی سمجھتی ہے۔

زیادہ سے زیادہ دولت۔۔۔معاشرے میں عزت و رتبہ۔۔۔طاقت اور شہرت۔۔۔

یہ سب چیزیں ہر انسان کو بھلی لگتی ہیں۔

بھگوڑا:

اگر بہتر معیارِ زندگی کا حصول کامیابی ہے تو پھر تو فطرت میں بڑی ناانصافی پائی جاتی ہے کہ جو خود ہی کچھ لوگوں کو پکڑ کر کامیاب بنا رہی ہے تو کچھ کو ناکام۔ایک انسان اپنی ساری زندگی کی محنت و مشقت کے بعد بھی وہ معیارِ زندگی حاصل نہیں کر پاتا کہ جو معیارِ زندگی کسی اور شخص کو پیدائشی طور پر تحفے میں مل جاتا ہے۔

سیانے! کیا بہتر معیارِ زندگی کا حصول کامیابی ہے؟

سیانا:

اچھا اچھا۔۔۔بھگوڑے! زیادہ جذباتی مت ہو۔میں کب کہہ رہا ہوں کہ بہتر معیارِ زندگی کا حصول کامیابی ہے۔میں تو انسانوں کا ایک عمومی رویہ تجھے بتا رہا ہوں۔

بھگوڑا:

تو ایک ہی بات ہوئی ناں سیانے۔انسانوں کی اکثریت اگر بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے لیے کوشاں ہے تو پھر یقیناً کامیابی بھی تو اسی کو سمجھتی ہوگی۔وگرنہ یہ تمام انسان پاگل تھوڑی نہ ہیں کہ ایک چیز کو ناکامی سمجھ کر اس کے پیچھے بھاگتے رہیں۔

سیانے یہی سچ ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت بہتر معیارِ زندگی کے حصول کو ہی کامیابی سمجھتی ہے، لیکن یہ کامیابی کیسی کامیابی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے تمام انسانوں کو یکساں مواقع نہیں مل رہے؟

سیانا:

دیکھ بھگوڑے! کامیابی اور ناکامی کی کوئی بھی ایک جامع تعریف کرنا تو ناممکن ہے اور اگر انسانوں کی اکثریت بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے لیے کوشاں ہے تو اس میں ایسی کون سی بُری بات ہے؟ اگر

کوئی شخص اپنی خواہشات کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس بات پر اعتراض کیوں کیا جائے؟ باقی رہی ناانصافی کی بات تو بھگوڑے یہ بات اچھے سے جان لے کہ فطرت کا بس یہی طریقۂ کار ہے۔

ذرا جنگل میں جا کر دیکھ۔۔۔یہی ناانصافی تجھے ہر جگہ نظر آ جائے گی۔ایک ہی نسل کے کچھ درخت توانا ہیں تو کچھ درخت کمزور۔کچھ پودوں کو اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے زیادہ سازگار ماحول ملتا ہے تو کچھ کو کم۔ایک ہی نسل کے کچھ جانور طاقتور ہیں تو کچھ لاغر اور کمزور۔

بھگوڑا:

لیکن یہ۔۔۔

سیانا:

مجھے اپنی بات مکمل کرنے دے پہلے۔۔۔

دیکھ بھگوڑے! ہم انسان بھی اسی زمین کا، اسی ماحول کا ایک حصہ ہیں۔فطرت کچھ افراد کو آگے بڑھنے کے لیے آسانیاں فراہم کرتی ہے تو کچھ افراد کو کم مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔یہ فطرت کا اصول ہے اور فطرت کے اسی اصول کی وجہ سے ہر نوع (Specie) اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔

انسانوں میں موجود تمام معاشی اور معاشرتی تفرقات کو ختم کر کے اگر سب انسانوں کو بالکل ایک ہی جیسا بنا دیا جائے تو انسانوں کی معاشرتی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی، تمام سماجی ادارے تباہ و برباد ہو جائیں گے، انسان کے لیے اپنا وجود برقرار رکھنا مشکل ہو جائے گا۔

انسان اور انسانیت کی بقاء اسی میں ہے کہ کچھ افراد کھیتی باڑی کریں تو کچھ محنت مزدوری۔ خاص و عام میں فرق رہنا ضروری ہے۔اگر سارے انسان زندگی کے اس میدان میں اتر کر اپنے جوہر دکھانا شروع کر دیں گے تو اس کھیل کو دیکھنے کے لیے تماش بین اور شائقین ختم ہو جائیں گے۔

زندگی کی اس فلم کو کامیاب بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس فلم میں ایک دو ہیرو ہوں، کچھ ولن، کچھ معاون کردار اور بہت سارے محض ایکسٹرا۔اسی چیز میں ہماری زندگی پوشیدہ ہے۔

بھگوڑا:

اچھی، بہت اچھی بات کہی تو نے، مگر۔۔۔

مگر سیانے زندگی کی اس کہانی میں کون ہیرو بنے گا؟۔۔۔اور کون محض ایکسٹرا؟

یہ سب فیصلے کیسے ہوں گے؟

کیا ایکسٹرا کے ساتھ یہ ناانصافی نہیں ہے؟

سیانا:

بھگوڑے! بات تو گھوم کر پھر وہیں پر آ گئی، جہاں سے شروع ہوئی تھی۔ یہ تھوڑی بہت ناانصافی تو ہر جگہ موجود ہے اور موجود رہے گی بھی۔ جنگل کے سبھی شیر یکساں طاقتور نہیں ہو سکتے ہیں۔ جنگل پر حکمرانی تو کوئی ایک شیر ہی کرے گا۔ ہارنے والے شیروں کو بھاگنا ہوگا اور پھر اگر کوئی طاقتور شیر کسی کمزور ہرن کو اپنی خوراک بنا رہا ہے تو اس میں ہرن کے ساتھ کوئی بھی ناانصافی نہیں ہے۔

یہی قانونِ فطرت ہے۔

Survival of the Fittest...

بھگوڑا:

سیانے! یہ تُو بار بار جنگل کا رخ کیوں کیے جاتا ہے؟

سیانا:

بھگوڑے! آخر جنگل سے ہی تو ہماری زندگی کا آغاز ہوا تھا۔ یہ سب جاندار بھی تو ہم میں سے ہیں۔ بس انسان دوسرے جانداروں سے تھوڑا زیادہ ترقی کر چکا ہے۔ انسانوں نے جنگل چھوڑ کر شہر آباد کر لیے، وگرنہ آج بھی انسانوں اور جانوروں میں کوئی خاص فرق موجود نہیں ہے۔

بھگوڑا:

اچھا اچھا۔۔۔سیانے یہ اپنا نظریۂ ارتقاء(Theory of Evolution) زبردستی مجھ پر نہ ٹھونس۔ یہ نظریہ، محض نظریہ ہی ہے ابھی۔ ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں اس نظریے کے پاس۔

سیانا:

ہاں ٹھیک ہے، اگر اس نظریے کے حق میں ٹھوس شواہد موجود نہیں ہیں تو اس نظریے کے مخالفین کے دلائل بھی کوئی بہت مضبوط نہیں ہیں۔ اس لیے جب تک اس سے بہتر کوئی نظریہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے تو اس وقت تک اس نظریے پر بات کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔

بھگوڑا:

اچھا سیانے! یہ تو بتا کہ یہ تیرے قدرے ترقی یافتہ بندر، یعنی انسان میں اخلاقی حِس کیوں پائی جاتی ہے؟۔۔۔۔۔انسان کچھ چیزوں، کچھ رویوں اور اعمال کو اچھا سمجھتا ہے تو کچھ کو بُرا۔۔۔

ایسا کیوں ہے؟

یہ سچ اچھا ہے تو جھوٹ بُرا، بہادری اچھی ہے تو بزدلی بُری، دوسروں کو نقصان پہنچانا بُری

بات ہے تو انسانیت کی خدمت کرنا ایک اچھی چیز۔

آخر بندر سے بنے انسان میں یہ اخلاقی حِس کیسے پیدا ہوگئی؟

سیانا:

انسانوں میں اخلاقی حِس کا پایا جانا انسانوں کی معاشرتی زندگی کے سبب ہے۔ جیسے جیسے انسان اور انسانی معاشرے ترقی کرتے گئے، ویسے ویسے ان معاشروں کی بہتری اور بقاء کے لیے انسانوں کو مختلف قوانین بنانا پڑے ہوں گے اور پھر رفتہ رفتہ یہی قوانین انسانی زندگیوں کا ایک اہم حصہ اور جزو بن گئے۔

بہت عرصہ پہلے یہ بات محسوس کی گئی ہوگی کہ وعدہ خلافی سے انسانوں کی معاشرتی زندگی پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔بس۔۔۔۔۔اس وقت سے وعدہ خلافی کو بُری چیز سمجھا جانے لگا اور پھر اسی طرح سے انسانی معاشرے کچھ چیزوں کو اچھا تو کچھ چیزوں کو بُرا جاننے لگے۔

یا یوں کہہ لے کہ اس طرح سے انسانوں میں اخلاقی حِس کا ارتقاء ہوگیا۔

بھگوڑا:

اچھا سیانے! یہ تو بتا کہ رشوت کا لین دین اور جھوٹ۔۔۔دونوں اچھی چیزیں ہیں یا بُری؟

سیانا:

رشوت اور جھوٹ دونوں بُری چیزیں ہیں۔اس بات میں تو کوئی شک نہیں ہے۔

بھگوڑا:

چل پھر صرف ایک بات مجھے سمجھا دے کہ اگر میں رشوت دے کر اپنا رکا ہوا کام نکلوا سکتا ہوں تو مجھے رشوت کیوں نہیں دینی چاہیے؟اور اگر میں رشوت لے کر اپنی بہت ساری خواہشات کو نہایت آسانی کے ساتھ پورا کرسکتا ہوں تو مجھے رشوت کیوں نہیں لینی چاہیے؟اور پھر اسی طرح سے اگر میں جھوٹ بول کر کوئی کاروباری فائدہ اٹھا سکتا ہوں تو مجھے جھوٹ کیوں نہیں بولنا چاہیے؟

سیانا:

اگر تُو بار بار جھوٹ بولے گا تو لوگ رفتہ رفتہ تیرا اعتبار کرنا چھوڑ دیں گے۔رشوت کے لین دین میں بھی اس بات کا قوی امکان موجود ہے کہ کسی دن تُو پکڑا جائے گا۔

بھگوڑا:

اچھا سیانے! چل فرض کر میں کسی اجنبی شہر میں بس چند گھنٹوں کے لیے موجود ہوں۔اس شہر میں

مجھے اپنی زندگی میں دوبارہ کبھی نہیں آنا۔ اس شہر کے لوگ میرے لیے اجنبی ہیں تو میں ان کے لیے اجنبی۔۔۔۔۔کیا اس شہر میں اپنے چند گھنٹوں کے قیام کے دوران میں اس شہر کے باسیوں کو ''چونا'' لگا سکتا ہوں؟۔۔۔۔۔ان اجنبی لوگوں کو دھوکہ دینا ایک اچھی بات ہوگی یا بُری؟

سیانا:

یقیناً۔۔۔یقیناً بُری بات ہوگی۔

بھگوڑا:

مگر کیوں؟۔۔۔۔۔اخلاقیات کی پیروی کرنے میں میرا اپنا کیا فائدہ ہے؟

اگر میں دھوکا دہی کے ذریعے اپنی خواہشات کو پورا کر سکتا ہوں تو مجھے ایسا کیوں نہیں کرنا چاہیے؟

سیانا:

بھگوڑے! یہ ایک حقیقت ہے اور اس بات کو تسلیم کرنے میں مجھے کوئی عار محسوس نہیں ہوتی کہ انسانی علم میں اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے کے لیے کوئی بھی خاص عقلی دلیل موجود نہیں ہے۔

کوئی شخص اگر جھوٹ بولنے پر بضد ہے تو ایسے شخص کو کسی بھی طرح عقلی دلائل دے کر یہ باور نہیں کروایا جا سکتا ہے کہ جھوٹ بولنا خود اس شخص کے لیے بھی ایک بُری چیز ہے اور سچ بولنے میں اس کا اپنا ہی فائدہ ہے۔

بھگوڑا:

اگر اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے میں کوئی بھی عقلی دلیل موجود نہیں ہے تو پھر ان اخلاقیات کے جھنجٹ میں پڑا ہی کیوں جائے؟ اگر ایک طاقتور شخص کسی کمزور انسان کو کچل کر خود کو فائدہ پہنچا سکتا ہے تو طاقتور شخص کمزور انسان کو نقصان کیوں نہ پہنچائے؟

اخلاقیات کی پیروی کرنا ایک اچھی چیز ہے، لیکن یہ کیسی فضول اور گھٹیا قسم کی منطق ہے کہ اچھا کام کرنے والے کو اپنی ہی خواہشات کی قربانی دینا پڑتی ہے۔ اخلاقی جرائم میں ملوث انسان نسبتاً بہتر معیارِ زندگی حاصل کر لیتے ہیں، جبکہ شریف انسان تو اپنی شرافت میں ہی مارا جاتا ہے۔

کیا یہ ناانصافی نہیں ہے؟

یہ اخلاقیات تو انسانی خواہشات کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہیں۔ اگر ان فضول کی اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے میں میرا اپنا نقصان ہو رہا ہے تو میں اخلاقیات کا یہ بوجھ کیوں اٹھائے اٹھائے پھروں؟

سیانا:

میں تو پہلے ہی اس بات کو تسلیم کر چکا ہوں کہ اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہمارے پاس

کوئی بھی خاص عقلی دلیل نہیں ہے، مگر اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ انسانی معاشروں کی بقاء کے لیے اخلاقیات کی پیروی کرنا ضروری ہے، بہت ضروری ہے۔

اخلاقیات کے بِنا ہماری سماجی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی۔

بھگوڑا:

سیانے۔۔۔دیکھ اب تُو منافقت سے کام لے رہا ہے۔

ایک جانب تو اپنی ساری دلیلیں جنگل سے اخذ کرتا ہے اور دوسری جانب تُو ایک بھوکے شیر کو یہ کہتے ہوئے کمزور ہرن کھانے سے روک رہا ہے کہ کسی کمزور کو نقصان پہنچانا بُری بات ہوتی ہے۔

Survival of the Fittest.....

آخر ایک طاقتور انسان اپنی طاقت کے بل پر کمزور انسان کو رگڑا کیوں نہ دے؟

سیانا: (اپنی بےزاری کا اظہار کرتے ہوئے)

جسے جو کرنا ہے کرے مگر میں تو اخلاقیات پر عمل پیرا ہونے کو ہی اچھا سمجھتا ہوں۔ اب اخلاقیات کی پیروی کرنے میں کوئی عقلی دلیل موجود ہے یا نہیں۔ مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بھگوڑا: (زیرِلب مسکراتے ہوئے)

سیانے اب یہ تو ایک بڑی ہی غیر سیانی بات کی ہے تُو نے۔ ایک چیز سے تجھے کچھ بھی خاص فائدہ نہیں ہو رہا، الٹا بہت سارے نقصانات کا اندیشہ موجود ہے، مگر تُو پھر بھی اس چیز کے ساتھ چپکے رہنا چاہتا ہے۔

بھگوڑے کی بات مان! کچھ نہیں رکھا ہے ان فضول اخلاقیات میں۔

جہاں جیسے بھی ہاتھ پڑ سکتا ہے، ڈال۔

کیوں ان دقیانوسی رسموں کی وجہ سے اپنی خواہشات کا دشمن بنا پھرتا ہے؟

سیانا: (غصے کا اظہار کرتے ہوئے)

بھگوڑے! اگر تُو کوئی ڈھنگ کی بات کر سکتا ہے تو کر، وگرنہ میں اٹھنے لگا ہوں۔ میں ان فضول کی باتوں میں مزید تیرا ساتھ نہیں دے سکتا۔

بھگوڑا:

اچھا اچھا۔۔۔چل ناراض نہ ہو۔ کچھ اور بات کر لیتے ہیں۔ سیانے چل یہ تو بتا کہ۔۔۔

میں کون ہوں؟

بہت عرصے سے یہ بات جاننے کی کوشش کر رہا ہوں مگر آج تک کوئی ڈھنگ کا جواب نہیں مل سکا۔

سیانا: (اب پُر جوش انداز میں)

بھگوڑے جانتا ہے کہ آج تک تجھے اس سوال کا جواب کیوں نہیں ملا؟

کیونکہ بھگوڑے تُو کچھ ہے ہی نہیں۔ اس لامحدود کائنات میں تیرا یہ منحنی وجود غیر اہم ہے۔

تُو ایسا حقیر ہے کہ تیرے ہونے نہ ہونے سے اس ایک نقطے پر بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوگا۔

بھگوڑے! تُو کچھ بھی نہیں ہے۔۔۔ تُو محض ایک دھوکا ہے۔

بھگوڑا:

ناں سیانے ناں۔۔۔ یوں مت بول۔۔۔ تُو نہیں جانتا میں جب آنکھیں بند کرتا ہوں تو ہر سو اندھیرا ہو جاتا ہے۔ میں سو جاؤں تو پوری کائنات میرے آرام کا خیال کرتے ہوئے گہری خاموشی کی چادر اوڑھ لیتی ہے اور ایک تُو ہے۔۔۔

کہتا ہے کہ میں دھوکا ہوں۔ اس کائنات میں غیر اہم ہوں۔

سیانا: (استہزائیہ انداز میں ہنستے ہوئے)

بھگوڑے۔۔۔ بس انہی خوش فہمیوں میں زندہ رہ تُو۔

یہ ذرا دیکھ اپنے اوپر موجود اس وسیع وعریض کائنات کو۔۔۔ اور پھر غور کر اپنے اس حقیر وجود پر۔ تُو محض چند ایٹمز ہے۔ جب تک یہ ایٹمز ایک خاص ترتیب سے جڑے ہیں۔۔۔

بھگوڑا موجود ہے۔

جس دن یہ ایٹمز بکھر گئے۔۔۔ بھگوڑا مٹی میں مٹی ہو جائے گا۔

گنتی کے چند ایٹمز۔۔۔ بس یہی حقیقت ہے بھگوڑے تیری۔

بھگوڑا: (اپنی نشست پر تھوڑا جم کر بیٹھتے ہوئے)

چند ایٹمز سے مل کر بنا ہوں ناں میں؟

اچھا سیانے پھر یہ تو بتا کہ Super Positions کیا ہوتی ہیں؟

ایٹم میں موجود الیکٹرونز بیک وقت بہت ساری جگہوں پر کیسے موجود ہو سکتے ہیں؟

بھگوڑے کے دیکھنے یا نا دیکھنے سے ان الیکٹرونز کی حرکت کا کیا تعلق ہے؟ ان الیکٹرونز کو کیسے پتہ چل جاتا ہے کہ اب ''جناب عزب مآب بھگوڑا صاحب'' ان کی جانب دیکھ رہے ہیں تو اب نہیں۔

سیانا: (پریشانی سے اپنی نشست پر پہلو بدلتے ہوئے)

بھگوڑے! مجھے اعتراف ہے کہ ابھی تک ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا

ہے، مگر ہم کوشش کر رہے ہیں اور امید ہے کہ ایک دن یہ عقدہ بھی حل کر لیں گے۔

بھگوڑا:

دیکھ سیانے۔۔۔تھوڑا غور سے سن میری بات۔۔۔

میرے دیکھتے ہی یہ الیکٹرونز اپنا چال چلن بدل لیتے ہیں۔اگر میں بھی بس چند ایٹمز ہی ہوں تو میرے دیکھنے سے ان الیکٹرونز کی حرکت کا کیا تعلق؟؟؟

سیانے۔۔۔بھگوڑا محض چند ایٹمز نہیں ہے۔

بھگوڑا کچھ اور ہے۔۔۔

بھگوڑا تو کچھ اور ہی ہے۔

یہ الیکٹرونز بھی اپنی Super Positions بس اس وقت تک برقرار رکھ سکتے ہیں، جب تک بھگوڑا ان کی جانب نہیں دیکھ رہا۔میری نگاہ کو محسوس کرتے ہی ان الیکٹرونز میں ہلچل ہونے لگتی ہے، ایک کھلبلی مچ جاتی ہے۔سیانے سوچ۔۔۔ذرا سوچ۔۔۔

یہ ساری کائنات بھی تو ایٹمز سے ہی مل کر بنی ہے ناں۔

اور ایک تُو ہے۔۔۔۔کہتا ہے کہ میں اس کائنات میں غیر اہم ہوں۔

سیانا:

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔۔۔بھگوڑے! تُو جیے جا اپنی انہی خوش فہمیوں میں، مگر حقیقت یہی ہے کہ تُو اس کائنات میں غیر اہم ہے۔

بھگوڑے! تُو بے اوقات ہے بے اوقات۔

بھگوڑا:

حقیقت؟؟؟۔۔۔۔سیانے! یہ لفظ ''حقیقت'' تیرے منہ سے سننا بالکل بھی اچھا نہیں لگتا۔کسی ایک چیز کی بھی حقیقت معلوم ہے تجھے؟ ایک ذرّے میں پنہاں کائناتوں سے اس کائنات کی وسعتوں تک۔۔۔۔کائنات کی ابتداء سے اس زمین پر زندگی کے آغاز تک۔۔۔یہ جس فضا میں تُو سانس لے رہا ہے اور یہ وقت جو تجھے لمحہ بہ لمحہ کھائے چلا جا رہا ہے۔۔۔

اس کائنات میں کسی ایک چیز کی حقیقت بھی معلوم ہے تجھے؟

سب سے بڑھ کر تُو خود کون ہے سیانے؟ یہ شعور کا عقدہ تجھ سے حل کیوں نہیں ہو پا رہا ہے؟

سیانے تُو خود اپنی حقیقت سے بھی بے خبر ہے۔تیرے منہ سے حقیقت کا لفظ سننا بُرا لگتا ہے۔

سیانا:

بس بس ۔۔۔بھگوڑے بس۔

ان تمام باتوں میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جس پر شرمندہ ہوا جائے۔

ہاں ہاں!! ٹھیک ہے نہیں معلوم ہمیں حقیقت کسی ایک بھی چیز کی ،مگر ہم کوشش کر رہے ہیں، مسلسل کوشش کر رہے ہیں اور ایک دن ہم اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جائیں گے اور پھر کائنات کی چودہ ارب سال کی طویل عمر کے مقابلے میں انسان ابھی چند ہزار سال کا ایک بچہ ہی تو ہے۔

ان چند ہزار برسوں میں ہم نے جنگل کو ترقی یافتہ مہذب معاشروں میں تبدیل کر دیا۔ چاند پر ہم پہنچ چکے ہیں۔ کائنات کا ماضی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ جدید سے جدید ٹیکنالوجی متعارف کروائی جا رہی ہے۔

ہم پرندوں کی طرح اڑنا سیکھ چکے ہیں تو مچھلیوں کی طرح تیرنا بھی۔

بھگوڑے۔۔۔اور کیا چاہتا ہے تُو ایک انسان سے؟ ایک بندر سے بنے انسان نے محض چند ہزار برس میں یہ سب کچھ کر دکھایا ہے، اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟

بھگوڑا:

سیانے! آنکھیں بند کر کے بھاگنے کو کامیابی مت بول۔

ٹھیک ہے آج بہت ساری مشینیں ضرور ایجاد کر لی ہیں تُو نے۔ اب سردیوں میں کمرے گرم رہتے ہیں تو گرمیوں میں ٹھنڈے، مگر اس کے ساتھ ساتھ نیند کی دوا بھی ایجاد کرنا پڑی ہے تجھے۔ جیسے جیسے تیری بنائی ہوئی مشینوں کا کردار انسانی زندگیوں میں بڑھ رہا ہے، ویسے ویسے ذہنی امراض بھی بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان تمام مشینوں کی سنگت کے باوجود لوگ خودکشیاں کیوں کر رہے ہیں؟

سیانے! تُو نے پرندوں کی طرح اڑنا اور مچھلیوں کی طرح تیرنا تو سیکھ لیا، مگر تجھے انسانوں کی طرح اس زمین پر بسنا نہیں آیا۔ تیری اس چند ہزار برس کی کامیابی اور ترقی سے جنگل کے جانور سہم چکے ہیں۔ انسان تو انسان ان معصوم جانوروں کی زندگیاں بھی خطرے میں پڑ چکی ہیں۔

ابھی اس چند ہزار برس کے ''معصوم بچے'' نے بڑے ہو کر جانے اور کیا کیا گُل کھلانے ہیں؟

کیا یہ ہے سیانے تیری ترقی اور کامیابی؟؟؟

اندھا دھند بھاگے چلے جا رہے ہو، بھاگے ہی چلے جا رہے ہو۔

ارے بھئی! جانا کدھر ہے؟ منزل کیا ہے؟ آخر انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے؟

سیانا:

مقصد؟؟؟؟ یہ ہر چیز میں تُو مقصد کیوں ڈھونڈ تا ہے؟

کوئی مقصد نہیں ہے اس کائنات کا اور زندگی کا۔ یہ زندگی محض ایک حادثہ ہے۔ زندگی کو اتنا سنجیدگی سے مت لے بھگوڑے! یہ پورا نظامِ زندگی وقت کی لہروں پر خود بخود بہہ رہا ہے، اسے بہنے دے۔ بس یہ بات یاد رکھ کہ اس لمحہ تُو زندہ ہے اور موجود ہے۔ خود کو خوش رکھ جیسے بھی خوش رکھ سکتا ہے۔ اگر حادثاتی طور پر تجھے زندگی کا تحفہ مل گیا ہے تو اسے انجوائے کر۔۔۔ پارٹی کر پارٹی۔

بھگوڑا:

یہ زندگی کیا زندگی ہے سیانے؟

اس زندگی کو انجوائے بس تیرے جیسے سیانے ہی کر سکتے ہیں۔

سیانے تُو اپنے اندر موجود لامحدود خواہشات کی موجودگی سے بے خبر ہے۔ تُو ان خواہشات کے مقصد سے لاعلم ہے۔ تُو اپنے ہی اندر موجود اخلاقی حِس کے مقاصد سے لاعلم ہے۔ تجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ تُو اس وقت، اس چھوٹے سے نقطے کی قید میں کیوں زندہ ہے۔

یہ زندگی تیری سمجھ سے بالاتر ہے سیانے! تُو خود سے نا آشنا ہے۔

بس۔۔۔۔ اس زندگی کے ظاہر سے واقفیت ہے تجھے۔ کسی بھی چیز کی حقیقت کا ذرا بھی اندازہ نہیں ہے تجھے۔ اندھوں کی طرح بھاگنا ہی جانتا ہے تُو۔

سیانا: (استہزائیہ انداز میں)

بھگوڑے! بات تو یوں کر رہا ہے جیسے تُو ہر چیز کی حقیقت سے واقف ہو۔

ایک ذرّے میں قیدِ دنیا سے لے کر اس کائنات کی وسعتوں تک، یہ سارا علم ہم ہی نے دیا ہے تجھے۔ آج ہماری بتائی گئی چیزوں پر ہم سے بحث مت کر۔ ہر چیز کی حقیقت سے تُو بھی اتنا ہی لاعلم اور بے خبر ہے جتنا ہم۔ اس لیے بھگوڑے تنقید اتنی ہی کر جتنی تجھے زیب دیتی ہو۔

بھگوڑا:

نہیں سیانے نہیں۔۔۔ میں جانتا ہوں ہر چیز کی حقیقت کو۔

میں اپنی حقیقت بھی جانتا ہوں اور اس زندگی کے مقصد سے بھی واقف ہوں۔

سیانا: (حیرت کے تاثرات چہرے پہ لیے)

یہ سب چیزیں تجھے کیسے پتہ چل گئیں؟

جب تک ہم تجھے نہیں بتائیں گے تُو کیسے جان سکتا ہے یہ سب کچھ؟

بھگوڑا: (مسکراتے ہوئے)

سیانے۔۔۔سیانے! اس زندگی اور خود کو جاننے کے لیے مجھے تیری ضرورت نہیں ہے۔ ہر چیز کا حقیقی علم میرے پاس موجود ہے۔ میرے پاس کتاب زندگی ہے کتابِ زندگی۔

سیانا:

کتابِ زندگی؟۔۔۔کوئی نئی کتاب آئی ہے کیا؟

کسی امریکن نے لکھی ہے یا جرمن نے؟

بھگوڑا:

نا کر سیانے۔۔۔ یہ امریکن اور جرمن۔۔۔ یہ سب بھی تیرے جیسے سیانے ہیں۔ یہ زندگی ان کی سمجھ سے بھی اتنی ہی بالا ہے جتنی تیری سمجھ سے۔ یہ کتابِ زندگی تو کچھ اور ہے۔

سیانا: (اچھنبے والی کیفیت میں)

اچھا۔۔۔ پھر ایسی کتاب کس نے لکھ دی کہ جس میں تمام حقائق موجود ہیں؟ اور پھر ابھی تک میری نگاہوں سے کیوں نہ گزری یہ کتاب؟

بھگوڑا:

سن۔۔۔غور سے سن سیانے۔۔۔غور سے سن میری بات۔۔۔

یہ کتابِ زندگی قرآنِ حکیم ہے۔ یہ کتاب میرے اور تیرے خدا نے لکھی ہے اور اس کتاب میں ہر چیز کی حقیقت موجود ہے۔

سیانا: (سیانے کے چہرے پر گھبراہٹ کے تاثرات نمایاں ہو چکے تھے)

خدا؟؟؟

آج تک دیکھا ہے کسی نے بھی خدا کو؟

ہم نے پوری کائنات چھان ماری ہمیں تو خدا کہیں نہیں ملا۔

بھگوڑا:

سیانے تجھے تو آج تک انسان اور انسانی شعور کہیں نہیں ملا۔۔۔ خدا تجھے کیسے ملے گا؟

اگر تجھے خدا دکھائی نہیں دے رہا ہے تو کیا۔۔۔

یہ خدا کے نہ ہونے پر دلیل ہے؟

سیانا:

دیکھ بھگوڑے خدا ہے یا نہیں ۔۔۔ہم نہیں جانتے ۔

یہ مذہب وغیرہ سب دقیانوسی باتیں ہیں ۔

انسانوں کو ان کی خواہشات سے دور رکھنے کے پرانے طریقے ہیں۔آج کے جدید دور میں ان فرسودہ روایات کا خاتمہ ہو رہا ہے۔اب سائنس ہی سب سے بڑی حقیقت ہے اور سائنس کو آج تک خدا کی موجودگی کا کوئی ایک بھی واضح ثبوت نہیں مل سکا۔

بھگوڑا:

ایک تو سیانے پریشان بڑی جلدی ہو جاتا ہے تُو۔

تھوڑا ٹھنڈا ہو۔۔۔میں تجھے دیتا ہوں خدا کی موجودگی کا ثبوت ۔

سیانا: (ایک بار پھر سے استہزائیہ انداز اختیار کرتے ہوئے)

بھگوڑے! مذاق مت کیا کر۔NASA اور ESA جیسے خلائی تحقیق کے اداروں کو خدا کی موجودگی کا ثبوت کہیں نہیں ملا ہے، تجھے یہ ثبوت کہاں سے مل سکتا ہے؟

بھگوڑا:

ارے اوئے سیانے۔۔۔

ان بے چارے NASA اور ESA والوں کو کہاں ملے گا کوئی ثبوت؟ خدا ان دوربینوں سے تھوڑی نہ دکھائی دے گا۔خدا تو کسی اور طرح ملتا ہے۔

سیانے! خدا تک پہنچنے کے میں تجھے تین راستے بتا دیتا ہوں ۔ جو راستہ بھی تجھے پسند ہو اختیار کر لینا۔ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تُو اس کائنات پر اور خود اپنے آپ پر غور و فکر کرنا شروع کر۔ کائنات کا ہر ہر ذرّہ خدا کی موجودگی پر گواہ ہے۔اس بے جان کائنات میں زندہ چیزوں کا پایا جانا خدا کی قدرت ہے۔سیانے! خود تیرے اپنے اندر موجود ہیں خدا کی نشانیاں ۔

انسانی شعور خدا کی نشانی ہے۔

ہر رات تیرا مر جانا اور پھر ہر صبح تیرا زندہ ہو جانا۔۔۔ یہ خدا کی نشانی ہے۔

سیانے! تیرے اندر موجود لامحدود خواہشات خدا کے وجود پر دلیل ہیں۔ تیری یہ خواہشات تجھے کچھ بتا رہی ہیں، سمجھا رہی ہیں۔۔۔۔تُو کبھی سن تو سہی ان کی بات ۔

انسانوں کے بیچ موجود تمام معاشی اور سماجی تفرقات خدا کے وجود پر دلیل ہیں۔

مگر تُو چھوڑ دے۔۔۔ یہ تیرے بس کی بات نہیں ہے سیانے۔
اس طریقے سے اگر تجھے خدا ملنا ہوتا تو اب تک مل چکا ہوتا۔

تیرے ہر سو۔۔۔ اور خود تیرے اپنے ہی اندر نشانیاں موجود ہیں خدا کی، مگر تُو خدا کی ان قدرتوں کو دیکھ کر بھی اَن دیکھا کر رہا ہے۔ تُو خدا کا انکار کرنے پر بضد ہے۔ یہ طریقہ تیرے لیے کارآمد نہیں ہوگا۔ چل تجھے ایک اور طریقہ بتا دیتا ہوں۔۔۔

سیانے! یہ جو تیرے اندر اخلاقی حِس پائی جاتی ہے۔۔۔ یہ اخلاقی حِس خدا کے وجود پر دلیل ہے۔ تیرے اپنے ہی اندر کوئی موجود ہے، جو تجھے اچھائی پر چلنے کی ترغیب دیتا رہتا ہے۔ تیرے اپنے ہی اندر کوئی موجود ہے جو ہر بُرا کام کرنے پر تجھے ملامت کرتا ہے۔

یہ جو تُو بِنا کسی بھی عقلی دلیل کے اخلاقیات پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہے، تیرا یہ رویہ خدا کے وجود پر دلیل ہے، مگر تُو خدا کی اس نشانی کا انکار کر رہا ہے اور مسلسل کر رہا ہے۔

سیانے! اگر تُو اپنے اندر موجود اس اخلاقی حِس کی مکمل پیروی کرنا شروع کر دے تو کچھ ہی عرصے بعد تُو خدا کے روبرو ہوگا۔

اگر تُو ہر وہ چیز، ہر وہ کام چھوڑ دے جس کے بارے میں تیرے اندر سے آواز آتی ہے کہ یہ ایک بُری چیز یا بُرا کام ہے۔۔۔ اور اگر تو ہر وہ چیز اپنا لے، ہر وہ کام کرنا شروع کر دے جس کے بارے میں تیرے اندر سے آواز آتی ہے کہ یہ ایک اچھی چیز اور اچھا کام ہے۔۔۔
تجھے خدا مل جائے گا۔

مگر چھوڑ دے سیانے! یہ کام بھی تجھ سے نہ ہو پائے گا۔ اپنی اخلاقی حِس کی مکمل پیروی کرنے کے لیے تجھے اپنی بہت ساری چھوٹی چھوٹی حیوانی خواہشات کو چھوڑنا پڑے گا۔ تجھے اپنے گریبان میں بار بار جھانکنا ہوگا۔ یہ مشکل کام ہے سیانے اور یہ کام تیرے سے نہ ہو پائے گا۔

اس لیے تجھے یہاں سے بھی خدا نہیں ملے گا۔

چل اب تجھے خدا کے روبرو ہونے کا سب سے آسان اور سب سے بہترین طریقہ بتا دیتا ہوں۔

تجھے خدا کے وجود پر سب سے بڑی اور روشن دلیل بتاتا ہوں۔۔۔

''قرآنِ حکیم''

قرآنِ حکیم خدا کے علم سے اتاری گئی کتاب ہے اور۔۔۔

خدا قرآنِ حکیم سے ملتا ہے۔

سیانا: (سیانے کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے، رنگ فق)

بھگوڑے ہر مذہب کے پاس اپنے پیروی کرنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے کتابیں موجود ہیں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ کتابیں خدا کے وجود پر دلیل ہیں۔ یہ سب محض ایک۔۔۔

بھگوڑا:

تُو نے کبھی قرآنِ حکیم پڑھا؟

سیانا:

نہیں میں کیوں پڑھوں گا؟۔۔۔ مجھے ضرورت نہیں ہے۔

بھگوڑا:

قرآنِ حکیم خدا کی کتاب ہے اور اس کتاب میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کے لیے کامل رہنمائی موجود ہے۔ بہت ساری ایسی چیزیں جو سائنس نے سو سال پہلے دریافت کی ہیں، ان چیزوں کے بارے میں قرآنِ حکیم نے چودہ سو سال پہلے ہی بتا دیا تھا، پیشین گوئی کر دی تھی۔

سیانے! تُو ایک کام کر۔۔۔

تُو کوشش کر کے قرآنِ حکیم میں سے کوئی ایک، بس کوئی ایک حقیقی غلطی ڈھونڈ دے۔

یا پھر قرآنِ حکیم میں چھے ہزار سے زائد آیات موجود ہیں، قرآنِ حکیم کی کسی دو آیات میں تضاد ڈھونڈ دے اور اس کام میں بے شک اپنے جیسے مزید جتنے مرضی سیانوں کو بلا لے۔

بس یہ کام کر دے۔ اگر تُو یہ کام کر دے تو جا۔۔۔ بھگوڑا ابھی سیانا ہو جائے گا۔

اور اگر تُو یہ کام نہ کر سکے۔۔۔

اور سیانے تُو ہرگز، ہرگز، ہرگز یہ کام نہ کر سکے گا۔

تو پھر یہ بات جان لے اور مان لے کہ قرآنِ حکیم تیرے خالق، تیرے خدا کے علم سے اتارا گیا ہے۔

(سیانے کا دل ڈوبنے لگا، بدن پر کپکپاہٹ طاری ہوگئی، مگر۔۔۔ سیانا بضد رہا۔)

سیانا:

بھگوڑے میرا وقت بہت قیمتی ہے۔

میں ایسا فارغ نہیں ہوں کہ ان سب چیزوں پر اپنا وقت ضائع کروں۔

بھگوڑا:

ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔

اچھا چل پھر یہی بتا دے کہ یہ وقت کیا ہوتا ہے؟ یہ وقت ہمیشہ آ گے۔۔۔

(سیانے کا دماغ گھوم گیا۔ سیانے نے کافی کا مگ ادھر ہی پھینکا اور بھاگ گیا۔)

میں بڑا حیران ہوا کہ سیانا یوں اچانک سے ہی اٹھ کر کیوں چلا گیا۔ کچھ دیر میں شش و پنج میں ڈوبا ادھر ہی بیٹھا رہا اور پھر میں بھی گھر واپس آ گیا۔ اماں کو سیانے کے ساتھ ہونے والی اپنی ملاقات کا احوال بیان کیا۔ میری بات سن کر اماں کسی گہری سوچ میں ڈوب گئیں۔ اماں کچھ دیر اسی طرح گم سم بیٹھی رہیں اور پھر مجھ سے کہنے لگیں کہ سیانے کے ساتھ ہونے والی اپنی تمام باتوں کو دوبارہ سے مکمل تفصیل کے ساتھ بیان کرو۔

اماں کے جوتوں کے ڈر سے میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی ساری باتیں دہرا دیں۔ میری باتیں سن کر کچھ دیر اماں گہری سوچ میں ڈوبی رہیں اور پھر اماں نے اپنی تشخیص کا اعلان کر دیا۔۔۔

''ان مردود سیانوں کو تو خدا اور قرآن کے نام پر ہی دورے پڑتے ہیں دورے۔''

میں تو اماں کی باتوں میں پوشیدہ حکمت کا بہت عرصہ پہلے ہی قائل ہو چکا تھا، لہٰذا میں نے بھی فوراً ہی اماں کی ہاں میں ہاں ملا دی اور اماں کے ساتھ باتیں کرتے کرتے جانے کیوں؟

اچانک سے مجھے سمندر کا وہ مینڈک یاد آنے لگا، جو سمندر میں آئے مدوجزر کے سبب ایک چھوٹے سے کنویں میں گر گیا تھا۔ ایک محدود کنویں میں گر کر سمندر کے اس مینڈک کا دم گھٹ رہا تھا۔ وہ تو سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہا تھا۔ کنویں کے اندھیرے میں اسے وحشت ہو رہی تھی۔

سمندر کا وہ مینڈک۔۔۔۔۔ کنویں میں گر کر زندہ رہا؟

یا پھر۔۔۔۔۔ کنویں کے گھٹن زدہ ماحول میں تڑپ تڑپ کر اپنی موت آپ مر گیا؟

کنویں میں گرے سمندر کے اس مینڈک پر۔۔۔۔۔ کیا بیتی ہوگی؟

دوسری دفعہ کا ذکر ہے کہ کسی ساحلِ سمندر سے بس کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا کنواں ہوا کرتا تھا۔ اس کنویں میں کچھ مینڈک رہتے تھے۔ یہ کنواں نہ صرف بہت گہرا تھا، بلکہ اس میں پانی کی سطح بھی بہت نیچی تھی، جس کی وجہ سے یہ مینڈک کنویں سے کبھی باہر نہ نکل پاتے۔ یہ مینڈک اسی کنویں میں پیدا ہوتے اور پھر اسی کنویں میں ہی پُھدک پُھدک کر مر جاتے۔ یہ محدود کنواں ہی ان مینڈکوں کی کل کائنات تھا۔

ہوا یوں کہ ایک چودھویں رات سمندر میں مدوجزر بہت زیادہ ہوا۔ اتنا زیادہ کہ سمندر کا کچھ پانی بہتا ہوا اس کنویں میں گرنے لگا اور پھر اسی پانی کے بہاؤ پر غوطے کھاتا ہوا سمندر کا ایک مینڈک بھی کنویں میں گر گیا۔ ایک اجنبی مینڈک کو کنویں میں گرتا دیکھ کر کنویں کے سبھی مینڈک اس نو وارِد کے گرد جمع ہو گئے اور حیرانی

کے ساتھ اسے دیکھنے لگے۔ پھر کچھ لمحات بعد کنویں کا ایک مینڈک سمندر کے اس مینڈک سے پوچھنے لگا:

''میاں! تم کہاں سے آن ٹپکے ہو؟''

سمندر کا مینڈک اس چھوٹے سے کنویں میں قید ہو کر بہت پریشان تھا۔ کنویں کی دیواریں اسے خود پر گرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس اندھیرے میں ڈوبے کنویں میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ بڑی مشکل سے سانس لیتے ہوئے بتانے لگا:

''میں سمندر کا مینڈک ہوں۔ مدوجزر کے سبب سمندر کے پانی کے ساتھ بہتا ہوا اس کنویں میں آن گرا ہوں۔''

کنویں کے مینڈکوں کے لیے یہ لفظ ''سمندر'' بالکل اجنبی تھا۔

سب حیران ہو کر پوچھنے لگے:

''یہ سمندر کیا چیز ہوتی ہے؟''

سمندر کا مینڈک اس تنگ و تاریک کنویں میں کچھ وقت گزار کر ہی نڈھال ہو چکا تھا، مگر اپنی بچی کچھی ہمت جمع کر کے بتانے لگا:

''سمندر پانی کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہوتا ہے اور اس پانی میں بڑے بڑے جاندار موجود ہوتے ہیں۔''

یہ سب سن کر کنویں کے ایک مینڈک نے اچھل کود کرنا شروع کر دی اور کنویں کی دیوار کے ساتھ ساتھ کچھ فاصلہ طے کر کے سمندر کے مینڈک سے پوچھنے لگا:

''کیا۔۔۔۔کیا اتنا بڑا ہوتا ہے یہ سمندر؟''

کنویں کے مینڈک کی یہ بات سن کر سمندر کے مینڈک کو اپنی حالتِ زار کے باوجود ہنسی آ گئی، لیکن وہ اپنی ہنسی پر قابو پا کر بتانے لگا:

''نہیں نہیں۔۔۔۔۔سمندر تو اس سے بہت بڑا ہوتا ہے۔''

کنویں کے مینڈک نے یہ سنتے ہی ایک بار پھر سے کنویں کی دیوار کے ساتھ ساتھ اپنی اچھل کود شروع کر دی۔ اب کی بار اس نے کنویں کا ایک چکر مکمل کیا اور پھر امید بھری نگاہوں سے سمندر کے مینڈک کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھنے لگا:

''کیا اتنا بڑا ہوتا ہے سمندر؟''

اب کی بار تو سمندر کے مینڈک کے لیے اپنی ہنسی روکنا ہی مشکل ہو گیا۔ ہنستے ہنستے وہ کنویں کی

دیواروں کے ساتھ لوٹ پوٹ ہونے لگا۔اسے کھانسی کا شدید دورہ بھی پڑا۔کافی دیر بعد سانس کچھ بحال ہوئی تو کنویں کے مینڈک کو بتانے لگا:

''سمندر تمھارے اس کنویں سے بڑا۔۔۔۔۔بہت بڑا۔۔۔۔۔بہت ہی بڑا ہوتا ہے۔''

یہ سنتے ہی کنویں کے سبھی مینڈک مل کر چلّانے لگے:

''نہیں نہیں،تم جھوٹ بول رہے ہو۔اس کنویں سے بڑا کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔یہ کنواں ہی سب سے بڑی چیز ہے۔یہ کنواں ہی کل کائنات ہے۔''

کنویں کے مینڈک کی اس کہانی میں اور اس سے پہلے والی کہانی میں۔۔۔

سب کچھ ایک جیسا ہے،سب کچھ یکساں ہے،مگر۔۔۔

مگر سمندر میں یہ والا مدوجزر پہلے والے مدوجزر کے چالیس سال بعد آیا تھا اور چالیس سال پہلے والے مدوجزر کے نتیجے میں سمندر کا جو مینڈک کنویں میں گرا تھا ناں۔۔۔

وہ یہی کنویں کا مینڈک ہے۔۔۔۔۔جو آج کنویں کی دیواروں کے ساتھ پھدک پھدک کر سمندر کا حجم دریافت کرنا چاہ رہا ہے۔کنویں میں کچھ وقت گزارنے کے بعد سمندر کا مینڈک۔۔۔

سمندر اور سمندر سے وابستہ ہر چیز بھول چکا ہے۔یہ کنواں ہی اب اس کی کل کائنات ہے۔یہ کنواں ہی اب اس کے لیے سب سے بڑی چیز ہے۔

کنویں میں چالیس سال گزارنے کے بعد اب سمندر کا مینڈک۔۔۔

سمندر کا مینڈک نہیں رہا۔

اب وہ مکمل طور پر بن چکا ہے ایک۔۔۔

''کنوئیں کا مینڈک''

باب:2

لامحدود

ہر انسانی معاشرے میں بالعموم جبکہ پاکستانی معاشرہ میں بالخصوص:

کچھ لوگ کچھ نہیں کرتے۔۔۔۔۔اور انہیں ''فارغ'' کہا جاتا ہے۔

کچھ لوگ مستقل طور پر کچھ نہیں کرتے۔۔۔۔۔اور ان کو''ویلے'' بولا جاتا ہے۔

جبکہ کچھ جری بہادر جوان ایسے بھی ہوتے ہیں، جو نہ تو مستقل طور پر کچھ کر رہے ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کا مستقبل میں کسی قسم کا کچھ کرنے کا ارادہ ہوتا ہے۔قوم کے ایسے سپوت''نکمے'' کہلاتے ہیں۔

اور میرا شمار۔۔۔۔۔آخر الذکر قسم کے لوگوں میں ہوتا ہے۔

اگر ایک انسان کے اندر اپنے فارغ پن، ویلے پن یا پھر نکمے پن کا باقاعدہ احساس اور شعور موجود ہو تو ایسے حالات میں انسان کا وقت کچھ اس قسم کی سرگرمیوں میں صرف ہوتا ہے:

فارغ لوگ۔۔۔۔۔کرکٹ کا ٹیسٹ میچ دیکھتے ہیں۔

ویلے لوگ۔۔۔۔۔Repeat پر کرکٹ کا ٹیسٹ میچ دیکھتے ہیں۔

نکمے لوگ۔۔۔۔۔یہ کلاسک شطرنج کے مقابلوں سے محظوظ ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے اگر ایک انسان کے اندر اپنے فارغ پن، ویلے پن یا پھر نکمے پن کا باقاعدہ احساس اور شعور موجود نہ ہو تو پھر انسان خوش فہمی میں مبتلا ہو کر خود کو محنتی اور مصروف ہی سمجھ رہا ہوتا ہے۔ان حالات میں انسانی سرگرمیاں کچھ یوں ہوتی ہیں:

فارغ لوگ پاکستان کے ہر نیوز چینل پر شام سے رات گئے تک پے در پے دکھائے جانے والے''کامیڈی شوز'' سے اپنا دل بہلاتے ہیں۔

ویلے لوگ اخبارات کے آن لائن ایڈیشنز کا مطالعہ کرتے ہیں۔نہ صرف مطالعہ کرتے ہیں بلکہ ہر تحریر پر اپنی رائے کا اظہار بھی تبصرے کی صورت میں کرتے ہیں۔

تبصرہ کرتے ہیں۔۔۔۔۔تبصرہ در تبصرہ کرتے ہیں اور کبھی کبھار تو ان تبصروں میں علم و معرفت

کے وہ وہ موتی بکھرتے ہیں کہ جنہیں بیان کرتے ہوئے ایک شریف انسان کی زبان لکنت مار جائے، مہذب الفاظ کا جامہ پہنانا مشکل ہوجائے۔

جبکہ نکمے لوگ۔۔۔

یہ ان تمام تحریروں اور تبصروں کے خاموش۔۔۔۔۔ بالکل خاموش قارئین ہوتے ہیں۔

اور میرا شمار۔۔۔

ایک وقت تھا کہ فارغ پن، ویلے پن اور نکمے پن کی یہ تینوں اقسام اور ان تینوں اقسام سے منسلک افراد۔۔۔۔۔ سب اپنا اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھے ہوئے تھے۔

بیس پچیس لوگوں کی محفل میں موجود نکمے لوگوں کو فارغ لوگوں سے ممتاز کرنا کچھ ایسا دشوار بھی نہ ہوا کرتا تھا۔ ہر مجلس میں بیٹھے ویلے لوگ دور سے ہی نظر آجایا کرتے تھے۔

مگر پھر۔۔۔

پھر کورونا وائرس آ گیا۔

لاک ڈاؤن ہوا۔۔۔۔۔ اور سب گڈ مڈ ہوگیا۔۔۔۔۔ سب کچھ گڈ مڈ ہوگیا۔

بہت سے کام کاج والے افراد فارغ ہو گئے۔

رات دن مصروف رہنے والوں کو ویلے پن کے طعنے سننا پڑے۔

بہت سے محنتی لوگوں نے گھر بیٹھ کر ترکاری بنائی، جبکہ۔۔۔

کچھ پہلے سے ہی فارغ لوگ نکمے بن گئے۔

نگوڑ مارے!

گنتی کے چند ہی لوگ ہوں گے، جن کے شب و روز پر یہ کورونا وائرس بھی کسی قسم کے اثرات مرتب کرنے میں ناکام رہا ہوگا۔

اور میرا شمار۔۔۔

اس لاک ڈاؤن سے پہلے بھی میں نکما تھا اور اس لاک ڈاؤن کے بعد۔۔۔

بہرحال اسی لاک ڈاؤن کے دوران پاکستان میں شائع ہونے والے اخبارات میں سے ایک میں اس کائنات کے بارے میں تحریر لکھی گئی۔ میں نے تحریر پڑھی اور تبصرے بھی۔ اس تحریر کی فصاحت و بلاغت تو اپنی جگہ، لیکن میری ساری توجہ اس تحریر کے نیچے لکھے گئے ایک تبصرے پر مرکوز ہوچکی تھی۔

کچھ تبصرے آفاقی ہوتے ہیں۔۔۔انسان کی زندگی میں روشنی بھر دیتے ہیں۔

کچھ لمحات جادوئی ہوتے ہیں۔۔۔انسان کی زندگی بدل دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ایک اخبار میں شائع ہونے والی تحریر کے نیچے لکھے گئے ایک ایسے ہی تبصرے نے مجھے جاہلیت کے اندھیروں سے نکال باہر کیا۔میری زندگی بدل کر رکھ دی۔

اس تبصرے کا مفہوم کچھ یوں تھا:

''کیا پتہ ہم کسی ویڈیو گیم میں زندگی بسر کر رہے ہوں؟ کیا پتہ کسی دوسرے بڑے سیارے پر موجود کوئی زیادہ ترقی یافتہ Alien ہماری زندگیوں کو چلا رہا ہو؟ اور کیا معلوم ہم جس ویڈیو گیم میں موجود ہوں، وہ کسی دس بارہ سال کے بچے نے بنائی ہو؟ اور اس بچے نے یہ ویڈیو گیم اپنے ماں باپ سے چھپا کر اپنے گھر کے تہہ خانے میں رکھی ہوئی ہو؟''

کسی سیانے کی جانب سے لکھے گئے اس قسم کے تبصرے نے میرے اندر بھی ایک کھلبلی مچا دی۔ مجھے محسوس ہوا کہ آج کا انسان ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔آج کا انسان پڑھا لکھا، ہوش مند اور ذی شعور انسان ہے۔ یہ ماضی کے لوگ کیسے اجڈ، جاہل اور گنوار تھے؟ کیسے جنگلی اور عقل سے پیدل لوگ تھے کہ جو ان بے جان ستاروں کی پوجا کیا کرتے تھے؟

مگر آج کا ''اعلیٰ تعلیم یافتہ'' انسان ان ستاروں کی حقیقت جان چکا ہے۔ چند بے جان ایٹمز سے بنے ان ستاروں کی کیا اوقات ہے کہ انہیں اپنا خدا بنایا جائے؟ یہ ستارے تو خود مجبورِ محض ہیں، لہٰذا آج کا پڑھا لکھا انسان ان بے جان ستاروں کی جگہ اب ان ستاروں پر رہنے والے کسی اَن دیکھے Alien کے دس بارہ سالہ بچے میں اپنا خدا تلاش کر رہے ہیں۔

ماننا پڑے گا۔۔۔

اب کی بار تو ماننا ہی پڑے گا۔

انسان ترقی یافتہ ہو چکا ہے۔۔۔۔۔تہذیب یافتہ ہو چکا ہے۔

ماضی کی فرسودہ روایات ختم ہوگئی ہیں۔۔۔۔۔روشن خیالی آ چکی ہے۔

بہر حال ان سیانوں کو ان کی سبھی سیانی باتوں کے ساتھ ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں۔

قرآنِ حکیم سے رجوع کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ۔۔۔

''ہمارا خدا کون ہے؟''

ویسے اس کتاب کا مقصد تو یہ جاننا تھا کہ۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

لیکن اب اس سے بھی پہلے یہ جاننا زیادہ ضروری ہو چکا ہے کہ میرا خدا کون ہے؟

مجھے کس نے پیدا کیا ہے؟ وہ کون ہے کہ جو میری زندگی پر قابو یافتہ ہے؟

کیا جس خدا نے مجھے پیدا کیا ہے، اس کے اپنے بھی کوئی والدین ہیں؟

آیئے! دیکھتے ہیں کہ وہ خدا خود اپنے بارے میں کیا فرماتا ہے:

''کہہ دو: بات یہ ہے کہ اللہ ہر لحاظ سے ایک ہے۔ اللہ ہی ایسا ہے کہ سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ اور اس کے جوڑ کا کوئی نہیں ہے۔'' (الاخلاص:4-1)

ایک بات تو یقینی ہے کہ جس ذاتِ برحق نے مجھے پیدا کیا ہے، وہ تنہا ہے۔ اس جیسا کوئی اور نہیں ہے۔ اس کی مثال کے جیسا بھی کوئی اور نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ میرے خالق، میرے خدا کا اس کائنات کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟

کیا یہ ساری کائنات خود بخود چل رہی ہے؟

یا پھر۔۔۔

میرا خالق اس کائنات کا بھی خالق ہے؟

''آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اور ان کے درمیان جو کچھ ہے، وہ سب بھی اسی کی ملکیت ہے اور زمین کی تہوں کے نیچے جو کچھ ہے وہ بھی۔'' (طٰہٰ:6)

''یقیناً تمھارا پروردگار وہ اللہ ہے جس نے سارے آسمان اور زمین چھے دن میں بنائے۔ پھر اس نے عرش پر استواء فرمایا۔ وہ دن کو رات کی چادر اوڑھا دیتا ہے، جو تیز رفتاری سے چلتی ہوئی اس کو آدبوچتی ہے اور اس نے سورج اور چاند تارے پیدا کیے ہیں، جو سب اس کے حکم کے آگے رام ہیں۔ یاد رکھو کہ پیدا کرنا اور حکم دینا سب اسی کا کام ہے۔ بڑی برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔'' (الاعراف:54)

ان دونوں آیاتِ مبارکہ سے یہ بات تو واضح ہے کہ جو میرا خالق ہے، وہ صرف میرا خالق نہیں ہے بلکہ۔۔۔

میں اور آپ ۔۔۔۔۔ یہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز ۔۔۔۔۔ ہر وہ چیز جسے ہم کسی بھی طرح دیکھ سکتے ہیں یا براہِ راست محسوس کر سکتے ہیں ۔۔۔۔۔ وہ تمام چیزیں بھی جنہیں ہم نہ تو دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی بھی طرح سے محسوس کر سکتے ہیں ۔۔۔۔۔اور وہ تمام چیزیں بھی جن کا تصور بھی ہمارے لیے ناممکن ہے ۔۔۔۔۔ان تمام چیزوں کا، ان تمام کی تمام چیزوں کا خالق بس وہ ایک اکیلا اللہ ہی ہے ۔ وہ تنِ تنہا خالق ہے باقی ہر چیز اس کی مخلوق ہے ۔

اب کسی سیانے کے دماغ میں یہ خیال بھی آ سکتا ہے کہ کوئی ہستی اتنی بڑی کیسے ہوسکتی ہے کہ وہ اس لامحدود کائنات کو پیدا کر دے ۔

ایسے سیانے لوگوں سے قرآنِ حکیم کچھ یوں مخاطب ہوتا ہے :

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے کوئی بیٹا بنایا ہوا ہے، (حالانکہ) اس کی ذات (اس قسم کی چیزوں سے) پاک ہے، بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ سب کے سب اس کے فرمانبردار ہیں ۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے بارے میں بس اتنا کہتا ہے کہ ہوجا، چنانچہ وہ ہوجاتی ہے۔'' (البقرۃ:117-116)

ارے بھئی ! اس اللہ کی شان تو کُن فَیَکُون ہے ۔ اس کا بس کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے ۔ جو وہ کہہ دیتا ہے، وہ ہو جاتا ہے اور یقیناً خدائے بزرگ و برتر کے علم میں تھا کہ انسانی ذہنوں میں شکوک وشبہات جنم لیں گے، وسوسے پیدا ہوں گے، اسی وجہ سے خدا نے قرآنِ حکیم میں بہت ساری نشانیاں بیان کر دی ہیں ۔ کوئی بھی شخص ان نشانیوں کو پرکھ کر اپنی تسلی کر سکتا ہے کہ اس کائنات کا خالق بس وہ اکیلا اللہ ہی ہے ۔

ایسی بہت ساری نشانیوں میں سے محض چند آپ کے گوش گزار کیے دیتا ہوں ۔ یہ تمام وہ نشانیاں ہیں، جو قرآنِ حکیم آج سے تقریباً ساڑھے چودہ سو سال پہلے بیان کر رہا ہے اور یہ وہ باتیں ہیں جنہیں کائنات کے خالق کے سوا ساڑھے چودہ سو سال پہلے کوئی اور نہیں جان سکتا تھا۔

تقریباً سو سال پہلے تک صاحبانِ علم و دانش یہی تصور کیا کرتے تھے کہ یہ کائنات ہمیشہ سے موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی ۔ Edwin Hubble وہ پہلا سائنسدان تھا، جس نے 1929ء میں یہ دریافت کیا تھا کہ ۔۔۔''یہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے۔''

وگرنہ اس سے پہلے انسانی علم میں اس بات کا تصور تک موجود نہیں تھا کہ یہ کائنات پھیل بھی سکتی

ہے، جبکہ قرآنِ حکیم کائنات کے اس پھیلنے کو ساڑھے چودہ صدیاں پہلے بیان کر رہا ہے۔

''اور آسمانی کائنات کو ہم نے بڑی قوت کے ذریعہ بنایا اور یقیناً ہم (اس کائنات کو) وسعت اور پھیلاؤ دیتے جا رہے ہیں۔'' (الذاریات:47)

یہ کائنات کا پھیلاؤ ہی ہے جس کے سبب سائنسدان یہ بات جان سکیں ہیں کہ اس کائنات کا کوئی آغاز بھی تھا اور اب ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ اس کائنات کا آغاز آج سے تقریباً 13.8 ارب سال پہلے Big Bang کی شکل میں ہوا تھا۔ کائنات کے آغاز کے وقت یہ تمام ستارے، سیارے اور کہکشائیں؛ یہ سب یکجا تھے۔ یہ زمین اور آسمان ملے ہوئے تھے۔ ان تمام چیزوں کو قرآنِ حکیم ساڑھے چودہ سو برس پہلے کچھ یوں بیان کر رہا ہے:

''کیا کافروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے تھے۔
تو ہم نے جدا جدا کر دیا اور تمام جاندار چیزیں ہم نے پانی سے بنائیں۔
پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے؟'' (الانبیاء:30)

پھر سائنس پر تو ایک دور ایسا بھی رہا ہے کہ جب کائنات کو ابدی تصور کیا جاتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ یہ کائنات ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والی ہے، لیکن 1929ء کے بعد سے اب سائنس کے مطابق بھی یہ کائنات ابدی نہیں ہے۔ ایک دن ایسا بھی آنے والا ہے کہ جب یہ تمام کائنات تباہ و برباد ہو جائے گی، جبکہ کائنات کے خاتمے کا قرآنِ حکیم نے پہلے سے ہی بتا رکھا ہے۔

''ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان دونوں کے مابین ہے، مبنی بر حکمت اور ایک وقتِ مقرر تک کے لیے پیدا کیا ہے اور کافروں کو جس چیز کی نصیحت کی جاتی ہے، اس سے منہ پھیر لیتے ہیں۔'' (الاحقاف:3)

''وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور (وہی) دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور اسی نے سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا ہے۔ ہر ایک، ایک وقتِ مقرر تک چل رہا ہے۔ یہی اللہ تمھارا پروردگار ہے۔ اسی کی بادشاہی ہے اور جن لوگوں کو تم اس کے سوا پکارتے ہو، وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے برابر بھی تو (کسی چیز کے) مالک نہیں۔'' (الفاطر:13)

''اللہ وہی تو ہے جس نے ستونوں کے بغیر آسمان جیسا کہ تم دیکھتے ہو (اتنے) اونچے بنائے۔ پھر عرش پر جا ٹھہرا اور سورج اور چاند کو کام میں لگا دیا۔ ہر

ایک، ایک میعاد تک گردش کر رہا ہے۔ وہی (دنیا کے) کاموں کا انتظام کرتا ہے۔ (اس طرح) وہ اپنی آیتیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے کہ تم اپنے رب کے روبرو جانے کا یقین کرو۔'' (الرعد:2)

اب یہ تمام چیزیں ساڑھے چودہ سو سال پہلے خدا کے سوا اور کون لکھ سکتا ہے؟

پھر انسانی علم پر تو ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے، جب اس زمین کو ہی کائنات کا مرکز و محور سمجھا جاتا تھا۔ خیال یہی تھا کہ ہماری یہ زمین ساکن ہے، جبکہ چاند کی طرح سورج بھی زمین کے گرد گردش کرتا ہے، لیکن آج ہمیں یہ چیز معلوم ہو چکی ہے کہ اس کائنات میں کوئی ایک چیز بھی ساکن نہیں ہے۔

کائنات میں موجود ہر ستارہ، سیارہ اور ہر کہکشاں۔۔۔۔۔ ہر ہر چیز حرکت میں ہے۔

اجرامِ فلکیہ کی انہی کیفیات کو قرآنِ حکیم کچھ یوں بیان کرتا ہے:

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دن اور سورج اور چاند پیدا کیے۔ سب کسی نہ کسی مدار میں تیر رہے ہیں۔'' (الانبیاء:33)

''اور سورج اپنے مقرر راستے پر چلتا رہتا ہے۔ یہ (اللہ) غالب اور دانا کا (مقرر کیا ہوا) اندازہ ہے اور چاند کی بھی ہم نے منزلیں مقرر کر دیں۔ یہاں تک کے (گھٹتے گھٹتے) کھجور کی پرانی شاخ کی طرح ہو جاتا ہے۔ نہ تو سورج ہی سے ہو سکتا ہے کہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات ہی دن سے پہلے آ سکتی ہے اور سب اپنے اپنے دائرے میں تیر رہے ہیں۔'' (یٰسں:40-38)

پھر یہ بڑے بڑے ستاروں کو نگل جانے والے Black Holes آج کے دور میں خلائی تحقیق کرنے والے سائنسدانوں کی دلچسپیوں کا مرکز و محور ہیں۔ پہلا بلیک ہول 1971ء میں دریافت ہوا تھا، جبکہ قرآنِ حکیم بلیک ہول کی نشاندہی ساڑھے چودہ سو سال پہلے کر چکا ہے۔

''تو مجھے قسم ہے ان جگہوں کی جہاں تارے ڈوبتے ہیں اور اگر تم سمجھو تو یہ بہت بڑی قسم ہے۔'' (الواقعۃ:75-76)

یہ تارے کہاں پر ڈوبتے ہیں؟

کیا انہی جگہوں کو بلیک ہول نہیں کہتے؟

اب یہ تمام باتیں قرآنِ حکیم میں خدائے بزرگ و برتر کے سوا بھی کوئی لکھ سکتا ہے کیا؟

اور پھر یہ وقت۔۔۔1905ء سے پہلے تک یہی سمجھا جاتا تھا کہ کائنات میں وقت ہر جگہ، ہر

فرد کے لیے ایک جیسا رہتا ہے۔ یہ تو آئن سٹائین ہے، جس نے 1905ء میں اپنا نظریہ پیش کیا تھا کہ۔۔۔''اس کائنات میں وقت ہر جگہ ایک جیسا نہیں رہتا بلکہ وقت ایک Relative چیز ہے۔''

وقت کی اس Relativity کو قرآنِ حکیم کچھ یوں بیان کرتا ہے:

''اور یہ لوگ تم سے عذاب جلدی لانے کا مطالبہ کرتے ہیں، حالانکہ اللہ اپنے وعدے کی ہرگز خلاف ورزی نہیں کرے گا اور یقین جانو کہ تمھارے رب کے یہاں کا ایک دن تمھاری گنتی کے مطابق ایک ہزار سال کی طرح کا ہوتا ہے۔'' (الحج:47)

''اور جس دن وہ انہیں جمع کرے گا۔ (وہ محسوس کریں گے) گویا وہ دن کی ایک گھڑی کے سوا دنیا میں ٹھہرے ہی نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ بیشک وہ لوگ خسارے میں رہے، جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا تھا اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔'' (یونس:45)

کیا اسی چیز کو وقت کا Relative ہونا نہیں کہتے ہیں؟

بہرحال یہ تو محض چند مقامات ہیں جن کا ذکر کیا گیا ہے، وگرنہ قرآنِ حکیم میں مزید بھی بہت ساری نشانیاں موجود ہیں، جن کو پرکھ کر کوئی بھی ہوش مند انسان یہ بات جان سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم خدا کے علم سے اتارا گیا ہے۔ یہ قرآن ایسی چیز نہیں ہے، جسے کوئی انسان تخلیق کر سکے۔ یہ خدائے بزرگ و برتر کا کلام ہے۔

اب تک ہم نے قرآنِ حکیم کی جتنی بھی آیات کا مطالعہ کیا ہے، ان سے دو باتیں تو بالکل عیاں ہیں۔ مجھے جس ہستی نے پیدا کیا ہے، وہ تنہا ہے۔ اس جیسا کوئی اور نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ تمام کائنات اور اس میں موجود ہر جاندار اور بے جان چیز اسی ایک اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

بس وہ اکیلا اللہ خالق ہے اور باقی ہر چیز مخلوق ہے۔

البتہ ''علم و معرفت'' کے خزانے، اس آفاقی تبصرے میں لکھی گئی ایک بات پر ابھی بھی بحث باقی ہے۔ کیا خدا کی ذات نے یہ کائنات محض کھیل کود اور دل لگی کے لیے پیدا کی ہے؟

کیا خدا نے مجھے کھیل تماشے کے لیے بنایا ہے؟

''اور ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے، کھیل تماشے کے طور پر (بے کار) نہیں بنایا۔ اگر ہم کوئی کھیل تماشا اختیار کرنا

چاہتے تو اسے اپنی ہی طرف سے اختیار کر لیتے۔ اگر ہم (ایسا) کرنے
والے ہوتے۔'' (الانبیاء:16-17)

''اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے، ان کو کھیلتے
ہوئے نہیں بنایا۔ ان کو ہم نے تدبیر سے پیدا کیا ہے، لیکن اکثر لوگ
نہیں جانتے۔'' (الدخان:38-39)

یقیناً خدا کو معلوم تھا کہ اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے کچھ سیانے اس قسم کے سوالات ضرور اٹھائیں گے۔ اسی وجہ سے خدا نے قرآنِ حکیم میں ان تمام سوالوں کے جواب پہلے سے ہی لکھ چھوڑے ہیں۔ یہ تمام کائنات ایک بامقصد تخلیق ہے۔ مجھے میرے خدا نے اپنی دل لگی کے لیے نہیں، بلکہ کسی خاص مقصد کے لیے پیدا کیا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ میرا وہ خالق کیسا ہے؟ وہ کتنا بڑا ہے؟
اس کے اختیارات کیا ہیں؟ اس کی طاقت کتنی ہے؟

اللہ کی بڑائی کا اندازہ لگانے کا ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ اس کی پیدا کی گئی کائنات کی وسعت کو جاننے کی کوشش کی جائے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ ہمارے اب تک کے بہترین اندازوں کے مطابق اس قابلِ مشاہدہ کائنات کا سائز تقریباً 93 ارب نوری سال ہے، جبکہ اس قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے کے بارے میں مختلف آراء پائی جاتی ہیں۔ جن میں سے ایک رائے یہ بھی ہے کہ ہماری یہ کائنات اکیلی کائنات نہیں ہے، بلکہ اس کائنات جیسی 10^1000000000000 مزید کائناتیں بھی پائی جاتی ہیں۔

آیئے! دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کی وسعت کے بارے میں کیا کہتے ہیں:

''اور اسی کے پاس غیب کی چابیاں ہیں جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''
(الانعام:59)

''اور تمھارے پروردگار کے لشکروں کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''
(المدثر:31)

اللہ کی مخلوقات کا حاطہ ہم کبھی نہ کر پائیں گے۔ اس کائنات کی وسعت کو ہم کبھی نہیں جان پائیں گے۔ یہ کائنات ہمارے لیے لامحدود ہے اور لامحدود ہی رہے گی۔ البتہ اللہ کی بزرگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ یہ لامحدود کائنات، یہ ساتوں آسمان اللہ کے ایک ہاتھ پر لپٹ سکتے ہیں۔ اب اس

چیز سے اللہ کی بڑائی کا کچھ بالکل ہی خام سا تصور قائم کر سکتے ہیں تو کر لیجیے۔

''اور ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر ہی نہیں پہچانی جیسا کہ اس کی قدر پہچاننے کا حق تھا۔ حالانکہ پوری کی پوری زمین قیامت کے دن اس کی مٹھی میں ہوگی اور سارے کے سارے آسمان اس کے دائیں ہاتھ پر لپٹے ہوں گے۔ وہ پاک ہے اور بہت بالا و برتر اس شرک سے جس کا ارتکاب یہ لوگ کر رہے ہیں۔'' (الزمر:67)

جاننا چاہتے ہیں لامحدود کیا ہوتا ہے؟

حقیقی لامحدود تو بس وہ ایک اکیلا اللہ ہی ہے۔

یہ کائنات ہمارے لیے لامحدود ہو سکتی ہے، لیکن اللہ کے لیے یہ کائنات نہ صرف محدود ہے بلکہ اتنی محدود ہے کہ یہ تمام کائنات اس بزرگ و برتر ہستی کے ایک ہاتھ پر لپٹ سکتی ہے۔

یہ ہے میرا خالق، مجھے تو ایسی عظمت والی ہستی نے پیدا کیا ہے۔

باقی پیدا تو اس دنیا کے سبھی سیانوں کو بھی اللہ نے ہی کیا ہے، لیکن اب یہ سیانے لوگ اپنے خدا کو اس کائنات میں نا پائے جانے والے Aliens کے کسی دس بارہ سال کے بچے میں ڈھونڈنے لگیں تو کوئی کیا کہہ سکتا ہے۔

اس دنیا کے بیشتر سائنسدان، خاص طور پر Atheist مزاج رکھنے والے سائنسدان اس بات پر نہ صرف زور دیتے ہیں، بلکہ اس بات کو ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور بھی لگا رہے ہیں کہ یہ کائنات اور اس میں موجود ہر چیز خود بخود ہی چل رہی ہے۔

یہ سب کچھ Randomly بس اپنے آپ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ بالکل لُڈو کے پھینکے گئے کسی دانے (Dice) کی مانند ''ایک سے چھے'' کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

اتفاق سے Big Bang ہو گیا۔ اتفاق سے Physical Laws ایسے بن گئے کہ یہ کہکشائیں اور ستارے وجود میں آ گئے۔ اتفاق سے ہی زمین پر زندگی کا آغاز ہو گیا اور پھر اتفاق سے ہی بندروں سے انسان بن گئے۔ مطلب۔۔۔

اتفاق در اتفاق، پھر ایک اور اتفاق۔۔۔۔۔ حادثہ در حادثہ، پھر ایک اور حادثہ۔

ان بیچارے سیانوں کو اپنے اس ''اتفاق'' والے بیان کو سچ ثابت کرنے کے لیے بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔

مثال کے طور پر ہماری اس کائنات میں ڈارک انرجی کی Value 1.38×10^-123 ہے۔اس خاص Value میں ذراسی بھی کمی بیشی تمام کائنات ختم کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

لیکن کائنات میں ڈارک انرجی کی یہ Value اتنی خاص کیوں ہے؟

کہیں یہ خدا کی جانب تو اشارہ نہیں کررہی؟

نہیں نہیں، یہ نہیں ہوسکتا،لہٰذا ڈارک انرجی کی اس خاص Value کو عام بنانے کے لیے ان سیانوں کو Multiverse کا آئیڈیا تخلیق کرنا پڑا ہے۔

بہت ساری کائناتوں کی موجودگی میں ہماری کائنات کے حصے میں آنے والی ڈارک انرجی کی یہ خاص مقدار۔۔۔۔۔کچھ عام سی نظر آنا شروع ہوجاتی ہے۔

ایک خدا کا انکار کرنے کے چکر میں بہت سارے خدا تخلیق کرنا پڑ گئے ہیں ان بیچاروں کو۔

جھوٹ بولتے ہیں وہ تمام Atheist جو کہتے ہیں کہ وہ خدا کو نہیں مانتے ہیں۔

ارے بھئی! یہ Atheist تو مشرک ہوتے ہیں۔

ایک اَن دیکھا اور انجانا Dark Matter ان کا دیوتا ہے تو ایک نامعلوم اور پُراسرار طاقت ڈارک انرجی ان کی دیوی ہے۔سائنس میں Multiverse کا نظریہ وہ نظریہ ہے، جسے سائنس کبھی بھی ٹھیک یا غلط ثابت نہیں کرسکتی۔یہ Multiverse دیوی ہے ان سیانوں کی۔

جانے یہ وقت کے ساتھ چیزیں خودبخود کیسے ہوجاتی ہیں؟ اس دنیا کے سیانوں میں سے کوئی ایک بھی وقت کی حقیقی نوعیت اور ماہیت نہیں جانتا ہے، مگر سیانے یہ بات ضرور جانتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ساتھ خودبخود بہت کچھ ہوجاتا ہے۔یہ انجانا اور اجنبی ''وقت'' خدا ہے ان سیانوں کا۔اتفاق معبود ہے ان کا تو چانس دیوی ہے۔

قرآنِ حکیم Atheism کے فلسفہ کو کچھ یوں بیان کرتا ہے:

> ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جو کچھ زندگی ہے بس یہی ہماری دنیوی زندگی ہے۔(اسی میں) ہم مرتے اور جیتے ہیں اور ہمیں کوئی اور نہیں، زمانہ ہی ہلاک کردیتا ہے۔حالانکہ اس بات کا انہیں کچھ بھی علم نہیں ہے، بس وہمی اندازے لگاتے ہیں۔'' (الجاثیہ:24)

Atheism کے پورے فلسفے کو اگر دو الفاظ میں بیان کرنا ہو تو یہ دو الفاظ ہوں گے:

''Time & Randomness''

''وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سب کچھ Randomly خود بخود ہوجاتا ہے۔''

ایک جانب ان سیانوں کا ناقص علم کہتا ہے کہ یہ تمام کائنات اور اس میں موجود ہر چیز خود بخود چل رہی ہے، جبکہ دوسری جانب میرا اللہ کہتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی، حکمت اور تدبیر کے مطابق ہو رہا ہے۔

کائنات کا ہر ہر ذرہ اللہ کی مرضی اور منشاء کے مطابق حرکت کرتا ہے۔ اس کائنات کے آغاز سے انجام تک ہر ہر چیز، ہر ہر لمحہ اور ہر ہر ذرہ اللہ کے پاس لکھا ہوا موجود ہے۔

''کیا تم نہیں جانتے کہ آسمان اور زمین کی تمام چیزیں اللہ کے علم میں ہیں؟ یہ سب باتیں ایک کتاب میں محفوظ ہیں۔ بیشک یہ سارے کام اللہ کے لیے بہت آسان ہیں۔'' (الحج:70)

اس کتاب کو اللہ کا علمِ قدیم بھی کہتے ہیں۔ لوحِ محفوظ بھی اسی کو کہا جاتا ہے یا پھر۔۔۔

آج کل کے دور کی جدید اصطلاحات کے مطابق، سمجھنے سمجھانے کے لیے ہم اسے سپر کمپیوٹر یا کوانٹم کمپیوٹر بھی کہہ سکتے ہیں۔ باقی اس کتاب کی حقیقی ماہیت تو یقیناً اللہ کے سوا کوئی اور نہیں جان سکتا۔ البتہ ایک بات جو ہمیں قرآنِ حکیم سے معلوم ہوتی ہے، وہ یہی ہے کہ اللہ کی اس کتاب میں تمام کون و مکاں کے سارے معاملات محفوظ ہیں۔

ہر چیز کی ایک مقدار اس کے ہاں متعین ہو چکی ہے۔

ابھی تھوڑا سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ لوحِ محفوظ میں کیا کیا چیزیں لکھی ہوئی ہیں:

''اور اللہ نے تمھیں مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفے سے، پھر تمھیں جوڑے جوڑے بنا دیا اور کسی مادہ کو جو کوئی حمل ہوتا ہے اور جو کچھ وہ جنتی ہے، وہ سب اللہ کے علم سے ہوتا ہے اور کسی عمر رسیدہ کو جتنی عمر دی جاتی ہے اور اس کی عمر میں جو کوئی کمی ہوتی ہے، وہ سب ایک کتاب میں درج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔'' (الفاطر:11)

''اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمے ہے۔ وہ جہاں رہتا ہے، اسے بھی جانتا ہے اور جہاں سونپا جاتا ہے اسے بھی۔ یہ سب کچھ کتابِ روشن میں (لکھا ہوا) ہے۔'' (ہود:6)

''کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین پر نازل ہوتی ہے یا تمھاری جانوں

کو لاحق ہوتی ہے، مگر وہ ایک کتاب میں اس وقت سے درج ہے، جب ہم نے ان جانوں کو پیدا ابھی نہیں کیا تھا۔ یقین جانو، یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔'' (الحدید:22)

''اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے، وہ اس سے واقف ہے۔ کسی درخت کا کوئی پتّا نہیں گرتا جس کا اسے علم نہ ہو اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ یا کوئی خشک یا تر چیز ایسی نہیں ہے، جو ایک کھلی کتاب میں درج نہ ہو۔'' (الانعام:59)

''اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم پر قیامت نہیں آئے گی۔ کہہ دو کیوں نہیں آئے گی؟ میرے عالم الغیب پروردگار کی قسم! وہ تم پر ضرور آ کر رہے گی۔ کوئی ذرہ برابر چیز اس کی نظر سے دور نہیں ہوتی۔ نہ آسمانوں میں، نہ زمین میں اور نہ اس سے چھوٹی کوئی چیز ایسی ہے نہ بڑی جو ایک کھلی کتاب (یعنی لوحِ محفوظ) میں درج نہ ہو۔'' (سبا:3)

اس کائنات میں کہکشاؤں کی تعداد سے ستاروں اور سیاروں کی تعداد تک۔۔۔

ڈارک انرجی کی Value سے کششِ ثقل کی قوت تک۔۔۔

انسانوں کی تعداد سے وائرس اور بیکٹیریا کی تمام انواع و اقسام تک۔۔۔

سب کچھ اللہ کے علم میں ہے۔

سب کچھ اللہ کی اس کتاب میں لکھا ہوا موجود ہے، محفوظ ہے۔

اس کائنات میں، ہماری زندگیوں میں اتفاق نام کی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔

وہ تمام چیزیں جنہیں ہم محض ایک اتفاق یا حادثہ سمجھ رہے ہوتے ہیں، درحقیقت ایسی تمام چیزیں بھی اس ''ماسٹر مائنڈ'' کی پلاننگ کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ کہیں آپ کے دل میں یہ خیال نہ آ جائے کہ اللہ کا یہ علم تو محض بے جان چیزوں کے لیے ہے۔ جان لیجیے کہ وہ تو ہمارے سینوں میں چھپی باتوں سے بھی واقف ہے۔

جس نے پیدا کیا ہے۔۔۔۔۔کیا وہی نہ جانے گا؟

''اور یقین رکھو کہ تمھارا پروردگار وہ ساری باتیں بھی جانتا ہے، جو ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں۔ وہ باتیں بھی جو وہ اعلانیہ کرتے ہیں اور

آسمان اور زمین میں کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں ہے، جو ایک واضح کتاب میں درج نہ ہو۔'' (النمل:75-74)

''اور (اے پیغمبر) تم جس حالت میں بھی ہوتے ہو اور قرآن کا جو حصہ بھی تلاوت کرتے ہو اور (اے لوگو) تم جو کام بھی کرتے ہو تو جس وقت تم اس کام میں مشغول ہوتے ہو، ہم تمہیں دیکھتے رہتے ہیں اور تمھارے رب سے کوئی ذرہ برابر چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ نہ زمین میں نہ آسمان میں، نہ اس سے چھوٹی نہ بڑی۔ مگر وہ ایک واضح کتاب میں درج ہے۔'' (یونس:61)

آپ کے خیالات، احساسات، جذبات اور یادداشت/ یادیں۔۔۔

یہ چاروں چیزیں مل کر آپ کے اندر آپ کی ایک الگ ہی دنیا قائم کر دیتی ہیں۔ ایک ایسی دنیا جس میں آپ کے سوا کسی بھی اور شخص کو داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے۔ کسی بھی اور انسان کے لیے آپ کے اندر کی اس دنیا کے حالات و واقعات کو جاننا ناممکن ہے، مگر۔۔۔

مگر آپ کے اندر کی اس دنیا کی باتیں اللہ سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ آپ کے اندر کی دنیا کی تمام خبریں اللہ کے علم میں ہوتی ہیں۔ آپ کے تمام شعوری احساسات سے اللہ باخبر ہے۔ وہ اللہ خوب واقف ہے آپ کے خیالات سے بھی اور آپ کے جذبات سے بھی۔ آپ کا ماضی بھی اللہ کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ آپ کی زندگی کا ہر ہر لمحہ اللہ کے پاس موجود ہے، محفوظ ہے۔

وہ اللہ جانتا ہے آپ کو۔ وہ اللہ آپ کو آپ سے بڑھ کر جانتا ہے۔

کبھی کبھار ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں خود بھی اپنے اندر کی کیفیات کا ٹھیک سے اندازہ نہیں ہو رہا ہوتا۔ ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ یا پھر ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ ہمارے فلاں کام کرنے یا نہ کرنے کی اصل وجہ کیا تھی۔

ایسے تمام حالات میں بھی اللہ ہماری حقیقی اندرونی کیفیات سے باخبر ہوتا ہے۔

اور اب کچھ دیر کے لیے رک جائیے۔

چند گہری سانسیں لیجیے۔

اب ذرا چیزوں کو محسوس کرنے کی کوشش کیجیے گا۔۔۔

جس وقت سے بھی اللہ نے اس کتاب کو تخلیق کیا ہے، تب سے ہی اس کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ عبداللہ نامی ایک شخص ''میں کون ہوں؟'' کے عنوان سے فلاں وقت پر ایک کتاب لکھے گا۔

اس کتاب کے تمام ابواب اور تمام الفاظ۔۔۔۔۔وہ ابواب جو میں نے ابھی لکھے بھی نہیں ہیں، وہ الفاظ جو اس وقت میرے اپنے وہم و گمان میں بھی نہیں ہیں۔

ایسے تمام ابواب اور الفاظ کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے اللہ کی اس کتاب میں، اللہ کے اس سپر کمپیوٹر میں لکھے ہوئے ہیں اور اللہ کی اس کتاب میں یہ بھی لکھا ہوا ہے کہ آپ۔۔۔

یعنی آپ کس وقت، کس جگہ، کس قسم کے حالات میں بیٹھ کر اس کتاب کا مطالعہ کریں گے۔

اب اس لمحۂ موجود میں آپ کے ذہن میں کس قسم کی سوچیں پروان چڑھ رہی ہیں؟

کون سے خیالات ایسے ہیں جن پر آپ زیادہ توجہ دے رہے ہیں؟ اور کون سی باتیں آپ اپنے دماغ سے نکال دینا چاہتے ہیں؟

اس وقت آپ کا بلڈ پریشر، بلڈ شوگر، جسم کا درجہ حرارت کیا ہے؟

آپ کے جسم میں موجود درجنوں ہارمونز میں سے کون سا ہارمون اس وقت کتنی مقدار میں آپ کے جسم میں موجود ہے؟

آپ کے جسم میں موجود خلیوں (Cells) کی تعداد کتنی ہے؟

آپ کے جسم میں موجود کس خلیے کو، کب ٹوٹ کر ایک سے دو ہو جانا ہے؟

آپ کے سپر کمپیوٹر جیسے دماغ کی تمام سرگرمیاں۔۔۔

آپ کے شعور، تحت الشعور اور لاشعور میں موجود ہر چیز۔۔۔

اس لمحۂ موجود میں آپ کی زندگی میں موجود ہر خوشی اور پریشانی۔۔۔

آپ کی ہر وہ منصوبہ بندی جو آپ دوسروں سے چھپا کر کرتے ہیں۔۔۔

یہ تمام چیزیں، یہ تمام کی تمام چیزیں کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے اللہ کے اس سپر کمپیوٹر میں لکھی ہوئی ہیں۔

یہ راہ چلتے کبھی کبھار ہماری نگاہوں کے سامنے سے جو مختلف پرندے اور حشرات وغیرہ گزرتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی Random نہیں ہوتی۔ کسی خاص راستے پر چلتے ہوئے کس وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے سے کون سی چیونٹی گزرے گی، کون سا پرندہ پھڑ پھڑائے گا اور کون سا کتا بھونکے گا، یہ تمام چیزیں بہت پہلے سے اللہ کے اس سپر کمپیوٹر میں لکھی ہوئی ہیں۔

محض یہی نہیں بلکہ اس اچھے سے دکھائی بھی نہ دینے والی چیونٹی کا نمبر شمار، اس پرندے کا احوال اور اس کتے کا پورا حسب نسب۔۔۔

اس کتے، چیونٹی اور پرندے کا ماضی، حال اور مستقبل،
میرا اور آپ کا ماضی، حال اور مستقبل،
اس تمام کائنات اور اس میں موجود ہر ایک انفرادی ایٹم کا ماضی، حال اور مستقبل،
ہر آن، ہر لمحہ میرے اللہ کے علم میں موجود ہے اور آج سے نہیں، اس کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے یہ تمام باتیں اللہ کی اس کتاب میں لکھی ہوئی ہیں۔
اور یہ جاہل سیانے کہتے ہیں کہ یہ تمام کائنات ہی ایک اتفاق ہے، ایک چانس ہے۔
آپ ایک کام کیجیے۔۔۔
کسی لڈو کے دانے (Dice) کو زمین پر پھینکیں۔
اب اس دانے پر ایک، دو، تین آئے گا یا پھر چار، پانچ، چھے آئے گا۔۔۔
یہ چھے نمبر آپ کے لیے تو ایک اتفاق، ایک چانس اور ایک Random چیز ہو سکتے ہیں،
مگر اس دانے پر جو بھی نمبر آئے گا، وہ نمبر ہمیشہ سے ہی اللہ کی اس کتاب میں لکھا ہوا تھا۔
اس کائنات میں اتفاق، حادثہ اور چانس جیسی چیزیں ہم انسانوں کے لیے تو موجود ہو سکتی ہیں، مگر اللہ کے لیے یہ الفاظ اپنا وجود نہیں رکھتے۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کے علم میں ہے۔
وہ اللہ اپنی تخلیق سے ہرگز ہرگز غافل نہیں ہے۔
میری زندگی کا ہر ہر لمحہ بہت پہلے سے ہی اللہ کی اس ''روشن کتاب'' میں لکھا ہوا ہے۔
میں ہمیشہ سے اللہ کے علم میں موجود تھا۔ میں اس لمحہ بھی اللہ کے علم میں موجود ہوں۔
میں ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ اللہ کے علم میں موجود رہوں گا۔
اللہ کے علم میں۔۔۔
میں ہمیشہ سے تھا۔ میں ہمیشہ رہوں گا۔
''میں اَمر ہوں''

باب:3

دھوکا

کسی بھی چیز کو دیکھتے وقت نقطۂ نظر بڑا اہم ہوتا ہے۔ زاویے میں کچھ ڈگری کا فرق بھی پوری تصویر بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر زاویے میں یہ فرق کچھ ڈگری کا نہیں، بلکہ خالق اور مخلوق کا ہو تو پھر سب بدل جاتا ہے۔

پھر سب کچھ بدل جاتا ہے۔

خالق کے نقطۂ نظر سے کچھ بھی لامحدود نہیں ہے۔ تمام چیزیں اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ ہر چیز اس کے حساب میں ہے، شمار میں ہے۔

یہ کائنات بھی اس ذاتِ برحق کے لیے محدود ہے۔ نہ صرف محدود ہے، بلکہ اتنی محدود کہ یہ اربوں نوری سالوں پر پھیلی کہکشائیں اور UY-Scuti جیسے بڑے بڑے ستارے، یہ ساتوں آسمان اللہ کے ایک ہاتھ پر لپٹ سکتے ہیں۔

مخلوق کے نقطۂ نظر سے نہ صرف یہ کائنات لامحدود ہوسکتی ہے، بلکہ اس لامحدود کائنات جیسی مزید لامحدود کائناتیں بھی موجود ہوسکتی ہیں۔ اب سوال ایک بار پھر سے وہی ہے، مگر اب کی بار یہ سوال اس دنیا کے سیانوں سے نہیں، بلکہ خدا سے ہے۔

ایک ایسی کائنات جس میں کروڑوں نوری سالوں پر محیط کہکشائیں بھی اپنی اپنی انفرادی حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔۔۔۔۔ میں کون ہوں؟

کنویں کا ایک مینڈک ہوں؟۔۔۔۔۔ یا پھر دھوبی کا کتا ہوں؟

میں نقطہ کا قیدی ہوں؟۔۔۔۔۔ یا وقت کا غلام ہوں؟۔۔۔۔۔ یا پھر غلام ابنِ غلام ہوں؟

میں کون ہوں؟

ایک 5-6 فٹ کا قدرے ترقی یافتہ حیوان اور بس؟

اس کائنات کے ساتھ میرا کیا تعلق ہے؟ کیا یہ وسیع و عریض کائنات اس لیے تخلیق کی گئی

ہے کہ مجھے میرے چھوٹے پن کا مزید احساس کروایا جا سکے؟

صرف ہماری اس نقطے جیسی زمین پر ہی 8.7 ملین مختلف اقسام کے جاندار پائے جاتے ہیں۔ اس تمام کائنات میں تو خدا کی مخلوقات کی تعداد بس وہ خدا ہی جان سکتا ہے۔

خدا کی ان تمام مخلوقات میں، ان تمام مخلوقات کے مقابلے میں انسان کون ہے؟

میں کون ہوں؟

''قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی اور اس امن و امان والے شہر کی۔ کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔'' (التین:4-1)

اس بزرگ و برتر ہستی کا کسی بھی چیز کے بارے میں بس کہہ دینا ہی حق ہے، سچ ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس مقام پر وہ خدائے بزرگ و برتر ایک نہیں، دو نہیں، تین بھی نہیں بلکہ پوری چار قسمیں اٹھانے کے بعد اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ اس نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے۔ Uy-Scuti جیسے بڑے بڑے ستاروں کو چراغ کہنے والی ہستی، اگر چار قسمیں اٹھانے کے بعد یہ فرما رہی ہے کہ اس نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ انسان کو بہت، بہت بلندی پر پیدا کیا گیا ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے، خدا کی تخلیق کی گئی تمام چیزوں میں سب سے افضل۔

انسان کو ایسی بلندی پر پیدا کیا گیا ہے، جس کا ابھی ہمارے لیے تصور بھی ناممکن ہے۔ البتہ اگر ہم تخلیقِ انسانی پر، پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق پر تھوڑا غور کریں تو امید ہے کہ ہم انسان کے اندر چھپی انسان کی عظمت کا کچھ کچھ اندازہ کرنے کے لائق ضرور ہو جائیں گے۔

''اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ زمین میں ایسی مخلوق پیدا کریں گے جو اس میں فساد مچائے اور خون خرابہ کرے، حالانکہ ہم آپ کی تسبیح اور حمد و تقدیس میں لگے ہوئے ہیں۔ اللہ نے کہا: میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور آدم کو (اللہ نے) سارے نام سکھا دیے، پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور (ان سے) کہا اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ وہ بول اٹھے آپ ہی کی ذات پاک ہے۔ جو کچھ علم آپ نے

ہمیں دیا ہے، اس کے سوا ہم کچھ نہیں جانتے ۔حقیقت میں علم وحکمت کے مالک تو صرف آپ ہی ہیں۔ اللہ نے فرمایا: آدم! تم ان کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ چنانچہ جب اس نے ان کے نام بتا دیے تو اللہ نے (فرشتوں سے) فرمایا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے بھید جانتا ہوں؟ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو، مجھے اس سب کا علم ہے اور (اس وقت کا تذکرہ سنو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ چنانچہ سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔اس نے انکار کیا اور متکبرانہ رویہ اختیار کیا اور کافروں میں شامل ہو گیا۔'' (البقرۃ:34-30)

سورۃ البقرہ کی ان آیات میں انسان،فرشتے اور جن ۔۔۔۔۔تین قسم کی مخلوقات کا ذکر ہوا ہے۔ان تینوں مخلوقات میں خدا نے انسان کو دوسری دونوں مخلوقات پر ترجیح دی ہے۔انسان کو زمین پر اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے۔نہ صرف خلیفہ بنایا بلکہ تمام فرشتوں اور ابلیس کو حضرتِ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم بھی دیا۔اس حکم کی تعمیل میں تمام فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کیا۔کوئی ایک فرشتہ بھی ایسا نہیں تھا جس نے سجدہ نہ کیا ہو،مگر ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔اور ابلیس ایک جِنّ تھا۔

اگر ہم انسانوں کے سوا فرشتوں اور جِنات کی ساخت اور ماہیت کے بارے میں کچھ جان سکیں تو اس چیز سے بھی ہمیں انسان کی حقیقت جاننے میں مدد مل سکتی ہے۔آخر انہی دونوں مخلوقات کو تو حضرت انسان کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔یعنی انسان کو ایک طرح سے ان دونوں مخلوقات پر فضیلت حاصل ہے۔فرشتوں اور جِنات کی ساخت کی وضاحت کرتی ان احادیثِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر توجہ فرمائیے:

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ حارث بن ہشام رضی اللہ عنہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ وحی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کس طرح آتی ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کئی طرح سے آتی ہے۔کبھی فرشتہ کے ذریعہ وحی آتی ہے تو وہ گھنٹی بجنے کی آواز کی طرح نازل ہوتی ہے۔جب وحی ختم ہو جاتی ہے تو جو کچھ فرشتے نے نازل کیا ہوتا ہے، میں اسے پوری طرح یاد کر چکا ہوتا ہوں۔ وحی اترنے کی یہ صورت میرے لیے بہت دشوار ہوتی ہے۔کبھی فرشتہ میرے

سامنے ایک مرد کی صورت میں آجاتا ہے۔ وہ مجھ سے باتیں کرتا ہے اور جو کچھ کہہ جاتا ہے، میں اسے پوری طرح یاد کر لیتا ہوں۔'' (بخاری:3215)

''حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بلا شبہ شیطان کسی آدمی کی شکل اختیار کرتا ہے پھر لوگوں کے پاس آتا ہے اور انہیں جھوٹ (پر مبنی) کوئی حدیث سناتا ہے۔ پھر وہ بکھر جاتے ہیں۔ ان میں سے کوئی آدمی کہتا ہے: میں نے ایک آدمی سے (حدیث) سنی ہے۔ میں اس کا چہرہ تو پہچانتا ہوں، لیکن اس کا نام نہیں جانتا۔ وہ حدیث سنا رہا ہوتا ہے۔'' (مسلم:17)

''حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ جس نے یہ گمان کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب کو دیکھا تھا تو اس نے بڑی جھوٹی بات زبان سے نکالی، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جبرائیل علیہ السلام کو (معراج کی رات) ان کی اصل صورت میں دیکھا تھا۔ ان کے وجود نے آسمان کا کنارہ ڈھانپ لیا تھا۔'' (بخاری: 3234)

''سلیمان نے کہا: اے اہلِ دربار! تم میں سے کون ہے جو اس عورت کا تخت ان کے تابعدار بن کر آنے سے پہلے ہی میرے پاس لے آئے؟
ایک قوی ہیکل جِن نے کہا: آپ اپنی جگہ سے اٹھے بھی نہ ہوں گے کہ میں اس سے پہلے ہی آپ کے پاس لے آؤں گا اور یقین رکھیے کہ میں اس کام کی پوری طاقت رکھتا ہوں (اور) امانت دار بھی ہوں۔'' (النمل:39-38)

قرآن و حدیث سے منتخب ان چار مختلف مقامات سے ہمیں فرشتوں اور جِنات کی ساخت اور ماہیت کے بارے میں کچھ اہم باتیں معلوم ہوتی ہیں۔۔۔

فرشتے جسامت میں انسانوں سے بڑے، بہت بڑے، بہت ہی بڑے ہو سکتے ہیں۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام اتنے بڑے ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو معراج کی رات ان کی اصل ملکوتی شکل میں دیکھا تھا تو وہ آسمان کا ایک کنارہ مکمل طور پر بھر چکے تھے۔ اس بہت ہی بڑی جسامت کے باوجود، وہ کسی بھی وقت خدا کے اِذن سے انسانی شکل و صورت بھی اختیار کر سکتے ہیں۔

یعنی ایک بہت بڑی جسامت والے فرشتے کا ایک بالکل ہی چھوٹے سے انسانی جسم کو اختیار کر لینا ممکن ہے، عین ممکن ہے۔

فرشتوں کی مانند جنات بھی انسانوں سے جسامت میں بہت بڑے اور طاقتور ہو سکتے ہیں۔ پھر جنات بھی انسانی شکل وصورت اختیار کر لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔یعنی یہ دو بالکل مختلف زمان ومکاں کی بات ہورہی ہے۔فرشتے اور جنات جس زمان ومکاں کی مخلوق ہیں، وہ ہمارے اس۔۔۔
Four Dimentional Time & Space سے بالکل مختلف ہوسکتا ہے۔

فرشتے اور جنات دونوں ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ یہ دونوں مخلوقات اپنی اپنی اصل شکل میں ہر وقت ہمارے آس پاس، ہمارے ساتھ موجود ہوتی ہیں، مگر ہم ان کی موجودگی سے لاعلم رہتے ہیں۔ہم انسانوں کو زیادہ تیز رفتاری سے سفر کرنے کے لیے مادی ذرائع کی ضرورت ہوتی ہے، جبکہ یہ دونوں مخلوقات کائنات میں انسانوں کی نسبت کافی دور تک سفر کرسکتی ہیں اور اس سفر کے لیے انہیں کسی بھی مادی وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اب ان تمام نکات سے بظاہر، بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ دونوں مخلوقات انسانوں سے بہتر اور افضل ہیں۔ یہ دونوں مخلوقات انسانی شکل وصورت اختیار کر لینے کی صلاحیت رکھتی ہیں، جبکہ ہم انسان تو انہیں دیکھنے سے بھی قاصر ہیں، لیکن ان تمام حقائق کے باوجود سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ خدائے بزرگ و برتر کے علمِ کامل کے مطابق انسان کو ان دونوں مخلوقات سے بہتر ساخت پر پیدا کیا گیا ہے۔ نہ صرف بہتر بلکہ اتنا افضل بھی کہ ان دونوں مخلوقات کو حضرتِ آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔

چلیں اس موضوع پر چند لمحات بعد دوبارہ سے بات کریں گے۔ ابھی ہم انسان کا اس کائنات کے ساتھ تعلق جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

> ''وہی تو ہے جس نے زمین میں جو کچھ ہے تمھارے لیے پیدا کیا، پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا، چنانچہ اس کو سات آسمان کی شکل میں ٹھیک ٹھیک بنادیا اور وہ ہر چیز کا پورا علم رکھنے والا ہے۔'' (البقرۃ:29)

> ''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے زمین کی ساری چیزیں تمھارے کام میں لگا رکھی ہیں اور وہ کشتیاں بھی جو اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہیں اور اس نے آسمان اس طرح تھام رکھا ہے کہ وہ اس کی اجازت کے بغیر زمین پر نہیں گرسکتا۔حقیقت یہ ہے کہ اللہ لوگوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرنے والا، بڑا مہربان ہے۔'' (الحج:65)

زمین اپنی تمام پیداواری صلاحیتوں کے ساتھ انسان کے آگے بچھی پڑی ہے۔ تمام معدنیات اور قدرتی وسائل انسان کے استعمال میں آتے ہیں۔ خشکی اور پانی کے تمام جانداروں کو بھی ایک طرح سے انسان کے تابع تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہ زمین ہر طرح سے انسان کے تسلط اور استعمال میں ہے یعنی یہ زمین انسان کی زمین ہے۔ کچھ یہی مفہوم ان دونوں آیاتِ مبارکہ کا بھی ہے، لیکن اتنی بڑی کائنات میں ہماری یہ زمین تو بہت چھوٹی سی ہے۔ اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک انسان کے لیے خدا کی اتنی بڑی کائنات میں سے بس اتنی چھوٹی سی زمین اور جگہ؟

دل مطمئن نہیں ہوتا ناں اس بات پر؟

چلیں اب ذرا دل کو تھام کر قرآنِ حکیم کی دو مزید آیات پر غور و فکر کیجیے۔۔۔

> ''کیا تم لوگوں نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسے اللہ نے تمھارے کام میں لگا رکھا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری پوری نچھاور کی ہیں۔ پھر بھی انسانوں میں سے کچھ لوگ ہیں کہ جو اللہ کے بارے میں بحثیں کرتے ہیں، جبکہ ان کے پاس نہ کوئی علم ہے، نہ ہدایت ہے اور نہ کوئی ایسی کتاب ہے جو روشنی دکھائے۔'' (لقمان:20)
>
> ''اور آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اس سب کو اس نے اپنی طرف سے تمھارے کام میں لگا رکھا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو غور و فکر سے کام لیں۔'' (الجاثیۃ:13)

خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم!

اس تمام کائنات اور اس کائنات میں موجود ہر کہکشاں، ستارے اور سیارے کو۔۔۔

ان ساتوں آسمانوں کو اور اس میں موجود ہر ایک جاندار اور بے جان چیز کو۔۔۔

میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ یہ سب کچھ آپ کے لیے تخلیق کیا گیا ہے، انسان کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ اگر یقین نہیں آرہا تو ان دونوں آیات پر پھر سے غور و فکر کر لیجیے۔

بہر حال ان آیاتِ مبارکہ سے ہمارے آج کل کے پڑھے لکھے نوجوانوں کے ذہنوں میں پرورش پانے والے چند سوالوں کا جواب بھی ملتا ہے۔ اس تمام کائنات اور اس میں موجود ہر چیز کو زمین پر بسنے والے انسانوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا ہماری اس کائنات میں موجود اربہا ارب سیاروں میں سے کسی ایک سیارے پر بھی زندگی نہیں ہے۔ ہماری زمین کے سوا کائنات میں کہیں پر بھی زندگی نہیں پائی

جاتی۔ یا پھر اگر سیانوں کی زبان میں بات کی جائے تو اس کائنات میں Aliens موجود نہیں ہیں۔

اس لامحدود کائنات میں ہم انسان بس اکیلے ہی ہیں۔

کائنات میں طبعی قوانین کو ایسے ترتیب دیا گیا ہے کہ انسان کو اس کائنات کا ماضی دکھایا جارہا ہے اور مستقبل کے بارے میں بھی نشاندہی کی جارہی ہے۔ روشنی کی رفتار کو محدود رکھا گیا ہے، جس کے سبب کائنات میں موجود اربوں سال پرانی کہکشائیں دیکھنا آج کے انسان کے لیے عین ممکن ہے۔ اگر یہ کائنات مسلسل پھیل نہ رہی ہوتی تو انسان اس کائنات کے آغاز کے بارے میں کبھی نہ جان پاتا اور نہ ہی کائنات کے انجام کے بارے میں کوئی رائے قائم کرسکتا تھا۔

مختصر یہ کہ اس کائنات کو انسان کے لیے سجایا گیا ہے، ترتیب دیا گیا ہے۔ تمام کائنات کو نہ صرف انسان کے لیے تخلیق کیا گیا ہے، بلکہ انسان کے اندر ایسی صلاحیتیں بھی رکھی گئی ہیں کہ انسان اس کائنات کے رازوں کو جاننے کی کوشش کرے۔ وگرنہ نقطہ کے قیدی، ایک پانچ چھے فٹ کے انسان کو کیا پڑی ہے کہ وہ اس قابلِ مشاہدہ کائنات سے پرے دیکھنے کی خواہش میں اپنے سر کے بال نوچے؟ یقیناً یہ تمام کائنات انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ اس بات میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم انسان جس زمین پر موجود ہیں، یہ چار گھنٹے کی نوری مسافت سے دکھائی دینا بند ہوجاتی ہے اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی انسان آج تک انسانی ذرائع سے چاند سے آگے کا سفر نہیں کرسکا ہے۔ پھر یہ بھی تو حقیقت ہے کہ حضرتِ انسان کو اپنی خواہشات تو بہت دور، چھوٹی چھوٹی ضروریاتِ زندگی کے لیے سارا سارا دن محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے۔

بہت سارے لوگ اس لمحۂ موجود میں بھی کسی سڑک کنارے سو رہے ہوں گے۔ کچھ بچے آج بھی بھوکے سوئے ہوں گے۔ بہت سے انسان آج بھی فروخت ہوئے ہوں گے۔

کچرے کے ڈھیروں پر کچرے کا ہی ایک حصہ بنے یہ لاکھوں کروڑوں انسان۔۔۔

کیا یہ انسان مسجودِ ملائک ہیں؟

ایک انسان جب جانور بنتا ہے تو سور کو بھی اس سے شرم آنے لگتی ہے۔۔۔

کیا یہ انسان اشرف المخلوقات ہے؟

ہماری اب تک کی گفتگو سے محسوس یوں ہوتا ہے جیسے انسان ایک نہیں، انسان دو ہیں۔ ایک انسان وہ ہے جس کے لیے یہ تمام کائنات اور اس میں موجود ہر چیز تخلیق کی گئی ہے، جبکہ ایک انسان ہمارے مشاہدے کا انسان ہے، جو زمین پر اپنی چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے مارا مارا پھرتا ہے۔

ایک انسان وہ تھا جس کے سامنے تمام فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا اور ایک انسان یہ ہے جس کی درندگی سے، جس کے جنگلی پن سے خود جنگل کے جانور بھی سہمے جاتے ہیں۔

ایک انسان وہ ہے جس کے بارے میں قرآنِ حکیم میں کچھ یوں ارشاد ہوتا ہے:

''قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی اور اس امن والے شہر کی کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔'' (التین:4-1)

اور ایک انسان یہ ہے جس کے بارے میں قرآنِ حکیم کچھ اس طرح سے بات کرتا ہے:

''اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے ساتھ آسانی کا معاملہ کرے اور انسان کمزور پیدا ہوا ہے۔'' (النساء:28)

''حقیقت یہ ہے کہ انسان بہت کم حوصلہ پیدا کیا گیا ہے۔'' (المعارج:19)

''انسان ہلاک ہو جائے، کیسا ناشکرا ہے۔'' (عبس:17)

''اور انسان برائی اس طرح مانگتا ہے جیسے اسے بھلائی مانگنی چاہیے اور انسان بڑا جلد باز واقع ہوا ہے۔'' (الاسراء:11)

''اور ہم نے اس قرآن میں لوگوں کے لیے طرح طرح کی مثالیں بیان فرمائی ہیں، لیکن انسان سب چیزوں سے بڑھ کر جھگڑالو ہے۔'' (الکھف:54)

''کہہ دو کہ اگر میرے رب کے خزانے تمھارے ہاتھ میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے خوف سے (ان کو) بند کر رکھتے اور انسان دل کا بہت تنگ ہے۔'' (الاسراء:100)

انسان ناشکرا ہے، دل کا تنگ ہے اور جھگڑالو ہے۔۔۔۔۔انسان کمزور ہے اور جلد باز ہے۔

خدا کی بہترین تخلیق، انسان میں اتنے نقائص اور اتنی کمزوریاں کیسے موجود ہو سکتی ہیں؟

محسوس یوں ہوتا ہے جیسے ایک انسان وہ ہے جسے بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا ہے اور ایک انسان یہ ہے جس میں یہ تمام کمزوریاں اور لغزشیں پائی جاتی ہیں۔ آخر انسان کون ہے؟

انسان اشرف المخلوقات ہے؟۔۔۔۔۔ یا پھر دل کا تنگ اور جھگڑالو ہے؟

انسان مسجودِ ملائک ہے؟۔۔۔۔۔ یا پھر کم حوصلہ اور جلد باز ہے؟

حقیقت جاننا چاہتے ہیں؟

حقیقت میں انسان ایک نہیں۔۔۔۔۔انسان دو ہیں۔

ایک انسان کا روحانی وجود ہے، جو ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے، بالکل اوجھل ہے اور ایک انسان کا جسمانی وجود ہے، جو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے، بالکل سامنے ہے۔

اب انسان کے روحانی اور جسمانی وجود کے تصور کو اپنے ذہن میں پختہ کیجیے اور پھر سورۃ التین کا دوبارہ سے مطالعہ کیجیے:

> ''قسم ہے انجیر کی اور زیتون کی اور صحرائے سینا کے پہاڑ طور کی اور اس امن والے شہر کی کہ ہم نے انسان کو بہترین سانچے میں ڈھال کر پیدا کیا ہے۔ پھر ہم اس کو پستی والوں میں سب سے زیادہ نچلی حالت میں کر دیتے ہیں۔'' (التین 4-1)

کوئی شک نہیں انسان کو بہترین صورت اور ساخت پر ہی پیدا کیا گیا تھا،لیکن پھر انسان کو پست کر دیا گیا۔انسان کو نیچے پھینک دیا گیا اور وہ بھی نچلوں میں سب سے نیچے۔ ❶

ہمارے روحانی وجود کو بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا تھا، جبکہ یہ ساری کمزوریاں ہمارے جسمانی وجود سے منسلک ہیں۔یعنی۔۔۔

ہم اس وقت ہمارے اصل مقام، اصل ماہیت اور ہماری حقیقی ساخت پر موجود نہیں ہیں۔

میں اپنی بات کو دہرا رہا ہوں۔۔۔

ہم اس وقت ہمارے اصل مقام، اصل ماہیت اور ہماری حقیقی ساخت پر موجود نہیں ہیں۔

بلکہ اس وقت ہم گرے ہوئے ہیں۔ہمیں نیچے گرا دیا گیا ہے۔تمام کائنات کو ہمارے لیے تخلیق کرنے کے بعد ہمیں ایک نقطے کا قیدی بنا دیا گیا ہے۔ بہترین ساخت پر پیدا کی جانے والی روح کو اس کمزور، ناتواں اور بیماریوں میں گھرے ہوئے جسم میں پھینک دیا گیا ہے۔

انسان اشرف المخلوقات ہے، یقیناً ہے،لیکن انسان کو یہ مقام و مرتبہ اس کے جسمانی وجود کی وجہ سے نہیں دیا گیا، بلکہ انسان کی یہ حیثیت اس کے روحانی وجود کی وجہ سے ہے۔انسان مسجودِ ملائک ہے مگر انسان کے سامنے یہ سجدہ بھی اس کے جسمانی وجود کی وجہ سے نہیں کروایا گیا تھا، بلکہ یہ روح ہے جس کی وجہ سے حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے تمام فرشتوں کو جھکایا گیا۔

---

❶ سورۃ التین کی یہ تفسیر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔اس موضوع پر تفصیلی بحث سے مستفید ہونے کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایک بار سورۃ التین کی تفسیر پر ڈاکٹر صاحب کا لیکچر ملاحظہ فرمائیں۔

تخلیقِ انسانی سے بحث کرتے قرآنِ حکیم کے ان دو مقامات پر ذرا غور کیجیے۔۔۔

''اور وہ وقت یاد کرو جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر کو پیدا کرنے والا ہوں، لہٰذا جب میں اس کو پوری طرح بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ چناں چہ سارے کے سارے فرشتوں نے سجدہ کیا۔ سوائے ابلیس کے کہ اس نے سجدہ کرنے والوں میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔'' (الحجر:31-28)

''یاد کرو جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں گارے سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں۔ چناں چہ جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ پھر ہوا یہ کہ سارے کے سارے فرشتوں نے تو سجدہ کیا، البتہ ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے تکبر سے کام لیا اور کافروں میں شامل ہو گیا۔'' (ص:74-71)

قرآنِ حکیم کے ان دو مقامات سے یہ بات واضح ہے کہ پہلے انسان کے جسمانی وجود میں روح پھونکی گئی اور اس کے بعد فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ انسان کے روحانی وجود کی بلندی، عظمت اور رفعت کا اندازہ محض اسی بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ خدائے بزرگ و برتر انسانی روح کو اپنی روح کہہ کر خود اپنی ہی ذات کی جانب منسوب کرتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ روح محض حضرت آدم علیہ السلام کے جسم میں نہیں پھونکی گئی تھی بلکہ یہ روح ہر انسان کے جسم میں پھونکی جاتی ہے۔ البتہ یہ فرق ضرور موجود ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جسدِ خاکی میں روح اللہ تعالیٰ نے خود پھونکی تھی، جبکہ باقی انسانوں کے جسم میں روح فرشتوں کے ذریعے پھونکی جاتی ہے۔ ہر انسان کے، ہر ہر انسان کے ظاہری جسمانی وجود کے اندر اس انسان کا باطنی اور چھپا ہوا روحانی وجود بھی موجود ہوتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا اور وہ سچوں میں سچے تھے کہ۔۔۔

''انسان کی پیدائش اس کی ماں کے پیٹ میں پہلے چالیس دن تک پوری کی جاتی ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دنوں تک غلیظ اور جامد خون کی صورت میں رہتا

ہے۔ پھر وہ اتنے ہی دنوں کے لیے مضغہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ کو چار باتوں کا حکم دے کر بھیجتا ہے۔ پس وہ فرشتہ اس کے عمل، اس کی مدتِ زندگی، روزی اور یہ کہ وہ نیک ہے یا بد کو لکھ لیتا ہے۔ اس کے بعد اس میں روح پھونکی جاتی ہے۔۔۔'' (بخاری:3332)

ہر انسان کا جسمانی وجود جب رحمِ مادر میں حمل کی صورت میں چار مہینے کا ہو جاتا ہے تو اس وقت خدا کے حکم پر فرشتے آ کر انسان کے جسم کے ساتھ اس انسان کی روح کو منسلک کر جاتے ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ موت کے وقت ایک بار پھر سے فرشتے آ کر روح کو جسم سے جدا کر دیتے ہیں۔ یہ جسم ایٹمز سے مل کر بنا ہوتا ہے۔ جسم کی موت کے بعد یہ ایٹمز بکھر جاتے ہیں۔ یہ جسم مٹی میں مٹی ہو جاتا ہے، جبکہ روح، فرشتوں کے ساتھ اپنے لیے مخصوص کیے گئے مقام کی جانب چلی جاتی ہے۔ البتہ موت کے وقت تمام ارواح کے ساتھ یکساں سلوک نہیں کیا جاتا۔ موت کے بعد مختلف ارواح کے رہنے کی جگہ ان کے اعمال کی نسبت سے مختلف ہو سکتی ہے۔ موت کے وقت روح کے جسم سے جدا ہونے کے مناظر بیان کرتی اس حدیثِ رسول ﷺ پر غور فرمائیے:

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: جب مومن کو موت آنے لگتی ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا لے کر اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: اے مومن روح! نکل آ، تُو اللہ سے راضی، اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی اور چل اللہ کی رحمت اور مہربانی کی طرف اور ایسے رب کے پاس جو تجھ پر قطعاً ناراض نہیں ہے۔ وہ (روح) انتہائی خوشبودار، پاکیزہ کستوری جیسی مہک کے ساتھ نکل آتی ہے، حتیٰ کہ فرشتے (خوشی اور سرور سے) اسے ایک دوسرے کو پکڑاتے (ہاتھوں ہاتھ لیتے) ہیں اور اسی طرح اسے آسمان کے دروازے تک لے جاتے ہیں۔ آسمان والے فرشتے کہتے ہیں: کس قدر خوشبودار ہے یہ روح، جو تم زمین سے لائے ہو۔ پھر وہ اسے (پہلے سے فوت شدہ) مومنین کی روحوں کے پاس لے آتے ہیں۔ اللہ کی قسم! وہ اس کے آنے پر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ تم اپنے کسی غائب شخص کے آنے پر اتنے خوش نہیں ہوتے۔ پھر وہ (پہلے مومن) اس سے پوچھتے ہیں: فلاں کا کیا حال ہے؟ فلاں کا کیا حال ہے؟ پھر وہ (آپس میں) کہتے ہیں: چھوڑو اسے وہ تو دنیا

کے غم وفکر میں تھا۔ جب وہ روح کہتی ہے کہ کیا وہ تمھارے پاس نہیں آیا؟ (یعنی وہ تو کب کا مر چکا ہے) تو وہ کہتے ہیں: اوہو! اسے اس کے جہنمی ٹھکانے کی جانب لے جایا گیا ہے۔ (اس کے مقابلے میں) جب کافر کو موت آتی ہے تو عذاب کے فرشتے گندا بدبودار ٹاٹ لے کر اس کے پاس آجاتے ہیں اور (غصے سے) کہتے ہیں: نکل ادھر، تُو بھی ناراض اور تیرا اللہ بھی تجھ سے ناراض۔ چل اللہ عزوجل کے عذاب کی طرف۔ تو وہ انتہائی بدبودار مردار لاش کے بھبوکے کے ساتھ نکلتی ہے، حتیٰ کے وہ اسے زمین کے دروازے پر لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں: کس قدر بدبودار ہے یہ، حتیٰ کہ وہ اسے (پہلے سے مرے ہوئے) کافروں کی روحوں میں لے جاتے ہیں۔'' (نسائی:1833)

نو وارِد روح اور پہلے سے موجود ارواح جس وقت آپس میں باتیں کر رہی تھیں تو اس وقت ان کے اجسام موجود نہیں تھے۔ اس سے یہ ثابت ہے کہ روح ایک مکمل اور خودمختار وجود ہے۔ روح کو بولنے، سننے یا پھر سوچنے سمجھنے کے لیے، باتیں کرنے کے لیے، شعوری اعمال سرانجام دینے کے لیے جسم کی ضرورت نہیں ہے۔

ارواح کی ملاقات کے وقت ان کے اجسام موجود نہیں تھے، لیکن اس کے باوجود تمام ارواح ایک دوسرے کو جانتی تھیں، پہچانتی تھیں۔ اگر ارواح ایک دوسرے کو جانتی تھیں تو یقیناً اپنی ذات کا شعور بھی رکھتی ہوں گی۔ ہر روح اپنی ذات سے آگاہ ہوگی یعنی ایک انسان کو اس کی ذات کی پہچان اور شناخت دینے والی حقیقی چیز روح ہوتی ہے نہ کہ یہ جسم۔

عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ انسان کی یادداشت کا سارا تعلق دماغ کے ساتھ ہوتا ہے، مگر اس حدیثِ مبارکہ سے ثابت ہے کہ دماغ سے ہٹ کر روح کی اپنی بھی مکمل یادداشت ہوتی ہے۔ عالمِ برزخ میں پہلے سے موجود ارواح کا نو وارِد روح سے دنیا میں بسنے والے لوگوں کے بارے میں دریافت کرنا اس بات پر دلیل ہے کہ ارواح اس دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی دنیا میں گزارے ہوئے اپنے وقت سے مکمل آگاہ ہوتی ہیں۔

عالمِ برزخ میں روحیں دنیا میں موجود اپنے تعلق والے انسانوں کا انتظار کرتی ہیں۔ نہ صرف انتظار کرتی ہیں بلکہ ایسی شدت سے انتظار کرتی ہیں کہ جیسا انتظار کسی گمشدہ شخص کا کیا جاتا ہے۔ ارواح خوشی بھی محسوس کرتی ہیں اور غم بھی۔

کیا یہ سب چیزیں انسانی شعور کا ایک حصہ نہیں ہیں؟

احساسات، جذبات، خیالات اور یادیں۔۔۔۔۔ یہ چاروں چیزیں مل کر ایک انسان کو انسان بناتی ہیں اور ان چاورں چیزوں کا تعلق انسان کے روحانی وجود کے ساتھ ہوتا ہے۔

ایک انسان کا حقیقی وجود اس کا روحانی وجود ہے۔ موت کے بعد مرنے والے کی روح نے جہاں جہاں بھی سفر کیا۔۔۔۔۔ یہ سفر دراصل روح نے نہیں بلکہ انسان نے ہی کیا ہے۔

موت کے بعد تمام اعزاز و اکرام بھی انسان کے روحانی وجود کا ہی کیا جاتا ہے۔

اس پوری حدیثِ مبارکہ میں کہیں پر بھی انسان کے جسمانی وجود کا تذکرہ ہوا ہو؟؟؟

انسانی روح اور انسان۔۔۔۔۔ دونوں ایک ہی چیز ہیں۔ انسان روح ہے۔

فرشتے، جنات اور انسان۔۔۔ ان تینوں مخلوقات میں خالق نے انسان کو برتری اور فضیلت عطا کی ہے، لیکن انسان یہ جسم نہیں ہے۔ انسان کو محض یہ جسم سمجھنا تو ایک پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ انسان روح ہے۔ یہ انسان کی روح ہے، جسے بہترین ساخت اور ماہیت پر پیدا کیا گیا ہے۔

البتہ پھر اس روح کو پستی میں پھینک دیا گیا۔ روح کو نچلوں میں سب سے نیچے کر دیا گیا۔ روح کو اس بیماریوں سے گِھرے ہوئے، کمزور اور ناتواں جسم کے اندر قید کر دیا گیا ہے۔

ایک انسان کا حقیقی وجود اس کا روحانی وجود ہوتا ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ ہم انسان خود اپنے آپ سے ہی بے خبر ہیں۔ کائنات میں پیدا کی گئی بہترین چیز، اشرف المخلوقات اور مسجودِ ملائک روح ہمارے اس کمزور اور ناتواں جسم میں کہیں موجود ہے، مگر ہم اپنے حقیقی وجود سے بے خبر اس جسم کو ہی انسان سمجھتے رہتے ہیں۔ آج ہم انسانوں کی اکثریت خود سے غافل ہو چکی ہے۔ ہم خود کو بھول چکے ہیں اور بات یہ ہے کہ ہمارے روحانی وجود کو ہم سے چھپایا بھی گیا ہے۔ اس جسم کو سامنے ظاہر کر کے انسان کو انسان سے چھپا دیا گیا ہے۔ انسان کو اس جسم کا دھوکا دیا جا رہا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ میرا جسم کیسا دکھائی دیتا ہے۔ میں اپنے اس جسم کو چھو سکتا ہوں، محسوس کر سکتا ہوں، مگر میری روح، میرا اصل وجود کس قسم کا ہے؟ میری روح کیسی دِکھتی ہوگی؟

میری روح کی ساخت اور ماہیت کیا ہے؟ یہ تمام باتیں ہم سے چھپائی گئی ہیں۔

> ''اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے اور تمہیں جو علم دیا گیا ہے، وہ بس تھوڑا ہی سا علم ہے۔ (الاسراء:85)

روح اور روح کے متعلق تمام امور کا علم ہمیں نہیں دیا گیا۔ روح کو اس جسم کی آنکھوں سے دیکھنا، روح کو اس جسم کے حواس سے محسوس کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے روح کے بارے میں بس جو چیزیں ہمیں بتا دی گئی ہیں، ان چیزوں کے سوا ہم خود سے اپنے طور پر روح کے بارے میں کچھ نہیں جان سکتے، لہٰذا اس زندگی میں روح کو جسم کی آنکھوں سے دیکھنے کی خواہش کبھی پوری نہیں ہوگی۔ البتہ عین موت کے لمحات میں جس وقت روح اور جسم کو جدا جدا کر دیا جاتا ہے، ان لمحات میں جسم بھی روح کا مشاہدہ کرتا ہے۔ جسم کا روح کو دیکھنا ایک نہایت حیران کن تجربہ ثابت ہوتا ہے۔ جسم خود میں سے روح کو نکلتا دیکھ کر اس قدر حیران ہوتا ہے کہ اس کی آنکھیں پھر کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں۔ خدا کی بہترین تخلیق، روح جب اس جسم کو خیر آباد کہہ کر جاتی ہے تو جسم کے تاثرات کچھ یوں ہوتے ہیں:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا تم انسان کو دیکھتے نہیں کہ جب وہ فوت ہو جاتا ہے تو اس کی نظر اٹھ جاتی ہے؟

لوگوں نے کہا: کیوں نہیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کی نظر اس کی روح کا پیچھا کرتی ہے۔'' (مسلم:2132)

اگر ایک بہت بڑی جسامت والا فرشتہ محدود انسانی جسم میں سما سکتا ہے تو ہماری اس روح کی ساخت اور ماہیت کیا ہوگی؟

وہ کیا چیز ہوگی جو موت کے وقت اس جسم میں سے نکل کر جائے گی؟ (واللہ اعلم)

موت کے وقت تو یقیناً ہر انسان حقیقت جان لے گا۔ خود اپنی حقیقت بھی کھل جائے گی، فرشتے بھی نظر آنا شروع ہو جائیں گے۔ یہ جسم بھی روح کو دیکھ لے گا اور روح بھی روح کو جان لے گی اور نہ جانے کون کون سے حقائق اس ایک لمحے میں عیاں ہوں گے۔

لیکن ہماری اس زندگی میں روح اور جسم کا آپس میں کیا تعلق ہے؟

روح اور جسم مل کر کس طرح سے کام کرتے ہیں؟

ہمارے کون سے افعال جسم کے متعلق ہیں اور کون سے روح کے متعلق؟

ہمارا حقیقی وجود، اگر روحانی وجود ہے تو پھر۔۔۔۔۔ اس جسم کی حقیقت کیا ہے؟

روح اور جسم باہم اس طرح پیوستہ ہیں کہ ان کے یکجا ہونے کی حقیقی نوعیت کو اسی زندگی میں ہم کبھی نہیں جان سکیں گے۔ موت کے وقت روح اور جسم دونوں جدا جدا ہو جاتے ہیں اور موت کے بعد ہمارا سب کچھ ہماری روح کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ روح اور انسان ایک ہی چیز ہے۔

البتہ روح اور جسم کے تعلق کو جاننے کا ایک اور طریقہ بھی ہو سکتا ہے۔ موت کے وقت تو جسم اور روح جدا ہوتے ہی ہیں، لیکن اس زندگی میں بھی روح اور جسم عارضی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ روزانہ بہت سارا وقت ہم ایسا بھی گزارتے ہیں جب ہماری روح ہمارے جسم میں موجود نہیں ہوتی۔۔۔

> ''اور وہی ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمھاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، اس سے خبر رکھتا ہے۔ پھر تمہیں دن میں اٹھا دیتا ہے، تا کہ (یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی) معین مدت پوری کر دی جائے۔ پھر تم (سب) کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ (اس روز) وہ تمہیں تمھارے اعمال، جو تم کیا کرتے ہو، بتائے گا اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبان مقرر کیے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔'' (الانعام:61-60)
>
> ''اللہ لوگوں کے مرنے کے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں ان کی روحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے، ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقتِ مقرر تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں، ان کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔'' (الزمر:42)

نیند فطرت کے رازوں میں سے ایک بہت بڑا راز ہے۔ نیند کو موت کی بہن بھی کہا جاتا ہے۔

ان دونوں آیاتِ مبارکہ میں ہمارے اس موضوع کے لیے جو اہم چیز بیان ہوئی ہے، وہ یہی ہے کہ نیند کے دوران روح جسم میں موجود نہیں ہوتی ہے۔ [1]

نیند کے دوران روح اور جسم دونوں جدا جدا ہوتے ہیں اور محض اسی ایک حقیقت سے مزید

---

[1] مزید تفصیلات کے لیے سورۃ الزمر، آیت نمبر 42 کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔
تفسیر مظہری از قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ — تفسیر تبیان القرآن از علامہ غلام رسول سعیدی رحمۃ اللہ علیہ

بہت سارے حقائق اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ روح اور جسم کے تعلق کو جاننے کے لیے، انسان کے جسم کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے، جسم میں روح کے کردار اور افعال کو جاننے کے لیے۔۔۔

بس قرآنِ حکیم کی ان دو آیاتِ مبارکہ پر غور وفکر کافی ہوگا۔

انسان کا حقیقی وجود اس کا روحانی وجود ہوتا ہے، لیکن جاگتے ہوئے روح اور جسم دونوں باہم اس طرح پیوستہ ہوتے ہیں کہ ہم اپنے روحانی وجود کو بالکل بھی محسوس نہیں کر پاتے۔ محض ہمارا یہ جسم ہماری نگاہوں کے سامنے موجود رہتا ہے، چونکہ نیند کے دوران روح اور جسم دونوں جدا جدا ہوجاتے ہیں، اس لیے نیند کے دوران روح کی غیر موجودگی کو محسوس کرنا نسبتاً آسان کام ہوگا۔

اگر آپ مرنے سے پہلے اسی زندگی میں خود کو جاننا چاہتے ہیں تو جان لیجیے کہ۔۔۔

نیند کے دوران جو چیز آپ کے جسم میں موجود نہیں ہوتی، نیند کے دوران جو چیز آپ کے جسم میں کم ہوجاتی ہے، بس۔۔۔۔۔ وہ ''چیز'' آپ ہیں۔

اور آیئے!

اب ہم اپنی زندگیوں کا ایک تہائی حصہ نگل جانے والی نیند کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

نیند کے آغاز کے ساتھ ہی ہماری روح قبض ہوجاتی ہے اور پھر جب تک ہم نیند سے بیدار نہیں ہوجاتے، روح اور جسم دونوں جدا جدا رہتے ہیں۔

پھر نیند کا آغاز ہوتے ہی، میری روح قبض ہوتے ہی۔۔۔

گدگدی، کھجلی، تکلیف یا پھر بھوک۔۔۔۔۔ میرے ہر قسم کے احساسات ختم ہوجاتے ہیں۔

محبت، نفرت، غصہ یا پھر خوف۔۔۔۔۔ میرے ہر قسم کے جذبات بھی خاموشی کی چادر اوڑھ لیتے ہیں۔

میری یادداشت کہیں کھو جاتی ہے۔ میرا ماضی مجھ سے چھین لیا جاتا ہے۔

میرے اندر ہر وقت شور مچائے رکھنے والی آواز۔۔۔

نیند کے دوران یہ آواز بھی تو چپ، بالکل چپ ہوجاتی ہے۔

نیند کے دوران میرا شعور ختم ہوجاتا ہے۔۔۔۔۔ میرا سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔

میں اپنی ذات سے اور اپنے ماحول سے ناآشنا ہوجاتا ہوں۔

میں ختم ہوجاتا ہوں۔۔۔۔۔ میں مرجاتا ہوں۔۔۔۔۔ یوں جیسے عبداللہ کبھی تھا ہی نہیں۔

نیند کے دوران بھی ہمارا جسم تو بالکل ویسے کا ویسا ہی موجود ہوتا ہے۔ ہمارے جسم میں تو کسی قسم کی کوئی بھی کمی واقع نہیں ہوتی۔ پھر نیند کے دوران ہمارا شعور ختم کیسے ہوجاتا ہے؟

یہ نیند آخر کیا چیز ہے؟

ہر روز میں مر کیوں جاتا ہوں اور ہر صبح ایک بار پھر سے جی کیسے اٹھتا ہوں؟

اور یقیناً اب آپ ان تمام سوالوں کے جواب جان گئے ہوں گے۔

اگر نہیں تو ایک بار پھر سے غور کیجیے۔۔۔

''اللہ لوگوں کے مرنے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں، ان کی روحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے)، پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے، ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقتِ مقرر تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں، ان کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔'' (الزمر:42)

نیند کے دوران انسان کا شعور ختم ہو جاتا ہے، انسان مر جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے، کیونکہ نیند کے دوران روح انسان کے جسم میں موجود نہیں ہوتی اور یقیناً اب یہ بات بھی آپ جان چکے ہوں گے کہ شعور کا سارا تعلق انسان کے روحانی وجود کے ساتھ ہوتا ہے۔

خیالات، احساسات، جذبات اور یادداشت/ یادیں۔۔۔۔۔ یہ چاروں چیزیں مل کر آپ کے اندر آپ کی ایک الگ ہی دنیا قائم کر دیتی ہیں۔ آپ کے اندر کی اس دنیا کا وجود روح کی وجہ سے ہے۔

اگر آپ کے اندر احساسات، خیالات، جذبات اور یادیں باقی ہیں تو آپ محض ایک باشعور انسان ہی نہیں ہیں، بلکہ آپ ایک ذی روح ہستی بھی ہیں۔ ایک انسان میں شعور کی موجودگی یا غیر موجودگی سے اس انسان کے اندر روح کی موجودگی یا غیر موجودگی کا پتہ چلایا جا سکتا ہے۔

البتہ یہاں اس وضاحت کی بھی ضرورت ہے کہ اگرچہ شعور کا سارا تعلق انسان کے روحانی وجود کے ساتھ ہوتا ہے، مگر ایک انسان کی روح محض شعور نہیں ہے، بلکہ انسانی روح تو فرشتے اور جِنات ہی کی طرح ایک مکمل اور خود مختار وجود ہے۔ جس طرح فرشتے اور جِنات انسانی جسم کو اختیار کر سکتے ہیں، انسانی جسم کو اوڑھ سکتے ہیں، بالکل اسی طرح سے انسانی روح بھی اس جسم میں پائی جاتی ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ فرشتے اور جِنات اپنی اپنی اصل شکل میں واپس بھی جا سکتے ہیں، جبکہ روح کو اس جسم کی قید میں ہی رہنا ہے۔ روح کو جسم سے مکمل آزادی محض جسم کی موت کی صورت میں ہی ملتی ہے۔

بہر حال ہمارے جسم میں شعور کا پایا جانا روح کی نشاندہی کرتا ہے۔ اگرچہ ہم اس زندگی میں روح کو دیکھ نہیں سکتے، مگر شعور کی موجودگی سے ہم روح کی موجودگی پر یقین ضرور کر سکتے ہیں۔ ہماری اس زندگی میں شعور روح کی نمائندگی کرتا ہے۔

دوسری جانب اگر ہم نیند کے دوران انسانی جسم کا جائزہ لیں تو روح قبض ہو جانے کے بعد بھی، نیند کے دوران بھی ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں، کروٹیں بدل رہے ہوتے ہیں۔ نیند کے دوران کوئی خراٹے لے رہا ہوتا ہے تو کوئی اپنے ہی بدن پر کھجلی کر رہا ہوتا ہے، حتیٰ کہ کچھ لوگوں کو نیند کے دوران بولنے کی عادت بھی ہوتی ہے اور پھر کچھ لوگ تو سوتے سوتے چہل قدمی بھی کر آتے ہیں، مگر یہ تمام افعال (Actions) خودکار طریقے سے ہو رہے ہوتے ہیں۔

سانس، کروٹیں، کھجلی، چہل قدمی یا پھر گپ شپ؛ نیند کے دوران کیے جانے والے ان تمام افعال کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ سونے والا شخص اپنے ان تمام افعال سے لاعلم اور بے خبر ہی رہتا ہے۔ جو کام جاگتے وقت انسان شعوری طور پر کر رہا ہوتا ہے، نیند کے دوران وہی کام لاشعوری طور پر ہو رہے ہوتے ہیں۔

نیند کے دوران ہمارا یہ جسم ایک خودکار بائیولوجیکل مشین کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ایک ایسی مشین جسے خود اپنی ہی کی جانے والی حرکات کا کچھ علم نہیں ہوتا۔

ہر قسم کے خیالات، احساسات اور جذبات سے عاری۔۔۔۔۔ایک مشین۔

میں امید کرتا ہوں کہ ہمارے اس جسم کی حقیقت کو اب آپ اچھے سے جان چکے ہوں گے۔

روح کے بنا یہ جسم بس۔۔۔۔۔ایک مشین ہے۔

اس مادی کائنات میں جذبات، احساسات، خیالات جیسی غیر مادی چیزیں کیسے پائی جاتی ہیں؟ کیوں پائی جاتی ہیں؟ کائنات میں شعور کا پایا جانا اس دنیا کے سیانوں کے لیے سب سے بڑا مسئلہ ہے، کیونکہ عقلی اور منطقی اعتبار سے ایک مادی چیز کسی غیر مادی چیز کو جنم نہیں دے سکتی۔

میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ یہ عقدہ بھی حل کر چکے ہوں گے۔ اس مادی کائنات میں غیر مادی شعور یعنی۔۔۔۔۔احساسات، خیالات، جذبات اور یادوں کا پایا جانا روح کی وجہ سے ہے۔

یہ کائنات ایٹمز سے مل کر بنی ہے اور اب تک ایٹمز کی کچھ خاص قسم کی حرکات تو یقیناً آپ کو یاد ہو چکی ہوں گی۔ ایٹم کی اس چھوٹی دنیا کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ کوئی ذی شعور ہستی جب ان ایٹمز کو Observe کر رہی ہو تو یہ اپنا چال چلن بدل لیتے ہیں۔ اگر آپ الیکٹرونز کی جانب نہیں دیکھ رہے تو یہ بیک وقت بہت ساری جگہوں پر موجود ہوگا، لیکن جیسے ہی آپ ان کی جانب دیکھیں گے تو یہ فوراً آپ کو دھوکا دینے کے لیے صرف ایک ہی مخصوص جگہ پر جامد ہو جائے گا۔

مگر کیوں؟۔۔۔۔۔اور کیسے؟۔۔۔۔۔آخر یہ سب کیسے ممکن ہے؟

میرے یا آپ کے جیسی کوئی ذی شعور ہستی جب ان الیکٹرونز کی جانب دیکھتی ہے تو یہ اپنا چال چلن کیوں بدل لیتے ہیں؟ کیسے بدل لیتے ہیں؟

ہمارے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے ان الیکٹرونز کا کیا تعلق ہے؟ مجھ میں اور میرے شعور میں ایسی کیا خاص بات ہے کہ جیسے ہی میں ان الیکٹرونز کی جانب دیکھتا ہوں تو یہ اپنا چال چلن بدل لیتے ہیں؟

یقیناً اب آپ کو اس سوال کا جواب بھی مل چکا ہوگا۔

ایک ذی شعور انسان کے دیکھتے ہی یہ الیکٹرونز اپنا چال چلن بدل لیتے ہیں، کیونکہ انسانی شعور کا سارا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ روح ہے جو الیکٹرونز کو اپنا چال چلن بدلنے پر مجبور کرتی ہے۔

الیکٹرونز اپنی Superpositions بس اس وقت تک ہی برقرار رکھ سکتے ہیں، جب تک کوئی ذی شعور ہستی ان کی جانب نہیں دیکھ رہی۔ جیسے ہی کوئی ذی شعور ہستی ان الیکٹرونز کی جانب دیکھتی ہے تو یہ الیکٹرونز اپنی تمام حرکات چھوڑ کر بس ایک ہی جگہ پر جامد ہو جاتے ہیں۔

اگر انسان بھی محض چند ایٹمز ہی ہے تو پھر۔۔۔۔۔ ایک انسان کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے ان الیکٹرونز کی حرکت کا کیا تعلق؟؟؟

ارے بھئی! میں یہ جسم نہیں ہوں۔ یہ جسم تو بس ایک دھوکا ہے۔ میں کچھ اور ہوں۔

میں روح ہوں۔

ستاروں، کہکشاؤں اور سیاروں سے بنی ایک کائنات میری ذات سے باہر موجود ہے۔ یہ کائنات ایٹمز سے بنی ہے، جبکہ احساسات، جذبات، خیالات اور یادوں سے بنی ایک دنیا میرے اپنے ہی وجود کے اندر موجود ہے۔ میرے اندر کی یہ دنیا میری روح کی وجہ سے ہے۔ جب بھی میں ایٹمز سے بنی اس کائنات میں کوئی بھی چیز دیکھتا ہوں تو یہ بنیادی طور پر دو بالکل مختلف کائناتیں ہیں کہ جو ایک دوسرے سے Interact کرتی ہیں۔ البتہ یہ بات قرآنِ حکیم میں واضح طور پر بتا دی گئی ہے کہ روح اور روح کے متعلقہ تمام امور کے بارے میں ہمیں علم نہیں دیا گیا ہے، لہٰذا روح کو اس جسم کی آنکھوں کے ذریعے دیکھنا ناممکن ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اب تک یقیناً آپ یہ بات بھی جان چکے ہوں گے کہ انسانی شعور اور اس سے متعلق تمام چیزوں کا علم ہمارے پاس نہ ہونے کے برابر کیوں ہے؟

انسانی شعور کا عقدہ، ہمیشہ عقدہ ہی رہے گا۔ Free-Will کی پہیلی کبھی حل نہ ہوگی۔ انسانی حواس سے وجود میں آنے والا علم یہ بات کبھی نہیں جان پائے گا کہ ہماری زندگیوں کا ایک تہائی حصہ نگل جانے والی نیند آخر کیا چیز ہے۔ ہم اپنے خوابوں کی حقیقت کبھی نہیں جان پائیں گے۔

اور تو اور ہم کافی اور آئس کریم کے ذائقے میں موجود فرق کو کبھی الفاظ میں بیان نہیں کر سکیں گے۔

ان تمام چیزوں کے بارے میں ہمارے پاس علم نہ ہونے کے برابر ہے اور وجہ بس یہی ہے کہ یہ تمام چیزیں روح کے متعلق ہیں۔ یہ بات قرآنِ حکیم کی حقانیت پر ایک دلیل بھی ہے۔ قرآن حکیم نے ساڑھے چودہ سو سال پہلے کہہ دیا تھا کہ انسان کو روح، یعنی شعور کے متعلق علم نہیں دیا گیا اور اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود ہم آج بھی شعور کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، حتیٰ کہ انسانی علم میں شعور کی کوئی ایک باقاعدہ تعریف بھی موجود نہیں ہے۔ بہرحال ایک انسان کا حقیقی وجود اس کا روحانی وجود ہوتا ہے اور ہماری اس زندگی میں بھی روح اپنے سبھی اعمال سرانجام دینے کے لیے جسم کی محتاج نہیں ہوتی۔

سیدنا عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مومنوں کی روحیں ایک دن کے فاصلہ پر جا کر دوسری روحوں سے ملتی ہیں، اگرچہ دنیا میں انہوں نے ایک دوسرے کو کبھی بھی نہ دیکھا ہو۔'' (مسند احمد:3032)

یعنی اس جسم سے ہٹ کر بھی روح کی کچھ مصروفیات ہوتی ہیں۔ کچھ ایسی مصروفیات جو ہمارے فہم سے بالاتر ہیں۔ بہرحال روح اور روح سے متعلق تمام امور کی حقیقت ہم اس زندگی میں کبھی نہیں جان سکیں گے۔ بس جو بات یقینی ہے، وہ یہی ہے کہ روح کے بغیر ہمارا یہ جسم ایک بائیولوجیکل مشین ہے۔ اس جسم کو انسان بنا دینے والی چیز روح ہے۔ جسم میں روح موجود ہے تو جسم ایک انسان ہے، وگرنہ ایک بائیولوجیکل مشین، ایک خودکار روبوٹ۔ بس یہی حقیقت ہے اس جسم کی۔

اس سے بھی بڑی حقیقت یہ ہے کہ۔۔۔ میں اشرف المخلوقات ہوں۔۔۔ میں مسجودِ ملائک ہوں۔

یہ تمام کائنات میری ہے۔ یہ سیانے کہتے ہیں کہ۔۔۔

میں محض چند ایٹمز ہوں؟ ایک ترقی یافتہ بندر ہوں؟

اب ان سیانوں کو کون سمجھائے کہ میں یہ جسم تو ہوں ہی نہیں۔۔۔ یہ جسم تو بس ایک دھوکا ہے۔

میں کچھ اور ہوں۔۔۔۔۔ میں تو کچھ اور ہی ہوں۔

''میں روح ہوں''

باب:4

احمق سیانے

جب میں چھوٹا سا تھا۔۔۔

مطلب جب میں بہت ہی چھوٹا سا تھا۔۔۔

اتنا چھوٹا کہ ابھی تو سکول جانا بس شروع کیا ہی تھا۔

ان دنوں مجھے بڑوں سے معلوم ہوا کہ یہ جو چھوٹے بچے ہوتے ہیں ناں، یہ اللہ جی کے پاس موجود ہوتے ہیں اور فرشتے رات کی تاریکی میں ان بچوں کو ہسپتال کی ''راہداریوں'' میں رکھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔ جس کسی انسان کو بھی بچہ چاہیے ہو تو وہ ہسپتال کی ان راہداریوں سے بچہ اٹھا کر گھر لا سکتا ہے۔

ابھی میں معصوم تھا۔۔۔۔۔ یقین کیجیے بہت معصوم تھا۔

میں نے بڑوں کی ان تمام باتوں پر مِن وعَن یقین کر لیا۔

بات اگر صرف یقین تک ہی رہتی تب بھی کچھ ایسا نقصان نہ ہوتا، لیکن میں نے تو دل ہی دل میں یہ دعا بھی مانگنا شروع کر دی کہ فرشتے میرے بھائی کا بیٹا۔۔۔

یعنی میرا بھتیجا ہسپتال کی راہداریوں میں رکھ کر نہ جائیں، بلکہ فرشتے میرے سکول آ کر میرا بھتیجا خود میرے ہی حوالے کر کے جائیں۔

میری اس دعا کا مقصد بس یہی تھا کہ۔۔۔

میں اپنے نومولود بھتیجے کے ساتھ گھر واپس جا کر سبھی گھر والوں کو ''سرپرائز'' دے سکوں۔

اگلے بہت سارے سال میں اپنی ان خاموش دعاؤں کی قبولیت کا انتظار کرتا رہا۔

مگر میرا یہ انتظار، انتظار ہی رہا۔

مجھے میرا بھتیجا تھما کر جانے والا وہ فرشتہ کبھی نہ آیا۔

وہ نہ آنے والا کبھی نہ آیا۔

بڑوں کو سرپرائز دینے کی میری یہ خواہش بس ایک خواہش ہی رہی۔

اگرچہ میں بڑوں کو سرپرائز دینے میں ناکام رہا، مگر بڑوں نے مجھے میری زندگی کا سب سے بڑا ''شاک'' ضرور دے ڈالا۔

یہ پانچویں جماعت کی بات ہوگی کہ جب مجھے چند ''نامعلوم'' ذرائع سے معلوم ہوگیا کہ بڑوں نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا اور ان بچوں کو فرشتے ہسپتال کی راہداریوں میں رکھ کر نہیں جاتے بلکہ۔۔۔

بلکہ یہ بچے تو ان بڑوں کے اپنے ہی ''اعمال'' کے نتائج ہوتے ہیں۔

ان حقائق کا منکشف ہوجانا مجھ پر بہت گراں گزر رہا تھا۔

کاش۔۔۔۔۔کاش میں اندھیرے میں ہی رہ جاتا۔

کاش بڑوں کا وہ جھوٹ ہی سچ ہوتا۔

جیسے جیسے انسان کے جسمانی وجود کی تخلیق کے مختلف مراحل میرے علم میں آتے گئے۔۔۔

ویسے ویسے اس دنیا کے سبھی بڑے میری نگاہوں سے گرتے ہی چلے گئے۔

یہ بڑے ظاہر میں کیسے معصوم کتنے بھولے بھالے اور کیسے سنجیدہ سے دکھائی دیا کرتے تھے۔

مگر اندر سے۔۔۔

مجھے بڑوں سے ہرگز، ہرگز یہ امید نہیں تھی۔

مجھے ان بڑوں نے کبھی اچھے سے مٹی بھی نہ کھانے دی تھی۔ بس ذرا ذرا سی بات پر ہی ڈانٹ پلا دیا کرتے تھے اور خود۔۔۔

اور خود۔۔۔

چھی، چھی، چھی گندے۔۔۔

مجھ سے تو شرم کے مارے ان بڑوں کے اعمال لکھے بھی نہیں جا رہے۔

آخر انسان ایسے کام کرے ہی کیوں، جنہیں بیان کرتے ہوئے زبان لڑکھڑانے لگے؟؟؟

اس دنیا کے سبھی بڑے مجھے بڑے نہیں۔۔۔۔۔منافق دکھائی دینے لگے تھے۔

گھن آنے لگا تھا مجھے بڑوں کے اس ''مکروہ'' کردار پر۔

کاش۔۔۔۔۔کاش میں واپس اندھیرے میں جا سکتا۔

کاش۔۔۔۔۔ان بچوں کو فرشتے ہی ہسپتال کی راہداریوں میں رکھ کر جایا کرتے۔

مجھے اس دنیا کے سبھی بڑوں سے نفرت۔۔۔۔۔شدید نفرت ہو چکی تھی۔

میں چھوٹا تھا، کمزور تھا۔

میں بڑوں کی ان ''غیر اخلاقی'' حرکتوں پر اپنی آواز بلند نہ کر سکا، مگر خاموش احتجاج کا حق میرے پاس محفوظ تھا اور میں اپنے اس حق کو اچھے طریقے سے استعمال کرنا چاہتا تھا۔

یہ انہی دنوں کی بات ہوگی جب ایک روز سکول میں ٹیچر نے میرا ہوم ورک چیک کرنے کے لیے مجھے اپنے پاس بلایا۔ ٹیچر کا دو سالہ بیٹا بھی اس وقت ٹیچر کے پلو کے ساتھ چپکا کھڑا تھا۔

وہ گول مٹول بچہ۔۔۔۔۔اس وقت مجھے با قاعدہ زہر لگ رہا تھا۔

میں نے اپنے اندر بڑوں کے خلاف شدید نفرت محسوس کی۔

اس وقت اگرچہ میں نے اپنا ہوم ورک مکمل کیا ہوا تھا، مگر ٹیچر کے بیٹے کو دیکھ کر۔۔۔

احتجاجاً۔۔۔۔۔ میں نے ٹیچر کو بول دیا کہ میں نے ہوم ورک نہیں کیا۔

عموماً میں اپنا ہوم ورک اچھے سے کیا کرتا تھا، لہٰذا ٹیچر نے میری اس غلطی پر مجھے ''مرغا'' بنانے کی جگہ بس آئندہ با قاعدگی سے ہوم ورک کرنے کی نصیحت پر ہی اکتفا کیا، مگر ٹیچر کے منہ سے یہ وعظ سننا بھی مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔۔۔

''ہنہ! دوسروں کو نصیحت اور خود۔۔۔''

میں نے ٹیچر کے بیٹے کی جانب طنزیہ نگاہوں سے دیکھ کر ٹیچر کو اس کی منافقت کا احساس دلانے کی ایک کوشش کی۔ میری اندرونی کیفیات سے بے خبر ٹیچر نے حیرانی کے ساتھ ایک نظر میرے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ کو دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے میرے گال پر تھپڑ رسید کر کے میری اس بلا وجہ کی مسکراہٹ کا سبب دریافت کر لیا۔ مجھے ٹیچر کی جانب سے اس تھپڑ کی بالکل امید نہیں تھی۔

مجھے تو یہ یقین تھا کہ۔۔۔۔۔ ٹیچر اپنی ''اس غلطی'' پر شرمندہ ہو کر میرے سامنے لجاجت سے کوئی جھوٹی وضاحت پیش کرنے کی کوشش کرے گی، مگر۔۔۔

مگر یہاں تو الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔

حق پر ہونے کے باوجود تھپڑ بھی مجھ ہی کو کھانا پڑا۔

ٹیچر نے اپنے بڑے ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا، مگر اب میں بھی باطل سے ٹکرانے کی ٹھان چکا تھا۔ بڑوں کے ڈر سے میں حق کا راستہ نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

لہٰذا میں ڈٹا رہا، میں جما رہا۔

میں نے اپنی اسی استہزائیہ مسکراہٹ کے ساتھ ٹیچر کو ایک بار پھر سے آئینہ دکھانے کی کوشش کی، لیکن ٹیچر کو آئینہ دیکھنا شاید اچھا نہیں لگا تھا۔

ٹیچر نے فوراً ہی میرے ''Innocent'' گال پر ایک اور تھپڑ رسید کر دیا۔
مگر میں نے بھی ہمت نہیں ہاری۔۔۔
اب میرے اور ٹیچر کے درمیان ایک بالکل انوکھی اور منفرد قسم کی گفتگو ہونا شروع ہو چکی تھی۔
اس گفتگو میں میری نگاہیں بول رہی تھیں۔۔۔۔۔اور ٹیچر کے ہاتھ۔
میں نے نظروں ہی نظروں میں ٹیچر کو یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ۔۔۔
''بس بس۔۔۔۔۔زیادہ ڈھونگ رچانے کی ضرورت نہیں ہے۔''
اور جواباً ٹیچر کا ہاتھ ایک زوردار چٹاخ کی آواز کے ساتھ میرے گال کو چھو گیا۔
میں بضد رہا۔۔۔۔۔اور ٹیچر بھی اَڑیل تھی۔
میں نے اپنی گفتگو جاری رکھی۔۔۔۔۔اور ٹیچر نے اپنی۔
''زیادہ معصوم بننے کی ضرورت نہیں ہے''۔۔۔۔۔چٹاخ
''سب جان چکا ہوں میں''۔۔۔۔۔چٹاخ
''تم بڑوں نے مل کر مجھے جتنا بے وقوف بنانا تھا، بنالیا''۔۔۔۔۔چٹاخ
''ہنہ، فرشتے رکھ کر جاتے ہیں ہسپتال کی راہداریوں میں''۔۔۔۔۔چٹاخ
''اب بس، بہت ہو گیا اور نہیں چلے گا یہ ڈھونگ''۔۔۔۔چٹاخ، چٹاخ، چٹاخ

اور پھر۔۔۔
حق و باطل کی اس جنگ میں۔۔۔۔۔حق ہار گیا۔
ٹیچر کو میری یہ صاف گوئی اچھی نہیں لگی تھی۔ سچ ہمیشہ کڑوا جو ہوتا ہے۔ٹیچر نے میرے پھولوں جیسے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کر ڈالی۔حق پر ہونے کے باوجود مجھے ہی اپنی نگاہیں جھکا کر گفتگو کے اس سلسلے کو منقطع کرنا پڑا۔میں چپ چاپ پوری کلاس کے سامنے تماشا بنا رہا۔میں ٹیچر کی اس ہٹ دھرمی کے سامنے بے بس تھا اور مارے بے بسی کے میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔
میں رو رہا تھا۔۔۔۔۔میں ہچکیاں لے لے کے رو رہا تھا۔
روتے روتے مجھے اور تو کچھ سجھائی نہ دیا بس۔۔۔
میں نے ٹیچر کے بیٹے کی جانب اپنے ہاتھ سے اشارہ کر کے ایک آخری بار۔۔۔
ٹیچر کو اس کا اصل چہرہ دکھانے کی کوشش کی۔
ٹیچر نے ناسمجھی کے عالم میں میرے اشارے کا پیچھا کرتے ہوئے اپنے بیٹے کی جانب دیکھا۔

ٹیچر کو لگا شاید اس کے بیٹے کی ناک بہہ رہی ہوگی ،مگر اپنے ہٹے کٹے بیٹے کو صحیح سلامت دیکھ کر ٹیچر نے میرے ایک اور تھپڑ لگا دیا اور پھر مجھ سے پوچھنے لگیں :

''تم یہ کیا اشارے کیے جا رہے ہو؟''

شرم وحیا۔۔۔۔۔اور تکلیف کے سبب۔۔۔۔۔مجھ سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

میرا منحنی بدن مسلسل کپکپا رہا تھا۔اپنے جسم و جاں کی تمام توانائیاں جمع کر کے میں نے ''حق'' کے حق میں ایک آخری بار آواز بلند کرنے کی کوشش کی ،مگر۔۔۔

مگر میرے منہ سے''یہ''۔۔۔''یہ''۔۔۔''یہ'' کی تیز چیخوں کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکا۔

جبکہ''یہ''۔۔۔''یہ''۔۔۔''یہ'' کی اس گردان کے دوران بھی میرا ہاتھ مسلسل ٹیچر کے بیٹے کی جانب ہی اٹھا ہوا تھا۔

ٹیچر کے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہو گیا۔میرے معصوم چہرے پر ایک بار پھر سے تھپڑوں کی بارش کی گئی اور ساتھ ہی ساتھ مجھ سے یہ بھی دریافت کیا جاتا رہا کہ میں اس کے جگر کے ٹکڑے،اس کے مُنّے کی جانب بار بار اشارے کیوں کر رہا ہوں؟

وہ ٹیچر۔۔۔۔۔وہ سب کچھ جان کر بھی انجان بنی رہی۔

اور میں۔۔۔۔۔شرم وحیا کے مارے بِنا کچھ بولے، بِنا کچھ کہے بس مار کھاتا رہا۔

اب اس سے زیادہ اور کیا بتاتا میں ٹیچر کو؟

عقل مند کے لیے تو اشارہ ہی کافی نہیں ہوتا؟

تھپڑوں کے بعد ٹیچر نے مجھے مرغا بنا دیا۔

میری آنکھوں سے آنسو گر کر کچی مٹی میں جذب ہوتے رہے۔

میں حق پر ہونے کے باوجود مرغا بنا ہوا تھا، جبکہ ٹیچر۔۔۔۔۔اپنے مُنّے کے ساتھ کرسی پر براجمان رہی۔اس دن میرے ہی جیسے بہت سے معصوم بچوں کی نگاہوں کے سامنے۔۔۔

حق ہار گیا۔۔۔۔۔باطل جیت گیا۔

ٹیچر کی اس بے جا ضد کی وجہ سے۔۔۔۔۔ان کلیوں جیسے معصوم بچوں کے ذہنوں پر۔۔۔

کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے؟؟؟

کیا ہو جاتا۔۔۔

کیا ہو جاتا اگر ٹیچر اپنی ''غلطی'' تسلیم کر کے مجھ سے معذرت کر لیتیں؟

میں نے تو فوراً ہی کھلے دل کے ساتھ معذرت قبول کر لینی تھی، مگر۔۔۔

دنیا سے میرا اعتبار اٹھ گیا۔۔۔۔۔ میں اندر سے ٹوٹ چکا تھا۔

لیکن اس سب کے باوجود اگلے بہت سارے سال مَیں حق و باطل کی اس لڑائی میں خاموشی کے ساتھ حق کا ساتھ دیتا رہا۔ اس تمام عرصے میں مجھے یہ بڑے کبھی ایک آنکھ نہ بھائے اور بڑوں کے ساتھ میرا یہ بغض وحسد شاید ابھی مزید بہت سارے سال بھی جاری رہتا، مگر پھر۔۔۔

پھر میں خود بڑا ہو گیا۔

حق و باطل میں پہلے صلح ہوئی اور پھر۔۔۔۔۔ دونوں یکجا ہو گئے۔

مجھے بڑوں کی مجبوریاں سمجھ آنا شروع ہو گئیں۔

بڑے سچے تھے۔۔۔۔۔ میں جان گیا، میں مان گیا۔

اور اس کے ساتھ ہی مجھے ٹیچر کے ساتھ کی گئی اپنی ناحق بدتمیزی کا بھی شدت سے احساس ہوا۔ میں شرمندہ تھا۔ میں اپنے ماضی کے اس غلط رویے کی تلافی کرنا چاہتا تھا، لہٰذا میں ایک شام پھولوں کا گلدستہ لیے ٹیچر کے گھر پہنچ گیا۔

گھر کے داخلی دروازے پر دستک دی۔ کچھ لمحات بعد وہی مُنّا دروازے پر نمودار ہو گیا۔ مُنّے کو دیکھ کر میرے اندر شرمندگی کا احساس مزید بڑھ گیا۔ مُنّا اب سات آٹھ برس کا ہو چکا تھا اور اس کے سامنے کے دو دانت بھی غائب تھے۔ میں نے اپنی اندرونی کیفیات کو چھپاتے ہوئے مسکرانے کی ایک کوشش کی اور پھر مُنّے کے گال پر پیار کر کے اس سے ٹیچر کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ میں مُنّے کو اپنی بات سمجھانے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اسی دوران۔۔۔

ایک دو تین سال کی گڑیا اپنی توتلی آواز میں ''بھائی بھائی'' کی رٹ لگائے دروازے پر نمودار ہو گئی اور۔۔۔ اور جانے کیوں؟

اس پریوں جیسی گڑیا کو دیکھ کر۔۔۔۔۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

مجھے ایک زوردار چکر آیا۔۔۔۔۔ گرنے سے بچنے کے لیے میں نے دیوار کا سہارا لیا۔

جبکہ پھولوں کا گلدستہ میرے ہاتھوں سے پھسل چکا تھا۔۔۔

ساری گلی میں پھول بکھر گئے۔

میں اچانک سے پانچ سال پیچھے پہنچ گیا۔ حق و باطل کی ''وہ'' لڑائی پھر سے میری نگاہوں کے سامنے نشر ہونا شروع ہو گئی۔ حق و باطل کی اس جنگ میں حق کی بے جا شکست پر۔۔۔

میرے کان گرم ہو گئے۔۔۔۔۔اور میرا دماغ گھوم گیا۔

بڑوں کے ساتھ میرا کئی سال پرانا بغض وحسد ایک بار پھر سے زندہ ہو چکا تھا۔

میں نے مُنّے کے گال پر ایک زوردار چٹکی کاٹی اور پھر۔۔۔

چیختے چلّاتے مُنّے کو ادھر ہی چھوڑ کر میں بھاگ گیا۔

مجھے دورہ پڑ چکا تھا۔۔۔۔۔میں بھاگ گیا۔

ان سب باتوں کو بہت وقت گزر چکا ہے، لیکن یہ میری زندگی کا وہ واحد دورہ تھا کہ جس کی اصل وجہ میں آج تک نہیں جان سکا۔ میرے دورے پیچیدہ ہوں گے، لیکن انسان کا مرکب وجود پیچیدہ ترین ہے۔ انسانی وجود کے دہرے پن کو سمجھنے میں مجھے وقت لگ گیا، بہت وقت لگ گیا۔

درحقیقت انسان کا یہ جسم ایک دھوکا ہے، بہت بڑا دھوکا۔

بچپن میں انسانی تخلیق کے بارے میں مجھے بڑوں نے فرشتوں کی جو کہانی سنائی تھی، وہ کہانی بھی مکمل طور پر غلط نہیں ہے اور اس دنیا کے سیانے جو انسان کو بندروں کے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں ہے۔

انسان کے جسمانی وجود کی تخلیق اسی زمین پر ہوتی ہے اور یہ تخلیق بھی بالکل اسی طرح ہوتی ہے، جیسے اس زمین پر موجود دیگر لاتعداد جانوروں کی افزائشِ نسل ہوتی ہے۔ ہر قسم کے جانوروں میں پہلے نر اور مادہ کے بیچ جنسی اختلاط ہوتا ہے، حمل قرار پاتا ہے اور پھر اسی نوع کی ایک یا ایک سے زائد نئی زندگیاں جنم لے لیتی ہیں۔ بالکل اسی طرح سے مرد وعورت کے جنسی رابطے کے نتیجے میں نیا انسان پیدا ہو جاتا ہے، حتیٰ کہ انسان کے جسمانی وجود کے محرکاتِ عمل بھی تقریباً وہی ہیں، جو اس دھرتی پر موجود دیگر جانداروں کے۔ معدے اور جنس کی بھوک ہر انسان کو ہی بھگاتی ہے، حرکت پر آمادہ کرتی ہے۔

یہاں تک انسان اور دیگر جانوروں میں کسی قسم کا کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ سوائے اس سے کہ انسان اس زمین پر موجود دیگر جانداروں سے تھوڑا ترقی یافتہ جانور ہے، مگر۔۔۔

مگر انسان اس زمین پر موجود دیگر تمام جانداروں سے یکسر مختلف ہے۔

انسان یہ جسم ہے ہی نہیں۔ انسان تو اس جسم کے اندر کہیں چھپا ہوا ہے۔

انسان یہ جسم نہیں، انسان کچھ اور ہے۔

انسان روح ہے۔

ہر انسان کا جسمانی وجود رحمِ مادر میں حمل کی صورت میں پرورش پاتا ہے، جبکہ انسان کے روحانی وجود کو فرشتے ہی اس زمین پر چھوڑ کر جاتے ہیں۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ فرشتے انسان کو ہسپتال کی راہداریوں میں رکھ کر نہیں جاتے، بلکہ انسانی روح کو رحمِ مادر میں انسان کے جسمانی وجود کے ساتھ منسلک کر دیا جاتا ہے۔ البتہ انسانی حواس سے روح کا براہِ راست مشاہدہ کرنا ناممکن ہے۔ انسان کے حقیقی روحانی وجود کو انسان سے پوشیدہ رکھا گیا ہے۔ انسان کو خود انسان سے ہی چھپایا گیا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ انسانوں کی عظیم اکثریت انجانے میں اپنے جسمانی وجود کو ہی انسان سمجھ رہی ہوتی ہے۔ غیر مسلموں کی تو خیر کیا بات کرنی، آج ہم مسلمانوں کی اکثریت بھی اپنے روحانی وجود سے مکمل طور پر ناآشنا ہو چکی ہے۔ ہم خود کو بھول چکے ہیں، حالانکہ انسان کے جسمانی وجود میں سے اگر روح کو نکال دیا جائے تو محض ایک حیوان باقی رہ جاتا ہے اور آج اس زمین پر دو پاؤں پر چلنے والے حیوانوں کی کثرت ہو چکی ہے۔

انسانی جسم وہ دھوکا ہے، جس سے اس دنیا کے بڑے بڑے سیانے دھوکا کھا چکے ہیں، کھا رہے ہیں۔ بہت سارے جدید دانشور اور سیانے ایسے بھی ہیں، جو انسان کے دہرے وجود سے لاعلم ہیں۔ پھر ایسے سیانے افراد اپنی اسی لاعلمی یا ہٹ دھرمی میں شعور کی حقیقتوں سے ہی منکر ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ شعور کو انسانی دماغ کی ایک چال اور دھوکا قرار دیا جاتا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ شعور کو دھوکا کہنے والے یہ سبھی سیانے خود دھوکا کھا چکے ہیں۔ یہ سیانے خود اپنے ہی دماغ کی چالوں کا شکار ہو چکے ہیں۔

شعور کا سارا تعلق تو انسان کے روحانی وجود کے ساتھ ہے۔ اس جسم میں، ایک مشین میں، ایک کمپیوٹر جیسے دماغ میں شعور کو ڈھونڈنے والے یہ سبھی سیانے انسانی جسم سے دھوکا کھا چکے ہیں۔

پھر یہ کوئی پہلا یا آخری دھوکا نہیں ہے، جس میں اس دنیا کے سیانے مبتلا ہوئے ہیں۔ انسانیت کی علمی تاریخ ان سیانوں کی حماقتوں سے بھری پڑی ہے۔

یقین نہیں آ رہا؟؟؟

چلیں۔۔۔

چلیں کچھ لطیفے سناتا ہوں آپ کو۔ ویسے تو لطائف کے لیے سردار جی مشہور ہیں، لیکن آج میں آپ کو ''سائنس جی'' کے لطیفے سناتا ہوں۔ آپ بس وقت پر ہنس دیجیے گا۔۔۔

سائنس کی اب تک کی معلومات کے مطابق تمام کائنات میں ہماری اس زمین کے سوا کہیں پر بھی زندگی نہیں ہے۔ کائنات میں موجود اربوں سیاروں میں سے کسی ایک پر بھی ہمیں زندگی کے آثار نہیں ملے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کائنات میں کہیں پر بھی زندگی نہیں ہے تو پھر ہماری زمین پر زندگی کیسے موجود ہو سکتی ہے؟

اور پھر زندگی بھی محض زندگی نہیں، بلکہ شعور اور ذہانت سے بھرپور زندگی۔

آخر اس زمین پر انسان کیسے وجود میں آ گئے؟

زمین پر زندگی کا پایا جانا سائنسدانوں کے لیے مزید لاتعداد پہیلیوں کی مانند ایک پہیلی ہی ہے۔ لاکھ کوششوں کے باوجود انسانی علم میں زمین پر زندگی کی ابتداء کے بارے میں کوئی بھی ایک حتمی رائے موجود نہیں ہے۔ البتہ بہت سارے نظریات انسانی علم میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ ان تمام نظریات میں سے نسبتاً مقبول نظریے کو Abiogenesis کہتے ہیں۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر ہو چکا ہے کہ اس نظریے کے مطابق زمین پر زندگی کی ابتداء بے جان چیزوں سے ہوئی تھی۔ اگرچہ کوئی بھی سائنسدان آج تک لیبارٹریز میں بے جان چیزوں سے جاندار چیز پیدا نہیں کر سکا ہے، مگر اس کے باوجود Abiogenesis کے حامی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ہماری یہ زمین جب آج سے 4.5 ارب سال پہلے معرضِ وجود میں آئی تھی تو اس وقت Abiogenesis کے لیے سازگار حالات موجود تھے۔

زمین کا سورج سے فاصلہ نہایت مناسب تھا۔۔۔۔۔ نہ بہت کم۔۔۔۔۔ نہ بہت زیادہ۔

مناسب درجہ حرارت۔۔۔۔۔ بہت زیادہ وقت کا گزرنا۔

مطلب۔۔۔۔۔ مطلب پتھروں کے بطن سے پہلے جاندار خلیے نے جنم لے لیا۔

پھر مزید وقت گزرا۔۔۔۔۔ تھوڑا اور وقت گزرا۔۔۔۔۔

اور پھر وہی ایک خلیہ آج ارتقاء کے مختلف مراحل طے کرتا ہوا 8.7 ملین مختلف قسم کے جانداروں کو جنم دے چکا ہے۔ ارتقاء کے اس گھنے درخت میں انسان بھی دیگر جانداروں کی مانند ایک جاندار ہے۔ باقی جانداروں کی نسبت قدرے ترقی یافتہ حیوان۔

ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ ہو جاتا ہو گا Abiogenesis کچھ خاص قسم کے حالات میں۔ اب اگر سائنسدان اس بات کو لیبارٹریز میں ثابت نہیں کر پا رہے ہیں تو اس کا یہ مطلب تھوڑی نہ ہے کہ Abiogenesis ہو ہی نہیں سکتا۔ بیشک سائنسدانوں کو نہیں پتہ کہ یہ وقت

کیا چیز ہے، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے جان چیزوں سے جاندار پیدا نہیں ہو سکتے۔ چونکہ انسانی علم کو، ان سیانوں کو زمین پر زندگی کی موجودگی کی وضاحت کے لیے Abiogenesis کی ضرورت ہے۔

اس لیے Abiogenesis ہوسکتا ہے بلکہ۔۔۔ بلکہ Abiogenesis ہو گیا۔

جو بھی ہوا۔۔۔۔۔ جیسے بھی ہوا۔۔۔۔۔ بس ہو گیا۔

لیکن اب ان سائنسدانوں نے خود ہی سوچا کہ اس کائنات میں تو ہماری زمین سے اربوں گنا بڑے سیارے بھی موجود ہیں۔ تو پھر اس کائنات میں یقیناً لاتعداد سیارے ایسے بھی ہوں گے کہ جن کا ہماری زمین ہی کی طرح اپنے سورج سے فاصلہ نہایت مناسب ہوگا۔۔۔

نہ بہت کم۔۔۔ نہ بہت زیادہ۔۔۔

مناسب درجہ حرارت۔۔۔ بہت زیادہ وقت کا گزرنا۔۔۔

آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات؟؟؟

اگر زمین پر زندگی کا آغاز Abiogenesis سے ہوا تھا تو Abiogenesis کے لیے درکار تمام عوامل تو اس کائنات میں دیگر لاتعداد سیاروں پر موجود ہوں گے۔ تو کیا ہماری زمین کے سوا بھی کائنات میں ارب ہا ارب سیاروں پر زندگی پائی جاتی ہے؟ کیا کائنات میں دیگر سیاروں پر بھی ہماری طرح کے ''ترقی یافتہ'' جانور پائے جاتے ہیں؟ یا پھر اگر سیانوں کی زبان میں بات کی جائے تو کیا ہماری کائنات میں Aliens موجود ہیں؟ ظاہری بات ہے کہ ان اربوں سیاروں میں ہماری زمین کوئی خاص تھوڑی نہ ہے کہ صرف اس پر ہی زندگی وجود میں آئے۔ اتنی بڑی کائنات میں ہم اکیلے موجود نہیں ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خلائی تحقیق کرنے والے سائنسدان پچھلے کافی عرصے سے کائنات میں موجود Aliens کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کائنات میں موجود Aliens کی تلاش کرنے کی کوشش کو Search for Extraterrestrial Intelligence (SETI) کا نام دیا جاتا ہے۔

NASA, ESA اور خلائی تحقیق کے دیگر تمام بڑے اداروں میں اب باقاعدہ SETI پروجیکٹ موجود ہیں اور ان پر کام ہو رہا ہے۔ ان پروجیکٹس پر اربوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں اور ہزاروں سیانے رات دن محنت کر رہے ہیں۔ اس ساری بھاگ دوڑ کا مقصد بس ایک ہی ہے کہ کسی بھی

طرح سے کائنات میں موجود Aliens کو ڈھونڈا جا سکے۔اسی مقصد کے لیے بڑی سے بڑی ریڈیو ٹیلی سکوپس بھی ایجاد کی جا رہی ہیں تاکہ Aliens کے چھوڑے گئے ریڈیو سگنلز کو قابو کیا جائے، جبکہ ہر کچھ عرصے بعد ہالی وڈ Aliens کے کرداروں پر فلم بنا کر SETI پروجیکٹ پر کام کرنے والے سائنسدانوں کے جوش وجذبات۔۔۔۔۔اور غیرت کو ابھارنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔

چند سال پہلے ستاروں کے ایک خاص جھرمٹ کی جانب زمین سے ریڈیو سگنلز بھی ارسال کیے گئے تھے۔ مقصد یہی تھا کہ اگر ان ستاروں پر Aliens موجود ہیں تو انہیں زمین پر انسانوں کی موجودگی سے آگاہ کیا جا سکے۔ ریڈیو سگنلز کے ارسال کیے جانے پر ایک بہت مشہور سائنسدان نے یہ بات بھی کہی تھی کہ۔۔۔

''انسانوں نے دوسرے سیاروں کی جانب سگنلز بھیج کر ایک بہت بڑی حماقت کی ہے۔ اگر ان سیاروں پر بسنے والے Aliens ہم سے زیادہ ترقی یافتہ اور ذہین ہوئے تو وہ ہماری زمین اور انسانیت کو تباہ و برباد بھی کر سکتے ہیں۔اس لیے اب ہمیں ان Aliens سے ہوشیار رہنا چاہیے۔''

اسی طرح 1961ء میں Dr. Frank Drake نے Aliens کی تلاش شروع کرنے کے لیے ایک فارمولا بھی پیش کیا تھا، جسے Drake Equation کے نام سے آج بھی جانا جاتا ہے۔اس فارمولے کے ابتدائی اندازوں کے مطابق محض ملکی وے کہکشاں میں ہی ایک ہزار سے دس کروڑ تک ایسے سیارے موجود ہو سکتے ہیں، جن پر ہماری زمین ہی کی طرح کی Intelligent Life موجود ہو سکتی ہے، مگر جانے کیوں؟

اس تمام بھاگ دوڑ، اچھل کود اور اس تمام پھدک پھدک کے باوجود۔۔۔

آج تک سائنسدانوں کی کوئی ایک بھی ٹیم کسی قسم کے Aliens کا سراغ نہیں لگا پائی ہے، بلکہ 1961ء کے اندازوں کے مطابق ہماری اس کہکشاں میں دس کروڑ سیاروں پر زندگی موجود ہو سکتی تھی، لیکن اب یہ تعداد کم ہوتے ہوتے اس مقام پر پہنچ چکی ہے کہ کچھ سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ ہماری اس کہکشاں میں صرف 36 ایسے سیارے موجود ہیں، جن پر زندگی موجود ہو سکتی ہے۔

لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ کم بخت ان 36 سیاروں پر رہنے والے Aliens بھی جانے کہاں مر گئے ہیں کہ جو ابھی تک ہمارے سیانے ان کو ڈھونڈ نہیں پا رہے۔ سائنسدانوں کی ترسی ہوئی نگاہوں کو سوائے ہالی وڈ کی فلموں کے اور کہیں بھی Aliens دکھائی نہیں دے رہے ہیں۔

اب تو مایوسی میں کچھ سیانوں نے یہ بھی کہنا شروع کر دیا ہے کہ شاید اس کائنات میں ہم اکیلے ہی ہیں۔ شاید تمام کائنات میں زندگی محض اس ایک چھوٹی سی زمین پر ہی موجود ہو۔

کائنات میں زندگی کا محض اس ایک زمین پر پایا جانا تو Abiogenesis کے نظریے کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ زندگی کا صرف اسی زمین پر پایا جانا تو خدا کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ اس کائنات میں Aliens موجود ہوں گے، ضرور موجود ہوں گے۔ لہٰذا ڈھونڈ رہے ہیں اب Aliens۔۔۔۔Aliens کو۔

جبکہ SETI پروجیکٹ پر کام کرنے والے کچھ سیانے ایسے بھی ہیں جو Aliens کا انتظار کرتے کرتے اب کچھ بوریت کا شکار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ ایسے ہی کچھ انتظار کی کوفت میں مبتلا سیانوں نے ایک دن آپس میں مشورہ کیا۔۔۔

''کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ جب تک ہمیں Aliens نہیں مل جاتے، تب تک ہم اپنی بوریت دور کرنے کے لیے Aliens کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کا ایک میچ کھیل لیں۔ Aliens کے بچوں کے ساتھ تھوڑا اگھل مل کر رہیں گے تو ہم Aliens کے بارے میں زیادہ جان سکیں گے۔''

لہٰذا اب کچھ سیانوں کا خیال ہے کہ Aliens کے بچے ہم انسانوں کے بچوں سے زیادہ ذہین اور چالاک ہوتے ہیں۔ کچھ سیانے کہتے ہیں کہ Alpha Centauri پر رہنے والے Aliens کا پانچ بازو والا بچہ ہمارے شعیب اور بھگوڑے۔۔۔۔۔ دونوں سے زیادہ تیز گیند پھینک سکتا ہے۔ کچھ سیانوں کا کہنا ہے کہ Aliens کے بچے ''کڑی پکوڑہ'' زیادہ شوق سے کھاتے ہیں، جبکہ کچھ دیگر کا خیال ہے کہ ''کریلے گوشت'' Aliens کی پسندیدہ ڈش ہے۔

خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ایک سیانے نے تو بالکل ہی حد کر دی۔۔۔۔ اس سیانے نے Uy-Scuti پر رہنے والے Aliens کی بچی کا رشتہ Jupiter پر رہنے والے اکلوتے Alien کے ساتھ طے بھی کروا دیا۔

سیانوں کی اس گول میز کانفرنس میں Aliens کے بچوں کے بارے میں یہ تمام باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک سیانا جو محض سیانا ہی نہیں، بلکہ کچھ سمجھدار بھی تھا، کہنے لگا۔۔۔

''ارے بھئی! Aliens تو آج تک آپ کو ملے نہیں، پھر Aliens کے بچوں کے بارے میں آپ یہ تمام باتیں کیسے جان سکتے ہیں؟

پہلے Aliens کو تو ڈھونڈ لو، پھر Aliens کے بچوں کے بارے میں
کوئی بات کرنا۔‘‘

اس سمجھدار سیانے کی بات سن کی باقی سیانوں کو بھی کچھ ہوش آیا اور اب تمام احمق سیانے ٹیلی سکوپس کے ساتھ چپکے کائنات میں Aliens کو ڈھونڈ رہے ہیں۔

اگر آپ یہ سوچ رہے ہیں کہ سائنس جی کا جو لطیفہ آپ کو سنانا تھا، وہ گزر چکا ہے تو آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ لطیفہ تو ابھی شروع ہونا ہے۔ یہ سب تو محض اس اصل لطیفے کو اچھے سے سمجھانے کے لیے ایک تمہید تھی۔

چلیں اب آپ کو انسانیت کی علمی تاریخ کا سب سے بڑا لطیفہ سناتا ہوں۔ اس لطیفے کو پڑھتے ہوئے آپ نے Aliens کے بارے میں مختلف سیانوں کے بیچ ہوئی گفتگو کو اپنے ذہن میں مستحضر رکھنا ہے۔ اچھے سے سمجھنے کی کوشش کیجیے گا۔

سیانوں کی اس کائنات میں نہ پائے جانے والے Aliens کو کھوج نکالنے کی کوشش ،ضد اور ہٹ دھرمی ابھی بالکل نئی نئی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ساٹھ ستر برس گزرے ہوں گے جب سے ان سیانوں نے کائنات میں سے Aliens کو ڈھونڈ نکالنے کی اپنی کوششوں کا باقاعدہ آغاز کیا ہوگا جبکہ Free-Will ایک ایسا عقدہ ہے، جس نے ہر دور کے دانشوروں کو ہی پریشان کیے رکھا ہے۔ نصف صدی پہلے تک Free-Will کے اس پیچیدہ عقدے پر محض فلسفی اور فلسفیانہ ذہن کے لوگ ہی بات کیا کرتے تھے، لیکن اب Free-Will کی کھوج باقاعدہ ایک سائنس بن کر ابھر رہی ہے۔ برین سائنٹسٹس انسانی دماغ میں سے Free-Will کھوجنے کی کوشش میں مختلف تجربات سرانجام دے رہے ہیں۔

امریکہ کی مختلف یونیورسٹیز میں اس عقدے کو حل کرنے کے لیے مختلف پروجیکٹس پر باقاعدہ کام ہو رہا ہے۔ ان پروجیکٹس میں سے کچھ مکمل ہو چکے ہیں، کچھ پر کام تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ کروڑوں ڈالر خرچ کیے جا رہے ہیں، دنیا کے بہترین دماغ اکٹھے ہو چکے ہیں۔ پوری دنیا میں پھیلے فلسفیوں کی منطق اور برین سائنٹسٹ کی جدید ترین مشینیں ان پروجیکٹس کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔

اس ساری بھاگ دوڑ سے محسوس یوں ہی ہو رہا ہے کہ بس جلد ہی Free-Will کی اس اڑتی چڑیا کو قابو کر لیا جائے گا۔ ان پروجیکٹس پر کام کرنے والے سیانوں میں سے کچھ نے مختلف TV شوز کو انٹرویوز بھی دیے، تحریریں بھی لکھی گئیں۔ Free-Will کے بارے میں دنیا

کے بہترین دماغوں نے اپنی اپنی آراء کا اظہار بھی کیا۔۔۔

کچھ سیانوں کا کہنا ہے کہ انسان میں Free-Will موجود ہے، مگر تھوڑی سی۔ کچھ کہتے ہیں کہ انسانوں میں Free-Will تھوڑی سے تھوڑی زیادہ موجود ہے، جبکہ کچھ سیانوں کا یہ خیال بھی ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے۔ ایک انسان کے کیے گئے کسی بھی عمل میں اس انسان کی اپنی مرضی شامل نہیں ہوتی۔ انسان کے تمام اعمال، پہلے سے کیے گئے اعمال کے نتائج ہوتے ہیں۔ بہت سارے برین سائنٹسٹس کا بھی یہی کہنا ہے کہ انسان کی ذاتی رائے اور ذاتی پسند نام کی کوئی بھی چیز اپنا حقیقی وجود نہیں رکھتی ہے۔ انسانی دماغ پر مختلف تجربات کر کے اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ دماغ سارے فیصلے خود بخود ہی کر لیتا ہے۔ دماغ کے کیے گئے فیصلوں میں ایک انسان کو کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔ انسان جو یہ محسوس کرتا ہے کہ اپنی زندگی میں تمام فیصلے وہ خود کرتا ہے، یہ چیز بنیادی طور پر ایک دھوکا ہے۔

Free-Will is an illusion...

Free-Will ایک ایسا دھوکا ہے جو ہمارا دماغ مسلسل ہمیں دے رہا ہے۔

جبکہ Free-Will کے بارے میں بیشتر سیانوں کی رائے یہی ہے کہ ابھی حتمی طور پر کچھ کہنا مشکل ہے۔ ابھی مزید تحقیق کی ضرورت ہے اور۔۔۔

اور سائنس جی کا جو لطیفہ میں نے آپ کو سنانا تھا، وہ گزر چکا ہے۔

نہیں ہنسے ناں آپ؟؟؟

مجھے پہلے ہی پتہ تھا۔ چلیں ایک بار پھر سے سناتا ہوں۔

اب کی بار ذرا چست ہو کر بیٹھ جایئے۔۔۔۔۔Free-Will کی جس چڑیا کو یہ سیانے قابو کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، اس کا سارا تعلق انسان کے شعور کے ساتھ ہوتا ہے۔ غیر شعوری طور پر لیے گئے فیصلوں میں تو کسی قسم کی Free-Will کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہمارا دماغ ہمارے جسم کے بیشتر افعال ہمیں آگاہ کیے بنا ہی سرانجام دے رہا ہوتا ہے اور پھر ایسے تمام کاموں کے کرنے یا نہ کرنے میں ہماری کوئی مرضی بھی شامل نہیں ہوتی۔

مثال کے طور پر نیند کے دوران ہمارا یہ جسم کروٹیں بدل رہا ہوتا ہے، مگر ہمیں اس چیز کا کوئی شعور حاصل نہیں ہوتا اور پھر یہی وجہ ہے کہ دورانِ نیند کروٹیں بدلنے یا نہ بدلنے پر ہمارا اپنا کوئی اختیار بھی نہیں ہوتا۔ بالکل اسی طرح اگر آپ محض اپنی سوچ سے ہی اپنے خون میں موجود

RBCs کی تعداد کو کم یا زیادہ کرنا چاہیں تو یہ آپ کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔یعنی لاشعوری طور پر کیے گئے تمام افعال میں ہمیں کسی قسم کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا اور یہ بالکل سامنے کی بات ہے،جس میں کوئی پیچیدہ چیز نہیں ہے۔

جبکہ دوسری جانب ہماری زندگی کے بہت سارے فیصلے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے بارے میں ہم شعوری طور پر آگاہ ہوتے ہیں۔مثال کے طور پر دورانِ تعلیم آپ کس شعبہ کو اختیار کریں گے؟ کام پر آپ اپنی گاڑی پر جائیں گے یا پھر پبلک ٹرانسپورٹ پر؟ آپ سے کوئی بھکاری پیسے مانگ رہا ہے تو آپ اس بھکاری کو پیسے دیں گے یا نہیں؟ آپ آج کھانا کیا کھائیں گے؟ شام کا وقت آپ کھیل کے میدان میں گزاریں گے یا کسی کیفے میں؟

یہ سب اور ایسے ہی مزید لاتعداد افعال ہیں، جو ہم اپنی روزمرہ کی زندگی میں شعوری طور پر کر رہے ہوتے ہیں اور ہم محسوس یہی کرتے ہیں کہ ان تمام افعال کے کرنے یا نہ کرنے کے لیے ساری فیصلہ سازی ہم خود کرتے ہیں۔Free-Will کا صدیوں پرانا عقدہ محض اتنا سا ہے کہ یہ تمام افعال جنہیں ہم شعوری طور پر سرانجام دے رہے ہوتے ہیں،کیا ان افعال کے کرنے یا نہ کرنے میں ہمیں حقیقی طور پر بھی کوئی اختیار حاصل ہوتا ہے یا نہیں؟

اب اس Free-Will کے ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں ہر کسی کی اپنی رائے ہے۔ایسی ہی چند آراء کا ذکر پہلے ہو بھی چکا ہے۔ان تمام آراء سے بالکل قطع نظر،ایک بات تو یقینی ہے کہ Free-Will کی جس چڑیا کو اس دنیا کے سیانے صدیوں سے ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں،اس Free-Will کا سارے کا سارا تعلق انسان کے شعور کے ساتھ ہوتا ہے۔

اور شعور کیا چیز ہے؟

اس دنیا کے تمام سیانے اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ شعور کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتے ۔یہ بات سیانے خود ہی کہتے ہیں کہ انسانی شعور کا عقدہ ، پیچیدہ ترین عقدہ ہے۔اتنا پیچیدہ کے صدیوں کی کوششوں کے باوجود اس عقدے کو حل کرنے میں کوئی بھی پیش رفت نہیں ہوسکی ہے۔

اب لطیفہ یہ ہے کہ انسانی شعور کے بارے میں جب کسی کو کچھ نہیں معلوم تو پھر۔۔۔انسان کے شعوری طور پر کیے گئے فیصلوں کے بارے میں کوئی بھی اپنی رائے کا اظہار کیسے کرسکتا ہے؟؟؟

یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے Aliens نہیں مل رہے تو بوریت دور کرنے کے لیے Aliens کے بچوں کے ساتھ کرکٹ کا ایک میچ کھیل لیا جائے۔

شعور اگر Alien ہے تو۔۔۔۔Free-Will اسی Alien کا بچہ ہے۔

انسانی شعور کو جانے بِنا ہی انسان کے شعوری طور پر کیے گئے فیصلوں پر اپنی رائے کا اظہار کیسے کیا جا سکتا ہے؟؟؟؟

انسانیت کی علمی تاریخ میں شاید اس سے بڑی اور مستقل طور پر دہرائی جانے والی حماقت کوئی اور نہ ہوگی۔شعور کو جانے بِنا ہی Free-Will پر بحث کرنے والے یہ سبھی سیانے ایسی ہی بڑی حماقت کر رہے ہیں کہ جتنی بڑی حماقت Aliens کو ڈھونڈے بِنا اس بات پر بحث کرنا ہے کہ Aliens کے بچوں کو ''کڑی پکوڑہ'' زیادہ پسند ہے یا پھر ''کریلے گوشت''۔

کسی معیشت دان کی ایک واقعی سیانی بات کو تھوڑا تبدیل کر کے Free-Will پر کام کرنے والے ان سیانوں پر کچھ یوں چسپاں کیا جا سکتا ہے۔۔۔

''Free-Will ایک سیاہ رنگ کی بلی ہے، جسے بہت سارے فلسفی، برین سائنٹسٹ اور سائیکالوجسٹ ایک اندھیرے میں ڈوبے ہوئے کمرے میں تلاش کر رہے ہیں۔ ہر چند لمحات بعد کسی سیانے کی ایک چیخ سنائی دیتی ہے۔۔۔وہ رہی کالی بلی۔۔۔۔۔وہ رہی۔وہ رہی۔
پکڑو پکڑو۔۔۔۔۔جانے نہ پائے۔جانے نہ پائے اب کی بار۔
ایک سائیکالوجسٹ نے کسی فلسفی کی چٹیا پکڑ رکھی ہے اور اب وہ بضد ہے کہ یہ چٹیا، چٹیا نہیں ہے بلکہ اس کالی بلی کی دم ہے۔اس اندھیرے کمرے میں خوب بھاگ دوڑ ہو رہی ہے، شور شرابا ہے، ہنگامہ ہے۔محسوس یوں ہوتا ہے جیسے اس کالی بلی کو پکڑے بِنا کوئی بھی سکون سے اپنی جگہ پر بیٹھے گا نہیں، جبکہ وہ کالی بلی۔۔۔جسے یہ سبھی سیانے اندھیرے کمرے میں ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بلی ان سیانوں کے اس کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی۔۔۔۔۔چپکے سے بغلی دروازے کے ذریعے کمرہ چھوڑ کر باہر جا چکی تھی۔''

اس دنیا کے سیانے انسان کے دماغ اور جسم میں Free-Will ڈھونڈ رہے ہیں۔

ارے بھئی! نہیں ملے گی Free-Will آپ کو کہیں بھی۔Free-Will کا سارا تعلق تو انسان کے شعور کے ساتھ ہوتا ہے، جبکہ شعور کا سارا تعلق انسان کی روح کے ساتھ ہوتا ہے۔

''اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یہ لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔کہہ دو کہ روح میرے پروردگار کے حکم سے (بنی) ہے اور تمھیں جو علم دیا گیا ہے، وہ بس تھوڑا سا ہی علم ہے۔''

(الاسراء:85)

روح اور روح کے متعلق تمام امور کا علم ہمیں نہیں دیا گیا ہے،نہیں دیا گیا ہے اور یہ احمق سیانے لگے ہوئے ہیں روح کے متعلق ایک چیز کو انسانی جسم اور دماغ میں ڈھونڈنے۔

جسم کا Free-Will اور شعور کے ساتھ کیا تعلق؟؟؟

شعور کی طرح سے Free-Will کا عقدہ بھی ان سیانوں سے کبھی حل نہیں ہوگا۔ Free-Will کی حقیقت جاننے کے لیے بھی ہمیں قرآنِ حکیم سے رجوع کرنا ہوگا۔خالق نے اس مسئلہ پر بھی بقدرِ ضرورت اور ہدایت، ہماری مکمل رہنمائی فرمائی ہے۔

قرآنِ حکیم میں بار بار، بار بار انسانوں کو ایمان لانے کی اور اچھے اعمال کرنے کی دعوت دی گئی ہے۔بُرے کام چھوڑنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔اگر انسان میں اپنے اچھے یا بُرے اعمال کو منتخب کرنے کا اختیار موجود نہ ہوتو پھر اس قسم کی دعوت یقیناً ایک بے معنیٰ بات بن کر رہ جائے گی۔خالق نے ہمیں اچھائی اور برائی کے درمیان فیصلہ سازی کا اختیار دیا ہے۔ہمارے اندر Free-Will رکھی گئی ہے۔اسی وجہ سے ہمیں اچھے اعمال کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔انسان میں اس کی مرضی اور پسند کی موجودگی کے اثبات میں قرآنِ حکیم کی اس آیتِ مبارکہ پر غور کیجیے۔۔۔

''بے شک ہم نے اسے (حق و باطل میں تمیز کرنے کے لیے شعور و بصیرت کی) راہ بھی دکھا دی ہے، (اب) خواہ وہ شکر گزار ہو جائے یا ناشکر گزار رہے۔'' (الدھر:3)

ہر انسان کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا گیا ہے۔ ہر ہر انسان کو اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کر دی گئی ہے۔اب انسان اچھائی کے راستے پر چل کر خدا کی اس نعمت کا شکر بھی ادا کر سکتا ہے اور برائی کا راستہ اختیار کر کے اس نعمت کا کفر بھی کر سکتا ہے۔اچھائی اور برائی کا راستہ منتخب کرنے کا اختیار تو ہر انسان کو دیا گیا ہے،لیکن خدا یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ اس کے بندے اس کا کفر کریں۔

''اگر تم کفر اختیار کرو گے تو یقین رکھو کہ اللہ تم سے بے نیاز ہے اور وہ اپنے بندوں کے لیے کفر پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو گے تو وہ اسے

تمھارے لیے پسند کرے گا اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ پھر تم سب کو اپنے پروردگار ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔ اس وقت وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کچھ کرتے تھے۔ یقیناً وہ دلوں کی باتیں بھی خوب جانتا ہے۔'' (الزمر: 7)

یہ بات تو یقینی ہے کہ ہر انسان کو کچھ نہ کچھ اختیار، کچھ مرضی اور کچھ Free-Will دی گئی ہے۔ Free-Will کا انکار کر کے انسان کو مجبورِ محض بتانے والے ہر شخص نے تو یقیناً اللہ کے کلام کے خلاف بات کی ہے، مگر اس Free-Will کی نوعیت اور ماہیت کیا ہے؟

ہمیں کم اختیار دیا گیا ہے یا زیادہ؟ ہماری زندگی کی کون سی چیزوں میں ہمیں اختیار حاصل ہے اور کون کون سی چیزیں ہم پر جبر ہیں؟

ان تمام چیزوں کا علم نہ تو ہمیں دیا گیا ہے اور نہ ہی کبھی ہم جان سکیں گے۔ البتہ یہاں ایک چھوٹی سی غلط فہمی یہ بھی پیدا ہوسکتی ہے کہ چونکہ ہر چیز خدا کی اس کتاب، لوحِ محفوظ میں پہلے سے ہی لکھی ہوئی موجود ہے تو اس وجہ سے ہم انسانوں میں Free-Will موجود نہیں ہے۔ یہ بھی سراسر ایک غلط بات ہے۔ خدا کا علمِ کامل اور ہماری Free-Will دونوں بیک وقت موجود ہو سکتے ہیں۔

میری زندگی کا ہر ہر لمحہ، میرا ہر ہر عمل اور میری ہر ہر سوچ اس کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے اللہ کی اس کتاب میں لکھی ہوئی موجود ہے، لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ میرے اندر اپنے ارادے کا اختیار موجود نہیں ہے اور میں وہ کام کر رہا ہوں جو میری پیدائش سے بھی بہت پہلے لکھے جا چکے تھے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جو کام بھی میں نے کرنا تھے، وہ تمام کام مکمل تفصیل کے ساتھ شروع سے ہی اللہ کے علم میں موجود تھے۔

اس کائنات کے ذرے ذرے کی تفصیل کا اللہ کی اس کتاب میں پہلے سے لکھا ہونا ہم انسانوں کے لیے اللہ کا علمِ کامل ہے نہ کہ جبر۔

Its pre-knowledge not pre-destination....

خدا کو ہمارے مستقبل میں کیے جانے والے فیصلوں کے بارے میں علمِ کامل کس طرح سے حاصل ہے؟ یہ بات تو یقیناً اللہ ہی بہتر جان سکتا ہے۔ وہ خالق ہے، وہ مالک ہے۔ ہر چیز اس کے قبضہ قدرت میں ہے۔ البتہ خدا کے ہی دیے گئے علم کی بدولت آج ہم اس قابل ہو چکے ہیں کہ خدا کے اس علمِ کامل کے بارے میں کچھ تھوڑا بہت جان سکیں۔

خدا کو ہر چیز کا مکمل علم حاصل ہے اور اس علمِ کامل کا ایک ممکن طریقہ ''وقت'' بھی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے کہ وقت میں ماضی، حال اور مستقبل کی کوئی بھی حقیقی تقسیم نہیں ہے۔ یہ تینوں وقت، ہر وقت موجود ہوتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم بس ہم انسانوں کے لیے ہے۔ وقت کے غلام ہم ہیں، جبکہ اللہ تو ہر چیز کی طرح اس وقت کا بھی خالق ہے۔

یہ ماضی، حال اور مستقبل کی تقسیم اس اللہ کے لیے تھوڑی نہ ہوگی۔ (معاذ اللہ)

خدا کے لیے اس کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل؛ تینوں وقت ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ تمام زمان و مکاں (Time & Space) ہر آن، ہر لحظہ خدا کے سامنے ہے۔

اس لیے خدا کے علمِ کامل کے ساتھ ساتھ ہماری Free-Will بھی موجود ہوسکتی ہے، بالکل موجود ہوسکتی ہے۔

Free-Will کے بارے میں قرآنِ حکیم کی ایک اور آیتِ مبارکہ سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہم انسان مکمل طور پر آزاد بھی نہیں ہیں۔ بہت ساری چیزیں ہم پر جبر بھی ہیں۔ ہر انسان کے لیے بہت ساری چیزیں Given اور Fixed بھی ہوتی ہیں۔

''فرما دیجیے! ہر کوئی (اپنے) اپنے طریقہ اور فطرت پر عمل پیرا ہے اور آپ کا رب خوب جانتا ہے کہ سب سے زیادہ سیدھی راہ پر کون ہے۔'' (الاسراء:84)

ہر انسان کے جسمانی وجود کے ساتھ بہت ساری چیزیں Given اور Fixed ہوتی ہیں۔ [1]

ایک انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی بہت سی چیزوں کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ رنگ، نسل، ذہانت، شکل و صورت اور جانے کیا کیا۔۔۔

ان تمام چیزوں کو ملا کر ہم جنیاتی عوامل (Genetic Factors) کہہ سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح سے ہر بچے کے لیے اس کی زندگی کا ابتدائی ماحول بھی Given اور Fixed ہوتا ہے اور اس ابتدائی ماحول کے اثرات بھی پھر ساری زندگی انسان کے ساتھ ساتھ ہی رہتے ہیں۔ یہ ماحولیاتی عوامل (Environmental Factors) بھی ہر انسان کی پسند اور اختیار پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ان دو قسم کے عوامل کے سوا بھی بہت سارے ایسے عوامل ہو سکتے ہیں، جو ایک انسان کی

---

[1] Free-Will کے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کے لیے سورۃ الاسراء، آیت نمبر 84 کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔
تفسیر بیان القرآن از ڈاکٹر اسرار احمد

شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہوں، لیکن ہمیں ایسے عوامل کا علم نہ دیا گیا ہو۔

مختصر یہ کہ ہر انسان کے لیے بہت ساری چیزیں Fixed اور Given ہوتی ہیں، لیکن ان تمام مہیا کردہ چیزوں کے ساتھ ساتھ ہر انسان میں Free-Will بھی موجود رہتی ہے۔

ایک انسان کو اپنی زندگی میں کتنا اختیار حاصل ہے اور کتنی چیزیں اس پر جبر ہیں؟

یہ بات ہم نہیں جان سکتے ہیں۔

ایک شخص نے کون سا عمل اپنی مرضی سے کیا اور کون سا عمل اپنے حالات سے مجبور ہو کر؟

یہ بات ہم نہیں جان سکتے ہیں۔ اپنی کم علمی کے اعتراف میں ہی عافیت ہے۔ اپنی عقل کی حدود کو پہچان لینا ہی سب سے بڑی عقل مندی ہے۔ [1]

میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ میری زندگی میں موجود ہر اچھی چیز، میرا ہر اچھا عمل خدا کی توفیق سے ہے۔ میری زندگی میں موجود تمام خوشیاں اس کی رحمت کے سبب ہیں، جبکہ اپنے ہر بُرے عمل اور اپنی ہر بُری سوچ کے لیے۔۔۔

میں ذمہ دار ہوں۔

اپنے ہر گھٹیا پن اور اپنی ہر رذالت کے لیے۔۔۔

''میں گناہ گار ہوں''

---

[1] صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ (ایک دن) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری طرف نکلے، اس وقت ہم سب تقدیر (Free Will) کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کر رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غصہ ہو گئے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ سرخ ہو گیا اور ایسا نظر آنے لگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گالوں پر انار کے دانے نچوڑ دیے گئے ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا تمہیں اسی کا حکم دیا گیا ہے؟ یا میں اسی واسطے تمہاری طرف نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں؟ بے شک تم سے پہلی امتیں ہلاک ہو گئیں، جب انہوں نے اس مسئلہ میں بحث ومباحثہ کیا۔ میں تمہیں قسم دلاتا ہوں کہ اس مسئلہ میں بحث و مباحثہ نہ کرو۔'' (ترمذی:2133)

باب:5

دھوکے پہ دھوکا

میں انسان ہوں۔
ایک میرا جسم ہے اور ایک میری روح۔ میرا حقیقی وجود میرا روحانی وجود ہے۔
اگر میں روح ہوں تو پھر میرے اس جسم کی حقیقت کیا ہے؟۔۔۔۔۔محض ایک دھوکا؟
لیکن مجھے جسم کا یہ دھوکا کیوں دیا جا رہا ہے؟
میں اگر روح ہوں تو مجھے خود مجھ سے ہی اتنا چھپایا کیوں جا رہا ہے؟
میں اپنے جسم کے خدوخال جانتا ہوں، پہچانتا ہوں مگر میری روح کیسی دِکھتی ہوگی؟
میرے حقیقی روحانی وجود کی ساخت کیا ہے؟

مجھے تو ان باتوں کا کوئی خام سا اندازہ بھی نہیں ہے۔ یہ مجھ سے خود میرے ہی بارے میں اتنی راز داری کیوں برتی جا رہی ہے؟ وہ کیا چیز ہے جو مجھ سے چھپائی جا رہی ہے؟

مجھے بہترین ساخت پر پیدا کیا گیا تھا، مگر پھر مجھے پستی میں پھینک دیا گیا۔۔۔مگر کیوں؟
یہ کائنات میری ہے۔اس کائنات میں موجود ہر جاندار اور بے جان چیز کو میرے لیے مسخر کیا گیا ہے۔
کائنات کے ہر ذرّے کو میرے لیے تخلیق کر کے۔۔۔خود مجھے ایک نقطے کا قیدی کیوں بنا دیا گیا ہے؟

حضرتِ انسان کو سب فرشتوں سے سجدہ کروایا گیا تھا، لیکن میں کیسا مسجودِ ملائک ہوں کہ ان فرشتوں کو دیکھنے یا محسوس کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوں۔

میرے اندر لامحدود خواہشات کو زندگی دے کر مجھے چھوٹی چھوٹی ضروریاتِ زندگی کے لیے بھگایا کیوں جا رہا ہے؟۔۔۔۔۔ترسایا کیوں جا رہا ہے؟ اور۔۔۔

اور یہ جسم۔۔۔۔۔کیا میرا جسم ہے؟

میں تو اپنے جسم میں اپنی مرضی سے کوئی تبدیلی بھی نہیں کر سکتا۔ میرا یہ جسم تو خود میرے ہی خلاف بغاوتیں کرتا رہتا ہے۔ یہ جسم، میرا جسم ہے؟۔۔۔۔۔یا پھر میں اس جسم کا قیدی ہوں؟

اس بیماریوں اور تکالیف میں گھرے ہوئے جسم کو میرا مسکن کیوں بنا دیا گیا ہے؟

اس کائنات کی وسعتوں سے میں لاعلم ہوں۔ایک ذرّے میں موجود دنیا کو دیکھنا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔ نہ تو میں خود کو دیکھ سکتا ہوں اور نہ ہی فرشتوں کو۔کیا میں۔۔۔

کیا میں اشرف المخلوقات ہوں؟ مسجودِ ملائک انسان اس قدر مجبور اور لاچار کیوں ہے؟

شاید انسان کی بے بسی کی یہ داستان بس یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ یہ تمام چیزیں تو وہ ہیں کہ جن میں پوری نوعِ انسانی ایک ہی صف میں کھڑی ہے۔

پوری انسانیت میں کامل مساوات ہے،لیکن اس کامل مساوات کے ساتھ ساتھ دنیا میں بہت سا فرق وتفاوت بھی تو موجود ہے۔اگر کچھ چارلی دنیا کی رنگین فضاؤں میں تیر رہے ہیں تو بہت سے چندو بھی تو اسی زمین پر بستے ہیں۔ بہت سارے لوگ ایسے بھی تو ہیں جو کچرے کے ڈھیروں پر سانس لے رہے ہیں، اپنی پوری زندگی اسی غلاظت میں بسر کر دیتے ہیں۔گندگی کے ڈھیروں پر سے اپنی خواہشات اور خوشیوں کو چنتے بچے۔۔۔۔۔ یہ بچے بھی تو آخر انسانوں کے بچے ہیں۔

کرتے ہوں گے چند امیرزادے نائٹ کلب میں جا کر پارٹی۔۔۔۔۔بھوک وافلاس سے تنگ آ کر خودکشی بھی تو اسی زمین پر بسنے والے انسان ہی کرتے ہیں۔

سجتی ہوں گی شراب وشباب کی، رنگ وسرور کی محفلیں ان بڑے بڑے ہوٹلوں میں۔۔۔

دسمبر کے جاڑے میں کھلے آسمان تلے، سڑک کنارے سونے والے لوگ۔۔۔

یہ لوگ بھی تو انسان ہی ہیں۔

امیر غریب، گورے کالے، بیمار تندرست، امریکن انڈین۔۔۔

آخر ایک ہی خالق کی مخلوق میں اتنے سارے فرق وتفاوت کیسے موجود ہیں؟ کیوں موجود ہیں؟

اور بات شاید ادھر بھی ختم نہیں ہو جاتی۔۔۔

مجھے اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت عطا کر کے، مجھے اچھائی اور برائی میں سے ایک کا انتخاب کر لینے کا اختیار کیوں دیا گیا ہے؟ میرے اندر موجود اخلاقی حِس کا مقصد کیا ہے؟

''قسم ہے سورج کی اور اس کی پھیلی ہوئی دھوپ کی اور چاند کی جب وہ سورج کے پیچھے پیچھے آتا ہے اور دن کی جب وہ سورج کا جلوہ دکھائے اور رات کی جب وہ اس پر چھا کر اسے چھپا لے اور قسم ہے آسمان کی اور اس کی جس نے اسے بنایا اور زمین کی اور اس کی جس نے اسے بچھایا اور انسانی

جان کی اور اس کی جس نے اسے سنوارا۔ پھر اس کے دل میں وہ بات بھی
ڈال دی کہ جو اس کے لیے بدکاری ہے اور وہ بھی جو اس کے لیے پرہیز
گاری ہے۔ فلاح اسے ملے گی جو اس نفس کو پاکیزہ بنائے گا اور نامراد وہ ہو
گا جو اس کو (گناہ میں) دھنسا دے۔'' (الشمّس:10-1)

گیارہ، پوری گیارہ (11) قسمیں اٹھائی گئی ہیں قرآنِ حکیم کے اس مقام پر اور میرے محدود مطالعہ کی حد تک قرآنِ حکیم میں کسی بھی اور مقام پر ایک ساتھ گیارہ (11) قسمیں نہیں اٹھائی گئی ہیں۔ تاکید کی انتہا ہے یہ۔

تین بار تو خدائے بزرگ و برتر نے اپنی ہی ذات کو گواہ بنایا ہے۔۔۔۔۔ زمین، سورج، چاند، تمام کائنات کو گواہ بنایا گیا ہے۔۔۔۔۔ دن اور رات کو گواہ بنایا گیا ہے۔۔۔۔۔ سارے کا سارا زمان و مکاں گواہی دے رہا ہے۔۔۔۔ اور پھر خود انسان بھی اس بات پر گواہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاقی حِس خدا کی جانب سے الہام کی گئی ہے۔ ہر انسان کو اس کی اچھائی اور برائی کا شعور دے دیا گیا ہے۔ ہر انسان کو معلوم ہے کہ کیا چیز اس کے لیے گناہ ہے اور کیا چیز نیکی اور اس سب کے ساتھ ساتھ انسان کو اپنی مرضی کا راستہ چُن لینے کا اختیار بھی دے دیا گیا ہے۔ جو انسان چاہے اچھائی کا راستہ اختیار کرلے اور جو چاہے برائی کے راستے پر گامزن ہو جائے، مگر۔۔۔۔۔ مگر کامیاب وہی ہوگا جو اچھائی کے راستے پر چلے گا۔ برائی کے راستے پر چلنے والوں کے حصے میں ناکامی ہی آئے گی۔

یہ خدا کا وعدہ ہے، اعلان ہے اور وہ بھی پوری گیارہ (11) قسمیں اٹھانے کے بعد۔

یہ بات محض پتھر پر لکیر نہیں ہے، بلکہ اس کائنات کے ہر ہر ذرّے پر یہ بات لکھی جا چکی ہے کہ اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوگا اور برائی کا بدلہ برائی۔ یہی اصول ہے اور یہی قاعدہ ہے۔

لیکن۔۔۔ لیکن اگر ہم اس دنیا میں دیکھیں تو حالات ہمیں اس کے برعکس نظر نہیں آتے؟

اس دنیا میں اچھائی کا بدلہ اچھائی ہو، یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے اور پھر برائی کا بدلہ بھی تو برائی ملتا ہوا نظر نہیں آرہا، بلکہ بہت سارے حالات میں تو نیکی کرنے والا مشکل میں پھنس جاتا ہے، جبکہ برائی کرنے والے عیاشی کرتے نظر آتے ہیں۔

اگر کوئی انسان ذرا سا جھوٹ بول کر ایک اچھی بزنس ڈیل حاصل کرسکتا ہے، تب بھی انسان کو جھوٹ نہیں بولنا چاہیے، کیونکہ جھوٹ بولنا ایک بُری چیز ہے اور جھوٹ کا بُرا ہونا خدا کی جانب سے ہر انسان کو الہام کر دیا گیا ہے، مگر جو شخص جھوٹ بول رہا ہے، اسے فائدہ ہو رہا ہے۔ جو شخص سچ بول رہا ہے،

اسے نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔ پھر بات محض ایک جھوٹ پر ہی تو ختم نہیں ہو جاتی۔ رشوت دینے والوں کی فائل نکل رہی ہے، جبکہ ایماندار انسان کا کام ویسے کا ویسے ہی رکا پڑا ہے۔

غنڈہ گردی، چوری، راہزنی، سود، بدمعاشی، قتل و غارت۔۔۔

کون سا ایسا بُرا کام ہے کہ جو اس زمین پر اور زمین کی ہر ہر بستی میں نہیں ہو رہا؟

ہر حرام خوری ہو رہی ہے اس زمین پر اور کھلے عام ہو رہی ہے۔ ڈنکے کی چوٹ پر ہو رہی ہے۔ یہ سارے بُرے کام کرنے والوں کو تو کچھ بھی نہیں ہو رہا۔ سب ہٹے کٹے ہیں اور سب تندرست ہیں۔

''جس کی لاٹھی اس کی بھینس''

اس زمین پر تو بس یہی قانون لاگو ہے۔ شرافت کو کمزوری کی علامت سمجھا جاتا ہے، بدمعاشی کے ساتھ عزت خریدی جا رہی ہے۔ آخر خدائے بزرگ و برتر کی اس زمین پر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟

خالق کی بنائی ہوئی یہ تمام کائنات تو توازن میں اپنی مثال آپ ہے۔ پھر اس چھوٹی سی زمین پر اتنا عدمِ توازن کیوں پایا جاتا ہے؟ کائنات کے ہر ہر ذرّے سے باخبر ہستی۔۔۔

کیا خدا زمین پر ہونے والے اعمال سے بے خبر ہے؟ اور اگر وہ باخبر ہے، جو کہ ہے اور آج سے نہیں، بلکہ کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے باخبر ہے تو پھر۔۔۔۔۔ اس زمین پر اچھائی کا بدلہ اچھائی اور برائی کا بدلہ برائی ملتا ہوا دکھائی کیوں نہیں دیتا ہے؟

اس باب کے آغاز سے اب تک اٹھائے گئے میرے درجنوں سوالوں کے جواب میں اللہ مسکرا کر بس ایک ہی بات کہتا ہے۔۔۔

''عبداللہ! یہ زندگی امتحان ہے۔''

> ''اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ (6) دن میں بنایا ہے۔ (اس وقت) اس کا عرش پانی پر تھا۔ (تمھارے پیدا کرنے کا) مقصد یہ ہے کہ وہ تمھیں آزمائے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے کون بہتر ہے اور اگر تم کہو کہ تم لوگ مرنے کے بعد اٹھائے جاؤ گے تو کافر کہہ دیں گے یہ تو کھلا جادو ہے۔'' (ہود: 7)
>
> ''جو چیز زمین میں ہے، ہم نے اس کو زمین کے لیے آرائش بنایا ہے، تا کہ لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں سے کون اچھے عمل کرنے والا ہے اور جو چیز زمین پر ہے ہم اس کو بنجر میدان کر دیں گے۔'' (الکہف: 7-8)

''اسی نے موت اور زندگی کو پیدا کیا، تا کہ تمھاری آزمائش کرے کہ تم میں کون
اچھے عمل کرتا ہے اور وہ زبردست (اور) بخشنے والا ہے۔'' (الملک:2)

یہ زندگی، زندگی نہیں ہے۔ ہماری حقیقی زندگی کا آغاز تو ابھی ہونا ہے۔

ہماری یہ زندگی ایک امتحان ہے۔ میری اور آپ کی اس زندگی کا مقصد آزمائش کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس جسم کی پیدائش کا مقصد آزمائش ہے۔ بے شمار حقائق ایسے ہیں، جو مجھ سے چھپائے جا رہے ہیں۔ نہ میں خود کو دیکھ سکتا ہوں اور نہ ہی فرشتوں کو۔ مجھے اندھیرے میں رکھ کر، مجھ سے بہت ساری باتوں کو چھپا کر مجھے آزمایا جا رہا ہے۔ اللہ نے خود کو میری نگاہوں سے چھپا لیا ہے۔ ایسے جیسے وہ کہیں پر بھی موجود نہ ہو۔ مجھے اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی عطا کی گئی ہے اور اچھائی یا برائی میں سے کوئی بھی راستہ چُن لینے کا اختیار بھی دیا گیا ہے۔ مقصد آزمائش ہے۔ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ اس کی بظاہر غیر موجودگی میں وہ کون ہے جو اچھے کام کرتا ہے؟ اور وہ کون ہے جو بُرے کام کرتا ہے؟

مجھے بہترین ساخت پر پیدا کر کے بہت نیچے پھینک دینے کا مقصد امتحان ہے۔ مجھے اس زمین پر، اس جسم میں قید رکھنے کا مقصد آزمائش ہے۔ میری خواہشات میرے امتحان کا ایک حصہ ہیں۔ مجھے خود مجھ سے ہی چھپا کر آزمایا جا رہا ہے، پرکھا جا رہا ہے۔

یہ زندگی ایک امتحان ہے اور اس امتحان میں اچھائی کا بدلہ اچھائی ہو گا اور برائی کا بدلہ برائی ہی ملے گا، مگر اس زندگی میں نہیں۔ امتحان کے دوران ہی کسی امیدوار کو پرچہ حل نہ کرنے پر سزا نہیں دی جاتی، بشرطیکہ وہ کمرۂ امتحان کا ماحول خراب نہ کر رہا ہو۔ نتائج کا اعلان تو امتحان کے بعد کیا جاتا ہے۔

ہماری اس زندگی میں بھی یہ لازم نہیں ہے کہ اچھائی کا بدلہ اچھائی ہو اور برائی کا بدلہ برائی۔ اس زندگی میں جس کا جو جی چاہے کر سکتا ہے۔ ہر انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اپنا پرچہ اچھے سے حل کرے یا پھر کھیل کود میں مصروف ہو جائے۔ دورانِ امتحان ہی سزا و جزا نہ ہو گی۔ زندگی کے اس امتحان کے نتائج کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔ سزا و جزا کے لیے الگ سے ایک روز مقرر ہو چکا ہے، جو ذرا بھی آگے پیچھے نہیں ہو گا اور اس امتحان کے دوران انسانوں کو چھوٹ دینے میں بھی حکمت ہے، رحمت ہے، شفقت ہے۔

''اور اگر اللہ لوگوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے (فوراً) اپنی پکڑ میں لیتا تو
روئے زمین پر کوئی جاندار باقی نہ چھوڑتا، لیکن وہ ان کو ایک معین وقت
تک مہلت دیتا ہے۔ پھر جب ان کا وہ معین وقت آ جائے گا تو وہ گھڑی
بھر بھی اس سے آگے پیچھے نہیں ہو سکیں گے۔'' (النحل:61)

''اور اگر اللہ لوگوں کے ہر کرتوت پر ان کی پکڑ کرنے لگتا تو اس زمین کی پشت پر کسی چلنے والے کو نہ چھوڑتا، لیکن وہ ایک معین مدت تک کے لیے ان کو مہلت دے رہا ہے۔ پھر جب ان کا مقررہ وقت آ جائے گا تو اللہ اپنے بندوں کو خود دیکھ لے گا۔'' (الفاطر:45)

''کہہ دو کہ جو شخص گمراہی میں پڑا ہوا ہے، اللہ اس کو آہستہ آہستہ مہلت دیے جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب اس چیز کو دیکھ لیں گے، جن کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔خواہ عذاب اور خواہ قیامت تو (اس وقت) جان لیں گے کہ مکان کس کا بُرا اور لشکر کس کا کمزور۔'' (مریم:75)

اس زندگی میں مہلت دی جاتی ہے۔ ڈھیل دی جاتی ہے۔ اپنی غلطیوں سے سیکھنے کا موقع دیا جاتا ہے۔نتائج کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

یہ زندگی ایک امتحان ہے، لیکن یہ کیسی عجیب بات ہے کہ ہم امتحان دے رہے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم امتحان دے رہے ہیں۔ نہ کوئی خاص کمرۂ امتحان والا ماحول نظر آ رہا ہے اور نہ ہی کوئی کرخت چہرے مہرے والا نگران۔ امتحان سے ایک رات پہلے والی گھبراہٹ بھی تو نہیں ہے اور نہ ہی نتیجے والے دن کے انتظار میں دن گنے جا رہے ہیں۔ آخر یہ امتحان، کیسا امتحان ہے؟

پھر امتحان تو عموماً چند گھنٹوں کا ہوتا ہے یا پھر زیادہ سے زیادہ کچھ دنوں کا۔ ہمارا یہ ساٹھ ستر سال پر مشتمل اتنا لمبا امتحان کیوں لیا جا رہا ہے؟

یہ امتحان کس قسم کا امتحان ہے؟ اس امتحان کی نوعیت اور ماہیت کیا ہے؟

''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔'' (آلِ عمران:185)

یہ زندگی ایک امتحان ہے اور یہ امتحان دھوکے کا امتحان ہے۔

یہ زندگی دھوکے کی زندگی ہے۔ اس زندگی میں ہر چیز کا ظاہر کچھ اور ہے تو باطن کچھ اور۔ زندگی کے ہر موڑ پر، زندگی کے ہر لمحے میں ایک نیا دھوکا موجود ہے۔

ہر انسان کو دھوکا دیا جا رہا ہے۔ دھوکے پہ دھوکا دیا جا رہا ہے۔

ہماری اس دنیا میں ایک اچھا اور عمدہ امتحان اسی کو تصور کیا جاتا ہے، جس میں امتحان دینے والے کو پتہ بھی نہ چلے اور اسے ہر طرح سے جانچ بھی لیا جائے۔ اس زمین پر بہت سے اداروں کی جانب سے ایسے امتحان بھی لیے جاتے ہیں کہ جہاں امیدواروں کو چند دنوں کے لیے اپنا مہمان بنا لیا جاتا ہے۔ پھر

ان کے شب و روز کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ کچھ خاص قسم کا ماحول تیار کیا جاتا ہے اور امیدواروں کو پہلے سے ترتیب دیے گئے حالات میں سے گزارا جاتا ہے۔ امتحان دینے والوں کو بتائے بِنا ہی ان پر گہری نگاہ بھی رکھی جاتی ہے۔ امیدواروں کی جسمانی قوتوں کو تولا جاتا ہے، ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی تغیرات کو ماپا جاتا ہے۔ امیدواروں کے ماضی کے حالات و واقعات کی اگر جانچ پرکھ کی جاتی ہے تو مستقبل کے لیے موجود ارادوں اور امنگوں کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ امتحان دینے والے کو معلوم نہیں ہوتا، لیکن۔۔۔

امتحان ختم ہونے سے پہلے پہلے وہ ہر طرح سے جانچا اور پرکھا جا چکا ہوتا ہے۔

اگر زمین پر موجود انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی اس قدر مفصّل اور کڑی آزمائش کر سکتے ہیں تو وہ خدائے بزرگ و برتر تو حکمت والا ہے۔ وہ زبردست ہے اور طاقت والا بھی ہے۔

اگر خدا بار بار۔۔۔۔ بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ اس زندگی کا مقصد صرف آزمائش ہے تو پھر جان لیجیے کہ اس امتحان کے دوران ہمیں کس کس پہلو سے کیسے کیسے جانچا اور پرکھا جا رہا ہے؟

اس بات کا حقیقی علم ہمیں اسی زندگی میں تو کبھی نہ ہو پائے گا۔

البتہ امتحان کی نوعیت اور ماہیت سے ہمیں بالکل لاعلم بھی نہیں رکھا گیا۔ قرآنِ حکیم میں کہیں واشگاف الفاظ میں تو کہیں بین السطور اس امتحان کے بارے میں ہمیں بہت ساری باتیں بتادی گئی ہیں۔

بنیادی طور پر یہ امتحان دھوکے کا امتحان ہے۔ یہ امتحان ''میں'' دے رہا ہوں اور میں روح ہوں۔

یہ امتحان میرے روحانی وجود نے دینا ہے۔ میری روح نے اس امتحان کی گتھیاں سلجھانی ہیں۔

یہ زمین، ستارے اور 93 ارب نوری سالوں پر محیط ہماری یہ قابلِ مشاہدہ کائنات، یہ سب ہمارا امتحان ہے۔ یہ کائنات ایک بہت بڑا سٹیج ہے، جو محض ہم انسانوں کو پرکھنے کے لیے سجایا گیا ہے۔

اس کائنات میں بڑی حکمت اور بڑی رازداری کے ساتھ بے شمار نشانیاں بھی رکھ دی گئی ہیں۔ حقائق کے بارے میں بہت سارے Hint اور Clue ہمیں دے دیے گئے ہیں۔ اگر کوئی انسان اپنی منزل پر پہنچنا چاہے تو اس کائنات میں جگہ جگہ راستوں کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ یہ تمام کائنات ایک کمرۂ امتحان ہے اور جیسے ہی سب امیدوار امتحان سے فارغ ہو جائیں گے تو اس کمرۂ امتحان کو ختم کر دیا جائے گا۔

''جس دن ہم (ساری) سماوی کائنات کو اس طرح لپیٹ دیں گے جیسے لکھے ہوئے کاغذات کو لپیٹ دیا جاتا ہے۔ جس طرح ہم نے (کائنات کو) پہلی بار پیدا کیا تھا۔ ہم (اس کے ختم ہو جانے کے بعد) اسی عملِ تخلیق کو دہرائیں گے۔ یہ وعدہ پورا کرنا ہم نے لازم کر لیا ہے۔ ہم (یہ اعادہ) ضرور کرنے والے ہیں۔'' (الانبیاء: 104)

یہ کمرۂ امتحان تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ اس کمرۂ امتحان کی تیاری کے بعد ہر انسان کے لیے اس کا انفرادی سوال نامہ تیار کیا جاتا ہے۔ ہر انسان کے لیے خاص طور پر تیار کیے جانے والا یہ پرچہ بس اسی ایک انسان کے لیے ہی ہوتا ہے۔ ہر انسان کا یہ انفرادی پرچہ دوسرے سبھی انسانوں کے لیے تیار کیے گئے پرچوں سے مختلف ہوتا ہے۔ بنیادی سوالات تو ہر انسان کے لیے یکساں ہی رہتے ہیں، مگر ہر انسان کے لیے ان سوالات کی ترتیب بدل دی جاتی ہے۔ایک انسان سے دوسرے انسان تک دھوکا بدل جاتا ہے۔ دھوکا دینے کا انداز بدل دیا جاتا ہے۔ ہر انسان کے لیے خاص طور پر تیار کیے جانے والے اس انفرادی سوال نامے کو ہم۔۔۔

جسم کہتے ہیں۔

دھوکا دہی کے اس امتحان میں سب سے پہلا اور بنیادی دھوکا ہمارا جسمانی وجود ہے۔ ہر انسان کی روح کو اس جسم کی آڑ میں، اس جسم کے پیچھے کہیں چھپا دیا جاتا ہے۔جسم کے دھوکے سے باہر نکل کر خود کو پہچان لینا ایک بہت اہم سوال ہے۔ انسانوں کی اکثریت جسم کے دھوکے میں مبتلا ہو کر اس جسم کو ہی انسان سمجھنا شروع کر دیتی ہے، حالانکہ ہمارا یہ جسم تو ہماری روح کے لیے امتحان ہے، ذریعۂ امتحان ہے۔ جسم کے ذریعے روح کو آزمایا جاتا ہے اور جسم کے ذریعے ہی روح نے پرچہ حل کرنا ہے۔

ہر جسم کو ایک خاص قسم کے جینز اور ماحول ملتا ہے، جس کے سبب اس جسم کے اندر بسنے والی روح کے لیے انفرادی پرچہ تیار ہو جاتا ہے۔انسانی جسم جب رحمِ مادر میں حمل کی صورت میں چار ماہ کا ہو جاتا ہے تو اس وقت فرشتے آ کر روح کو اس جسم کے ساتھ منسلک کر جاتے ہیں اور اب امتحان ختم ہونے تک روح نے اس خاص جسم میں ہی رہنا ہے۔امتحان کے دوران روح کی اپنی انفرادی اور خود مختار حیثیت معطل رہے گی۔اب روح کا مادی دنیا سے رابطے کا ذریعہ یہ جسم ہوگا۔اب روح جسم کے ذریعے ہی چیزوں کو دیکھے گی، سنے گی، محسوس کرے گی۔اب جسم کی موت تک یہ روح جسم کی قید میں ہے۔

ہر روح اپنے لیے خاص طور پر تیار کیے گئے جسم کی پیدائش کی صورت میں کمرۂ امتحان میں داخل ہوتی ہے اور جسم کی موت کی شکل میں کمرہ امتحان سے باہر چلی جاتی ہے۔ امتحان کے دوران انسان کو یہی باور کروایا جاتا ہے کہ یہ جسم ہی انسان ہے۔جسم کی پیدائش ہی انسان کی ابتداء ہے اور جسم کی موت ہی انسان کا خاتمہ۔۔۔۔۔مگر یہ سب ایک دھوکا ہے۔

انسان اس جسم کی پیدائش سے بہت پہلے سے موجود ہے۔ نہ تو جسم کی پیدائش انسانی زندگی کی ابتداء ہے اور نہ ہی جسم کی موت انسان کا خاتمہ ہے۔جسم کی موت کی صورت میں تو روح کمرۂ امتحان سے

باہر نکل جاتی ہے۔جسم کی موت کمرۂ امتحان سے باہر نکلنے کا واحد راستہ ہے۔البتہ نیند کی صورت میں بھی عارضی طور پر روح کمرۂ امتحان سے باہر جاسکتی ہے، مگر نیند کے دوران بھی روح کی اپنی انفرادی اور خود مختار حیثیت بحال نہیں ہوتی ہے۔ یہ کام بس موت کے بعد ہی ممکن ہے۔

''اور وہی ہے جو رات کو (سونے کی حالت میں) تمھاری روح قبض کر لیتا ہے اور جو کچھ تم دن میں کرتے ہو، اس سے خبر رکھتا ہے۔ پھر تمھیں دن میں اٹھا دیتا ہے، تاکہ (یہی سلسلہ جاری رکھ کر زندگی کی) معین مدت پوری کر دی جائے۔ پھر تم (سب) کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔(اس روز) وہ تمھیں تمھارے اعمال جو تم کیا کرتے ہو، بتائے گا اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے اور تم پر نگہبان مقرر کیے رکھتا ہے۔ یہاں تک کہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرشتے اس کی روح قبض کر لیتے ہیں اور وہ کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے۔'' (الانعام:61-60)

روح اپنے لیے مخصوص کیے گئے جسم کی پیدائش کی صورت میں کمرۂ امتحان میں داخل ہوتی ہے اور جسم کی موت کی صورت میں باہر چلی جاتی ہے۔جسم کی پیدائش سے جسم کی موت تک کے وقت میں، روح کو اپنے مخصوص جسم میں رہتے ہوئے اپنی کارکردگی دکھانی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب مومن کی موت آنے لگتی ہے تو رحمت کے فرشتے سفید ریشمی کپڑا لے کر اس کے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں: اے مومن روح! نکل آ، تُو اللہ سے راضی ، اللہ تعالیٰ تجھ سے راضی اور چل اللہ کی رحمت اور مہربانی کی طرف اور ایسے رب کے پاس جو تجھ پر قطعاً ناراض نہیں ہے۔تو وہ انتہائی خوشبودار، پاکیزہ کستوری جیسی مہک کے ساتھ نکل آتی ہے، حتیٰ کہ فرشتے (خوشی اور سرور سے) اسے ایک دوسرے کو پکڑاتے (ہاتھوں ہاتھ لیتے) ہیں اور اسی طرح اسے آسمان کے دروازے تک لے جاتے ہیں۔آسمان والے فرشتے کہتے ہیں: کس قدر خوشبودار ہے یہ روح جو تم زمین سے لائے ہو! پھر وہ اسے (پہلے سے فوت شدہ) مومنین کی روحوں کے پاس لے آتے ہیں۔اللہ کی قسم! وہ اس کے آنے پر اس قدر خوش ہوتے ہیں کہ تم اپنے کسی غائب شخص کے آنے پر اتنے

خوش نہیں ہوتے۔ پھر وہ (پہلے مومن) اس سے پوچھتے ہیں: فلاں کا کیا حال ہے؟ فلاں کا کیا حال ہے؟ پھر وہ (آپس میں) کہتے ہیں: چھوڑ واسے وہ تو دنیا کے غم وفکر میں تھا۔ جب وہ روح کہتی ہے کہ کیا وہ تمھارے پاس نہیں آیا؟ (یعنی وہ تو کب کا مر چکا ہے) تو وہ کہتے ہیں: اوہو! اسے اس کے جہنمی ٹھکانے کی جانب لے جایا گیا ہے۔ (اس کے مقابلے میں) جب کافر کو موت آتی ہے تو عذاب کے فرشتے گندا بدبودار ٹاٹ لے کر اس کے پاس آجاتے ہیں اور (غصے سے) کہتے ہیں: نکل ادھر، تُو بھی ناراض اور تیرا اللہ بھی تجھ سے ناراض۔ چل اللہ عزوجل کے عذاب کی طرف۔ تو وہ انتہائی بدبودار مردار لاش کے بھبوکے کے ساتھ نکلتی ہے، حتیٰ کے وہ اسے زمین کے دروازے پر لے جاتے ہیں اور کہتے ہیں: کس قدر بدبودار ہے یہ! حتیٰ کہ وہ اسے (پہلے سے مرے ہوئے) کافروں کی روحوں میں لے جاتے ہیں۔'' (نسائی:1834)

ہمارے دوست احباب، ہمارے عزیز واقارب جو ہم سے پہلے اس دنیا سے جا چکے ہیں، وہ سب ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔ بڑی شدت کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔

بالکل ایسے ہی جیسے اس دنیا کے امتحانوں میں بھی کمرۂ امتحان سے باہر نکل کر ہم اپنے دوستوں کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر پرچے میں پوچھے جانے والے سوالات پر بحث ہوتی ہے۔ اپنی اپنی کارکردگی کا جائزہ لینے کی کوشش کی جاتی ہے اور پھر کچھ سوال ایسے بھی تو ہوتے ہیں کہ جو کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر ہمیں یاد نہیں آرہے ہوتے، مگر کمرۂ امتحان سے باہر نکل کر سب کچھ یاد آجاتا ہے۔ پھر محسوس ہوتا ہے کہ یہ سوال ہی تو سب سے آسان تھے۔ کبھی افسوس کے ساتھ اپنے سر کو دائیں بائیں جھٹکا جاتا ہے تو کبھی کسی سوال کے غیر امکانی طور پر ٹھیک ہوجانے پر خوشی منائی جاتی ہے۔

کچھ ایسے ہی حالات، کچھ اسی قسم کی باتیں موت کے بعد ارواح بھی آپس میں کرتی ہوں گی۔

بنیادی طور پر موت ہر انسان کے لیے ایک بہت بڑا جھٹکا ثابت ہوتی ہوگی اور یہ جھٹکا ہر انسان کو لگنا ہی لگنا ہے۔ موت کے وقت محض ایک چھوٹے سے لمحے میں ہی اتنی بڑی تبدیلی آجاتی ہے کہ اس تبدیلی کو فوراً سے قبول کرنا شاید ہر روح کے لیے ایک دشوار مرحلہ ثابت ہوتا ہوگا۔

بالکل اچانک نگاہوں کے سامنے لاتعداد فرشتوں کا ظاہر ہو جانا، تمام مادی کائنات کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا اور پھر جسم میں سے روح کا نکل کر جانا، روح کی حقیقت کا پتہ چل جانا

اور جسم کی حقیقت کا عیاں ہو جانا؛ اسی ایک لمحے میں اس بات کا ادراک بھی ہو جائے گا کہ یہ زندگی تو زندگی تھی ہی نہیں، زندگی تو کچھ اور ہے۔۔۔

ان تمام چیزوں کو فوراً ہی قبول کر لینا یقیناً آسان نہیں ہوتا ہو گا۔

بہرحال یہ زندگی ایک امتحان ہے اور یہ کائنات ایک بہت بڑا کمرۂ امتحان۔

یہ امتحان دھوکے کا امتحان ہے اور اس امتحان میں پہلا دھوکا ہمارا یہ جسم ہے۔ ایک روح پر اس زندگی میں جتنی بھی چیزیں جبراً لاگو کی جاتی ہیں، اس تمام جبر کا ذریعہ انسانی جسم ہی ہے۔ بہت سے ایسے کام ہیں، جو اس جسم نے کرنے ہی کرنے ہیں۔ جسم کی شکل میں ایک بہت بڑا بوجھ ہے، جو روح کے ساتھ باندھ دیا گیا ہے۔ جسم کے تقاضوں کو پورا کرنا یقیناً کچھ آسان کام نہیں ہے۔ ایک انسان کی زندگی کا بیشتر وقت تو جسم کی ضروریات کو پورا کرنے میں ہی صرف ہو جاتا ہے اور یہی وہ تمام چیزیں ہیں، جن پر ایک انسان کی آزمائش کی جاتی ہے۔ ہر روح کو جسم میں قید کر کے بالکل منفرد قسم کے حالات میں سے گزارا جاتا ہے۔ مہیا کیے گئے حالات میں اپنی بہترین کارکردگی دکھانا ہی روح کا امتحان ہے۔

کسی روح کو اگر زیادہ ذہین جسم عطا کیا گیا ہے تو اس روح کے لیے جسم کی ذہانت امتحان ہے۔ اسی طرح سے کند ذہن کے لیے اس کی کند ذہنیت امتحان ہے۔ خوبصورتی اور بدصورتی دونوں کے ذریعے ایک انسان کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے۔ صحت اور بیماری دونوں میں آزمائش موجود ہے۔ کہیں دولت کے انبار لگا کر آزمایا جا رہا ہے تو کہیں چھوٹی چھوٹی ضروریات کے پیچھے دوڑا کر۔

عزت، ذلت، شہرت، دولت اور غربت۔۔۔۔۔ یہ تمام چیزیں دھوکا ہیں۔

نہ ہی اس دنیا کی عزت، عزت ہے اور نہ ہی یہاں کی ذلت میں رسوائی ہے۔

جس انسان نے بھی اس زندگی کو زندگی سمجھ لیا۔۔۔۔۔ دھوکا کھا گیا۔

جس شخص نے بھی اس جسم کو انسان سمجھ لیا۔۔۔۔۔ دھوکا کھا گیا۔

اور ہم اس زندگی سے دھوکا کھا چکے ہیں۔۔۔۔۔ ہم دھوکے پہ دھوکا کھا چکے ہیں۔

آج ہم انسانوں کی اکثریت بہتر معیارِ زندگی کے حصول کے لیے دوڑ رہی ہے۔ اس دھرتی پہ موجود ہر چندو، چارلی بننا چاہتا ہے۔ یہ جانے بنا ہی کہ چارلی پر کیا بیت رہی ہے۔ ہمیں انسانوں کے معیارِ زندگی میں جتنے بھی فرق و تفاوت نظر آتے ہیں، یہ سب امتحان کا ایک حصہ ہے۔ یہ سب ایک دھوکا ہے۔

''اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور
تم میں سے کچھ لوگوں کو دوسروں سے درجات میں بلندی عطا کی، تا کہ

اس نے تمھیں جو نعمتیں دی ہیں، ان میں تمہیں آزمائے۔ یہ حقیقت ہے
کہ تمھارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور یہ (بھی) حقیقت ہے کہ وہ بہت
بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔'' (الانعام:165)

''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور ہم تم لوگوں کو سختی اور آ
سودگی میں آزمائش کے طور پر مبتلا کرتے ہیں اور تم ہماری ہی
طرف لوٹ کر آ ؤ گے۔'' (الانبیاء:35)

''اور دیکھو! ہم تمہیں آزمائیں گے ضرور۔(کبھی) خوف سے اور (کبھی)
بھوک سے۔(کبھی) مال و جان اور پھلوں میں کمی کر کے اور جو لوگ (ایسے
حالات میں) صبر سے کام لیں، ان کو خوشخبری سنا دو۔'' (البقرۃ:155)

ہم میں سے بہت کم لوگ ہوں گے، جو اس زندگی کو ایک امتحان سمجھ کر اپنے شب و روز بسر کرتے ہوں گے۔ جو چند لوگ اس زندگی کو امتحان سمجھ بھی رہے ہوتے ہیں، ان لوگوں میں سے بھی اکثر میں یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ ہر چندو کا امتحان مشکل ہے اور ہر چارلی کا امتحان آسان۔

حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ چندو سے زیادہ ہمدردی کے لائق تو یہ چارلی لوگ ہیں۔ ہر چندو کا امتحان چارلی کے امتحان کی نسبت آسان ہے۔ اس زندگی میں اگر تکالیف، پریشانیاں اور مصائب ہوں، خواہشات پوری نہ ہو رہی ہوں تو یہ سب چیزیں انسان کو غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ انسان کو سوچنے سمجھنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ان حالات میں پھر انسان اس زندگی کو ایک امتحان سمجھ کر ہی گزارتا ہے۔ ایسے میں امتحان میں کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں، جبکہ دوسری جانب اگر چھوٹی چھوٹی خواہشات بھی ایک تسلسل کے ساتھ پوری ہوتی رہیں، زندگی میں کوئی خاص پریشانی یا الجھن موجود نہ ہو تو ان حالات میں اس بات کے امکانات بڑھ جاتے ہیں کہ ایسا شخص اس زندگی کو زندگی سمجھ بیٹھے گا اور۔۔۔

اور جس شخص نے بھی اس زندگی کو زندگی سمجھ لیا۔۔۔۔۔ مار کھا گیا، دھوکا کھا گیا۔

اس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ دھوکا دہی کے امتحان میں امیدواروں کے لیے کچھ نشستیں ائیر کنڈیشنڈ ماحول میں لگائی گئی ہیں، جبکہ بہت ساری نشستیں باہر جون جولائی کی چلملاتی دھوپ میں لگی ہوئی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اندر AC والے کمرے میں بیٹھ کر امتحان دے۔ باہر تیز دھوپ میں بیٹھنا ہر انسان کو ہی برا لگتا ہے، مگر اندر AC والے کمرے کا ماحول بڑا اسحر انگیز ہے۔ وہ بالکل سامنے ایک دیوار گیر سکرین پر آپ کی پسندیدہ فلم چل رہی ہے۔ آپ کے سب جگری دوست اسی

کمرے میں موجود ہیں۔نگران بھی تو جانے کہاں غائب ہے۔اس ACوالے کمرے کا ماحول کہیں سے بھی کمرۂ امتحان والا ماحول نہیں ہے۔

آپ کے پاس اپنا پرچہ حل کرنے کے لیے بس تین گھنٹے ہیں۔ان تین گھنٹوں میں یا تو آپ اپنا پرچہ حل کر سکتے ہیں اور یا پھر اپنے دوستوں کی کمپنی انجوائے کر سکتے ہیں،فلم دیکھ سکتے ہیں۔آپ بہت کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اپنے پرچے پرتوجہ مرکوز رکھ سکیں،مگر فلم کے مناظر بڑے دلنشین ہیں، بار بار آپ کی توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔دوستوں کی یاری بھی آپ کو اپنی جانب بلا رہی ہے۔ہر جانب شور شرابا ہے،ہنگامہ ہے۔کمرۂ امتحان میں ہی ایک پارٹی جاری ہے۔

ان سب چیزوں کی موجودگی میں آپ اپنے پرچے پرتوجہ مرکوز نہیں رکھ پاتے اور پھر کچھ دیر بعد آپ بھی اپنے پرچے کو بھول کر ماحول کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

ہماری یہ دنیا کی فلم بھی کم بخت کچھ ایسی ہی دل آویز ہے۔آج ہم انسان اس فلم اور پارٹی کے چکر میں پڑ کر یہ بات بھی بھول چکے ہیں کہ ہم کمرۂ امتحان میں موجود ہیں۔

ACوالے کمرے کے برعکس باہر دھوپ میں بیٹھ کر امتحان دینے والے شخص کو پسینہ آرہا ہے، پیاس بار بار تنگ کرتی ہے،نشست بھی کچھ آرام دہ محسوس نہیں ہو رہی اور نگران بھی ظالم بڑا سخت گیر ہے۔

ان تمام مسائل سے گھبرا کر دھوپ میں بیٹھے ہر شخص کا جی چاہتا ہے کہ وہ بھی اندر AC والے کمرے میں بیٹھ کر امتحان دے،مگر ACوالے کمرے کا دروازہ ہر کسی کے لیے نہیں کھلتا۔ہر وہ شخص جو اندر AC والے کمرے میں نہیں جا پاتا، پھر وہ اپنی قسمت کو کوستا ہے۔بار بار پسینہ صاف کرتا ہے۔ حالات کی تنگی کا رونا روتا ہے۔نشست پر بار بار پہلو بدلے جاتے ہیں۔

حالات سے مجبور ہو کر ہی سہی،مگر باہر دھوپ میں بیٹھے شخص کے لیے اس بات کے زیادہ امکانات موجود ہیں کہ وہ اپنے پرچے پر توجہ مرکوز کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور حقیقت یہ ہے کہ عملاً ACوالے کمرے میں بیٹھے لوگوں کی اکثریت امتحان میں ناکام ہو چکی ہے۔امتحان میں کامیاب ہو جانے والوں کی اکثریت ان لوگوں کی ہوگی،جو باہر دھوپ میں بیٹھ کر امتحان دے رہے ہیں۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کیا میں تمہیں بتلا نہ دوں کہ جہنم والے کون ہیں اور جنت والے کون؟ ہر وہ آدمی جو دنیاوی طور پر کمزور ہو، جسے لوگ کمزور سمجھتے ہوں، پراگندہ اور غبار آلود ہو اور دو بوسیدہ سی چادریں پہن رکھی ہوں، یہ لوگ جنتی ہیں۔ان

کا اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ مقام ہے کہ اگر ان میں سے کوئی اللہ تعالیٰ پر قسم اٹھا
دے تو وہ ان کی قسم کو ضرور پوری کر دیتا ہے اور سخت مزاج، بداخلاق، مال
و دولت جمع کرنے والا، بخیل اور موٹا تازہ آدمی، جو لوگوں کے آگے آگے
چلنا پسند کرتا ہو، جہنمی ہے۔'' (مسند احمد:13185)

ہم میں سے ہر شخص اندر AC والے کمرے میں بیٹھ کر امتحان دینا چاہتا ہے۔ ہماری شب وروز کی ساری بھاگ دوڑ بھی بس اسی ایک چیز کے لیے ہوتی ہے۔ جانے انجانے ہم ایک ایسی چیز کے لیے دوڑ لگا رہے ہیں، جس کا مل جانا بذاتِ خود ایک بہت بڑی آزمائش ہے۔

پھر خدا کی جانب سے بھی ہوتا یہ ہے کہ لوگوں کی نشستیں تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی AC والے کمرے میں موجود امیدواروں کو اٹھا کر باہر دھوپ میں بھیج دیا جاتا ہے تو کبھی باہر دھوپ میں موجود لوگوں کو اندر بلا لیا جاتا ہے۔ اس زندگی میں نشیب و فراز کا آنا ایک لازمی امر ہے اور ان تمام تبدیلیوں کا مقصد بھی بس آزمائش ہی ہوتا ہے، مگر ہم انسان تو انسان ہی ہیں۔

ہر وہ شخص جسے دھوپ سے اٹھا کر اندر AC والے کمرے میں بٹھا دیا جاتا ہے، وہ خوش ہو رہا ہوتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ خدا کی جانب سے اسے عزت دی گئی ہے، اس کا اعزاز و اکرام کیا گیا ہے، جبکہ AC والے کمرے میں سے اٹھ کر باہر دھوپ میں جانے والا ہر شخص اپنی قسمت کا رونا رو رہا ہوتا ہے۔ اسے لگتا ہے کہ خدا نے اسے ذلیل اور رسوا کر دیا ہے۔

''لیکن انسان کا حال یہ ہے کہ جب اس کا پروردگار اسے آزماتا ہے اور انعام و
اکرام سے نوازتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری عزت کی ہے
اور دوسری طرف جب اسے آزماتا ہے اور اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے تو
کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری توہین کی ہے۔'' (الفجر:16-15)

اس زمین پر موجود تقریباً ہر شخص اندر AC والے کمرے میں جانا چاہتا ہے اور ہم انسانوں کے اس احمقانہ طرزِ عمل میں یقیناً ہماری معاشرتی اور سماجی زندگی بھی بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے تو۔۔۔۔۔ مینڈک کو دیکھ کر مینڈک بھی پھدکتا ہے۔

بنیادی طور پر ہم میں سے تقریباً ہر انسان مستقل طور پر اپنی زندگی کا موازنہ اپنے اردگرد موجود لوگوں کی زندگیوں سے کرتا رہتا ہے۔ ہم انسانوں کا یہ طرزِ عمل نہ صرف ہمارے امتحان کو متاثر کر رہا ہے، بلکہ ہماری زندگی کی خوشیوں کا ایک بڑا حصہ بھی اسی ایک موازنے کی نظر ہو جاتا ہے۔

اپنی زندگی کا دوسرے لوگوں کی زندگیوں کے ساتھ موازنہ کرنا بذاتِ خود کوئی بُری بات نہیں ہے، مگر ہم یہ موازنہ جانب داری کے ساتھ کرتے ہیں۔ہم میں سے ہر انسان اپنی اندرونی کیفیات کا موازنہ دوسرے لوگوں کی ظاہری زندگی سے کرتا ہے، حالانکہ اگر ہمیں دوسرے انسانوں کے اندر جھانکنے کا موقع ملے تو معلوم ہوگا کہ اندر سے تو سبھی ایک جیسے ہیں۔ ہر انسان اپنی خواہشات کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہے۔اندر سے سبھی ڈرے سہمے بیٹھے ہیں۔کسی ایک انسان کی زندگی بھی مکمل نہیں ہے۔ ہر انسان کے ساتھ کچھ نہ کچھ ایسی چیزیں لگی ہوئی ہیں، جو اسے تنگ کرتی رہتی ہیں۔اس زندگی میں انسان کو مشقت میں مبتلا رکھا جائے گا۔یہی قانونِ فطرت ہے۔

''بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں (مبتلا رہنے والا) پیدا کیا ہے۔''

(البلد:4)

اس زمین پر موجود ہر انسان مشقت میں ہے۔بس ایک انسان سے دوسرے انسان تک اس مشقت کی نوعیت اور ماہیت بدل جاتی ہے۔ایک انسان سے دوسرے انسان تک ان مشقت بھرے حالات کا مقابلہ کرنے کا طریقہ بدل جاتا ہے۔ ہر انسان اس زندگی کو اپنے ہی طریقے سے دیکھتا اور استعمال کرتا ہے۔اندر سے سب انسان ایک جیسے ہیں، فرق محض ظاہر میں ہے۔کچھ افراد اپنے اندر کی کیفیات کو زیادہ بہتر طور پر قابو کرنے کے اہل ہوتے ہیں تو کچھ کم۔

اب ایک انسان کے اندر کی کیفیات کیا ہیں؟

یہ بات کوئی دوسرا انسان ٹھیک کبھی نہیں جان سکتا اور یہی وجہ ہے کہ جب ہم اپنی زندگی کا موازنہ کسی دوسرے انسان کی زندگی کے ساتھ کرتے ہیں تو یہ موازنہ ہوتا ہی غلط بنیادوں پر ہے۔اگر دو انسانوں کی زندگیوں کا موازنہ کرتے وقت ان میں سے ہر ایک شخص کے باطن کا دوسرے شخص کے باطن سے موازنہ کیا جائے تو سارے مسئلے ہی ختم ہو جائیں۔ ہم دوسروں کو اپنا آئیڈیل بنانا چھوڑ دیں، لیکن ہم انسان کیا کرتے ہیں۔۔۔

ہم اپنی اندرونی کیفیات کا موازنہ دوسرے انسانوں کی بیرونی اور ظاہری کیفیات کے ساتھ کرتے ہیں۔ پھر جب ہم دوسرے انسانوں کے ظاہر کو اپنے باطن سے زیادہ پُرسکون اور بہتر حالت میں پاتے ہیں تو پھر ہمارے اندر بھی خود کو بدلنے کی خواہش جنم لیتی ہے۔پھر زندگی میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کے لیے دوڑ لگائی جاتی ہے۔ہم انسانوں کے اسی طرزِ عمل سے پھر ناشکری کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ پھر زندگی میں بہت کچھ ہونے کے باوجود خوشی موجود نہیں ہوتی۔

پھر حرص اور لالچ انسان کی جڑوں میں بیٹھ جاتا ہے اور۔۔۔

اور شاید ان تمام چیزوں میں ایسی کوئی پریشانی والی بات بھی نہیں ہے۔ ہمارے سیانے تو ہمیں بس یہی بتائیں گے کہ۔۔۔۔۔لالچی تو کتا ہوتا ہے۔

بہرحال یہ زندگی، زندگی نہیں ہے۔ ہماری حقیقی زندگی کا آغاز ابھی ہونا ہے۔

یہ زندگی بس ایک امتحان ہے۔ یہ زندگی بس ایک دھوکا ہے۔ ہمارا جسم ہمارے لیے امتحان ہے۔ ہمارے ماحول میں ہمارے لیے آزمائشیں موجود ہیں۔ ہماری تمام رشتہ داریاں اور قرابت داریاں ہمارے لیے آزمائش ہیں۔ کون اپنے بوڑھے والدین کو کتنا وقت دیا کرتا ہے؟ کون اپنے بیوی بچوں کی محبت میں خدا کو بھول چکا ہے؟

کون اپنے خاندان کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے حرام کو حلال بنا رہا ہے؟ اپنے ملازمین کے ساتھ سلوک کیسا ہے؟ اپنے اردگرد موجود لوگوں کے ساتھ کیسا رویہ ہے؟

اس دنیا میں موجود ہر شخص دوسرے تمام افراد کے امتحان کا ایک حصہ ہے۔ اگر ہم تمام انسان چاہیں تو مل کر اس امتحان کو ایک دوسرے کے لیے آسان، بہت آسان بنا سکتے ہیں۔ کمرۂ امتحان کے ماحول کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔ اس زندگی میں بھی خوشیاں موجود ہیں، مل سکتی ہیں، مگر ہم۔۔۔

اس زندگی کو ایک ریس بنا کر ہم میں سے ہر فرد باقی تمام افراد کے امتحان کو مشکل سے مشکل تر کرتا چلا جا رہا ہے، لیکن۔۔۔تو۔۔۔تو کیا یہ زندگی۔۔۔۔۔واقعی ایک امتحان ہے؟

ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم اس وقت حالتِ امتحان میں ہیں۔

ہم اس زندگی سے دھوکا کھا چکے ہیں۔ ہم دھوکے پہ دھوکا کھا چکے ہیں۔

ایک اور دھوکے کے بارے میں بتاؤں؟

جسم کی طرح کا ایک اور بہت ہی بڑا دھوکا۔ ایک ایسا دھوکا جس کا شکار ہم سب ہو چکے ہیں۔

جسم کی طرح یہ ''وقت'' بھی ایک دھوکا ہے۔ ہماری اس دنیا میں امتحان کا دورانیہ عموماً دو تین گھنٹے کا ہوتا ہے ناں؟ کبھی صبح کے وقت پرچہ ہوتا ہے تو کبھی شام کے وقت۔

آپ نے کبھی سوچا کہ خدا ہمارا یہ ساٹھ ستر سال کا اتنا لمبا امتحان کیوں لے رہا ہے؟ یہ زندگی اگر امتحان ہے تو اس امتحان کو بھی بہت مختصر، بس دو تین گھنٹوں پر مشتمل ہونا چاہیے تھا ناں؟

حقیقت یہ ہے کہ ہماری یہ ساٹھ ستر سالہ زندگی بھی محض ایک دھوکا ہے۔ ہمارا یہ والا امتحان بھی بس دو تین گھنٹوں پر ہی مشتمل ہے۔ یہ وقت ہمارے ساتھ ''ہاتھ'' کر چکا ہے۔

''جس دن صور پھونکا جائے گا اور اس دن ہم مجرموں کو یوں جمع کریں گے کہ ان کے جسم اور آنکھیں (شدتِ خوف اور اندھے پن کے باعث) نیلگوں ہوں گی۔ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہوں گے کہ تم دنیا میں مشکل سے دس دن ہی ٹھہرے ہو گے۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہوں گے، جبکہ ان میں سے ایک عقل و عمل میں بہتر شخص کہے گا کہ تم تو ایک دن کے سوا (دنیا میں) ٹھہرے ہی نہیں ہو۔'' (طٰہٰ:104-102)

''اور جس روز قیامت برپا ہو گی، اس دن گنہگار قسمیں کھائیں گے کہ وہ (دنیا میں) ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے تھے اور اسی طرح وہ (راستے سے) الٹے جاتے تھے۔'' (الروم:55)

''(پھر) اللہ (ان دوزخیوں سے) فرمائے گا: تم زمین میں گنتی کے کتنے سال رہے؟ وہ کہیں گے: ہم ایک دن یا ایک دن سے بھی کم رہے ہوں گے۔ (ہمیں پوری طرح یاد نہیں) اس لیے جنہوں نے وقت کی گنتی کی ہو، ان سے پوچھ لیجیے۔ اللہ فرمائے گا: تم تھوڑی مدت سے زیادہ نہیں ٹھہرے۔ خوب ہوتا! اگر یہ بات تم نے (اس وقت) سمجھ لی ہوتی۔'' (المؤمنون:112-114)

''اور جس دن وہ انہیں جمع کرے گا، (وہ محسوس کریں گے) گویا وہ دن کی ایک گھڑی کے سوا دنیا میں ٹھہرے ہی نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کو پہچانیں گے۔ بے شک وہ لوگ خسارے میں رہے جنہوں نے اللہ سے ملاقات کو جھٹلایا تھا اور وہ ہدایت یافتہ نہ ہوئے۔'' (یونس:45)

''(اے پیغمبر ﷺ) آپ اسی طرح صبر کیے جاؤ جیسے اولوالعزم پیغمبروں نے صبر کیا ہے اور ان کے معاملے میں جلدی نہ کرو۔ جس دن یہ لوگ وہ چیز دیکھ لیں گے، جس سے انہیں ڈرایا جا رہا ہے، اس دن (انہیں) یوں محسوس ہو گا جیسے وہ (دنیا میں) دن کی ایک گھڑی سے زیادہ نہیں رہے۔ یہ ہے وہ پیغام جو پہنچا دیا گیا ہے۔ اب برباد تو وہی لوگ ہوں گے جو نافرمان ہیں۔'' (الاحقاف:35)

''جس دن یہ اس کو دیکھ لیں گے، اس دن انہیں ایسا معلوم ہو گا جیسے وہ (دنیا میں) ایک شام یا ایک صبح سے زیادہ نہیں رہے۔'' (النازعات:46)

ہم وقت سے دھوکا کھا چکے ہیں۔
ہم دھوکے پہ دھوکا کھا چکے ہیں۔

دو تین گھنٹوں کی اس زندگی کو پُر آسائش اور بہتر بنانے کے چکر میں ہم اپنی حقیقی زندگی کو خود اپنے ہی ہاتھوں سے برباد کر رہے ہیں۔ اس نقصان کا جب احساس ہوگا تو ازالہ ناممکن ہو چکا ہوگا۔

ایک اور دھوکے کے بارے میں بتاؤں؟

یہ دولت کی بڑی ''ت'' جسے حاصل کرنے کے چکر میں ہم نے زندگی کو ایک دوڑ بنا دیا ہے۔ یہ دولت کی بڑی ''ت'' جس کے لیے ''میں'' کو مار دیا جاتا ہے، جو انسان خرید لیتی ہے، جس کے لیے انسانیت کو بیچ دیا جاتا ہے، اس دولت کی کمی بیشی ہم انسانوں کے اختیار میں نہیں ہے۔ کسی بھی انسان کا رزق کم یا زیادہ کرنا اللہ کا، رازق کا کام ہے۔

> ''اللہ اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے، روزی فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے، تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز سے واقف ہے۔'' (العنکبوت:62)
>
> ''آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ جس کے لیے چاہتا ہے، رزق فراخ کر دیتا ہے (اور جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے۔ بے شک وہ ہر چیز سے واقف ہے۔'' (الشوریٰ:12)
>
> ''کہہ دو کہ میرا رب جس کے لیے چاہتا ہے، روزی فراخ کر دیتا ہے اور (جس کے لیے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے اور تمھارا مال اور اولاد ایسی چیز نہیں ہیں کہ تم کو ہمارا مقرب بنا دیں۔ (ہاں مقرب وہ ہے) جو ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا۔ ایسے ہی لوگوں کو ان کے اعمال کے سبب دوگنا بدلہ ملے گا اور وہ بالا خانوں میں امن سے ہوں گے۔'' (سباء:36-37)

ہماری زندگی کے بیشتر مسائل، ہمارے اکثر خیالات، ہماری زیادہ تر سوچیں؛ کسی نہ کسی طرح دولت کی اس بڑی ''ت'' کے ساتھ منسلک ہوتی ہیں۔ ہماری زندگی کی ساری بھاگ دوڑ ایک ایسی چیز کے لیے ہو رہی ہوتی ہے، جو کسی بھی طرح ہمارے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور جو چیز ہمارے اپنے اختیار میں ہے، اس سے ہم بالکل ہی غافل ہو چکے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اہلیہ حضرت امِ حبیبہ رضی اللہ عنہا نے یہ دعا کی: ''اے اللہ! مجھے اپنے خاوند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، اپنے والد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ اور اپنے بھائی حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ (کی زندگیوں) سے مستفید فرما۔

(حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے) کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تم نے عمروں کی ایسی مدتوں کا، جو مقرر کر دی گئی ہیں اور ان دنوں کا، جو گنے جا چکے ہیں اور ایسے رزقوں کا، جو بانٹے جا چکے ہیں، سوال کیا ہے۔ اگر تم اللہ سے یہ مانگتی کہ تمہیں آگ میں دیے جانے والے یا قبر میں دیے جانے والے عذاب سے پناہ عطا فرما دے تو یہ زیادہ اچھا اور زیادہ افضل ہوتا۔'' (مسلم:6770)

آج ہمارا حال یہ ہے کہ ہم میں سے ہر وہ شخص جسے رزق تھوڑا آسانی اور کشائش سے فراہم کیا جا رہا ہے، اس چیز کو اپنی عقل، ذہانت اور منصوبہ بندی سے تعبیر کرتا ہے۔ اپنی ہی محنت کے گن گائے جاتے ہیں، اپنی ہی صلاحیتوں کی مدح سرائی کی جاتی ہے اور پھر ایسا شخص خاندان کے بہت سارے لونڈوں کا آئیڈیل بھی بن جاتا ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو اس جیسا بننے کی دعائیں دیتی ہیں۔ ایسے شخص کی مثالیں دے دے کر بچوں کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ نوجوان نسل کو ''کامیاب زندگی'' کے راز بتائے جاتے ہیں۔ زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے سنہری اصول وضع کیے جاتے ہیں۔

''جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب ہم اس کو اپنی طرف سے نعمت بخشتے ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو مجھے (میرے) علم (ودانش) کے سبب ملی ہے۔ (نہیں) بلکہ وہ آزمائش ہے، مگر ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔'' (الزمر:49)

''تمھارے مال اور تمھاری اولاد تو تمھارے لیے ایک آزمائش ہیں اور وہ اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔'' (التغابن:15)

یہ دولت ہمارے امتحان کا ایک بہت بڑا حصہ ہے۔ دولت میں کمی یا زیادتی کر کے ہماری جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور ہم ایسے احمق ہیں کہ ایک پہلے سے طے شدہ چیز پر خوشیاں منا رہے ہوتے ہیں یا پھر غم۔ دولت کی اس بڑی ''ت'' سے ہم دھوکا کھا چکے ہیں۔ ہم دھوکے پہ دھوکا کھا چکے ہیں۔

ایک اور دھوکے کے بارے میں بتاؤں؟

یہ جنگلی حیات (Wild Life) پر کام کرنے والے سائنسدان یا پھر فوٹوگرافر وغیرہ۔۔۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یہ حضرات کسی خاص جانور کا انتخاب کرکے اسے Tag کر دیتے ہیں اور پھر بعد میں سگنلز کی مدد سے دور بیٹھ کر ہی اس جانور کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھی جاتی ہے۔

خشکی اور پانی کے چھوٹے بڑے جانداروں کو Tag کرنے والا یہ انسان خود Tag ہو چکا ہے۔ دوسرے جانداروں کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے والا انسان شاید یہ بات بھول گیا ہے کہ خود اس پر بھی نظر رکھی جارہی ہے۔نظر بھی ایسی نظر کہ جس کا ہمارے لیے تصور بھی ناممکن ہے۔

اپنی تنہائی اور پرائیویسی کا ہر پل خیال رکھنے والا انسان زندگی کے کسی ایک پل بھی تنہا نہیں ہوتا۔ ہر انسان کے ہر ہر عمل، ہر ہر سوچ اور ہر ہر وہم وخیال پر کم ازکم پانچ مختلف قسم کے پہرے لگ چکے ہیں۔

آپ بس گنتی کرتے جائیے۔۔۔

''اور جو باتیں ان کے سینوں میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور جو کام وہ ظاہر کرتے ہیں، تمھارا رب ان (سب) کو جانتا ہے اور آسمانوں اور زمین میں کوئی پوشیدہ چیز نہیں، مگر (وہ) کتابِ روشن میں (لکھی ہوئی) ہے۔'' (النمل:74-75)

نمبر 1: ہماری ہر سوچ، ہر عمل اور ہر خیال، ہمارے اس جسم میں موجود ہر ایک خلیے کی تمام تفصیلات کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے سے خدا کی اس کتاب میں، لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی موجود ہیں۔

''وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھے (6) دنوں میں پیدا کیا۔ پھر عرش پر جا ٹھہرا اور جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو چیز اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس کی طرف چڑھتی ہے، سب اس کو معلوم ہے اور تم جہاں کہیں ہو، وہ تمھارے ساتھ ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس کو دیکھ رہا ہے۔'' (الحدید:4)

نمبر 2: میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو اللہ میرے ساتھ، میرے پاس، میرے کمرے میں موجود ہے۔آپ یہ الفاظ پڑھ رہے ہیں تو اللہ اس وقت آپ کے پاس موجود ہے۔

اللہ ہر وقت، ہر ہر انسان کے ساتھ موجود ہے۔ ہر ہر انسان کو دیکھ رہا ہے، جانچ رہا ہے، پرکھ رہا ہے۔بس یہ ہے کہ ہم اسے دیکھنے سے قاصر ہیں۔ہم اسے نہیں دیکھ سکتے ہیں، مگر وہ ہمیں دیکھ رہا ہے اور پھر یقیناً خالق کا دیکھنا بھی کوئی ہماری طرح کا دیکھنا نہیں ہوگا۔

وہ سب کچھ، سب کچھ دیکھ رہا ہے۔

''اور ہم نے ہر انسان کے اعمال کا نوشتہ (لکھا ہوا) اس کی گردن میں لٹکا دیا ہے اور ہم اس کے لیے قیامت کے دن (یہ) نامہ اعمال نکالیں گے، جسے وہ (اپنے سامنے) کھلا ہوا پائے گا۔ (اس سے کہا جائے گا) اپنی کتاب (اعمال) پڑھ لے۔آج تُو اپنا حساب جانچنے کے لیے خود ہی کافی ہے۔'' (الاسراء:13-14)

نمبر 3: ہر انسان کے جسم میں، یہ گلے کے پاس اندر کہیں، کہیں بہت اندر کوئی نظر بھی نہ آنے والی کتاب، کوئی کیمرہ یا کمپیوٹر نصب کر دیا گیا ہے۔ قیامت کے دن بس یہی خفیہ آلہ نکال کر ہر انسان کے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ اس ایک چھوٹے سے پرزے میں ہمارے امتحان کی مکمل تفصیلات موجود ہوں گی اور اس کتاب کی مدد سے اس دن ہر انسان اپنا محاسبہ کرنے کے لیے بس خود ہی کافی ہوگا۔

''اور اس دن کا دھیان رکھو! جب اللہ کے دشمنوں کو جمع کر کے آگ کی طرف لے جایا جائے گا، چنانچہ انہیں ٹولیوں میں بانٹ دیا جائے گا۔ یہاں تک کے جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچ جائیں گے تو ان کے کان، ان کی آنکھیں اور ان کی کھالیں ان کے خلاف گواہی دیں گی کہ وہ کیا کچھ کرتے رہتے تھے۔ وہ اپنی کھالوں سے کہیں گے کہ تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دی؟ وہ کہیں گی کہ ہمیں اس ذات نے بولنے کی طاقت دے دی ہے، جس نے ہر چیز کو گویائی عطا کی ہے اور وہی ہے جس نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور اسی کی طرف تمہیں واپس لے جایا جا رہا ہے اور تم (گناہ کرتے وقت) اس بات سے تو چھپ ہی نہیں سکتے تھے کہ تمھارے کان، تمھاری آنکھیں اور تمھاری کھالیں تمھارے خلاف گواہی دیں، لیکن تمھارا گمان یہ تھا کہ اللہ کو تمھارے بہت سارے اعمال کا علم نہیں ہے۔'' (حم السجدۃ:19-22)

نمبر 4: ''میرا جسم، میری مرضی''

یہ حماقت کی علامت، یہ گدھے۔۔۔

بس بلا وجہ ہی مشہور ہو گئے ہیں حماقتوں کے لیے وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ ہم انسانوں کی حماقتوں پر تو یہ گدھے بھی ہنستے ہوں گے۔ گدھوں کی محفلوں میں انسانوں کے لطائف مشہور ہیں۔

''میرا جسم، میری مرضی''

اس جملے میں میری مرضی لطیفہ نہیں ہے۔ ہر انسان کو ہی اختیار دیا گیا ہے، لیکن اس جسم کو''میرا'' کہنا تو ایک پرلے درجے کی حماقت ہے۔ اب یہ حماقت مرد و زن میں سے کوئی بھی کر سکتا ہے۔ یہ جسم تو بہت بڑا جاسوس ہے۔ ہر وقت، ہر لمحہ انسان پر نگاہ رکھتا ہے۔

''جب (وہ کوئی کام کرتا ہے تو) دو لکھنے والے جو دائیں بائیں بیٹھے ہیں، لکھ لیتے ہیں۔ کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی، مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے۔'' (ق:17-18)

نمبر5: ہر ایک انسان کا نامہ اعمال تیار کرنے کے لیے دو فرشتے بھی مقرر کیے جا چکے ہیں۔ کم از کم دو فرشتے ہر انسان کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔

ایک بات پوچھوں؟

کیا لگتا ہے آپ کو؟ اتنے سخت پہروں میں کیوں رکھا جا رہا ہے انسان کو؟

یہ ایسا تردد محض ایک انسان کی جانچ پرکھ کے لیے کیوں کیا جا رہا ہے؟

ہمیشہ یاد رکھیے! اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوگا اور برائی کا بدلہ برائی۔

یہ وعدہ ہے اللہ کا اور وہ بھی گیارہ قسمیں اٹھانے کے بعد۔

چور کو چوری نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ چوری کرنا ایک بُری بات ہے۔ چور کو اس دنیا میں سزا ملے یا نہ ملے، خدا اس چور کو ضرور دیکھ رہا ہے۔ کیا خدا شرافت کی زندگی بسر کرنے والے نیک انسان کو بدمعاش اور غنڈوں کے برابر کر دے گا؟

کیا ایماندار افسر اور رشوت خور افسر دونوں برابر ہو جائیں گے؟

''بھلا کیا ہم فرماں برداروں کو مجرموں کے برابر کر دیں گے؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟ تم کیسی باتیں طے کر لیتے ہو؟ کیا تمھارے پاس کوئی کتاب ہے، جس میں تم یہ پڑھتے ہو؟'' (القلم:35-37)

''اور اندھا اور بینائی رکھنے والا دونوں برابر نہیں ہوتے۔ اور نہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، وہ اور بدکار برابر ہیں، (لیکن) تم لوگ بہت کم دھیان دیتے ہو۔'' (الغافر:58)

''جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے ہیں، کیا ہم ان کو ایسے

لوگوں کے برابر کر دیں گے، جو زمین میں فساد مچاتے رہے؟ یا ہم پرہیز گاروں کو بدکاروں کے برابر کر دیں گے؟'' (ص:28)

''جولوگ بُرے کام کرتے ہیں، کیا وہ خیال کرتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگول جیسا کر دیں گے، جو ایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے؟ اور ان کی زندگی اور موت یکساں ہوں گے؟ یہ جو دعوے کرتے ہیں، بُرے ہیں اور اللہ نے آسمانوں اور زمین کو حکمت سے پیدا کیا ہے، تا کہ ہر شخص اپنے اعمال کا بدلہ پائے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔' (الجاثیہ:22-21)

''اور ہم قیامت کے دن انصاف کا ترازو کھڑا کریں گے تو کسی شخص کی ذرہ برابر بھی حق تلفی نہ کی جائے گی۔ اگر رائی کے دانے کے برابر بھی (کسی کا عمل) ہوگا تو ہم اس کو حاضر کریں گے اور ہم حساب کرنے کو کافی ہیں۔'' (الانبیاء:47)

اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوگا اور برائی کا بدلہ برائی ہوگا۔

یہ وعدہ ہے اللہ کا اور وہ بھی گیارہ قسمیں اٹھانے کے بعد۔

یہ زندگی ایک امتحان ہے۔

اس امتحان میں جس شخص نے جیسی بھی کارکردگی دکھائی ہوگی، ہر شخص کو اس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔ کسی کے ساتھ ظلم یا ناانصافی نہیں ہوگی۔

بس۔۔۔۔۔ نتیجے والے دن کا انتظار باقی ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ نتیجے والا دن۔۔۔۔۔ یہ روزِ محشر ہم سے کتنی دور ہے؟

جس شخص کی موت آ گئی، اس شخص کے لیے قیامت قائم ہوگئی اور ہماری موت بھی بس آتی ہوگی۔ پروانہ جاری ہو چکا ہے، بلٹ فائر کر دیا گیا ہے۔

بس کسی بھی وقت، کسی بھی لمحہ آن کر لگتا ہوگا۔

وہ ایک لمحہ کہ جس میں سب کچھ۔۔۔۔۔ ''اِدھر'' سے ''اُدھر'' ہو جانا ہے۔

جانے یہ کیسا دھوکا ہے کہ ہم کو تو اپنی موت پر، اپنے مرنے پر بھی یقین نہیں آتا۔ محسوس یوں ہوتا ہے جیسے ہم تو ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ہمارے اردگرد، ہمارے ماحول میں، اس دنیا میں روزانہ لاکھوں افراد اِدھر سے اُدھر ہو رہے ہیں، مگر جانے کیوں؟

ہمیں لگتا ہے کہ مرنا تو بس ان احمق گدھوں کو ہی تھا۔ یہ موت ہمارے لیے نہیں ہے۔
موت کے بارے میں ہمارا یہ رویہ۔۔۔۔۔اور زندگی سے وابستہ ہماری لمبی لمبی امیدیں۔
اس زندگی سے اور موت سے۔۔۔جسم سے اور وقت سے۔۔۔
دولت کی بڑی ''ت'' سے اور ہماری تنہائی سے۔۔۔
ہم دھوکا کھا چکے ہیں۔ہم دھوکے پہ دھوکا کھا چکے ہیں۔
اور جانتے ہیں کہ سب سے بڑا دھوکا کیا ہے؟
ہم اس دھوکے میں مبتلا ہیں کہ یہ سب کچھ دھوکا نہیں ہے۔
جانتے ہیں ہماری اس زندگی کی حقیقت کیا ہے؟
اس زندگی کی حقیقت دھوکا ہے۔
اس زندگی میں دھوکے کے سوا۔۔۔۔۔باقی ہر چیز دھوکا ہے۔
اس زندگی کے ہر ہر پہلو پر، ہر ہر لمحہ میں ہمیں دھوکا دیا جا رہا ہے۔
اس زندگی میں بس ایک چیز حقیقی ہے۔اس زندگی میں بس ایک ہی چیز ایسی ہے جس پر آنکھیں بند کر کے اعتبار کیا جا سکتا ہے۔۔''دھوکا''

''اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔'' (آلِ عمران:185)

دھوکا دہی کے امتحان کی اس پیچیدگی اور گہرائی پر۔۔۔
میں ششدر ہوں، میں حیران ہوں۔
اس امتحان میں ہم انسانوں کی جہالت اور حماقت پر۔۔۔
میں دلگیر ہوں، میں پریشان ہوں۔
اور اس امتحان میں کی جانے والی اپنی تمام لغزشوں اور گناہوں پر۔۔۔
میں نادم ہوں۔
میں پشیمان ہوں۔

باب:6

کائناتِ وہم وگماں

سُنا ہے انسانی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں!

یہ لامحدود کیا۔۔۔

ارے ارے عبداللہ میاں! کیا کرتے ہو؟۔۔۔۔۔ کیا ہوگیا ہے تمہیں؟

بھئی ہوتی ہوں گی یہ خواہشات لامحدود۔

لیکن ایک ہی چیز کا تذکرہ بار بار کیوں کیے جاتے ہو؟ اگر تمھارے اور قارئین کے بیچ مناسب فاصلہ موجود ہے تو اس کا یہ مطلب تھوڑی نہ ہے کہ کچھ بھی لکھ دو۔

کچھ خوفِ خدا کر عبداللہ!

آہ پڑے گی تجھے کسی خواہش کے مارے کی۔ یہ بددعائیں فاصلے نہیں دیکھا کرتی ہیں۔

بھگوڑے کی بات مان۔۔۔

ان دُکھتی رگوں کے ساتھ زیادہ چھیڑ چھاڑ مت کر۔ دفن شدہ خواہشات کو دفن ہی رہنے دے۔

ان مردہ خوابوں کو زیادہ مت ہلا۔

وگرنہ۔۔۔۔۔ وگرنہ پھر سے زندہ ہو جائیں گے۔ سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

دیکھ عبداللہ! مان جا، مان جا میری بات۔۔۔۔۔ ضد مت کر۔

ان مرے ہوؤں کو مرا ہی رہنے دے۔ اسی میں عافیت ہے۔

لیکن بھگوڑے!

عبداللہ بھی بار بار ان خواہشات کا رونا نہ روئے تو اور کیا کرے؟

عبداللہ کو اس زمین پر انسان تو کہیں دکھائی دیتے ہی نہیں۔

ہر سو خواہشات ہیں، خواہشات کی لاشیں ہیں۔

یہ انسان، انسان تھوڑی نہ ہیں بھگوڑے! یہ تو چلتے پھرتے مقبرے ہیں، خواہشات کے

قبرستان ہیں۔اس دنیا میں ہر شخص اپنے اندر چارلی بننے کی خواہش کو دفن کیے ایک چندو کی سی زندگی بسر کر رہا ہے۔ان حالات میں عبداللہ کرے تو کیا کرے؟

مطلب۔۔۔۔۔مطلب تُو باز نہیں آئے گا۔

یہاں تو ضروریاتِ زندگی کے حصول کے لیے خود زندگی ہی کو داؤ پر لگانا پڑتا ہے اور ایک تم ہو کہ خوابوں کی باتیں کرنا چاہتے ہو۔اپنی ہی ایک کائناتِ وہم وگماں سجانا چاہتے ہو۔

ٹھیک ہے عبداللہ۔۔۔

تُو کر ان خواہشات کے مارے ہوؤں کے ساتھ ''برداشت سے صبر تک کا سفر''

لیکن اس سفر میں بھگوڑا تیرا ساتھ نہیں دے گا۔۔۔۔۔بھگوڑا تو بھاگ رہا ہے۔

بھاگ بھاگ بھگوڑے! تیرا تو کام ہے بات بے بات بھاگنا۔ویسے بھی یہ صبر تیرے بس کی بات ہے بھی نہیں۔صبر کے نام پر ہی تیرا دل گھبرانے لگتا ہے۔ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔

ارے ارے آپ تو رکیے۔ہم بات کرتے ہیں ناں۔

بھگوڑے کو ''صبر'' کا لفظ سن کر ہی دورہ پڑ جاتا ہے۔اس لیے بھاگ گیا،مگر ہم بات کرتے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ''خواہشات''،محض ایک لفظ نہیں ہے۔یہ تو ایک پوری کائنات ہے۔

اس زمین پر موجود تمام انسانوں کی پوری کی پوری زندگی کو محض اسی ایک لفظ کے ذریعے بیان کیا جا سکتا ہے۔ہر انسان کی ہر ہر سوچ کسی خواہش کے زیرِ اثر پروان چڑھتی ہے۔ہر انسان کا ہر ہر عمل کسی خواہش کے حصول کے لیے ہے۔خواہشات کے پورا ہو جانے کا نام اگر خوشی ہے تو خوشی کا حصول بذاتِ خود ایک خواہش ہے۔انسانی زندگیوں میں موجود تمام رنج،تمام تکلیفیں اور پریشانیاں انہی خواہشات کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے ہیں۔پھر اپنی خواہشات کو کم کرنے کی کوشش کرنے والا شخص بھی درحقیقت ایک اور قسم کی خواہش کی پیروی کر رہا ہوتا ہے۔

یہ تمنا ہے کہ آزادِ تمنا ہی رہوں
دلِ مایوس کو مانوسِ تمنا نہ بنا

خواہشات سے پیچھا چھڑوانے کی کوشش کرنا۔۔۔۔۔بذاتِ خود بھی ایک خواہش ہی تو ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگیوں کا ہر ہر لمحہ اور ہر ہر پہلو اس ایک لفظ میں سما سکتا ہے۔

خواہشات محض ایک لفظ نہیں ہے۔۔۔۔۔یہ میں ہوں،یہ آپ ہیں۔

میری خواہشات لامحدود ہیں۔۔۔۔۔آپ کی خواہشات لامحدود ہیں۔

میری خواہشات نا آسودہ ہیں۔۔۔۔۔آپ کی خواہشات نا آسودہ ہیں۔

یہ بیماری آفاقی ہے۔۔۔۔۔یہ روگ سانجھا ہے۔

ایک حقیر انسانی وجود میں لامحدود خواہشات کیسے بسیرا کر لیتی ہیں؟۔۔۔۔۔میں حیران ہوں۔

آخر ان خواہشات کا حل کیا ہے؟۔۔۔۔۔میں پریشان ہوں۔

کیا خواہشات کے پیچھے بھاگنا خواہشات کا حل ہے؟

وقت کو شکست دینے کی کوشش میں ہر انسان تیز سے تیز دوڑ رہا ہے، بھاگ رہا ہے۔

مگر بچے، بوڑھے، مرد، عورت؛ سب ایک ایک کر کے مرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہر گزرتا لمحہ وقت کے مقابلے میں انسانی شکست کا اعلان کر رہا ہے۔ پھر دولت کی بڑی ''ت'' بھی تو اپنی تمام زمانہ شناسی کے باوجود انسانی خواہشات کے سامنے بے بس اور لاچار کھڑی ہے۔

کیا دولت کے ذریعے خواہشات کو پورا کیا جا سکتا ہے؟

آخر ان خواہشات کا حل کیا ہے؟ کیا خواہشات کے پیچھے بھاگنا چاہیے؟ دوڑنا چاہیے؟

انسانوں کی اکثریت تو ہمیشہ سے یہی کام کرتی چلی آ رہی ہے۔

کیا خواہشات آسودہ ہو چکی ہیں؟؟؟

جنسی خواہشات کی آسودگی کے لیے آدھی سے زائد دنیا میں عورت کو بے لباس کیا جا چکا ہے، عورت اپنا لباس اتار چکی ہے۔ باقی آدھی دنیا میں بھی حقوقِ نسواں، فیشن اور جدّت پسندی کے نعروں کی آڑ میں عورت کے جسم سے لباس اتارنے کے لیے کھینچا تانی جاری ہے۔ پورنوگرافک مواد تک ہر بچے بوڑھے کی آسان رسائی کو بالکل آسان بنا دیا گیا ہے۔

چلیں پاکستان جیسے ترقی پذیر اور ''دقیانوسی'' ممالک کی بات کو چھوڑ دیجیے، اس دنیا کے بیشتر ترقی یافتہ ممالک کے باشندوں کو تو ہر قسم کی، ہر طرح کی جنسی آزادی حاصل ہے۔

کیا یورپ اور امریکہ میں جنسی خواہشات آسودہ ہو چکی ہیں؟

ان ممالک کے ''ریپ'' اور ''جنسی تشدد'' کے اعداد و شمار تو کچھ اور ہی کہانی بیان نہیں کرتے ہیں؟

نِت نئی ایجادات کے ذریعے انسانی زندگیوں کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن کیا وجہ ہے کہ ان تمام مشینوں کی سنگت کے باوجود ذہنی امراض بڑھتے جا رہے ہیں؟

صرف امریکہ میں ہی ہر سال پچاس ہزار سے زائد افراد خودکشی کر رہے ہیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ بہت سارے لوگ۔۔۔۔۔سب کچھ ہوتے ہوئے بھی خودکشی کر رہے ہیں؟

اگر خواہشات کے پیچھے بھاگنا ہی مسئلے کا حل ہے تو اس وقت دنیا کے حالات بالکل مختلف ہونے چاہیے تھے۔ جس رفتار سے انسان اپنی خواہشات کے پیچھے دوڑ رہا ہے، اس حساب سے تو دنیا کو امن وآشتی کا گہوارا ہونا چاہیے تھا۔ مگر بات یہ ہے کہ اس دنیا کے احمق سیانے اپنی بنائی گئی مشینوں کے ذریعے چندو کو چارلی بنانا چاہتے ہیں۔ مصنوعی طور پر خواہشات کو پورا کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں۔

ان مشینوں کے ذریعے چند لمحاتی لذات تو حاصل کی جاسکتی ہیں، مگر آخر میں ہر چندو۔۔۔

چارلی کی جگہ دھوبی کا کتا بن چکا ہوتا ہے۔

کیا خواہشات کی پیروی کرنا خواہشات کا حل ہے؟

انسانی خواہشات تو لامحدود ہوتی ہیں۔

اور اگر خواہشات کے پیچھے بھاگنا نہیں تو پھر۔۔۔

ایک انسان میں ان خواہشات کا مقصد کیا ہوتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا کے کسی سیانے کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے۔ سیانا انسانی خواہشات کو سمجھ ہی نہ سکا۔ دیگر بے شمار چیزوں کی طرح یہ خواہشات بھی سیانے کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔ اس معاملے میں بھی ہمیں کامل رہنمائی قرآنِ حکیم سے ملے گی۔ خالق سے بڑھ کر اور کوئی نہیں جان سکتا کہ مخلوق کی ضروریات کیا ہیں، لیکن ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ آج ہم اس غلط فہمی کا شکار ہو چکے ہیں کہ مذہب انسان کو اس کی خواہشات سے دور کرتا ہے۔ انسانوں کی اکثریت مذہب کو ناپسند محض اسی وجہ سے کرتی ہے کہ مذہب کو انسانی خواہشات کی راہ میں ایک رکاوٹ سمجھا جاتا ہے۔

لیکن یہ ایک دھوکا ہے۔ خواہشات کو اگر سمجھا جا سکتا ہے تو صرف اور صرف قرآنِ حکیم کی مدد سے۔ انسانی خواہشات کا اگر کسی کے پاس واقعی کوئی حل موجود ہے تو وہ محض قرآنِ حکیم ہے۔

خواہشات اس لیے نہیں ہوتی ہیں کہ انہیں برداشت کیا جائے۔

نہیں نہیں میرے بچپن کی وہ پہلی خواہش اتنی ارزاں نہیں ہے کہ اس سے دستبردار ہوا جائے۔ میری وہ وائرلیس ریموٹ کنٹرول گاڑی، میرے وہ کتا اور بلی مجھے بہت عزیز ہیں۔ میری ہر خواہش میری زندگی ہے اور میری ہر خواہش پوری ہونے کے لیے ہے۔

یہ زمین بھی میری ہے اور اس کائنات کا ذرہ ذرہ بھی میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔

میں ابنِ آدم ہوں۔۔۔۔۔ میں مسجودِ ملائک ہوں۔

میری خواہشات ایسی نہیں ہیں کہ ان کو زندہ دفن کر دیا جائے اور پھر میں بھی تو ایسا ارزاں نہیں ہوں کہ ان خواہشات کے پیچھے کتوں کی طرح بھاگوں۔

خواہشات برداشت کرنے کے لیے نہیں ہوتی ہیں۔ خواہشات کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ خواہشات پوری کرنے کا طریقہ کچھ اور ہے۔

خواہشات کا سفر دائرے کا سفر نہیں ہے۔ خواہشات کا سفر تو بالکل ہی سیدھا راستہ ہے۔ ''صراطِ مستقیم'' ہے خواہشات کا راستہ۔

''لوگوں کے لیے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے، جو ان کی نفسانی خواہش کے مطابق ہوتی ہیں۔ یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے، (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے۔'' (آلِ عمران:14)

سب سے پہلے تو یہ جان لینا ضروری ہے کہ وہ تمام چیزیں جو ہمیں عزیز ہیں اور جنہیں حاصل کرنے کے لیے ہم اپنی ساری زندگی بھاگتے رہتے ہیں، ان تمام چیزوں کی محبت خدا نے ہی ہمارے دل میں رکھی ہے۔ اب یہ جنسی خواہشات ہوں، نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں ہوں یا پھر مال اور اولاد کی محبت؛ یہ تمام چیزیں ہمارے لیے محبوب بنائی گئی ہیں۔ اس لیے ان میں سے کسی بھی چیز کی خواہش کا دل میں پیدا ہو جانا ایک بالکل فطری بات ہے اور پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ خدا ہمیں ہر لمحہ تنگ کرنے والی ان خواہشات سے بے خبر ہے۔ ہماری تمام آسودہ اور نا آسودہ خواہشات سے وہ پوری طرح آگاہ ہے۔ اس وقت ہم کمرۂ امتحان میں ہیں۔ اس زندگی میں ہمارے اندر لامحدود خواہشات کا رکھا جانا ہمارے امتحان کا ایک حصہ ہے۔

یہ بات بھی جان لیجیے کہ اس زندگی میں تو یہ خواہشات پوری نہیں ہوں گی، کبھی پوری نہیں ہوں گی۔ ہم جتنا ان خواہشات کے پیچھے بھاگیں گے، خواہشات کی یہ بلی اتنا ہی آگے کی جانب کھسک جائے گی۔ البتہ خواہشات برداشت کرنے کے لیے بھی نہیں ہوتی ہیں۔

خواہشات کا راستہ صبر کا راستہ ہے۔ اس زندگی میں خواہشات پر صبر کرنا ضروری ہے۔

''یہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے جنت کے بالا خانے عطا ہوں گے اور وہاں دعاؤں اور سلام سے ان کا استقبال کیا جائے گا۔'' (الفرقان:75)

''جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ سب ختم ہوجائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے، وہ باقی رہنے والا ہے اور جن لوگوں نے صبر سے کام لیا ہوگا، ہم انہیں ان کے بہترین کاموں کے مطابق ان کا اجر ضرور عطا کریں گے۔'' (النحل:96)

''ہر متنفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے، پھر ہماری ہی طرف تم سب کو واپس لایا جائے گا اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں، ان کو ہم ضرور جنت کے ایسے بالا خانوں میں آباد کریں گے، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ بہترین اجر ہے ان عمل کرنے والوں کا جنہوں نے صبر سے کام لیا اور جو اپنے پروردگار پر بھروسہ کرتے رہے۔'' (العنکبوت:59-57)

صبر، صبر، صبر۔۔۔۔اس زندگی میں ہمیں اپنے دل میں پیدا ہوجانے والی بیشتر خواہشات پر صبر کرنا ہوگا۔ دورانِ امتحان پرچہ حل کرنا ہی اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر، بے صبری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچھل کود کرنا کوئی عقل مندی والا کام نہیں ہے اور۔۔۔

اور خدارا! صبر کو برداشت کے ساتھ نہ ملا دیجیے گا۔ صبر اور برداشت میں تو زمین آسمان کا فرق ہے، مگر تھوڑا سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اگر تو زندگی بس یہی ساٹھ ستر سال کی زندگی ہے، اگر تو اس جسم کی موت پر ہی ہمارا خاتمہ ہوجاتا ہے اور اگر مرنے کے بعد کوئی بھی زندگی موجود نہیں ہے تو پھر اس مختصر زندگی میں انسانی خواہشات کی تکمیل تو بہت دور کی بات ہے، انسان کی حقیقی خواہشات کا اندازہ لگانا بھی ایک مشکل چیز ہوگی۔ ان حالات میں آپ خواہشات کے پیچھے بھاگیں یا نہیں، آپ کچھ بھی کرلیں، کسی بھی صورت خواہشات پوری نہیں ہوں گی، لہٰذا خواہشات کو برداشت کرنا ہی واحد حل ہے۔

برداشت بذاتِ خود ایک منفی جذبہ ہے۔ اس میں مایوسی ہے۔ اس میں یاس، حسرت اور ناشکرا پن ہے۔ برداشت میں مجبوری کا اور بے بسی کا عنصر غالب ہے، جبکہ قرآنِ حکیم کے مطابق ہماری یہ زندگی تو زندگی ہے ہی نہیں۔ ہماری حقیقی زندگی کا آغاز اس جسم کی موت کے بعد ہوگا۔ ہماری یہ زندگی محنت کرنے کے لیے ہے، صبر کرنے کے لیے ہے۔ ہم اپنی اس زندگی میں محنت کرکے اپنی حقیقی زندگی کو سنوار سکتے ہیں۔ یہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ جو چیز بھی یہاں کاشت کریں گے، موت کے فوراً بعد وہی چیز نگاہوں کے سامنے موجود ہوگی۔

اس زندگی میں اگر چند لمحات کے لیے اپنی نفسانی خواہشات پر صبر کرلیا جائے تو آخرت کی

زندگی میں تمام خواہشات کو پورا کیا جا سکتا ہے۔صبر ایک مثبت چیز ہے۔اس میں انتظار کا پہلو نمایاں ہے۔صبر میں امید ہے،خوشی ہے۔صبر میں شکر ہی شکر ہے۔

پھر اس زندگی میں بھی خواہشات پورا کرنے سے روکا نہیں گیا۔ یہ تمام زمین اور اس میں موجود ہر چیز انسان کے لیے پیدا کی گئی ہے۔استعمال کیجیے ان چیزوں کو، دل کھول کر استعمال کیجیے۔اپنی جس خواہش کو بھی پورا کر سکتے ہیں، کریں۔بس اسی زندگی پر خوش اور مطمئن نہیں ہو جانا ہے۔ یہ بات ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہنی چاہیے کہ ہماری حقیقی زندگی کا آغاز ابھی ہونا ہے اور وہ والی زندگی،اس زندگی سے لامحدود طور پر بہتر ہوگی۔

اس لیے ان چند لمحاتی لذات کی وجہ سے اپنے امتحان کو خراب نہیں کرنا ہے کبھی بھی۔ اگر حلال راستے سے خواہشات پوری ہو رہی ہیں تو ضرور کیجیے۔ وگرنہ صبر۔

اگر اس زندگی میں بے صبرا پن دکھا کر خواہشات کو حرام طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ زندگی بے سکون ہو جائے گی اور آخرت خواہشات سے عاری۔لیکن اگر کہیں ہم اپنی خواہشات پہ صبر کر کے اس پرچے کو حل کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں تو یقیناً آپ جانتے ہوں گے کہ اس امتحان میں کامیابی کا صلہ کیا ملے گا۔۔۔''جنت''

جنت کا نام تو ہم سب نے ہی سن رکھا ہے،مگر جنت کی حقیقت سے ہم اتنے ہی ناآشنا ہیں، جتنا خود اپنے آپ سے۔اپنی لاعلمی میں ہم اس جسم کو انسان سمجھتے ہیں، جبکہ جنت کا ہمارا تصور بھی کسی پکنک سپاٹ سے زیادہ بڑا نہیں ہے۔ بہرحال کنویں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ بڑا سوچتے ہیں۔اپنے چھوٹے چھوٹے ذہنوں میں جنت کا کچھ تصور قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جنت سے بھی پہلے اگر ہم اس دنیا کی حقیقت جان لیں تو یقیناً اس سے بھی ہمیں جنت کی حقیقت کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (مدینہ کی) کسی بالائی جانب سے داخل ہوتے ہوئے بازار سے گزرے۔لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ چل رہے) تھے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقیر کانوں والے مرے ہوئے میمنے کے پاس سے گزرے۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے کان سے پکڑ کر اٹھا لیا۔ پھر فرمایا:

''تم میں سے کون اسے ایک درہم کے عوض لینا پسند کرے گا؟''

انہوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے کہا:

''ہمیں یہ کسی بھی چیز کے عوض لینا پسند نہیں ہے۔ ہم اسے لے کر کیا کریں گے؟''

آپ ﷺ نے فرمایا:

(پھر) کیا تم پسند کرتے ہو کہ یہ تمھیں مل جائے؟''

انہوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے عرض کی:

''اللہ کی قسم! اگر یہ زندہ ہوتا، تب بھی اس میں عیب تھا، کیونکہ (ایک تو) یہ حقیر کانوں والا ہے (بھلا نہیں لگتا)، پھر جب وہ مرا ہوا ہے تو کس کام کا؟''

اس پر آپ ﷺ نے فرمایا:

''اللہ کی قسم! جتنا تمھارے نزدیک یہ حقیر ہے۔ اللہ کے نزدیک دنیا اس سے بھی زیادہ حقیر ہے۔'' (مسلم:7418)

مدہم نیلا نقطہ۔۔۔۔۔ ایک مثبت چیز ہوتی ہے، اس میں ناپسندیدگی کا عنصر نہیں ہوتا۔

ہماری یہ زمین محض ایک نقطہ نہیں ہے، بلکہ اللہ کے نزدیک تو یہ ساری دنیا ایک مرے ہوئے، چھوٹے کانوں والے میمنے سے بھی زیادہ حقیر اور گھٹیا چیز ہے۔ اور ہم ''باشعور'' انسانوں کی ساری زندگی کی تمام بھاگ دوڑ، اسی ایک مرے ہوئے میمنے کا بس تھوڑا زیادہ گوشت نوچنے کے لیے ہوتی ہے۔ بہرحال تھوڑا مزید غور کرتے ہیں۔۔۔

حضرت سہیل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جنت میں کوڑا رکھنے کی جگہ، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، سب سے بہتر ہے۔'' (بخاری:3250)

تھوڑا اور آگے بڑھتے ہیں۔۔۔ یہ تمام کائنات حضرتِ انسان کے لیے تخلیق کی گئی ہے اور اس بات پر یقین کرنے میں شاید ابھی تک کچھ قارئین کو دشواری کا سامنا ہو۔

اب جو حدیثِ رسول ﷺ بیان کی جا رہی ہے، اس سے ایک طرف تو انسان کے روحانی وجود کی حقیقت آپ کے سامنے مزید واضح ہوگی اور دوسرا آپ کو اس بات پر بھی یقین قائم کرنے میں مدد ملے گی کہ یہ تمام کائنات انسان کے لیے ہی تخلیق کی گئی ہے۔

سیدنا براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بے شک بندہ جب دنیا سے آخرت کی جانب جانے کی حالت میں ہوتا ہے تو اس کی طرف آسمان سے فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان کے چہرے سورج

کی طرح سفید ہوتے ہیں۔ ان کے پاس جنت کے کفنوں میں سے ایک کفن اور جنت کی خوشبوؤں میں سے خوشبو ہوتی ہے۔ وہ تاحدِ نگاہ اس آدمی کے پاس بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر ملک الموت آتا ہے اور اس کے سر پر بیٹھ کر کہتا ہے: اے پاکیزہ نفس! نکل اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور خوشنودی کی طرف۔ پس (روح) اس طرح بہہ کر نکلتی ہے جیسے مشکیزے سے پانی کا قطرہ بہتا ہے۔ پس وہ اس کو پکڑ لیتا ہے تو دوسرے فرشتے آنکھ جھپکنے کے بقدر اس کو اس کے ہاتھ میں نہیں رہنے دیتے، وہ خود اس کو پکڑ لیتے ہیں اور اس کو خوشبو اور کفن میں رکھ دیتے ہیں۔ اس سے روئے زمین پر پائی جانے والی سب سے بہترین کستوری کے جھونکے کی طرح خوشبو آتی ہے۔ پس وہ فرشتے اس روح کو لے کر چڑھتے ہیں اور فرشتوں کے جس گروہ کے پاس سے گزرتے ہیں، وہ کہتے ہیں: یہ پاکیزہ روح کون سی ہے؟ وہ کہتے ہیں: یہ فلاں بن فلاں ہے۔ وہ اس کو بہترین نام کے ساتھ یاد کرتے ہیں، جس کے ساتھ وہ دنیا میں اس کو موسوم کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اس کو آسمانِ دنیا تک لے جاتے ہیں اور دروازہ کھولنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پس ان کے لیے دروازہ کھول دیا جاتا ہے۔ ہر آسمان کے مقرب فرشتے اس کو الوداع کرنے کے لیے اگلے آسمان تک اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ یہاں تک کہ اس روح کو ساتویں آسمان تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: میرے بندے کی کتاب کو علیین میں لکھ دو اور اس کو زمین کی طرف لوٹا دو، کیونکہ میں نے ان کو زمین سے پیدا کیا، اسی میں ان کو لوٹاؤں گا اور اسی سے دوبارہ ان کو نکالوں گا۔ پس اس کی روح اس کے جسم میں لوٹا دی جاتی ہے۔ اس کے پاس دو فرشتے آتے ہیں اور اس کو بٹھا کر کہتے ہیں: تیرا رب کون ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا رب اللہ ہے۔ وہ کہتے ہیں: تیرا دین کیا ہے؟ وہ کہتا ہے: میرا دین اسلام ہے۔'' (مسند احمد: 10267)

صرف ایک انسان کو، صرف ایک روح کو خوش آمدید کہنے کے لیے لاتعداد فرشتے آتے ہیں۔ اتنے زیادہ فرشتے کہ ہر جانب، تاحدِ نگاہ بس روشن چہروں والے فرشتے ہی فرشتے نظر آتے ہیں اور پھر روح کو اس Universal VVIP Protocol کے ساتھ پوری کائنات کی، ساتوں آسمانوں کی

سیر کروائی جاتی ہے، جبکہ ہمارے یہ احمق سیانے مایوسی میں اعلان کر رہے ہوتے ہیں کہ انسان آسمان کی بلندی کو کبھی نہ جان پائے گا۔انسان کے لیے نظامِ شمسی سے باہر نکلنا ایک ناممکن چیز ہے۔

یہ سیانے خود بھی مایوس ہو چکے ہیں اور دوسرے انسانوں میں بھی مایوسی پیدا کرنا ان سیانوں کا کام ہے۔سیانے کہتے ہیں کہ میرے بچپن کی وہ پہلی خواہش، میرا وہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا؟

ان سیانوں کو اب کون بتائے کہ آسمان کی خود سے دوری جاننے کی میری خواہش تو جنت میں داخل ہونے سے بھی بہت پہلے۔۔۔۔۔بس چٹکیوں میں پوری ہوجائے گی۔(ان شاءاللہ)

اوراس کے ساتھ ہی میری لیول تھری کی پہلی خواہش بھی پوری ہوجاتی ہے۔

''میں کون ہوں؟''

عین موت کے لمحات میں ہی مجھے اس سوال کا ٹھیک ٹھیک ، بالکل ٹھیک ٹھیک جواب مل جائے گا۔دنیا کی زندگی میں اس خواہش کا پورا ہونا ناممکن ہے اور یقین کیجیے اس وقت ہم جتنی پستی میں گرے ہوئے ہیں، ہمیں بالکل بھی اندازہ نہیں ہے کہ انسان کون ہے؟

پھر انسان کی خود کو جاننے کی خواہش لیول تھری کی خواہش ہے۔

ہمیں ذرا بھی اندازہ نہیں ہے کہ موت کے وقت اس جسم میں سے کیا''چیز''نکل کر جائے گی۔

اس چیز کا،اس روح کا خام سا تصور بھی ہمارے لیے ناممکن ہے۔

یہ کائناتِ وہم وگماں ہے۔یہ لیول تھری ہے۔

بس اتنا جان لیجیے کہ موت کے وقت روح کی ایک جھلک دیکھ کر اس جسم کی آنکھیں پھر کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں اور اگر ایک بہت بڑی جسامت والا فرشتہ چھوٹے سے انسانی جسم میں سما سکتا ہے،اس جسم کو اختیار کرسکتا ہے تو پھر۔۔۔

اس جسم میں ایک پوری زندگی گزار کر جانے والی روح کا حدودِ اربعہ کیا ہوگا؟

روح کی جسامت کیا ہوگی؟۔۔۔۔۔شکل وصورت کیسی ہوگی؟

ان باتوں کا جواب جاننے کے لیے تو ہمیں انتظار ہی کرنا ہوگا اور انتظار کے ان لمحات میں اب کچھ تذکرہ جنت کا بھی کرتے ہیں۔

سب سے پہلے تو یہ بات جان لینی چاہیے کہ جنت میں تمام لوگوں کو ایک ہی جیسی جنت نہیں ملے گی۔جس طرح سے ہماری اس دنیا میں بھی بہت سارے سماجی اور معاشی طبقات موجود ہیں، بالکل اسی طرح سے جنت میں بھی یہ درجات نہ صرف موجود ہوں گے، بلکہ جنت کے درجات میں

فاصلہ بھی بہت زیادہ ہوگا۔ اس زندگی میں تو دنیا کا امیر ترین انسان اور غریب ترین انسان دونوں ایک ہی نقطے کے قیدی ہیں اور پھر یہاں تو یہ بھی عین ممکن ہے کہ آخرالذکر، اوّل الذکر سے زیادہ خوشحال اور پُرسکون زندگی بسر کر رہا ہو، لیکن جنت میں اوپر اور نیچے والے طبقات میں موجود فاصلہ ہمارے ہر تصور سے بھی زیادہ ہوگا۔

''جو شخص دنیا کا فوری فائدہ ہی چاہتا ہے تو ہم جس کے لیے چاہتے ہیں، جتنا چاہتے ہیں، اسے یہیں پر جلدی دے دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے ہم نے جہنم رکھ چھوڑی ہے، جس میں وہ ذلیل وخوار ہو کر داخل ہوگا اور جو شخص آخرت (کا فائدہ) چاہے اور اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرے جیسی اس کے لیے کرنی چاہیے، جبکہ وہ مومن بھی ہو تو ایسے لوگوں کی کوشش کی پوری قدردانی کی جائے گی۔ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جہاں تک (دنیا میں) تمھارے رب کی عطا کا تعلق ہے، ہم ان کو بھی نوازتے ہیں اور ان کو بھی اور (دنیا میں) تمھارے رب کی عطا کسی کے لیے بند نہیں ہے۔ دیکھو! ہم نے کس طرح ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دے رکھی ہے اور یقین رکھو کہ آخرت درجات کے اعتبار سے بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت زیادہ ہے۔'' (الاسراء:21-18)

جنت حاصل کرنے کے لیے صرف جنت کی خواہش کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے لیے ویسی ہی کوشش کرنا بھی لازم ہے کہ جیسی کوشش جنت کو حاصل کرنے کے لیے کرنی چاہیے۔

بہرحال جو لوگ بھی جنت میں جائیں گے، ان میں اعلیٰ درجے کے جنتی بھی ہوں گے اور ادنیٰ درجے کے جنتی بھی۔ اعلیٰ درجے کے جنتی کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ معلومات حاصل نہیں ہیں، البتہ جنتیوں میں سے جو سب سے ادنیٰ اور غریب جنتی ہوگا، اس شخص کے بارے میں ہمارے پاس کافی معلومات موجود ہیں۔ اس سب سے غریب جنتی کو جو مقام حاصل ہوگا، اگر ہم اس مقام کو ارب ہا ارب، ارب ہا ارب گنا کرتے چلے جائیں گے تو کبھی نہ کبھی اعلیٰ درجے کے جنتی کے مقام تک بھی پہنچ ہی جائیں گے۔

ہماری اس دنیا میں ہر صاحبِ حیثیت شخص کا کچھ ''علاقہ'' ہوتا ہے، جس پر اس شخص کی حکومت چلتی ہے۔ اب یہ ''علاقہ'' تین مرلے پر بھی مشتمل ہوسکتا ہے اور ہزار ایکڑ پر بھی۔ بالکل

اسی طرح جنت میں جانے والے ہر شخص کو بھی کچھ ''علاقہ'' دیا جائے گا، جس پر اس شخص کی حکومت قائم کر دی جائے گی۔ البتہ جنت کے ''علاقے'' اور حکومت کو اس نقطہ پر موجود ''علاقے'' اور حکومت پر قیاس کرنا ایک پرلے درجے کی حماقت ہوگی۔

کیا لگتا ہے آپ کو؟ سب سے غریب، سب سے ادنیٰ جنتی کو کتنی بڑی جنت دی جائے گی؟

سوچیں مگر کنویں سے تھوڑا باہر نکل کر۔۔۔

کچھ بڑا سوچیں۔۔۔۔۔کچھ بہت بڑا سوچیں۔

نہیں نہیں، یہ نہیں۔۔۔۔۔رہنے دیں آپ سے نہ ہو پائے گا۔

میں ہی بتا دیتا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''بے شک میں اسے جانتا ہوں جو دوزخ والوں میں سب سے آخر میں اس سے نکلے گا اور جنت والوں میں سب سے آخر میں جنت جائے گا۔ وہ ایسا آدمی ہے جو ہاتھوں اور پیٹ کے بل گھسٹتا ہوا آگ سے نکلے گا۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: جاؤ! جنت میں داخل ہو جاؤ۔ وہ جنت میں آئے گا تو اسے خیال دلایا جائے گا کہ جنت بھری ہوئی ہے۔ وہ واپس آکر عرض کرے گا: اے میرے رب! مجھے تو وہ بھری ہوئی ملی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: جا! جنت میں داخل ہو جا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وہ (دوبارہ) جائے گا تو اسے یہی لگے گا کہ وہ بھری ہوئی ہے۔ وہ واپس آکر (پھر) کہے گا: اے میرے رب! میں نے تو اسے بھری ہوئی پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا: جا! جنت میں داخل ہو جا۔ تیرے لیے (وہاں) پوری دنیا کے برابر اور اس سے دس گنا زیادہ جگہ ہے۔ (یا تیرے لیے دنیا سے دس گنا زیادہ جگہ ہے)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

وہ شخص کہے گا: کیا تُو میرے ساتھ مذاق کرتا ہے۔ (یا میری ہنسی اڑاتا ہے) حالانکہ تُو ہی بادشاہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہنس دیے۔ یہاں تک کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پچھلے دندان مبارک ظاہر ہو گئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا:

چنانچہ یہ کہا جاتا تھا کہ یہ شخص سب سے کم مرتبہ جنتی ہوگا۔'' (مسلم:461)

وہ آخری جنتی بھی بالکل ہماری طرح، اسی زمین کا ایک باشندہ تھا۔ اسے یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اس دنیا سے دس گنا بڑی جگہ اس اکیلے کو ملے گی۔ یہ سب کچھ اسے مذاق ہی لگ رہا تھا۔

اور اگر آپ نے ''اس دنیا سے دس گنا بڑی'' جگہ سے مراد ہماری زمین سے دس گنا بڑی کوئی جگہ تصور کی ہے تو شاید۔۔۔۔۔شاید آپ غلط سوچ رہے ہیں۔ حدیثِ مبارکہ کے عربی متن میں لفظ ''دنیا'' استعمال ہوا ہے نہ کہ زمین اور ہمارے لیے ہماری دنیا میں آسمانِ دنیا بھی شامل ہوسکتا ہے۔ کائنات کا وہ تمام حصہ جسے ہم کسی بھی طرح سے دیکھ سکتے ہیں، وہ سب کچھ ہمارے لیے ہماری اس دنیا کا ایک حصہ ہی تو ہے۔

اس لیے قوی امکان یہ ہے کہ آخری جنتی کو جو ''علاقہ'' دیا جائے گا، وہ قابلِ مشاہدہ کائنات سے دس گنا بڑا یا پھر اس سے بھی زیادہ بڑا کچھ ہوگا اور اس میں ایسی کوئی انہونی والی بات نہیں ہے۔ اس محدود کنویں سے باہر یہ سب کچھ ممکن ہے، عین ممکن ہے۔ وہ خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اور پھر آخری جنتی کو دیے جانے والے ''علاقے'' کے بارے میں میری یہ ذاتی رائے بلاوجہ بھی نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اہلِ جنت میں سے سب سے کم درجہ والا جنتی ایک ہزار سال کی مسافت سے اپنے باغات، نعمتوں، خادموں اور تختوں کو دیکھے گا۔'' (مسند احمد:13313)

سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اہلِ جنت میں سب سے کم مرتبہ والا آدمی اپنے ملک میں دو ہزار سال کے عرصہ میں محض ایک بار ہی نظر ڈال سکے گا۔ وہ دور والے مقامات کو بھی اسی طرح دیکھے گا، جیسے قریب والی جگہ کو دیکھے گا۔ اسی طرح وہ اپنی بیویوں اور خادموں کو دیکھے گا اور اہلِ جنت میں اعلیٰ ترین درجے والا جنتی وہ ہوگا، جو روزانہ دو بار اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔'' (مسند احمد:13312)

جنت میں حکومت کرنے کے لیے بس ایک بہت بڑا ''علاقہ'' ہی نہیں دیا جائے گا، بلکہ حکومت کو چلانے کے لیے ایسی ایسی صلاحیتیں بھی دی جائیں گی، جن کا ابھی ہمارے لیے تصور ناممکن ہے۔

جنت میں ادنیٰ ترین جنتی بھی ایک ہزار سال کی مسافت پر موجود تمام چیزوں کو ایسے دیکھے گا، جیسے ہم اس وقت اپنے بالکل سامنے موجود چیزوں کو بھی نہیں دیکھ سکتے ہیں۔ اس قدر وسیع حدِ نگاہ کے باوجود ادنیٰ جنتی کو اپنی ساری جنت، اپنے سارے ''علاقے'' کو بس ایک بار دیکھنے میں ہی دو ہزار سال لگ جائیں گے۔ اب ان تمام چیزوں سے آپ اس ادنیٰ ترین جنتی کو دیے جانے والے ''علاقے'' کی وسعت کا کچھ اندازہ کر سکتے ہیں تو کر لیجیے۔ پھر یقیناً جنت میں سفر کرنے کی رفتار بھی کوئی 120 کلومیٹر فی گھنٹہ کی نہیں ہوگی۔ وہ رفتار تو روشنی کی رفتار سے بھی تیز، بہت تیز ہوگی۔

حضرت سہیل بن سعد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جنت والے جنت کے بالا خانے کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم لوگ آسمان میں ستارے دیکھتے ہو۔'' (مسلم:7141)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کم درجے کا جنتی وہ ہے کہ جس کے لیے اسی ہزار خادم اور بہتر (72) بیویاں ہوں گی۔ اس کے لیے موتی، زمرد اور یاقوت کا خیمہ نصب کیا جائے گا، جو مقامِ جابیہ سے صنعا (یمن) تک کے برابر ہوگا۔'' (ترمذی:2562)

اب ذرا اس جسم کی حقیقت بھی جان لیجیے۔

سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب اہلِ جنت، جنت میں جائیں گے تو ان کے جسموں پر بال نہیں ہوں گے اور وہ بے ریش نوجوان، سفید رنگ، گھنگریالے بالوں والے اور سرمگیں آنکھوں والے ہوں گے۔ ان کی عمریں 33 برس کی اور قد آدم علیہ السلام کے قد کے برابر ساٹھ (60) ہاتھ اور جسم کی چوڑائی سات (7) ہاتھ ہوگی۔'' (مسند احمد:13320)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جنت میں ایک ایسا بازار ہے جس میں خرید و فروخت نہیں ہوگی، البتہ اس میں مرد اور عورتوں کی صورتیں ہیں۔ جب آدمی کسی صورت کو پسند کرے گا تو وہ اس میں داخل ہو جائے گا۔'' (ترمذی:2550)

جنت میں جسم کو لباس کی مانند تبدیل کرنا عین ممکن ہوگا۔ جب دل چاہا، جیسا جی چاہا، ویسی شکل اختیار کرلی۔ آپ تھوڑا محسوس کیجیے ناں ان چیزوں کو۔

خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم! اس دنیا میں بیت الخلاء جیسی حقیر خواہشات کے پیچھے بھاگنے والے یہ ''حقیقت پسند'' لوگ بالکل بھی حقیقت پسند نہیں ہیں، بلکہ یہ لوگ تو اس زندگی کی حقیقت سے ہی ناآشنا ہیں۔ ایسے لوگوں کے منہ سے حقیقت کا لفظ سننا بُرا لگتا ہے۔

یہ زندگی دھوکا ہے، یہ دنیا دھوکا ہے۔ بس یہ جنت حقیقت ہے، اس جنت کی تمام نعمتیں حقیقت ہیں۔

بہرحال سب سے ادنیٰ جنتی کے بارے میں بیان کی گئی ان متعدد احادیثِ رسول ﷺ سے ہم جنت کا کچھ کچھ تصور اپنے ذہنوں میں قائم کرسکتے ہیں۔ باقی جنت کی حقیقت تو خدا ہی بہتر جان سکتا ہے یا پھر جنت والے جنت میں پہنچ کر جان جائیں گے، البتہ اسی زندگی میں جنت کے تصور کو ہمارے ذہنوں میں مزید واضح کرنے کا ایک اور طریقہ جو ہوسکتا ہے، وہ ہے۔۔۔ ''خواہشات''

اب میں آپ کے سامنے قرآنِ حکیم میں بیان کی گئی جنت کی بہترین اور جامع ترین تعریف بیان کرنے لگا ہوں۔ تھوڑا غور کیجیے گا ان آیاتِ مبارکہ پر۔ اگر یہ چند آیات بھی دل میں اتر گئیں تو زندگی بن جائے گی، زندگی بدل جائے گی۔ یہ دنیا ایک قید خانہ معلوم ہوگی۔ موت کی خواہش ہونے لگے گی پھر۔

بار بار پڑھیے ان آیاتِ مبارکہ کو۔۔۔

''اور پرہیزگاروں کے لیے جنت اتنی قریب کردی جائے گی کہ کچھ بھی دور نہیں رہے گی۔ (اور کہا جائے گا) یہ ہے وہ چیز جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا کہ وہ ہر اس شخص کے لیے ہے، جو اللہ سے خوب لو لگائے رکھتا ہو۔ (اور) اپنی نگرانی رکھنے والا ہو۔ جو خدائے رحمان سے اسے دیکھے بغیر ڈرتا ہو اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والا دل لے کر آئے۔ تم سب اس میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ وہ دن ابدی زندگی کا دن ہوگا۔ ان (جنتیوں) کو وہ سب کچھ ملے گا، جو وہاں وہ چاہیں گے اور ہمارے ہاں کچھ اور زیادہ بھی ہے۔'' (ق:31-35)

''کہو کہ یہ انجام بہتر ہے یا ہمیشہ رہنے والی جنت، جس کا وعدہ متقی لوگوں سے کیا گیا ہے۔ وہ ان کے لیے انعام ہوگی اور آخری انجام۔ وہاں انہیں ہمیشہ ہمیشہ بستے ہوئے ہر وہ چیز ملے گی، جو وہ چاہیں گے۔ یہ وہ ذمہ دارانہ وعدہ ہے، جو تمھارے رب نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔'' (الفرقان:15-16)

ہر انسان کی ایک ہی خواہش ہے۔۔۔ ''میری ہر خواہش پوری ہو''

خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم!

خدائے بزرگ و برتر کے جاہ وجلال کی قسم!

جو شخص بھی ایک بار جنت میں داخل ہوگیا، پھر اس شخص کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا، ہر ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا۔ ہر جنتی کی ہر خواہش کو اس کی مرضی کے عین مطابق پورا کیا جائے گا، ہر حالت میں پورا کیا جائے گا۔ یہ وعدہ ہے اللہ کا اور اللہ سے بڑھ کر اپنے وعدہ میں سچا کون ہوسکتا ہے؟ اس وعدے کو پورا کرنا اللہ نے اپنے اوپر لازم کرلیا ہے۔ اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے وہ اللہ خود ذمہ دار ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ پر اس یقین کے ساتھ ایمان لے آیئے کہ آپ کی ہر ہر خواہش نہ صرف پہلے سے اللہ کے علم میں ہے، بلکہ یہ تمام خواہشات اللہ ہی کے اِذن سے ہیں۔ جنت میں جا کر آپ کے دل میں جن خواہشات نے بھی جنم لینا ہے، وہ تمام خواہشات اللہ کے علم میں ہیں اور ان خواہشات کی کامِل تسکین کا سامان بھی پہلے سے جنت میں تیار کر رکھا ہے۔

البتہ جنت کی خواہشات کو اس دنیا کی خواہشات پر قیاس کرنا شاید غلط ہوگا۔ ہماری یہ زندگی ایک امتحان ہے اور اس زندگی میں ہماری بیشتر خواہشات محض ایک پردہ ہیں، ہمارے امتحان کا ایک حصہ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زندگی میں ہمارے اندر بغض وحسد، نفرت وکینہ اور کنجوسی وغیرہ جیسے بہت سے منفی جذبات بھی رکھے گئے ہیں، جبکہ جنت میں جانے والوں سے ان کی یہ تمام برائیاں دور کردی جائیں گی۔

پھر یہ لیول ون، ٹو اور تھری بھی ہماری اسی زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ جنت میں تو خواب اور وہم وگماں نام کی کوئی بھی چیز موجود نہیں ہوگی۔ وہاں تو ہر خواہش پورا ہونے کے لیے ہوگی۔ جو خواہش بھی بس ایک بار جی میں پیدا ہوگئی، اس خواہش کو اسی وقت عملاً پورا بھی کردیا جائے گا۔

البتہ جنت میں بہت بدلے ہوئے اور بہت ہی بہتر Physical Laws کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے ہمارے اندر کس قسم کی خواہشات جنم لیں گی؟ جنت کے بے پناہ حسین مناظر کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے ہمارے جسم وجاں پر کس قسم کے اثرات مرتب ہوں گے؟

ہماری صلاحیتیں جب ارب ہا ارب گنا بڑھ چکی ہوں گی، ہزاروں سالوں کی مسافت پر موجود تمام چیزوں کو بیک وقت اپنی نگاہوں کے بالکل سامنے موجود پاکر ہماری خواہشات کی نوعیت کیا ہوگی؟

اس زندگی کے دوران یہ تمام چیزیں ہمارے فہم سے بالاتر ہیں۔

یہ کائناتِ وہم وگماں ہے۔ یہ لیول تھری ہے۔

پھر ویسے بھی ہمارا اس سب سے کیا لین دین؟ ہمیں تو اپنی اسی زندگی میں ایک بڑا آدمی بنناہے۔ہمیں تو اسی نقطے کی قید میں رہتے ہوئے کامیابی حاصل کرنی ہے۔ہمیں تو ہمارا یہ نقطہ ہی سب سے بڑھ کر ہے۔ بہرحال اس زندگی میں صبر کرنے والے جو افراد بھی ایک بار جنت میں داخل ہو جائیں گے، ان کی ہر ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا اور ہمیں بالکل بھی معلوم نہیں ہے کہ جنت میں ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کیا سامان تیار کر رکھا ہے۔

''کوئی متنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا کر رکھی گئی ہے۔ یہ ان اعمال کا صلہ ہے، جو وہ کرتے تھے۔ بھلا جو مومن ہو، وہ اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے جو نافرمان ہو؟ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔''

(السجدۃ:17-18)

اسی بات کو حضور اکرم ﷺ نے کچھ مزید وضاحت کے ساتھ یوں بیان کیا ہے:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے وہ کچھ تیار کر رکھا ہے، جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال تک گزرا ہے۔'' (مسلم:7132)

یہ ہے کائناتِ وہم وگماں۔ یہ ہے لیول تھری۔ ہر جنتی کی ہر ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا۔

آپ جانتے ہیں کہ یہ تمام خواہشات کتنے عرصے کے لیے پوری کی جائیں گی؟

ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ۔۔۔۔۔کسی بھی جنتی کو موت نہیں آئے گی۔

موت کو موت دے دی جائے گی۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن موت کو چت کبرے مینڈھے کی طرح لایا جائے گا اور جنت اور جہنم کے درمیان کھڑا کر دیا جائے گا۔ پھر وہ ذبح کی جائے گی اور جنتی اور جہنمی دیکھ رہے ہوں گے۔ سو اگر کوئی شخص خوشی سے مرنے والا ہوتا تو جنتی مر جاتے اور اگر کوئی غم سے مرنے والا ہوتا تو جہنمی مر جاتے۔'' (ترمذی:2558)

وقت کے غلام کو وقت سے آزادی مل جائے گی۔ جنت کی زندگی لامحدود زندگی ہے۔

ایک تو ہمارا یہ لامحدود کا تصور بہت چھوٹا ہے۔ بڑے سے بڑا جو عدد بھی ہم تصور کر سکتے ہیں، وہ

عدد نہ صرف محدود ہوگا، بلکہ اتنا محدود کہ لامحدود کے مقابلے میں صفر تسلیم کیا جائے گا، جبکہ جنت میں جانے والے ہر شخص کے لیے ایک نہیں، دو بھی نہیں، بلکہ پورے تین لامحدود ایک ہی جگہ اکٹھے کیے جائیں گے۔

''ہر جنتی کی لامحدود خواہشات کو ۔۔۔۔۔لامحدود طور پر بہترین طریقہ اور ساخت پر۔۔۔۔۔لامحدود وقت کے لیے پورا کیا جاتا رہے گا۔''

یہ ہے جنت۔۔۔۔۔یہ ہے کامیابی۔۔۔۔۔اور یہ ہے منزل۔

یہ ہے اس امتحان میں کامیاب ہوجانے والوں کا انعام۔۔۔۔۔اور یہ ہے صبر کا نتیجہ۔

یہ ہے وہ چیز جس کے لیے ساری زندگی محنت کرنی چاہیے۔ جنت ہے وہ منزل جس پر پہنچنے کے لیے اپنی ساری توانائیاں اور صلاحیتیں خرچ کر دینی چاہئیں۔ اس دنیا کے لیے، اس ایک چھوٹے کانوں والے مرے ہوئے میمنے کو حاصل کرنے کے لیے جتنا بھی وقت صرف کر دیا، ضائع چلا گیا۔ ہمیں اپنی زندگی کے ہر اس لمحے کے لیے پچھتانا پڑے گا، جس لمحے میں ہم اپنے لیے جنت نہ خرید سکے۔

''فرما دیجیے: کیا ہم تمہیں ایسے لوگوں سے خبردار کر دیں جو اعمال کے حساب سے سخت خسارہ پانے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی ساری جدوجہد دنیا کی زندگی میں ہی برباد ہوگئی اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔'' (الکہف:104-103)

کیا آج ہمارا، ہم مسلمانوں کا یہی حال نہیں ہو چکا ہے؟

آج ہماری برائیاں ہی ہمیں حسین دکھائی دیتی ہیں۔ آج ہم اپنی جہالت میں اپنی ناکامیوں پر ہی خوشی منا رہے ہوتے ہیں۔ کاش ہمیں ذرہ برابر اندازہ ہو جائے کہ ہم کیا چیز کھو رہے ہیں۔ نقطے کی قید میں رہتے ہوئے بالکل حقیر اور چھوٹی چھوٹی خواہشات کے حصول کے لیے ہم اپنا وقت، اپنی صلاحیتیں اور اپنی دولت ضائع کرتے چلے جا رہے ہیں۔ کمرۂ امتحان سے باہر نکل کر جب تمام حقائق عیاں ہوں گے تو ازالہ ناممکن ہو چکا ہوگا۔

اس دنیا کو حاصل کرنے کے لیے کی گئی ہر محنت ضائع چلی گئی، تباہ و برباد ہوگئی۔ جنت ہے وہ چیز کہ جس کے لیے ہر محنت کرنے والے کو محنت کرنی چاہیے۔ جنت ہے وہ چیز کہ جس کے لیے کی گئی محنت کبھی ضائع نہ جائے گی۔ اللہ ہر نیکی، ہر چھوٹی سے چھوٹی نیکی کا بھی پورا پورا بدلہ دے گا۔

اب بہت غور سے پڑھیے گا، دھیان سے سنیے گا۔۔۔

جس ہستی کی ہر خواہش پوری ہو رہی ہو۔۔۔جس ہستی کو کبھی بھی، کبھی بھی موت نہ آئے۔۔۔

جو ہستی ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ زندہ رہے۔۔۔

ایسی ہستی کو اس دنیا کے احمق سیانے کیا کہتے ہیں؟

ذرا غور کیجیے، تھوڑا سوچیں۔۔۔ہاں ہاں ٹھیک سوچ رہے ہیں آپ۔

ہر جنتی کو خدا بنا دیا جائے گا۔۔۔۔۔ہر ہر جنتی کو خدا بنا دیا جائے گا۔

اور۔۔۔۔اور وہ اللہ؟؟؟

ارے بھئی! وہ اللہ بہت اعلیٰ ہے۔۔۔۔۔بہت ارفع ہے۔

اللہ پاک ہے میرے ہر تصور سے، اللہ تو بلند ہے میرے ہر خیال سے۔اللہ کو سوچنے کا کوئی سوچ بھی کیسے سکتا ہے؟ اللہ کی تو مثال کے جیسا بھی کچھ ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے۔

ہر جنتی اللہ کی مخلوق ہے اور مخلوق ہی رہے گا۔یہ تو ہماری سوچ بہت چھوٹی ہے۔ہمارا خدا کا تصور بہت محدود ہے، بہت ہی محدود۔بالکل ہماری طرح، جبکہ وہ اللہ تو حقیقی لامحدود ہے۔

میں اپنے کنویں کی مینڈک والی ذہنیت کے ساتھ اس حقیقی لامحدود ذات کا تصور بھی کیسے کر سکتا ہوں؟ البتہ اس معاملے میں بھی ربِ رحیم نے مجھے ہدایت اور رہنمائی سے محروم نہیں رکھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میرے بندو! تم سب گناہ گار ہو، سوائے اس کے جس کو میں بچائے رکھوں۔تو تم مجھ سے مغفرت طلب کرو۔میں معاف کر دوں گا اور تم میں سے جو جانتا ہے کہ میں مغفرت کی قدرت رکھتا ہوں اور وہ میری قدرت کی وجہ سے معافی چاہتا ہے تو میں اسے معاف کر دیتا ہوں۔تم سب کے سب گمراہ ہو، سوائے اس کے جسے میں ہدایت دوں۔تم مجھ سے ہی ہدایت مانگو، میں تمہیں ہدایت دوں گا۔تم سب کے سب محتاج ہو، سوائے اس کے جس کو میں غنی کر دوں۔تم مجھ ہی سے مانگو، میں تمہیں روزی دوں گا اور اگر تمھارے زندہ و مردہ، اول و آخر اور خشک اور تر سب جمع ہو جائیں اور میرے بندوں میں سے سب سے زیادہ پرہیز گار شخص کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کے برابر بھی اضافہ نہ ہوگا اور اگر یہ سب مل کر میرے بندوں میں سے سب سے زیادہ بد بخت کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کے برابر کمی نہ ہوگی اور اگر تمھارے زندہ و

مردہ، اول وآخر اور خشک وتر سب جمع ہو جائیں اور ان میں سے ہر ایک مجھ سے اتنا مانگے، جہاں تک اس کی آرزوئیں پہنچیں تو میری سلطنت میں کوئی فرق واقع نہ ہوگا، مگر اس قدر جیسے تم میں سے کوئی سمندر کے کنارے پر سے گزرے اور اس میں ایک سوئی ڈبو کر نکال لے۔ یہ اس وجہ سے ہے کہ میں سخی ہوں، بزرگ ہوں۔ میرا دینا صرف کہہ دینا ہے۔ میں کسی چیز کا ارادہ کرتا ہوں تو کہتا ہوں، ہوجا! اور وہ ہو جاتی ہے۔'' (ابنِ ماجہ: 4257)

کہا تھا ناں میں نے کہ حقیقی لامحدود ذات تو صرف اللہ ہی کی ذات ہے۔

ہماری خواہشات ہمارے لیے لامحدود ہو سکتی ہیں، مگر خالق نے تو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا ہے مجھے بھی اور آپ کو بھی۔ کیا ہماری خواہشات اللہ کے لیے بھی لامحدود ہو سکتی ہیں؟

اور ایک ہم ہیں۔۔۔

ہم انسان کو بندروں میں تلاش کرتے ہیں اور خدا کو اس کائنات میں ناپائے جانے والے Aliens میں۔ ہمارا خدا کا تصور کیسا محدود اور کتنا چھوٹا ہے۔

یاد رکھیے! ہم میں سے اکثر انسانوں کا جو خدا کا تصور ہے، اللہ نے انسان کو اس سے بھی کہیں بہتر مقام پر پیدا کیا ہے، جبکہ وہ اللہ پاک ہے۔ وہ ہر تصور سے اعلیٰ وارفع ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اللہ کی قدر ہی نہ جانی۔ ہم نے اللہ کی ویسی قدر نہ کی، جیسی قدر اس کی کرنی چاہیے تھی۔ اپنی اس غفلت اور کوتاہی پر۔۔۔

میں نادم ہوں۔

دھوکا دہی کے اس امتحان میں اپنے ہر گناہ اور ہر بے صبری پر۔۔۔

میں شرمندہ ہوں۔

لیکن اس کی رحمت سے مایوس ہرگز نہیں ہوں۔ اللہ کے فضل وکرم کے بھروسے۔۔۔

میں جنت کا امیدوار ہوں۔

باب:7

دھوکے باز

ہر انسان کی بس ایک ہی خواہش ہے۔۔۔

''میری ہر خواہش پوری ہو''

انسان کی اسی ایک خواہش کے عملی طور پر پورا ہو جانے کا نام جنت ہے۔غیر ارادی طور پر ہی سہی ،مگر ہم میں سے ہر انسان اپنی اس زندگی کو بہتر سے بہتر بنانے کی جدوجہد کر کے اپنے اندر موجود جنت کی اسی خواہش کو مطمئن کرنے کی کوشش کررہا ہوتا ہے۔

جنت۔۔۔۔۔ایک آئیڈیل ہوم۔

تھوڑی اور آرام دہ زندگی۔۔۔۔۔تھوڑا اور پُرسکون ماحول۔

اس زمین پر خدا کے وجود کا انکار کرنے والے بہت انسان موجود ہوں گے،لیکن حقیقت یہ ہے کہ آخرت کا انکار کرنے والے یہ ملحد (Atheist) بھی شعوری یا لاشعوری طور پر جنت ہی کی تلاش میں ہیں۔جنت ہی ہر انسان کی خواہش ہے اور ضرورت بھی۔

انسانوں کی عظیم اکثریت اپنی جنت کی اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے بے صبری کا مظاہرہ کرتی ہے اور پھر خواہشات کو پورا کرنے کے لیے غلط راستوں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔یہ زندگی امتحان ہے اور ہم اس وقت کمرۂ امتحان میں موجود ہیں۔اس زندگی میں جنت نہ تو کسی کو ملی ہے اور نہ ہی کبھی مل سکے گی۔ساٹھ ستر سال کی اس زندگی میں جنت تلاش کرتے کرتے ہزاروں نسلیں مٹی میں مٹی ہو چکی ہیں۔اسی دنیا میں جنت کو حاصل کر لینے کی انسانی خواہش ہمیشہ تشنہ رہے گی اور ہم انسان اپنی اس خواہش سے جتنا جلدی دستبردار ہو جائیں گے،اتنا ہی اچھا ہو گا۔

البتہ آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والی حقیقی جنت ہم میں سے ہر انسان کے لیے موجود ہے۔کوئی بھی شخص دھوکا دہی کے امتحان میں کامیاب ہو کر جنت میں اپنا ایک گھر، بلکہ اپنی ایک پوری کائنات بنا سکتا ہے،لیکن انسان اور اس ابدی جنت کے بیچ بھی دو بہت بڑی رکاوٹیں موجود ہیں۔

''اور میں دعویٰ نہیں کرتا کہ میرا نفس بالکل پاک صاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نفسِ امارہ تو برائی کی تلقین کرتا ہی رہتا ہے۔ ہاں! میرا رب رحم فرما دے تو بات اور ہے۔ بے شک میرا رب بہت بخشنے والا، بڑا مہربان ہے۔''

(یوسف:53)

ہر انسان کے اندر کچھ منفی جذبات موجود ہیں۔ برائی کی طرف بھی ہمارا دھیان لگا ہی رہتا ہے۔ نفسِ امارہ کی موجودگی میں اس بات کا امکان بھی موجود رہتا ہے کہ ہم برائی کی جانب راغب ہو جائیں گے، جبکہ جنت کے راستے میں دوسری بڑی رکاوٹ۔۔۔

وہ ابلیس مردود۔۔۔ وہ سب سے بڑا دھوکے باز۔۔۔ وہ شیطان ہے۔

انسان اور انسان کی خواہشات کا سب سے بڑا دشمن یہ ابلیس ہی ہے۔

شیطان انسان کے اندر وسوسہ اندازی کر کے برائی کی دعوت دیتا ہے، اپنی جانب بلاتا ہے اور بھلائی کے راستے سے روکتا ہے۔

''یاد کرو جب تمھارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں گارے سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، چنانچہ جب میں اسے پوری طرح بنا دوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔ پھر ہوا یوں کہ سارے کے سارے فرشتوں نے تو سجدہ کیا، البتہ ابلیس نے نہ کیا۔ اس نے تکبر سے کام لیا اور کافروں میں شامل ہو گیا۔ اللہ نے فرمایا: ابلیس! جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، اس کو سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے روکا؟ کیا تُو نے تکبر سے کام لیا ہے یا تُو کوئی بہت اونچی ہستیوں میں سے ہے؟ کہنے لگا: میں اس (آدم علیہ السلام) سے بہتر ہوں۔ تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو گارے سے پیدا کیا ہے۔ اللہ نے فرمایا کہ اچھا! تُو نکل جا یہاں سے کیونکہ تُو مردود ہے اور یقین جان! قیامت کے دن تک تجھ پر میری پھٹکار رہے گی۔ اس نے کہا: میرے پروردگار! پھر تُو مجھے اس دن تک کے لیے (جینے کی) مہلت دے دے جس دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اللہ نے فرمایا: چل! تجھے ان لوگوں میں شامل کر لیا گیا ہے جنہیں مہلت دی جائے گی۔ (لیکن) ایک معین دن کے وقت تک۔ کہنے

لگا: پس میں تیری عزت کی قسم کھاتا ہوں کہ میں ان سب کو بہکاؤں گا۔ سوائے تیرے برگزیدہ بندوں کے۔ اللہ نے فرمایا: پھر سچی بات یہ ہے اور میں سچی بات ہی کہا کرتا ہوں کہ میں تجھ سے اور ان سب سے جو تیرے پیچھے چلیں گے، جہنم کو بھر دوں گا۔" (ص:85-71)

"اے لوگو! اپنے پروردگار کی ناراضی سے بچو اور ڈرو اس دن سے جب کوئی باپ اپنے بیٹے کے کام نہیں آئے گا اور نہ ہی کسی بیٹے کی یہ مجال ہوگی کہ وہ اپنے باپ کے ذرا بھی کام آجائے۔ یقین جانو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اس لیے ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ یہ دنیوی زندگی تمہیں دھوکہ میں ڈال دے اور ایسا ہرگز نہ ہونے پائے کہ وہ (شیطان) تمہیں اللہ کے معاملے میں دھوکے میں ڈال دے، جو سب سے بڑا دھوکے باز ہے۔" (لقمان:33)

"اے لوگو! یقین جانو کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، لہٰذا تمہیں یہ دنیوی زندگی ہرگز دھوکے میں نہ ڈالے اور نہ اللہ کے معاملے میں تمھیں وہ (شیطان) دھوکے میں ڈالنے پائے جو بڑا دھوکے باز ہے۔ یقین جانو کہ شیطان تمھارا دشمن ہے، اس لیے اس کو دشمن ہی سمجھتے رہو۔ وہ تو اپنے ماننے والوں کو جو دعوت دیتا ہے، وہ اس لیے دیتا ہے تاکہ وہ دوزخ کے باسی بن جائیں۔" (الفاطر:6-5)

اللہ کا گیارہ قسموں کے بعد اعلان ہے کہ۔۔۔

اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوگا اور برائی کا بدلہ برائی۔

اچھائی کا راستہ جنت کا راستہ ہے، مگر اس صراطِ مستقیم پر ابلیس گھات لگائے بیٹھا ہے۔ وہ انسان پر ہر طرف سے حملہ آور ہو کر انسان کو بھٹکانے کی کوشش کرتا ہے۔ نفسِ امارہ اور اس سب سے بڑے دھوکے باز کی موجودگی میں انسان برائی کرنے پر، سرکشی کرنے پر آمادہ ہو ہی جاتا ہے اور ہر برائی انسان کو جنت سے، اس کی خواہشات سے دور کر دیتی ہے۔

خِلقت کے اعتبار سے ابلیس ایک جِنّ ہے، لیکن وہ اپنے علم اور عبادت کی زیادتی کے سبب فرشتوں کی صفوں میں شامل ہو چکا تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کے جسمانی وجود میں جب روح پھونکی گئی تو خدائے بزرگ و برتر نے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم دیا اور کچھ یہی حکم ابلیس کے لیے بھی تھا۔ اس حکم کی تعمیل میں سب کے سب فرشتوں نے تو سجدہ کیا، مگر ابلیس

نے اپنے رب کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ ایک سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے مقربِ بارگاہ جنّ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ابلیس مردود ہو گیا۔

قصۂ حضرت آدم اور ابلیس؛ قرآنِ حکیم میں سات مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے اور غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس کا سب سے بڑا جرم تکبر ہی تھا، مگر ابلیس کا یہ تکبر ایک نہیں دو مختلف بنیادوں پر تھا۔

ایک تو ابلیس نے اپنی ذات پر تکبر کیا اور یہ سمجھ بیٹھا کہ وہ آدم علیہ السلام سے بہتر ہے، کیونکہ اسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے اور آدم علیہ السلام کو مٹی سے۔

جبکہ اپنی ذات کے ساتھ ساتھ ابلیس نے اپنے علم پر بھی تکبر کیا تھا۔

فرشتہ، انسان یا پھر جنّ۔۔۔۔۔ یہ تینوں ایک ہی اللہ کی مخلوق ہیں۔

ان تینوں میں سے اللہ نے ہر ایک مخلوق میں کیا کیا خواص رکھے ہیں؟

کون سی مخلوق زیادہ بہتر ہے کون سی کم؟ کون سی مخلوق کس کام کے لیے تخلیق کی گئی ہے؟

یہ تمام باتیں یقیناً خالق سے بڑھ کر اور کوئی نہیں جان سکتا۔

اللہ کا علم یہ کہتا تھا کہ فرشتوں اور ابلیس کو آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونا چاہیے، جبکہ دوسری جانب ابلیس کا علم یہ کہتا تھا کہ وہ آدم علیہ السلام سے بہتر ہے، کیونکہ اسے آگ سے پیدا کیا گیا ہے جبکہ آدم علیہ السلام کو مٹی سے اور یہاں پر وہ سب سے بڑا دھوکے باز خود بھی دھوکا کھا گیا۔

وہ سب سے بڑا دھوکے باز۔۔۔۔۔ انسانی جسم سے دھوکا کھا گیا۔

ابلیس حضرت آدم علیہ السلام کے جسمانی وجود کو ہی مکمل انسان سمجھ بیٹھا، حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ ریز ہونے کا حکم تو ان کے جسمانی وجود میں روح پھونک دینے کے بعد دیا گیا تھا۔

ابلیس نہیں جانتا تھا اور وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ نہیں جانتا۔ ابلیس نے اپنے ادھورے اور ناقص علم کو خدائے بزرگ و برتر کے علمِ کامل پر ترجیح دی۔

ابلیس اپنے علم کی حدود نہ پہچان سکا۔ ابلیس اپنی کم علمی کا اعتراف نہ کر سکا۔

ابلیس نے خود کو حضرت آدم علیہ السلام سے بہتر سمجھ کر تکبر کیا۔۔۔۔۔ ابلیس نے حضرتِ انسان کو حقیر جان کر تکبر کیا۔۔۔۔۔ ابلیس نے اپنے علم کو خدا کے علم سے بہتر جان کر تکبر کیا۔۔۔۔۔ ابلیس نے خدا کے حکم کو خالی از حکمت سمجھ کر تکبر کیا۔

تو کیا جہنم ہی ٹھکانا نہیں ہے ہر تکبر کرنے والے کا؟

ابلیس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردود اور ملعون ہو چکا ہے۔ ابلیس شیطان ہے۔

اگرچہ ابلیس ایک بار دھوکا کھا چکا ہے، لیکن اب وہ خود سب سے بڑا دھوکے باز ہے۔ جن چیزوں پر ابلیس نے خود دھوکا کھایا تھا، اب انہی چیزوں پر انسان کو دھوکا دیتا ہے۔ ابلیس اللہ کی رحمت سے مایوس ہو چکا ہے اور اسی مایوسی میں اب وہ انسان اور انسانیت کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ انسانی خواہشات کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، یہ سب سے بڑا دھوکے باز ہی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انسان دشمنی میں ابلیس ایک اکیلا جِنّ نہیں ہے، بلکہ ابلیس کے ساتھ اس کا ایک پورا لشکر موجود ہے۔ حتیٰ کہ ہم میں سے ہر انسان کے ساتھ کم از کم ایک شیطان جِنّ ضرور موجود رہتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

''تم میں سے کوئی شخص بھی نہیں، مگر اللہ نے اس کے ساتھ جِنّوں میں سے ایک ساتھی مقرر کر دیا ہے۔ (جو اسے برائی کی طرف مائل کرتا رہتا ہے)

انہوں (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے کہا:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ کے ساتھ بھی؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: میرے ساتھ بھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے مقابلہ میں میری مدد فرمائی اور وہ مسلمان ہو گیا ہے۔ اس لیے (اب) وہ مجھے خیر کے سوا کوئی بات نہیں کہتا۔'' (مسلم:7108)

ہر انسان کا Anti-Matter سے بنا ہوا ہمزاد تو ان سیانوں کو کبھی نہیں ملے گا۔ البتہ آگ سے بنا ہوا ایک شیطان جِنّ ضرور ہر انسان کے ساتھ بسیرا کرتا ہے، جسے ہم عام فہم الفاظ میں ہمزاد بھی کہہ سکتے ہیں۔ البتہ قرآنِ حکیم کی اصطلاح میں اس کو ''قرین''، یعنی ساتھی کہا جاتا ہے۔

اب اگر ہم دوبارہ سے انسان کے جسمانی وجود کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا جسم محض ایک دھوکا ہی نہیں ہے، بلکہ یہ جسم تو کسی میدانِ جنگ کے مناظر بھی پیش کر رہا ہوتا ہے۔

ہر انسان کے جسمانی وجود میں ایک روح مستقل طور پر بسیرا کیے رہتی ہے۔ البتہ نیند کے دوران روح جسم میں موجود نہیں ہوتی۔ ہر انسان کے ساتھ کم از کم دو فرشتے ہر وقت موجود ہوتے ہیں، جبکہ ان دو فرشتوں کے سوا بھی بہت سارے فرشتے انسانوں پر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر رحمت کے فرشتے بھیجتا رہتا ہے، سرکش شیاطین سے حفاظت کے لیے بھی فرشتے انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ فرشتے مومنین کے نہ صرف دوست ہوتے ہیں، بلکہ فرشتے آ کر

انہیں بشارتیں بھی دیتے ہیں۔

اور پھر کم از کم ایک شیطان جِن ہر انسان کے ساتھ بسیرا کرتا ہے۔ نہ صرف انسان کے ساتھ بسیرا کرتا ہے، بلکہ انسان کے جسم میں خون کی مانند گردش کرتا ہے۔یعنی ہر انسانی جسم کے ساتھ یہ تین مختلف قسم کی مخلوقات نہ صرف موجود ہوتی ہیں، بلکہ برسرِ پیکار بھی۔

روح اس جنگ کی سب سے اہم کھلاڑی ہے۔ یہ جسم اگر ایک مشین ہے، ایک گاڑی ہے تو روح اس گاڑی کی ڈرائیور ہے، جبکہ شیطان کا کام روح کے امتحان کو مشکل بنانا ہے، اس گاڑی کا ایکسیڈینٹ کروانا ہے۔جسم کی گاڑی کا Steering تو اگرچہ روح کے ہاتھ میں ہے لیکن اس گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر یہ مردود شیطان بیٹھا ہے۔

اگرچہ شیطان کے پاس سوائے وسوسہ اندازی کرنے کے اور کوئی اختیار نہیں ہے، مگر یہ مر جانا ہر وقت شور شرابا کر کر کے روح کا سر کھاتا رہتا ہے، گاڑی کو غلط راستوں کی جانب موڑنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

جبکہ اس Triangle کا تیسرا زاویہ، یعنی فرشتے جسم کی اس گاڑی کی پچھلی نشستوں پر بیٹھے رہتے ہیں۔فرشتے روح کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور مدد کرتے بھی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ فرشتے کمرۂ امتحان کی انتظامیہ میں بھی شامل ہیں۔

اس امتحان کے دوران روح کی اپنی انفرادی اور خودمختار حیثیت معطل رہتی ہے۔کمرۂ امتحان میں کوئی بھی عمل کرنے کے لیے روح جسم کی محتاج ہے۔یعنی ہم انسان جو یہ امتحان دے رہے ہیں، ہم خود سے بھی غافل ہیں اور باقی دونوں مخلوقات کی موجودگی سے بھی لاعلم ہیں۔نہ صرف لاعلم ہیں، بلکہ ان تینوں مخلوقات میں سے کسی ایک کو بھی ہم براہِ راست دیکھ نہیں سکتے۔البتہ انسانی جسم کی شکل میں نامعلوم کتنے جِنّ اور فرشتے ہر وقت ہمارے اردگرد موجود رہتے ہوں گے۔ ہر انسانی جسم کے پیچھے ایک انسان کی روح موجود ہو، یہ بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔

شاید انسانی وجود کی پیچیدگی بس ادھر ہی ختم نہیں ہو جاتی۔ان تین مختلف قسم کی مخلوقات کے ساتھ ساتھ ہر انسان کے اندر تین مختلف قسم کے نفوس بھی پائے جاتے ہیں۔

انسان کے اندر نفسِ امارہ موجود ہے۔یہ نفس ہمیشہ برائی اور بُرے کاموں کی جانب متوجہ رہتا ہے۔نفسِ امارہ انسان کو برائی کی جانب کھینچتا ہے۔انسان کے ساتھ نفسِ لوّامہ بھی موجود ہے۔نفسِ لوّامہ انسان کو برائی کی جانب جانے سے روکتا ہے، سرزنش کرتا ہے۔انسان کے بُرے کام پر ملامت کرنے

والی آواز اسی نفسِ لوّامہ کی ہوتی ہے اور پھر انسان کے اندر نفسِ مطمئنہ بھی موجود ہوتا ہے۔ یہ نفس بالکل یکسو ہو کر بس ایک خدا کی عبادت کرنا چاہتا ہے۔

ایک رائے یہ بھی ہے کہ یہ تینوں نفوس، تین الگ الگ نفس نہیں ہیں، بلکہ یہ ایک ہی نفس کے تین مختلف پہلو ہیں یا پھر تین مختلف درجات ہیں اور۔۔۔

اور حقیقت یہ ہے کہ انسان پیچیدہ ترین چیز ہے۔

انسان کو سمجھنا مشکل ہے۔

موت سے پہلے اسی زندگی میں انسان کی حقیقت کو جاننا ناممکن ہے۔

بہرحال ان تین بالکل مختلف قسم کی مخلوقات اور تین ہی مختلف قسم کے نفوس کی موجودگی میں ہر انسان کے اندر ایک اَن دیکھی اور انجانی سی لڑائی جاری رہتی ہے۔ خیر و شر کی قوتوں کے بیچ ہونے والی اس لڑائی کی حقیقت کو ہم اس زندگی میں تو کبھی نہیں جان سکیں گے، البتہ اس پُراسرار لڑائی کو ہم اپنے ہی وجود کے اندر برپا ہوتے محسوس ضرور کر سکتے ہیں۔

خیر و شر کی اس انوکھی لڑائی کا عملی نمونہ دیکھنا چاہتے ہیں؟

ہاں ہاں، سچ کہہ رہا ہوں میں۔ ابھی کے ابھی آپ اس جنگ کو اپنے اندر محسوس کر سکتے ہیں۔ خیر و شر کی قوتوں کو آپس میں ٹکراتا ہوا دیکھ سکتے ہیں، شیطان اور نفسِ امارہ کی شرانگیزیوں کو بھی محسوس کر سکتے ہیں اور پھر نفسِ لوّامہ کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سن سکتے ہیں۔

اگر ان تمام چیزوں کو آپ عملی طور پر ابھی کے ابھی محسوس کرنا چاہتے ہیں تو ایک کام کیجیے۔

ضرور۔۔۔ضرور۔۔۔ضرور کیجیے گا۔ دیر تو بالکل بھی نہیں لگانی ہے۔

بس الفاظ کو پڑھتے ہی کتاب کو بند کر کے اٹھ جانا ہے۔

ٹھیک ہے؟؟؟

فوراً سے اٹھیں۔۔۔ وضو کریں۔۔۔ اور نماز پڑھ کر اپنے لیے جنت مانگ لیں۔

اپنی ہر ہر خواہش کو۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مانگ لیں۔

اٹھیں جلدی کریں۔۔۔

بس کتاب بند کر دیں اب۔

میں ادھر ہی موجود ہوں۔۔۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔۔۔

گئے یا نہیں؟؟؟

چلیں ایک کام اور کیجیے۔۔۔

اپنا والٹ نکالیں اور اس میں موجود تمام رقم کا بیس (20) فیصد حصہ الگ سے نکال کر رکھ دیں اور پہلی فرصت میں ہی ان پیسوں کو کسی مستحق تک پہنچا دینے کا ارادہ کرلیں۔

جلدی کریں۔۔۔نکالیں اپنا والٹ۔۔۔

حوصلہ کریں تھوڑا سا۔۔۔۔کچھ بھی نہیں ہوگا۔

بھوک سے مرنے نہیں دے گا اللہ آپ کو۔۔۔

جلدی کریں جلدی۔۔۔۔۔شاباش!

اب اگر تو آپ نے ان دونوں کاموں پر عمل کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کی ہے یا اگر آپ یہ دونوں کام کر بھی چکے ہیں۔ (جس کی مجھے بالکل امید نہیں ہے)

ہر ایک صورت میں آپ اپنے اندر موجود خیر و شر کی قوتوں کو محسوس کر سکتے ہیں۔

اگر میری اس بات پر یقین نہ آ رہا تو بعد میں کسی وقت ان دونوں باتوں پر عمل کرنے کی کوشش کر کے دیکھ لیجیے گا۔

ہر انسان کے اندر تقریباً ہر وقت خیر و شر کی ایک جنگ ضرور چل رہی ہوتی ہے۔البتہ ہر انسان کے لیے اس جنگ کی شدت،نوعیت اور نتائج اس شخص کے اپنے ذاتی اعمال کی نسبت سے دوسرے تمام انسانوں سے یکسر مختلف ہو سکتے ہیں۔

ایک مستقل طور پر نماز پڑھنے والے شخص کے لیے نہ صرف نماز پڑھنا ایک بالکل آسان فعل ہے، بلکہ اگر کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے بھی نماز میں دیر ہو رہی ہو تو بالکل ٹرین چھوٹنے والی کیفیات طاری ہو جاتی ہیں،لیکن اگر کبھی کسی مستقل طور پر نماز نہ پڑھنے والے شخص کو نماز کی دعوت دے دی جائے تو۔۔۔

اچانک۔۔۔

بالکل اچانک ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں۔۔۔سانس پھولنا شروع ہو جاتی ہے۔۔۔

پھیپھڑے منہ میں آ جاتے ہیں۔۔۔اور دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے۔۔۔

جنگ پر جانا نماز پڑھنے سے زیادہ آسان کام معلوم ہوتا ہے۔

پھر ہم انسانوں کا یہ رویہ محض ایک نماز کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے۔کوئی شخص جب مستقل طور پر اچھائی کی جانب چلتا رہتا ہے تو اچھائی کرنا اس شخص کے لیے آسان سے آسان تر ہوتا چلا جاتا

ہے اور اگر کوئی شخص مستقل طور پر برائی کے راستے پر چلتا رہتا ہے تو اس کے لیے برائی کے راستے آسان سے آسان تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یہی قانونِ خداوندی ہے۔ ❶

اگر کوئی شخص اچھائی کے راستے پر چلنا چاہتا ہے تو اس کے لیے اچھائی کا راستہ آسان سے آسان بنا دیا جائے گا اور اگر کوئی برائی پر چلنا چاہتا ہے تو اس کے لیے برائی کا راستہ آسان کر دیا جائے گا۔ ایک عادی چور کے لیے چوری کرنا ذرا بھی دشوار کام نہ ہوتا ہوگا، لیکن کسی نیک سیرت شخص کے لیے چوری کرنے کی نسبت مرجانا زیادہ آسان کام ہوگا۔ خیر وشر کی اس لڑائی میں کہیں شیطان نے پسپائی اختیار کی ہے تو کہیں انسان سرنڈر کر کے شیطان کا آلہ کار بن چکا ہے۔

وہ ابلیس، وہ سب سے بڑا دھوکے باز ہر انسان کو اس کا اپنا ہی من پسند دھوکا دیتا ہے۔ انسان کو خواہشات کی تکمیل کا جھانسہ دیتا ہے، سبز باغ دکھاتا ہے۔ انسان کو ایک مصنوعی اور فوری جنت کے خواب دکھا کر اپنی جانب بلاتا ہے اور آج ہم انسانوں کی اکثریت ابلیس کے جھانسے میں آچکی ہے۔

ابلیس انفرادی سطح پر انسانوں کو اپنے دام میں پھنسا کر اپنا آلہ کار بنا لیتا ہے اور پھر جو کام ابلیس خود براہِ راست نہیں کر پاتا، وہ کام انسانوں میں موجود ابلیس کے چیلے چانٹے کرتے ہیں۔

آج وہ سب سے بڑا دھوکے باز اپنے انہی چیلوں کی مدد سے اس پوری زمین پر ایک باطل نظام قائم کر چکا ہے۔ ایک ایسا نظام جس میں کمرۂ امتحان کا ماحول حد درجہ غلیظ اور آلودہ ہو چکا ہے۔ کمرۂ امتحان میں شور شرابا اور ہنگامہ اتنا بڑھ چکا ہے کہ وہ افراد جو سکون کے ساتھ اپنا پرچہ حل کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے بھی اپنے پرچے پر توجہ مرکوز رکھنا بہت مشکل ہو چکا ہے۔

ہر جانب ابلیسیت پھیل چکی ہے۔ شیطنت اپنے پنجے گاڑ چکی ہے۔ اچھائی کے راستوں پر چلنا دشوار سے دشوار تر ہوتا چلا جا رہا ہے، جبکہ برائی کے سبھی راستے کھلے ہیں، اپنی جانب بلا رہے ہیں، دعوت دے رہے ہیں۔ وہ سب سے بڑا دھوکے باز انسانوں کی عظیم اکثریت کو خواہشات کی تکمیل کا جھانسہ دے کر خواہشات سے دور کر چکا ہے۔

آج ہمیں ہماری برائیاں ہی سب سے خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔ آج گناہ ہی فیشن میں ''اِن'' ہے۔ چند لمحاتی لذات کی خاطر ہم اپنی ہمیشہ ہمیشہ کی خواہشات سے دور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ بہت ہی گھاٹے کا سودا ہے، جو ہم کر رہے ہیں۔ بہت کم قیمت میں بیچ دیا ہے ہم

❶ اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کے لیے سورۃ اللیل کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔

انسانوں نے اپنی جنت کواور پھروہ دھوکے باز بھی تو ہر بار ایک نیا ہی دھوکا دیتا ہے۔ایسے خوبصورت الفاظ اور نعروں کا چناؤ کرتا ہے کہ بس۔۔۔۔۔جی خوش کر دیتا ہے۔

جمہوریت، جدت پسندی، روشن خیالی، حقوقِ نسواں، ورلڈ بینک، آئی ایم ایف۔۔۔

سننے میں ہی کیسے بھلے اور انسان دوست معلوم ہوتے ہیں یہ سب نام، مگر سب دھوکا ہے۔

پھر''خوشی'' کی بات تو یہ ہے کہ ہمارے پاس ہمارے اپنے سیانے موجود ہیں۔ ہمارے پاس ہماری اپنی جمہوریت ہے۔ ہمارا اپنا ایک سودی نظام ہے۔

میں اس وقت یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں آج کے روز شرح سود سات فیصد رائج ہے۔اسلام اور شرح سود، دونوں ایک ساتھ ایک ہی جملے میں۔۔۔

سننے میں ہی بُرے لگتے ہیں، زہر لگتے ہیں۔

''جو لوگ سود کھاتے ہیں، وہ (قیامت میں) اٹھیں گے تو اس شخص کی طرح اٹھیں گے جسے شیطان نے چھو کر پاگل بنا دیا ہو۔ یہ اس لیے ہوگا کہ انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود ہی کی طرح ہوتی ہے، حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام قرار دیا ہے، لہٰذا جس شخص کے پاس اس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت آ گئی اور وہ (سود کے معاملات سے) باز آ گیا تو ماضی میں جو کچھ ہوا، وہ اسی کا ہے اور اس (کی باطنی کیفیت) کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے اور جس شخص نے لوٹ کر پھر وہی کام کیا تو ایسے لوگ دوزخی ہیں۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ ہر اس شخص کو ناپسند کرتا ہے جو ناشکرا گناہگار ہو۔ (ہاں) وہ لوگ جو ایمان لائیں، نیک عمل کریں، نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، وہ اپنے رب کے پاس اپنے اجر کے مستحق ہوں گے۔ نہ انہیں کوئی خوف لاحق ہوگا اور نہ کوئی غم پہنچے گا۔اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اگر تم واقعی مومن ہو تو سود کا جو حصہ بھی (کسی کے ذمہ) باقی رہ گیا ہے، اسے چھوڑ دو۔ پھر بھی اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ سن لو اور اگر تم (سود سے) توبہ کرو تو تمھارا اصل سرمایہ تمھارا حق ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے۔'' (البقرۃ:279-275)

آج اسلام کے نام پر بننے والے ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کی پوری معیشت سود پر چل رہی ہے، رینگ رہی ہے۔

پاکستان کی بائیس کروڑ ''مومن اور جنت کی حقدار عوام'' میں سے کوئی ایک شخص، کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے، جو سود کے بلاواسطہ یا بالواسطہ اثرات سے مکمل محفوظ ہو۔

اللہ کا علمِ کامل کہتا ہے کہ شرح سود کو صفر رکھنے میں ہی معیشت اور معاشرے کی بہتری ہے۔ شرح سود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے صفر رہے گا۔

شرح سود کو نہ تو اس سے کم کیا جائے گا اور نہ ہی اس سے زیادہ۔

مگر ہمارے سیانوں بلکہ بہت سارے ''امپورٹڈ سیانوں'' کا علم کہتا ہے کہ شرح سود پر ہر تین ماہ بعد غور وفکر کیا جائے گا اور پھر۔۔۔

ملکی معیشت کے اعداد وشمار کا جائزہ لے کر ایک نئے شرح سود کا اعلان کیا جائے گا۔

اللہ کا علم کہتا ہے کہ سود سے مال کم ہو جاتا ہے، جبکہ ہمارے یہ سیانے کہتے ہیں کہ سود تو مال کو بڑھاتا ہے۔ اللہ کا علم کہتا ہے کہ معیشت صفر شرح سود پر بہتر چلے گی، نہ صرف چلے گی، بلکہ دوڑے گی بھی، جبکہ سیانے کہتے ہیں کہ اللہ کو پاکستانی معیشت کے بارے میں کیا پتہ؟؟؟

معیشت کی بہتری کے لیے شرح سود کو مثبت رکھنا بہت ضروری ہے۔ اللہ کی بات مان کر اگر شرح سود صفر کر دی گئی تو ملکی معیشت تباہ وبرباد ہو جائے گی۔

ایک جانب اللہ کا علم ہے۔۔۔۔۔شرح سود صفر، صفر، صفر

اور ایک جانب ہمارے سیانوں کا علم ہے۔۔۔۔۔شرح سود سات، آٹھ، نو کچھ بھی۔

شاید آج انسان اپنی پیدائش کو بھول چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو، انسان کی پیدائش پر غور وفکر کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

> ''اس نے انسان کو نطفے سے پیدا کیا، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھلم کھلا جھگڑے پر آمادہ ہو گیا۔'' (النحل:4)

> ''اور کیا انسان نے یہ نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے نطفے سے پیدا کیا تھا، پھر اچانک وہ کھلم کھلا جھگڑا کرنے والا بن گیا۔ ہمارے بارے میں تو وہ باتیں بناتا ہے اور خود اپنی پیدائش کو بھلا بیٹھا ہے۔'' (یٰس:78-77)

> ''کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے یونہی چھوڑ دیا جائے گا؟ کیا وہ اس منی کا ایک

قطرہ نہیں تھا، جو (ماں کے رحم میں) ٹپکا یا جاتا ہے؟ پھر وہ لوتھڑا بنا، پھر اللہ نے
اسے بنایا اور ٹھیک ٹھاک کیا۔'' (القیامۃ:38-36)

ایک گندے، لیس دار اور بد بودار مادے کی پیداوار۔۔۔۔۔اپنے ہی باپ کا تخم

چند نا پاک بوندوں سے پرورش پانے والا انسان۔۔۔۔۔ایک مکروہ صورت جرثومے کی تبدیل شدہ شکل۔۔۔۔۔اور دوبار گندگی کی جگہ سے برآمد ہونے والا انسان۔

آج یہ انسان اس قابل ہو چکا ہے کہ اللہ کو، اپنے خالق کو معیشت چلانے کے اصول بتا سکے۔

سیانے نہیں جانتے ہیں اور سیانے یہ بھی نہیں جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے ہیں۔

اللہ کے علمِ کامل کو پسِ پشت ڈال کر اپنی عقل اور اپنے علم کو ترجیح دی جا رہی ہے۔کیا یہی وہ غلطی نہیں ہے، جو ان سیانوں کے گُرو، ابلیس نے کی تھی؟۔۔۔۔۔کیا اسی چیز کو تکبر نہیں بولتے ہیں؟

ان سیانوں نے اپنے ناقص اور گھٹیا علم کو خدا کے علمِ کامل سے بہتر جان کر تکبر کیا۔

ان سیانوں نے خدا کے حکم کو خالی از حکمت سمجھ کر تکبر کیا۔

جاننا چاہتے ہیں کہ محنت کیسے ضائع ہوتی ہے؟

میری محنت ضائع چلی گئی۔آٹھ سال، آٹھ سال معاشیات پڑھی ہے میں نے۔

سود پڑھا ہے میں نے، سودی نظام کو چلانے کے طریقے سیکھے ہیں۔

اگرچہ خدائے بزرگ و برتر کے خاص رحم و کرم کی بدولت میں عملی زندگی میں کبھی براہِ راست سودی نظام کا حصہ نہیں رہا ہوں، مگر ایک سود پر چلنے والی معیشت کا حصہ ہونے کے ناطے سود کے تمام مضر اثرات مجھ تک پہنچ رہے ہیں۔نہ صرف مجھ تک، بلکہ آپ تک بھی پہنچ رہے ہیں۔ پاکستان کے ہر ہر شہری تک پہنچ رہے ہیں۔کوئی ایک شخص بھی سود کے اثرات سے محفوظ نہیں ہے۔

اس گناہ میں، اس لعنت میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔پاکستان میں بھوکے سونے والے ہر خاندان کی حالتِ زار کے لیے ہم سب برابر کے گناہ گار ہیں۔غربت اور مفلسی کے ہاتھوں تنگ ہو کر خودکشی کرنے والے ہر فرد کے خون کے ذمہ دار ہم سب ہیں۔

میری اس زندگی کے بہترین دوست، میرے بہت سے عزیز اور تعلق والے آج، اس وقت بھی پاکستان میں سودی نظام کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ پاکستان کے تعلیمی اداروں میں ہزاروں نہیں لاکھوں طلبہ ساری ساری رات جاگ کر سود کے ''فوائد'' ڈھونڈنے کی کوشش کرتے ہیں۔سودی نظام چلانے کے داؤ پیچ سیکھتے اور سکھاتے ہیں۔لاکھوں افراد اس وقت بھی سود کے

لین دین میں براہِ راست ملوّث ہیں۔

جانے انجانے ہم خدا کے ساتھ اپنی اس دشمنی میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جارہے ہیں۔

کیا اس محنت کے بدلے میں ہمیں جنت ملے گی؟ کیا خدا سے دشمنی کرنے کے عوض ہمیں جنت ملے گی؟

جاننا چاہتے ہیں محنت کیسے ضائع ہوتی ہے؟

میری زندگی کے آٹھ سال اس سود کو پڑھنے میں ضائع ہو چکے ہیں۔ میرے بہت سارے دوستوں کی محنت مسلسل ضائع جارہی ہے۔ سود اور سودی نظام سے منسلک ہر ہر شخص کی محنت ضائع ہورہی ہے۔

بھولا بادشاہ یاد ہے؟

مری ہوئی مَیں کو زندہ کرنے کے لیے جوتے مارے جانے میں شاید کسی پہلو پر کوئی حکمت نظر آجائے، مگر خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم!

شرح سود کو صفر کے سوا کسی بھی اور شرح پر رکھ کر معیشت چلانے میں کوئی ایک حکمت بھی موجود نہیں ہے۔ البتہ سودی نظام میں معیشت اور معاشرے کے لیے ستر سے زائد قسم کے نقصانات ضرور موجود ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''سود ستر گناہوں کے برابر ہے۔ جن میں سے سب سے چھوٹا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنی ماں سے نکاح کرے۔'' (ابنِ ماجہ:2274)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سود کھانے والے، کھلانے والے، لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت کی اور فرمایا: (گناہ میں) یہ سب برابر ہیں۔'' (مسلم:4093)

ایک بات تو یقینی ہے کہ سود اور سودی نظام سے منسلک ہر شخص کی، ہر ہر شخص کی محنت ضائع چلی گئی ہے۔

پھر بات محض ایک سود پر ہی تو ختم نہیں ہوجاتی۔

اللہ کا علمِ کامل کہتا ہے کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو۔ اسی چیز میں چور اور معاشرے، دونوں کی بہتری ہے، لیکن ہمارا نظام کہتا ہے کہ چور کو جیل بھیج دو۔ جیل میں بڑے چوروں کے ساتھ وقت گزارے گا تو اچھی تربیت حاصل کر کے واپس لوٹے گا۔

الغرض ہر جگہ ابلیس ہے اور ابلیس کا باطل نظام ہے۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں

میں ہر چیز، ہر ہر چیز خلافِ خدا ہے۔
ہم مسلمان ہیں ناں؟
کیا ہماری زندگیوں کے کسی ایک پہلو میں بھی اسلام موجود ہے؟ قرآن موجود ہے؟
ڈھونڈیے۔۔۔۔۔کوشش کیجیے اگر مل سکے تو۔
ہاں ہاں۔۔۔۔۔یاد آ گیا۔۔۔۔۔اسلام موجود ہے۔
ہماری زندگی کے کم از کم ایک پہلو میں تو اسلام موجود ہے۔
مکمل اسلام موجود ہے۔
اگر آپ نے کبھی غور کیا ہو تو مرد اب اپنی نگاہ نیچی رکھنے لگا ہے۔
مرد اب اپنی نگاہ۔۔۔۔۔نیچی رکھنے لگا ہے۔
جیسے جیسے عورت کی شلوار ٹخنوں سے اوپر۔۔۔۔۔اوپر۔۔۔۔۔اور اوپر اٹھ رہی ہے،
ویسے ویسے مرد کی نگاہ نیچی۔۔۔۔۔نیچی۔۔۔۔۔اور نیچی ہوتی چلی جا رہی ہے۔
پہلے محض شریعت کا تقاضا تھا کہ مرد اپنی نگاہ نیچی رکھے۔
لیکن اب وقت کا تقاضا بھی یہی کہتا ہے کہ۔۔۔
''حرام خور! نگاہ نیچی رکھ۔ ادھر ہی ملے گا جو بھی ملے گا۔''
مرد گرا ہوا تو خیر ہمیشہ سے ہی تھا، لیکن بنتِ حوا نے اپنی شلوار ٹخنوں سے اوپر اٹھا کر۔۔۔
مرد کو نظر سے بھی گرا دیا۔
پہلے شادی بیاہ کے موقع پر منہ دکھائی ہوا کرتی تھی، اب راہ چلتے ٹخنہ دکھائی ہوتی ہے۔
آج کل لِپ سرجری کا فیشن ہے۔
مجھے یقین ہے کہ کچھ ہی عرصے بعد ''ٹخنہ سرجری'' بھی ہوا کرے گی۔
حد نہیں ہو گئی ویسے فرسٹریشن والی۔
بس اتنے سے۔۔۔۔۔اتنے سے دیکھنے دکھانے پر خوش ہو گئے ہو؟
راضی ہو گئے ہو اس پر ہی؟۔۔۔۔۔''ٹھنڈ پے گئی اے؟''
نوجوانو! کیا ہو کیا گیا ہے تمہیں؟
تھوڑا آگے بڑھو، کچھ بڑا سوچو۔۔۔
''ان ٹخنوں سے آگے جہاں اور بھی ہیں''

مگر۔۔۔

مگر تھوڑا صبر۔۔۔۔۔حوصلہ، حوصلہ۔

خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم!

ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ۔۔۔

جنت میں ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک کے لیے کیا کیا ''سامان'' موجود ہوگا۔

ہماری ہر ہر خواہش پوری ہونے کے لیے ہے۔

اور یہاں پر خواہش سے میری مراد۔۔۔۔۔''خواہش'' ہی ہے۔

تھوڑا سا۔۔۔۔۔بس تھوڑا سا صبر کر لو۔

ان خواہشات سے دستبردار ہونے کی ضرورت نہیں ہے، ان خواہشات کے پیچھے دوڑنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔بس تھوڑا صبر کر لیجیے پھر۔۔۔

ہر خواہش اور ہر ''خواہش'' خود چل کر آپ کے پاس آئے گی۔

پھر رقص و سرود کی محفلیں بھی سجیں گی۔۔۔۔۔شراب و شباب سب موجود ہوگا۔

افغانستان کی چرس، برازیل کی کوکین، ساؤتھ افریقہ کا پاؤڈر اور۔۔۔

اور ہالی ووڈ، بالی ووڈ کی ہیروئین۔۔۔

یہ سب سستے نشے ہیں۔

ان سے ارب ہا ارب گنا بہتر نشے مل جائیں گے۔

پھر بے شک اپنی ''خواہش'' کے ساتھ پانچ ہزار سال کے ہنی مون پر چلے جائیے گا۔

اور۔۔۔

کیا؟۔۔۔۔۔کیا کہا؟۔۔۔۔۔پانچ ہزار سال کے بعد کیا ہوگا؟

ارے بھئی صاحبانِ بصیرت بتاتے ہیں کہ جنت میں تو ''شہد'' کی نہریں بہتی ہیں نہریں۔

پانچ ہزار سال بعد۔۔۔۔۔اِک نئی ہنی اور ایک نیا ہنی مون۔

پریشان نہیں ہونا بس۔تھوڑی سی دیر صبر کر لیجیے۔ہماری یہ چھوٹی چھوٹی بے صبریاں ہمیں ہماری بڑی بڑی خواہشات اور پیاری پیاری۔۔۔۔۔پیاری پیاری ''خواہشات'' سے دور کر دیتی ہیں۔

اور۔۔۔

اور یہ سب قصور میڈیا کا ہے۔

بنیادی طور پر انسان کی عقل اور انسان کے جنسی جذبات۔۔۔۔۔دونوں بالکل ایک سی خصوصیات کے حامل ہیں۔ دونوں میں کچھ امنگیں انگڑائیاں لیتی رہتی ہیں اور دونوں ہی کچھ کر گزرنا چاہتے ہیں۔ دونوں میں طاقت موجود ہے اور دونوں کو اپنی اپنی طاقت کا اظہار چاہیے۔

عقل اور جنس؛ دونوں کے ذریعے ہمیں آزمایا جاتا ہے اور یہ دونوں اس دھوکے باز کے نشانے پر ہیں۔ یہ دونوں جذبات اگر اعتدال میں رہیں تو انسانی زندگیوں کے لیے بہت بڑی نعمت ہیں، وگرنہ یہ دونوں ہی ایک انسان کو گمراہ کر دینے کی، ایک انسان کو جانور بنا دینے کی طاقت بھی رکھتے ہیں۔

جنسی جذبات اگر اپنی حدود میں رہیں تو نہ صرف زوجین کی باہمی تسکین کا سامان فراہم کرتے ہیں، بلکہ نسلِ انسانی کی بڑھوتری اور بقاء کا وسیلہ بھی بنتے ہیں، لیکن اگر یہی جنسی جذبات اپنی حدود سے تجاوز کر جائیں تو پھر انسانوں میں سور جنم لیتے ہیں۔ پھر آئے دن اپنے ہی بچوں کی لاشیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ ہم جنس پرستی کو فروغ ملتا ہے۔Nude Societies وجود میں آتی ہیں۔

دوسری جانب عقل انسان کو زندگی کے ہر موڑ پر رہنمائی فراہم کرتی ہے۔ اچھے اور بُرے میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ عقل بہتر سے بہتر طور پر زندگی بسر کرنے کا سامان فراہم کرتی ہے، لیکن جنسی جذبات کی مانند یہ عقل بھی بھٹک جاتی ہے اور عقل کی گمراہی جنس کی گمراہی سے کہیں زیادہ تباہ کن ہے۔

عقل اگر اپنی حدود سے تجاوز کر جائے تو پھر دنیا میں سیانے جنم لیتے ہیں۔

پینٹ کوٹ میں ملبوس۔۔۔معاشرے میں جانے پہچانے۔۔۔اور باعزت سیانے۔۔۔

ایسے سیانے جو خدا کو Aliens میں تلاش کرتے ہیں تو انسان کو بندروں میں۔ عقل کی بے راہ روی سے دنیا میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف جیسے ادارے وجود میں آتے ہیں۔ سود اور سودی نظام کو دنیا میں پھیلایا جاتا ہے اور پھر جنسی بے راہ روی کو فروغ دینے میں بھی عقل کا بڑا ہاتھ ہے۔ گناہ کو فیشن کا نام دینے کا سارا کریڈٹ عقل کو ہی جاتا ہے۔ جنسی بے راہ روی کے فروغ کے لیے یہ جدّت پسندی، روشن خیالی اور حقوقِ نسواں جیسے خوبصورت اور دلکش نعرے۔۔۔

یہ سب عقل ہی کی کارستانی تو ہے۔

انسان کی عقل، انسان کے جنسی جذبات سے کہیں بڑھ کر طاقت ور ہے۔

عقل کی گمراہی، جنس کی گمراہی سے کہیں بڑی گمراہی ہے۔

پھر سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ عقل کی بے راہ روی کو پہچاننا بہت مشکل ہے۔ ان مردود سیانوں کا پہناوا بہت باعزت ہے۔ سیانوں کو پہچاننے کے لیے عقل کی نہیں، بصیرت کی ضرورت

ہے۔بصیرت کے بِنا ان سیانوں کی نشاندہی کرنا ناممکن ہے۔

بہرحال ایک بات یقینی ہے۔۔۔۔عقل گمراہ ہو،جنس گمراہ ہو یا پھر یہ دونوں ہی۔۔۔

ہر ایک صورت میں انسان، انسانیت سے بہت دور چلا جاتا ہے۔

انسان پھر جانور بن جاتا ہے، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر۔

''کیا تم نے ایسے شخص کو دیکھا جس نے خواہشِ نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے تو کیا تم اس پر نگہبان ہو سکتے ہو؟ یا تم یہ خیال کرتے ہو کہ ان میں سے اکثر سنتے یا سمجھتے ہیں۔(نہیں) یہ تو چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی زیادہ گمراہ ہیں۔'' (الفرقان:43-44)

''اور (اے رسول ﷺ) ان کو اس شخص کا واقعہ پڑھ کر سناؤ،جس کو ہم نے اپنی آیتیں عطا فرمائیں،مگر وہ ان کو بالکل چھوڑ نکلا۔پھر شیطان اس کے پیچھے لگا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ گمراہ لوگوں میں شامل ہو گیا اور اگر ہم چاہتے تو ان آیتوں کی بدولت اسے سربلند کرتے،مگر وہ تو زمین ہی کی طرف جھک کر رہ گیا اور اپنی خواہشات کے پیچھے پڑ گیا۔اس لیے اس کی مثال اس کتے کی سی ہو گئی کہ اگر تم اس پر حملہ کرو،تب بھی وہ زبان لٹکا کر ہانپے گا اور اگر اسے (اس کے حال پر) چھوڑ دو،تب بھی زبان لٹکا کر ہانپے گا۔یہ ہے مثال ان لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے، لہٰذا تم یہ واقعات ان کو سناتے رہو،تاکہ یہ کچھ سوچیں۔کتنی بُری مثال ہے ان لوگوں کی جنھوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا ہے اور جو اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔جسے اللہ ہدایت دے،بس وہی ہدایت یافتہ ہوتا ہے اور جسے وہ گمراہ کر دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو نقصان اٹھاتے ہیں اور ہم نے جِنات اور انسانوں میں سے بہت سے لوگ جہنم کے لیے پیدا کیے ہیں۔ان کے پاس دل ہیں،جن سے وہ سمجھتے نہیں۔ان کے پاس آنکھیں ہیں،جن سے وہ دیکھتے نہیں۔ان کے پاس کان ہیں،جن سے وہ سنتے نہیں۔وہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں، بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں۔یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔'' (الاعراف:179-175)

''جن لوگوں پر تورات کا بوجھ ڈالا گیا، پھر انہوں نے اس کا بوجھ نہیں اٹھایا،
ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے، جو بہت ساری کتابیں لادے ہوئے ہو۔
بہت بُری مثال ہے ان لوگوں کی جنہوں نے اللہ کی آیتوں کو جھٹلایا اور اللہ
ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں پہنچاتا۔'' (الجمعۃ:5)

وہ اللہ جس نے انسان کے سامنے تمام فرشتوں کو جھکا دیا۔۔۔۔۔وہ اللہ جس نے انسان کے لیے یہ تمام کائنات سجادی۔۔۔۔۔وہ اللہ جس نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا۔

اب وہی اللہ انسان کو نہ صرف جانور، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر کہہ رہا ہے۔ ابلیس کے نقشِ قدم پر چلنے والے انسانوں کو انسان تصور ہی نہیں کیا جاتا۔ ایسے انسانوں کی مثال کتے، گدھے اور چوپایوں کی سی ہے۔ یہ لوگ جانور ہیں، بلکہ جانوروں سے بھی بدتر۔

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ انسان مسجودِ ملائک ہے۔

لیکن ہر دو پاؤں پر چلنے والا شخص انسان نہیں ہوتا۔ انسان بننے کے لیے محنت کرنا پڑتی ہے۔ آج ہم میں سے ہر شخص بڑا آدمی بننا چاہتا ہے، کامیاب آدمی بننا چاہتا ہے، مگر انسان کوئی نہیں بننا چاہتا۔

ابلیس کے نقشِ قدم پر چلتے چلتے آج ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں ہر ہر چیز خلافِ قرآن ہو چکی ہے۔ ہر جگہ ابلیس ہے اور ابلیس کا باطل نظام ہے۔ سودی نظام کا حصہ ہیں ہم سب۔ ہم خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ دشمنی کا آغاز کر چکے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہماری حماقت اور جہالت کا عالم یہ ہے کہ ہم بہت ساری خوش فہمیوں کا شکار بھی ہو چکے ہیں، جیسا کہ۔۔۔

میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتی ہوں۔
میں جنت کا حقدار ہوں۔
میں مسلمان ہوں۔
اور پھر۔۔۔
ہماری سب سے بڑی خوش فہمی۔۔۔
''میں انسان ہوں''

باب:8

آخری خواہش

میں اور آپ ۔۔۔

ہم سب اس وقت کمرہ امتحان میں موجود ہیں۔

ہماری اس زندگی کا مقصد آزمائش ہے۔

ہم انسان اس وقت ایک ایسا امتحان دے رہے ہیں، جس کی بنیاد دھوکا ہے۔ ہر چیز کا ظاہر کچھ اور ہے تو باطن کچھ اور۔ یہ امتحان بہت زبردست ہے، بہت کڑا ہے اور پھر اسی حساب سے اس امتحان کا انعام بھی بہت بڑا ہے، ہمارے ہر تصور سے بھی بڑا ہے۔

''دھوکا دہی کے امتحان میں کامیاب ہوجانے والے ہر امیدوار کی لامحدود خواہشات
کو لامحدود طور پر بہترین ساخت پر لامحدود وقت کے لیے پورا کیا جاتا رہے گا۔''

لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنا ضروری ہے کہ اس امتحان میں ناکام ہو جانے والوں کے لیے جہنم کی سزا ہوگی۔

امتحان کے خاتمے کے بعد ہم میں سے ہر انسان یا تو جنت میں ہوگا یا پھر جہنم میں۔

قرآنِ حکیم میں عموماً جنت اور جہنم کا ذکر ایک ساتھ کیا جاتا ہے۔ ہماری اس کتاب کے مضامین جس ترتیب کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، اس اعتبار سے اب مجھے جہنم پر بھی ایک مکمل باب قائم کرنا چاہیے تھا۔ انعام کے ساتھ ساتھ امتحان میں ناکامی کی صورت میں سزا کا علم ہونا بھی ضروری ہے، مگر اپنی تمام کوششوں کے باوجود جہنم پر ایک مکمل باب لکھنے کی ہمت اور طاقت میں اپنے اندر محسوس نہیں کرتا، لہٰذا جہنم پر لکھے گئے باب کو اس کتاب کا حصہ نہیں بنایا جارہا۔

البتہ دھوکا دہی کے امتحان میں ناکام ہوجانے والوں کی چند ''آخری خواہشات'' آپ کے سامنے ضرور بیان کرنا چاہتا ہوں۔ یہ کام بھی اس لیے کیا جارہا ہے کہ شاید ہم دوسروں کی غلطیوں سے کچھ سبق حاصل کرسکیں۔ جو حماقتیں دوسرے انسانوں سے سرزد ہوئی تھیں، شاید ہم ان حماقتوں کو ترک کردیں۔

شاید۔۔۔

شاید ہم اس دھوکے باز کے دھوکے سے باہر نکل آئیں۔

بس اتنا جان لیجیے کہ جو شخص بھی ایک بار امتحان میں ناکام ہو گیا، پھر موت ہی اس شخص کی سب سے بڑی خواہش ہو گی، لیکن یہ خواہش بھی پوری نہیں کی جائے گی۔

امتحان میں ناکام ہو جانے والوں کے لیے موت ہی زندگی کی سب سے بڑی حسرت بن جائے گی۔

اب آپ ''حقیقی ناکام'' لوگوں کی چند آخری خواہشات کا مطالعہ کریں اور۔۔۔

مجھے اجازت دیجیے۔

اب ''پہلی زندگی'' میں آپ سے بھگوڑا ملاقات کرے گا، کیونکہ۔۔۔

''میں خوف زدہ ہوں''

''اصل حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے قیامت کی گھڑی کو جھٹلایا ہوا ہے اور جو کوئی قیامت کی گھڑی کو جھٹلائے، اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کر رکھی ہے۔ جب وہ ان کو دور سے دیکھے گی تو یہ لوگ اس کے بپھرنے اور پھنکارنے کی آوازیں سنیں گے اور جب ان کو اچھی طرح باندھ کر اس کی ایک تنگ جگہ میں پھینکا جائے گا تو وہاں یہ موت کو آواز دے کر پکاریں گے۔ (اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج تم موت کو صرف ایک بار نہ پکارو، بلکہ بار بار موت کو پکارتے ہی رہو۔''

(الفرقان:11-14)

''اور جس دن آسمان پھٹ کر ایک بادل کو راہ دے گا اور فرشتے اس طرح اتارے جائیں گے کہ ان کا تار بندھ جائے گا۔ اس دن صحیح معنی میں بادشاہی خدائے رحمن کی ہو گی اور وہ دن کافروں پر بہت سخت ہو گا اور جس دن ظالم انسان (حسرت سے) اپنے ہاتھوں کو کاٹ کھائے گا اور کہے گا: کاش میں نے پیغمبر کی ہمراہی اختیار کر لی ہوتی۔ ہائے میری بربادی! کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ میرے پاس نصیحت آ چکی تھی، مگر اس (دوست) نے مجھے اس سے بھٹکا دیا اور شیطان تو ہے ہی ایسا کہ وقت پڑنے پر انسان کو بے کس چھوڑ جاتا ہے۔ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہیں گے کہ: یا رب! میری قوم

اس قرآن کو بالکل چھوڑ بیٹھی تھی۔'' (الفرقان:25-30)

''وہ دن یاد رکھو جس دن کسی بھی شخص نے نیکی کا جو کام کیا ہوگا، وہ اپنے سامنے موجود پائے گا اور برائی کا جو کام کیا ہوگا، اس کو بھی (اپنے سامنے دیکھ کر) یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس کے اور اس کی بدی کے درمیان بہت دور کا فاصلہ ہوتا۔ اللہ تمہیں اپنے (عذاب) سے بچاتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت شفقت رکھتا ہے۔'' (آلِ عمران:30)

''اور وہ شخص جس کا نامۂ اعمال اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا: ہائے کاش! مجھے میرا نامۂ اعمال نہ دیا گیا ہوتا اور نہ میں جانتا کہ میرا حساب کیا ہے۔ ہائے کاش! وہی (موت) کام تمام کر چکی ہوتی۔(آج) میرا مال مجھ سے (عذاب) کچھ بھی دور نہ کر سکا۔ مجھ سے میری قوت وسلطنت (بھی) جاتی رہی۔'' (الحاقہ:25-29)

''(وہ عذاب) اس دن ہوگا جب آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ رنگین روئی کی طرح ہو جائیں گے اور کوئی جگری دوست کسی جگری دوست کو پوچھے گا بھی نہیں، حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیے جائیں گے۔ مجرم یہ چاہے گا کہ اس دن کے عذاب سے چھوٹنے کے لیے اپنے بیٹے فدیہ میں دے دے اور اپنی بیوی اور اپنا بھائی اور اپنا وہ خاندان جو اسے پناہ دیتا تھا اور زمین کے سارے کے سارے باشندے۔(پھر ان سب کو فدیہ میں دے کر) اپنے آپ کو بچا لے۔(لیکن) ایسا ہرگز نہیں ہو سکے گا۔ وہ تو ایک بھڑکتی ہوئی آگ ہے، جو کھال اتار لے گی۔ ہر اس شخص کو بلائے گی جس نے پیٹھ پھیر کر منہ موڑا ہوگا اور (مال) اکٹھا کیا ہوگا، پھر اسے سینت سینت کر رکھا ہوگا۔'' (المعارج:8-18)

''اور جسے اللہ گمراہ کر دے تو اس کے بعد کوئی نہیں ہے جو اس کا مددگار بنے اور جب ظالموں کو عذاب نظر آ جائے تو تم انہیں یہ کہتا ہوا دیکھو گے کہ کیا واپس جانے کا بھی کوئی راستہ ہے؟ اور تم انہیں دیکھو گے کہ دوزخ کے

سامنے انہیں اس طرح پیش کیا جائے گا کہ وہ ذلت کے مارے جھکے ہوئے کن اکھیوں سے دیکھ رہے ہوں گے اور جو لوگ ایمان لا چکے ہیں، وہ کہہ رہے ہوں گے کہ واقعی اصل خسارے میں وہ لوگ ہیں، جنہوں نے قیامت کے دن اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو خسارے میں ڈال دیا۔ یاد رکھو کہ ظالم لوگ ایسے عذاب میں ہوں گے جو ہمیشہ قائم رہے گا اور ان کو ایسے کوئی مددگار میسر نہیں آئیں گے، جو اللہ کو چھوڑ کر ان کی مدد کریں اور اللہ جسے گمراہ کر دے، اس کے لیے بچاؤ کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ (لوگو) اپنے پروردگار کی بات اس دن کے آنے سے پہلے پہلے مان لو، جسے اللہ کی طرف سے ٹالا نہیں جائے گا۔ اس دن تمھارے لیے کوئی جائے پناہ نہیں ہو گی اور نہ تمھارے لیے پوچھ گچھ کا کوئی موقع ہوگا۔'' (الشوریٰ:44-47)

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اللہ نے کافروں کو رحمت سے دور کر دیا ہے اور ان کے لیے بھڑکتی ہوئی آگ تیار کی ہے، جس میں وہ ہمیشہ اس طرح رہیں گے کہ انہیں نہ کوئی حمایتی مل سکے گا اور نہ کوئی مددگار۔ جس دن ان کے چہروں کو آگ میں الٹا پلٹا جائے گا، وہ کہیں گے کہ اے کاش! ہم نے اللہ کی اطاعت کر لی ہوتی اور رسول کا کہنا مان لیا ہوتا اور کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کا کہنا مانا اور انہوں نے ہمیں راستے سے بھٹکا دیا۔ اے ہمارے پروردگار! ان کو دوگنا عذاب دے، ان پر ایسی لعنت کر جو بڑی بھاری لعنت ہو۔'' (الاحزاب:64-68)

''اللہ فرمائے گا کہ جاؤ! جنات اور انسانوں کے گروہوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ، جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ (اسی طرح) جب بھی کوئی گروہ دوزخ میں داخل ہوگا، وہ اپنے جیسوں پر لعنت بھیجے گا، یہاں تک کہ جب ایک کے بعد ایک، سب اس میں اکٹھے ہو جائیں گے تو ان میں سے جو لوگ بعد میں آئے تھے، وہ اپنے سے پہلے آنے والوں کے بارے میں کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! انہوں نے ہمیں غلط راستے پر ڈالا تھا، اس لیے ان کو آگ کا دوگنا عذاب دینا۔ اللہ فرمائے گا کہ سبھی کا عذاب دوگنا ہے، لیکن تمہیں (ابھی)

پتہ نہیں ہے اور پہلے آنے والے بعد میں آنے والوں سے کہیں گے: تو پھر تم کو ہم پر کوئی فوقیت تو حاصل نہ ہوئی ،لہٰذا جو کمائی تم خود کرتے رہے ہو، اس کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔'' (الاعراف:39-38)

''اور ہم نے (دنیا میں) ان پر کچھ ساتھی مسلط کر دیے تھے، جنہوں نے ان کے آگے پیچھے کے سارے کاموں کو خوشنما بنا دیا تھا۔ چنانچہ جو دوسرے جنات اور انسان ان سے پہلے گذر چکے ہیں، ان کے ساتھ مل کر عذاب کی بات ان پر بھی سچی ہو گی۔ یقیناً وہ سب خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہوں گے اور یہ کافر (ایک دوسرے سے) کہتے ہیں کہ اس قرآن کو سنو ہی نہیں اور اس کے بیچ میں غل مچا دیا کرو، تا کہ تم ہی غالب رہو۔ اس لیے ہم ان کافروں کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور یہ (دنیا میں) جو بدترین کام کیا کرتے تھے، اس کا پورا پورا بدلہ دیں گے۔ یہی ہے سزا اللہ کے دشمنوں کی جو آگ کی صورت میں ہو گی، اسی میں ان کا دائمی ٹھکانا ہو گا، جو اس بات کا بدلہ ہو گا کہ وہ ہماری آیتوں کا انکار کیا کرتے تھے اور یہ کافر لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں ان جنات اور انسان دونوں کی صورتیں دکھایئے جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا تھا، تا کہ ہم انہیں اپنے پاؤں تلے ایسا روندیں کہ وہ خوب ذلیل ہوں۔ (دوسری طرف) جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے اور پھر اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر بے شک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو اور اس جنت سے خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔'' (حم السجدۃ:25-30)

''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آ کھڑی ہو گی تو وہ کہے گا: میرے پروردگار! مجھے واپس بھیج دیجیے، تا کہ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں، اس میں جا کر نیک عمل کروں۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک بات ہی بات ہے، جو وہ زبان سے کہہ رہا ہے اور ان (مرنے والوں) کے سامنے عالمِ برزخ کی آڑ ہے، جو اس وقت تک قائم رہے گی، جب تک ان کو دوبارہ زندہ کر کے اٹھایا جائے۔ پھر جب صور پھونکا جائے گا تو اس دن نہ ان کے درمیان رشتے ناطے باقی رہیں

گے اور نہ ہی کوئی کسی کو پوچھے گا۔اس وقت جن کے پلڑے بھاری نکلے تو وہی ہوں گے جو فلاح پائیں گے اور جن کے پلڑے ہلکے پڑ گئے تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے لیے گھاٹے کا سودا کیا تھا۔وہ دوزخ میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔آگ ان کے چہروں کو جھلس ڈالے گی اور اس میں ان کی صورتیں بگڑ جائیں گی۔(ان سے کہا جائے گا کہ) کیا میری آیتیں تمہیں پڑھ کر سنائی نہیں جاتی تھیں؟اور تم ان کو جھٹلایا کرتے تھے۔وہ کہیں گے کہ ہمارے پروردگار! ہم پر ہماری کم بختی چھا گئی تھی اور ہم گمراہ لوگ تھے۔ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے باہر نکال دیجیے، پھر اگر دوبارہ ہم وہی کام کریں تو بے شک ہم ظالم ہوں گے۔اللہ فرمائے گا:اسی (دوزخ) میں ذلیل ہوکر پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔میرے بندوں میں سے ایک جماعت یہ دعا کرتی تھی کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لے آئے ہیں، پس ہمیں بخش دیجیے اور ہم پر رحم فرمائیے اور آپ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والے ہیں۔تو تم نے ان لوگوں کا مذاق بنایا تھا۔یہاں تک کے ان ہی (کے ساتھ چھیڑ چھاڑ) نے تمہیں میری یاد سے بھی غافل کر دیا اور تم ان کی ہنسی اڑاتے رہے۔انہوں نے جس طرح صبر سے کام لیا تھا، آج میں نے انہیں اس کا بدلہ دے دیا ہے کہ انہوں نے اپنی مراد پالی ہے۔'' (المؤمنون:111-99)

''اور جن لوگوں نے کفر اپنا لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ہم نہ تو اس قرآن پر کبھی ایمان لائیں گے اور نہ ان (آسمانی کتابوں) پر، جو اس سے پہلے نازل ہوئی تھیں اور اگر تم اس وقت کا منظر دیکھو جب یہ ظالم لوگ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے کیے جائیں گے تو یہ ایک دوسرے پر بات ڈال رہے ہوں گے۔جن لوگوں کو (دنیا میں) کمزور سمجھا گیا تھا، وہ ان سے کہیں گے جو بڑے بنے ہوئے تھے کہ اگر تم نہ ہوتے تو ہم ضرور مومن ہوتے۔جو بڑے بنے ہوئے تھے، ان سے کہیں گے کہ جنہیں کمزور سمجھا گیا تھا کہ کیا ہم نے تمہیں ہدایت سے روکا تھا، جبکہ وہ تمھارے پاس آ چکی تھی؟اصل بات یہ ہے کہ تم خود مجرم تھے اور جنہیں کمزور سمجھا گیا تھا، وہ ان سے کہیں گے کہ جو بڑے بنے

ہوئے تھے کہ یہ تمھاری رات دن کی مکاری ہی تو تھی (جس نے ہمیں روکا تھا) جب تم ہمیں تاکید کرتے تھے کہ ہم اللہ سے کفر کا معاملہ کریں اور اس کے ساتھ (دوسروں کو) شریک مانیں اور یہ سب جب عذاب کو دیکھ لیں گے تو اپنا پچھتاوا چھپا رہے ہوں گے اور جن جن لوگوں نے کفر کیا تھا، ہم ان سب کے گلوں میں طوق ڈال دیں گے۔ ان کو کسی اور بات کا نہیں، انھی اعمال کا بدلہ دیا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے۔'' (سبا:31-33)

''اور یہ سب لوگ اللہ کے آگے پیش ہوں گے۔ پھر جو لوگ (دنیا میں) کمزور تھے، وہ بڑائی بھگارنے والوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمھارے پیچھے چلنے والے لوگ تھے، تو کیا اب تم ہمیں اللہ کے عذاب سے بچا لو گے؟ وہ کہیں گے: اگر اللہ نے ہمیں ہدایت دی ہوتی تو ہم بھی تمھیں ہدایت دے دیتے۔ چاہے ہم چیخیں چلائیں یا صبر کریں، دونوں صورتیں ہمارے لیے برابر ہیں۔ ہمارے لیے چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں اور جب ہر بات کا فیصلہ ہو جائے گا تو شیطان (اپنے ماننے والوں سے) کہے گا: حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے تم سے سچا وعدہ کیا تھا، جو میں نے تم سے وعدہ کیا تو اس کی خلاف ورزی کی اور مجھے تم پر اس سے زیادہ کوئی اختیار حاصل نہیں تھا کہ میں نے تمھیں (اللہ کی نافرمانی کی) دعوت دی تو تم نے میری بات مان لی، لہٰذا اب مجھے ملامت مت کرو، بلکہ خود اپنے آپ کو ملامت کرو۔ نہ تمھاری فریاد پر میں تمھاری مدد کر سکتا ہوں اور نہ میری فریاد پر تم میری مدد کر سکتے ہو۔ تم نے اس سے پہلے مجھے اللہ کا جو شریک مان لیا تھا، (آج) میں نے اس کا انکار کر دیا ہے۔ جن لوگوں نے یہ ظلم کیا تھا، ان کے حصہ میں تو اب دردناک عذاب ہے۔'' (ابراہیم:21-22)

''اور یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ جو کچھ یہ ظالم کر رہے ہیں، اللہ اس سے غافل ہے۔ وہ تو ان لوگوں کو اس دن تک کے لیے مہلت دے رہا ہے، جس دن آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جائیں گی۔ وہ سروں کو اوپر اٹھائے دوڑ رہے ہوں گے، ان کی نگاہیں جھپکنے کو واپس نہیں آئیں گی اور ان کے دل (بدحواسی میں) اڑے جا رہے ہوں گے اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) تم لوگوں کو اس دن سے خبردار کرو، جب

عذاب ان پر آن پڑے گا۔ تو اس وقت یہ ظالم کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمیں تھوڑی سی مدت کے لیے اور مہلت دے دیجیے، تا کہ ہم آپ کی دعوت قبول کرلیں اور پیغمبروں کی پیروی کریں۔ (اس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) ارے کیا تم لوگوں نے پہلے قسمیں کھا کھا کر یہ نہیں کہا تھا کہ تم پر کوئی زوال نہیں آ سکتا؟ اور تم ان لوگوں کی بستیوں میں رہ چکے تھے، جنھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا اور یہ بات کھل کر تمھارے سامنے آ چکی تھی کہ ہم نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا اور ہم نے تمھیں مثالیں بھی دی تھیں اور وہ لوگ اپنی ساری چالیں چل چکے تھے اور ان کی ساری چالوں کا توڑ اللہ کے پاس تھا، چاہے ان کی چالیں ایسی کیوں نہ ہوں، جن سے پہاڑ اپنی جگہ سے ہل جائیں، لہٰذا اللہ کے بارے میں ہرگز یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ اس نے اپنے پیغمبروں سے جو وعدہ کر رکھا ہے، اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ یقین رکھو کہ اللہ اپنے اقتدار میں سب پر غالب ہے (اور) انتقام لینے والا ہے۔ اس دن جب یہ زمین ایک دوسری زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل جائیں گے) اور سب کے سب خدائے واحد وقہار کے سامنے پیش ہوں گے اور اس دن تم مجرموں کو اس حالت میں دیکھو گے کہ وہ زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہوں گے۔ ان کے قمیض تارکول کے ہوں گے اور آگ ان کے چہروں پر چھائی ہوئی ہوگی، تا کہ اللہ ہر شخص کو اس کے کیے کا بدلہ دے۔ یقیناً اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ یہ تمام لوگوں کے لیے ایک پیغام ہے اور اس لیے دیا جا رہا ہے، تا کہ انھیں اس کے ذریعے خبردار کیا جائے اور تا کہ وہ جان لیں کہ معبودِ برحق بس ایک ہی ہے اور تا کہ سمجھ رکھنے والے نصیحت حاصل کرلیں۔'' (ابراہیم:42-52)

باب:9

پہلی زندگی

میں نے آٹھ سال اکنامکس کی رسمی تعلیم حاصل کی ہے۔میری اور اکنامکس کی اس طویل رفاقت کے باوجود۔۔۔۔۔ہماری کبھی بن نہ سکی۔

زمانۂ طالبِ علمی سے ہی ہمارے بیچ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہونا شروع ہوچکی تھیں۔

بس۔۔۔۔۔دونوں کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کو برداشت کرلیا کرتے تھے۔

پورا سمیسٹر میں اسے منہ نہ لگاتا، گھاس نہ ڈالتا۔۔۔۔۔ہر آن، ہر لمحہ اسے نظرانداز کیے رکھتا اور پھر۔۔۔۔۔پرچے والے دن۔۔۔۔۔وہ سب حساب چکتا کرجاتی۔

ہر گزرتے دن کے ساتھ ہماری لڑائیاں شدت اختیار کرتی جارہی تھیں۔

آخر ایک دن۔۔۔۔۔اکنامکس کے چھوٹے بہن بھائی ''ریاضی'' اور ''سود'' کی وجہ سے ہماری باقاعدہ علیحدگی ہوگئی۔ویسے اب Separation کے بھی اتنے عرصے بعد۔۔۔۔۔اس کی غیر موجودگی میں ایسی باتیں کرنا اچھا تو نہیں لگتا، لیکن ابھی آپ سے بھی کیا چھپانا۔۔۔

دراصل میں اور اکنامکس مختلف تھے۔ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے باشندے تھے۔

یہ جو اکنامکس تھی۔۔۔۔۔بڑی مادہ پرست (Materialist) تھی۔

بس ہر وقت پیسہ، پیسہ، پیسہ کرتی رہتی تھی۔۔۔۔۔جبکہ میں تو تھا شروع سے ہی ملنگ۔

وہ دو جمع دو چار کرتی تھی۔۔۔۔۔مجھے ادھر ادھر کی باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔

اسے ''ریاضی'' بہت پسند تھی۔وہ ساری باتیں فارمولوں میں ہی کیا کرتی تھی۔

''ریاضی'' شکل وصورت سے تو مجھے بھی کبھی بُری نہیں لگی تھی، لیکن ''ریاضی'' کو بڑوں سے بات کرنے کی تمیز نہیں تھی۔بات چیت کرتے وقت وہ بالکل بے مروّت ہوجایا کرتی تھی۔''ریاضی'' کا دوٹوک اور قطعی رویہ مجھے کبھی ایک آنکھ نہ بھاتا۔کیا بڑوں سے ایسے بات کیا کرتے ہیں؟

پھر وہ ''سود''۔۔۔۔۔''سود'' تو اکنامکس کی آنکھوں کا تارا تھا، دلارا تھا۔''سود'' چند لمحات کے

لیے بھی ادھر ادھر ہو جاتا تو اکنامکس کی سانسیں رکنے لگتیں اور رنگ فق پڑ جاتا۔ ''سوڈ'' کے بنا اکنامکس سے دو قدم بھی نہ چلا جاتا، جبکہ میرے ذہن میں تو ''سوڈ'' کی پیدائش کے بارے میں ہی اشکالات پائے جاتے تھے۔ مجھے یہ ''سوڈ'' شکل سے ہی حرام کا جَنا لگتا تھا۔ اکنامکس کے اس لاڈلے سے مجھے با قاعدہ نفرت تھی۔ اس کم بخت کی وجہ سے ہماری کبھی بن نہ سکی۔

''سوڈ'' کی حرام خوریوں پر میں اسے ڈانٹ دیتا۔۔۔۔۔ اکنامکس اپنے لاڈلے کے ساتھ میرا یہ رویہ برداشت نہ کر پاتی۔۔۔۔۔ اور پھر ہماری ایک اور لڑائی ہو جاتی۔

اس لڑائی میں اکنامکس کو تو میں کسی نہ کسی طرح قابو کر ہی لیا کرتا تھا، مگر وہ۔۔۔

وہ آفت کی پڑیا، وہ ''ریاضی''۔۔۔۔۔ ''ریاضی'' کی مشکل باتوں کا جواب میرے پاس کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ''ریاضی'' مجھے ہمیشہ لاجواب کر دیا کرتی تھی۔

اور سچ بتاؤں تو ان تینوں بہن بھائیوں نے مل کر میرے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ویسے تو پہلے بھی بہت کم وقت ہم ایک ساتھ گزارا کرتے تھے اور پھر ان کی روز کی ''چخ چخ'' سے تنگ آ کر میں نے اپنا سارا وقت باہر دوستوں کے ساتھ گزارنا شروع کر دیا۔

بس۔۔۔۔۔ وہ کچھ ایسی ہی وجوہات تھیں کہ ایم ایس سی کے سیکنڈ سمیسٹر میں ریاضی کے فائنل پیپر والے دن میں کمرۂ امتحان میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی خاموش بیٹھا تھا۔

رات ہی میری اور اکنامکس کی شدید لڑائی ہوئی تھی۔ پورا سمیسٹر میں نے اسے لفٹ نہیں دی تھی اور آج اس کا دن تھا اور پھر معاف کرنا تو اس نے کبھی سیکھا ہی نہیں تھا۔ حالانکہ ساری رات جاگ کر میں اکنامکس کی باقاعدہ منتیں کرتا رہا، اگلے سمیسٹر سے پورا پورا وقت دینے کے وعدے بھی کیے مگر وہ پہلے۔۔۔۔۔ پچھلے سمیسٹر کا بدلہ لینے پر بضد تھی۔

اور پھر اس کی ضد کے آگے میں بھی خاموش ہو گیا۔ میری خاموشی کا ایک اور سبب اماں حضور کے وہ جوتے تھے، جو مجھے ابھی سے باقاعدہ نظر آنا شروع ہو چکے تھے۔

کمرۂ امتحان میں میرے بالکل سامنے، بس دو فٹ کی دوری پر بیٹھا ایک دوسرے ڈیپارٹمنٹ کا لڑکا میری اس خاموشی سے دھوکا کھا گیا۔ وہ اس خاموشی کو میری ذہانت کی علامت سمجھ بیٹھا۔ بات اگر بس یہیں تک رہتی تب بھی خیر تھی، مگر۔۔۔ وہ نگوڑا تو مجھ سے پیپر میں ''مدد'' کی درخواست بھی کرنے لگا۔

میں نے ایک نظر اس کے چہرے پر برستی یتیمی کو دیکھا۔۔۔۔۔ میں خاموش رہا اور۔۔۔

وہ دھوکے پہ دھوکا کھا گیا۔ اب وہ باقاعدہ میری منتیں کرنے لگا تھا کہ میں پرچہ حل کرنے میں اس

کی مدد کروں، وگرنہ وہ یونیورسٹی سے خارج ہو جائے گا۔

جواباً میں خاموش رہا۔۔۔۔۔کچھ بول ہی نہ سکا۔

ایسے میں امتحان کا وقت ہو گیا۔سبھی طالب علم اپنی اپنی نشستوں پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

پیپر تقسیم ہو گئے، سوال نامے بٹ گئے۔

میں نے ایک نظر تین صفحات پر مشتمل سوال نامے کی جانب دیکھا۔

مجھے کوئی شناسا صورت، کوئی جان پہچان والا لفظ نظر نہ آیا۔اکنامکس اپنا بدلہ لے چکی تھی۔

میں نے مایوسی میں ایک گہرا سانس لیا اور پرچے کو الٹا کر کے رکھ دیا۔

خاموش تو میں پہلے ہی تھا، اب باقاعدہ مراقبے میں بھی چلا گیا۔میرے اس مراقبے سے میرے سامنے والی نشست پر موجود لڑکا مزید متاثر ہو گیا۔اسے لگ رہا تھا کہ میرا یہ مراقبہ سوالوں کو عمدہ ترین طریقے سے حل کرنے کے لیے ہے، جبکہ میں اپنی نشست پر نیم دراز پڑا یہ سوچ رہا تھا کہ اماں کے متوقع جوتوں سے بچا کیسے جائے؟ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ۔۔۔

"گھر جاتے وقت بہانے کے طور پر اپنے دائیں ہاتھ پر پٹی کروائی جائے یا
بائیں ہاتھ پر؟ اگر دائیں ہاتھ پر پٹی کروائی تو کھاؤں گا کیسے؟
اور اگر بائیں ہاتھ پر پٹی کروائی تو۔۔۔؟؟؟"

بڑی پریشانی کا عالم تھا۔۔۔۔۔کچھ بھی تو سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

یہ زندگی کبھی کبھار انسان کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کرتی ہے کہ دو میں سے کسی ایک راستے کا انتخاب کرنا پھر ناممکن ہو جاتا ہے۔انسان کی پوری ذات ہی دو حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

زندگی کے کچھ فیصلے اتنے مشکل کیوں ہوتے ہیں؟

ابھی میرے اندر باقاعدہ ایک جنگ لگ چکی تھی۔

آدھا گھنٹہ گزر گیا۔۔۔۔۔ایک گھنٹہ۔۔۔۔۔ڈیڑھ گھنٹہ۔۔۔۔۔میں بے حس و حرکت اپنے مراقبے میں ڈوبا رہا۔کسی طور فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا اور شاید اب میرے سامنے بیٹھے اس لڑکے کو بھی حالات کا کچھ کچھ اندازہ ہو چکا تھا۔اسی لیے مجھ سے پوچھنے لگا:

"بھائی! پیپر نہیں آتا کیا؟"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے بولنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔بول نہ سکا۔

میں نے کوشش در کوشش کی۔۔۔۔۔الفاظ کہیں کھو سے گئے تھے۔

اپنے جسم و جان کی تمام قوتوں کو جمع کر کے میں نے اس لڑکے کو مکمل بات سمجھانے کی کوشش کی، مگر میرے منہ سے ایک مدھم سے ''نہیں'' کے سوا اور کوئی بھی آواز نہ نکل سکی۔

اور۔۔۔۔اور اب حالات الٹ ہو چکے تھے۔

وہ لڑکا جو محض چند لمحات پہلے تک مدد حاصل کرنے کے لیے با قاعدہ میری منتیں کر رہا تھا۔۔۔

اب وہی لونڈا۔۔۔۔اپنا مکمل حل شدہ پیپر میرے سامنے کیے اِک شانِ بے نیازی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔وقت کے اس الٹ پھیر پر تو میں ششدر تھا ہی، لیکن اس منحوس کا گرگٹ کی مانند رنگ بدلنا مجھے ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔اس کے باوجود۔۔۔۔اماں کے جوتوں کے خوف سے میں نے اس لڑکے کے حل شدہ پرچے پر نگاہ دوڑائی اور اپنا پرچہ حل کرنے کی ایک کوشش بھی کی۔

لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔۔۔۔ہر چیز اجنبی اجنبی دکھائی دے رہی تھی۔

اب مجھے اکنامکس پر ایک بار پھر سے غصہ آنے لگا تھا۔چھوٹی موٹی لڑائیاں تو ہر جگہ ہوتی رہتی ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں ہوتا کہ انسان برسوں کی رفاقت کو ہی بھول جائے؟ مجھے بیچ کمرۂ امتحان میں اس طرح دوسروں کے سامنے ذلیل کر کے۔۔۔۔وہ کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی؟

اپنی انہی سوچوں میں گم میں نے تھوڑا بے چین ہو کر اپنا پہلو تبدیل کیا تو۔۔۔

مجھے ایک اور جھٹکا لگ گیا۔

میرے بالکل قریب دائیں جانب والی نشست پر بیٹھی ایک ''چھپکلی'' اپنا پرچہ مکمل حل کر چکی تھی اور جانے کب سے میری اس حالتِ زار کو کن اکھیوں سے دیکھ کر لطف اندوز ہو رہی تھی۔۔۔

میسنا میسنا مسکرا رہی تھی۔

چھپکلی مجھے سادہ بھی بہت بُری لگتی تھی، مگر یہ مسکراہٹ والی ''چھپکلی'' تو مجھے با قاعدہ زہر لگی تھی۔

میں بے بس تھا اور مارے بے بسی کے اب میرے ہاتھ پاؤں سُن ہونے لگے تھے۔

یونیورسٹی میں ہم آٹھ دوستوں کا ٹولہ ہوا کرتا تھا۔کمرۂ امتحان میں میرے آس پاس موجود میرے ساتوں دوست اپنا اپنا پرچہ حل کر کے فارغ ہو چکے تھے اور اب ان منافقوں کو بھی میری یاد ستانے لگی تھی۔سب میری مدد کو پہنچ گئے۔نگران سے چھپ چھپ کر سبھی اپنا حل شدہ پیپر میری نگاہوں کے سامنے کر رہے تھے، لیکن مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

میں منتشر دماغی والی کیفیت میں کبھی اِدھر دیکھ رہا تھا تو کبھی اُدھر، جبکہ اِس دوران میرے ہاتھ لاشعوری طور پر میرے خالی پرچے کو ''گھُو چومُو چو'' کر کے چھوٹا، چھوٹا اور چھوٹا کرتے ہی چلے جا رہے تھے۔

دوسری جانب میرے دوست اب باقاعدہ میری منتیں کرنے لگے تھے کہ۔۔۔

''بھائی! لکھ لے، کچھ تو لکھ لے۔ بھائی منت ہے، خدا کا واسطہ ہے تجھے کچھ تو لکھ۔''

پھر دوستوں کے اس بے حد اصرار پر میں نے اکنامکس کے ساتھ اپنی ناراضی کو بھلا کر کچھ نہ کچھ لکھنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ میں نے اپنے پرچے پر لکھنے کے لیے پنسل ہاتھ میں پکڑ کر اپنے سر کو جھکایا تو۔۔۔

میرا سر گھوم گیا۔۔۔۔۔میرا کورے کاغذ جیسا پرچہ خود میرے اپنے ہی ہاتھوں میں مسلسل ''گھُو چومُوچو، گھُو چومُوچو'' ہونے کے بعد۔۔۔۔۔اب باقاعدہ ایک سخت گیند کی شکل اختیار کر چکا تھا۔

اپنے پرچے کی بنی اس درگت کو دیکھ کر میرے دونوں جبڑے ایک دوسرے پر کس گئے۔

میرے کان گرم ہوئے اور پھر میں نے پرچے کی بنی سخت گیند کو قریب ہی بیٹھی اس زہریلی مسکراہٹ والی ''چھپکلی'' کی جانب پھینک دیا۔

مجھے اپنی پھینکی گئی چیزوں کی رفتار پر کبھی شرمندگی نہ ہوئی تھی اور۔۔۔

اور اب کی بار تو زاویہ بھی بالکل ٹھیک بیٹھا تھا۔

جیسے ہی ''چھپکلی'' کے منہ سے ایک زوردار چیخ برآمد ہوئی۔۔۔۔۔میں بھاگ گیا۔

مجھے دورہ پڑ چکا تھا۔۔۔۔۔میں بھاگ گیا۔

یہ میری زندگی کا کامیاب ترین دورہ تھا۔ بھلے ہی میں ریاضی کے پرچے میں فیل ہو گیا، مگر میرا زاویہ درست ہو چکا تھا۔ میں اپنی زندگی کی پہلی ''چھپکلی'' مار چکا تھا۔

میں خوشی خوشی کمرۂ امتحان سے بھاگ کر ہاسٹل آ گیا۔

میں اماں کو اپنے اس ''کامیاب دورے'' کی خوشخبری سنانا چاہتا تھا، مگر اماں شاید میرے زاویے کی اس درستگی کی جگہ ریاضی کے پرچے میں میری ناکامی کو زیادہ اہمیت دیتیں، اس لیے میں خاموش ہی رہا۔

پھر اماں کے جوتوں سے بچنے کا مسئلہ بھی تو اپنی جگہ ویسے کا ویسے ہی موجود تھا۔

میں اسی شش و پنج میں مبتلا تھا کہ دوست کی جانب سے موبائل پر پیغام موصول ہوا۔۔۔

''چھپکلی'' کی اونچی ناک اور درمیانہ رشتہ۔۔۔۔۔دونوں ٹوٹ چکے تھے۔

جبکہ میرے حصے میں شوکاز نوٹس آیا تھا۔

میں نے اسی وقت اپنے اس دورے کا Cost Benefit Analysis شروع کر دیا۔

''چھپکلی'' کے ٹوٹے ہوئے رشتے کے بدلے میں مجھے شوکاز نوٹس۔۔۔یہ تو ہوا حساب برابر۔

اور۔۔۔۔۔اور ٹوٹی ہوئی ناک؟

میں نے اچانک ہی ہوا میں چھلانگ لگائی اور ساتھ ایک نعرۂ مستانہ بھی بلند کر دیا۔

''چھپکلی'' کے ساتھ ہوئی اس مڈبھیڑ میں مجھے ایک ٹوٹی ہوئی ناک کا نقد فائدہ ہو چکا تھا۔

میں خوش تھا۔ میں اپنی کاروباری صلاحیتوں پر مطمئن تھا، لہٰذا میں سو گیا اور پھر سویا ہی رہا۔

رات ہو گئی۔۔۔۔۔ بجلی چلی گئی۔۔۔۔۔ گرمیوں کے دن تھے۔

میں نے چارپائی کمرے سے باہر گیلری میں نکال لی اور پھر مچھروں سے بچاؤ کے لیے سفید چادر کو سر سے پاؤں تک تان لیا اور میں لیٹ گیا۔۔۔۔۔ میں سو گیا۔۔۔۔۔ میں سویا ہی رہا۔

رات 2 بج کر 37 منٹ۔۔۔

اچانک رونے کی تیز آوازوں اور شور شرابے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔۔۔۔۔ لیکن میں اپنی جگہ سے ہِل بھی نہ سکا۔ میرے ساتوں منافق دوست میری چارپائی کے اطراف میرے ہاتھ پاؤں قابو کیے ہوئے موجود تھے۔ وہ میری سفید چادر کو میرا کفن بنا چکے تھے اور اب میری اس جوان موت پر وہ رو رہے تھے، چیخ رہے تھے، چلّا رہے تھے۔

میں نے اپنے دوستوں کو بڑا سمجھانے کی کوشش کی کہ۔۔۔

''میں زندہ ہوں۔''

مگر وہ مجھے مرا ہو تسلیم کرنے پر بضد تھے اور پھر اپنے دوستوں کا دل رکھنے کی خاطر۔۔۔

میں مر گیا۔

میں جیتے جی مر گیا اور وہ میری موت پر روتے رہے۔ بار بار میرے چہرے سے سفید چادر ہٹا کر ''میت'' کا آخری دیدار بھی کیا جا رہا تھا۔ پورا ہاسٹل رونے کی تیز آوازوں سے گونجنے لگا تھا۔ میں نے مرے مرے ہی ایک بار پھر سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، حالات کی نزاکت کا کچھ احساس دلانا چاہا، مگر انہوں نے دو ہتھڑ مار کر مجھ مرے ہوئے کو مزید مار دیا۔

اب یہ ساتوں منافق مجھ مرے ہوئے پر باقاعدہ بَین کر رہے تھے۔ با آوازِ بلند میری ان خوبیوں کا ذکر کیا جا رہا تھا کہ جن خوبیوں سے میں خود بھی ساری زندگی ناآشنا رہا تھا۔

مجھے دوستوں کے اس جھوٹ سے گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔

شور شرابے اور ہنگامے کے سبب تمام ہاسٹل واسی جاگ چکے تھے۔ ہاسٹل کا لان طلباء سے بھر چکا تھا۔ سب اپنی نیند خراب ہو جانے کی وجہ سے غصے میں تھے، شدید غصے میں تھے۔

بحث و تکرار ہوئی اور بات بڑھتی ہی چلی گئی۔۔۔۔۔ پہلے گالم گلوچ ہوا اور پھر لڑائی۔

میرے دوست سات تھے، جبکہ ہاسٹل کے طلباء ڈیڑھ سو سے زائد۔

حالات کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے میں نے چپکے سے اپنی سفید چادر کو سر سے پاؤں تک تان لیا اور۔۔۔اور میں مر گیا۔

مر جانے میں ہی زندگی تھی۔اگر میں اس وقت زندہ رہ جاتا۔۔۔۔تو مار دیا جاتا۔

اب میں اگلے بہت سارے گھنٹے بس مرا ہی رہنا چاہتا تھا،مگر شور شرابا،لڑائی، بلکہ یک طرفہ مار کٹائی کی آوازیں مجھے چین سے مرنے بھی نہیں دے رہی تھیں۔اب کی بار دوستوں کی حقیقی چیخیں اور دھاڑیں میرے اعصاب پر منفی اثرات مرتب کر رہی تھیں۔وہ میرے دوست تھے،میرے جگر کے ٹکڑے تھے۔اپنے دوستوں کو اس تشویش ناک حالت میں دیکھ کر مجھ سے بھی رہا نہ گیا۔

میرے دونوں جبڑوں نے زور سے ایک دوسرے کے ساتھ ''جپھی'' ڈالی اور پھر۔۔۔

میں نے دائیں بائیں کچھ نہیں دیکھا۔۔۔۔۔میں بھاگ گیا۔

22 دن بعد۔۔۔

میرے ان دوستوں میں سے ایک کا ابّا فوت ہو گیا۔ہم آٹھوں دوست سیدھا فوتگی والے گھر پہنچ گئے۔

میں ہاسٹل سے۔۔۔۔۔باقی سات ہسپتال سے۔

بالکل سامنے ہی سفید چادر میں لپٹی چاچے کی میت پڑی تھی۔میں اپنے دوست کے غم میں نڈھال تھا۔مجھے بار بار رونا آ رہا تھا۔میں نے اپنی پُرنم آنکھوں سے اپنے دوستوں کو ڈھونڈنا چاہا تو وہ مجھے کہیں بھی دکھائی نہ دیے۔کافی کوشش کے بعد مجھے اپنے ساتوں دوست ایک کونے میں کھڑے نظر آ گئے۔

کم بخت! سب کے سب میت سے دور، بہت دور کھڑے تھے۔سب چپ تھے، بلکہ سُن تھے۔ کسی کی آنکھ میں ایک آنسو تک نہ تھا۔میں نے قریب جا کر حیرانی اور غصے کی ملی جلی کیفیت میں پوچھا:

''بدبختو! روتے کیوں نہیں ہو؟''

وہ سب تو ڈر کر یوں دو قدم پیچھے کو ہٹ گئے جیسے۔۔۔۔۔جیسے پھر سے ہاسٹل پہنچ گئے ہوں۔وہ سب مل کر اب الٹا مجھے سمجھانے لگے تھے کہ۔۔۔

''ناں بھائی ناں! مُردوں پر رویا نہیں کرتے، بین بھی نہیں کرتے۔''

چندرے، ابھی تک ڈرے ہوئے تھے۔لڑکے سہم چکے تھے۔آخر بچے ہی تو تھے ابھی۔

بیس بائیس سال کوئی مار کھانے والی عمر تھوڑی نہ ہوتی ہے۔

میں نے انہیں بڑا سمجھایا کہ۔۔۔''رولو! بین بے شک نہ کرو، مگر رولو۔زیادہ

اونچا نہ سہی، آہستہ آہستہ سہی، مگر کچھ نہ کچھ رو ضرور لو۔''

نہیں مانا کوئی بھی۔ سفید چادر میں لپٹے چاچے کی میت کے پاس جانے کے لیے بھی کوئی تیار نہ تھا۔ میت کا آخری دیدار بھی کوئی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس واقعہ کا اثر بچوں کے جسموں کے ساتھ ساتھ ذہنوں پر بھی موجود تھا۔

میری تمام کوششوں کے باوجود ان کا ڈر کسی طور ختم ہونے کو نہیں آرہا تھا۔

ویسے بز دل نہیں تھے، میرے یہ لگڑ بگھے، مگر سات اور ڈیڑھ سو، کوئی مقابلہ بھی تو نہیں تھا ناں۔

میں نے باقی چھے کو تو چھوڑ دیا، البتہ جس کا ابّا مرا تھا، اسے پکڑ لیا۔ ہاسٹل میں مجھ مرے ہوئے کو دو ہتھڑ مار کر مزید مار دینے والا یہی منافق تھا۔ میں نے بھیگی بلی بنے اپنے اس دوست کو بڑی شرم دلائی کہ۔۔۔

''تیرا ابّا مرا ہے، کچھ تو رو لے۔''

پتھر کا سینہ لے کر پیدا ہوا تھا شاید۔۔۔۔نہیں رویا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا اور کہا:

''چل آ، اپنے ابّے کا آخری دیدار تو کر لے۔''

مگر وہ کم بخت تو ایسے بِدکا جیسے میت کے دوسری جانب اسے ڈیڑھ سو کا ہجوم کھڑا نظر آ رہا ہو۔

اب میرے کان بھی گرم ہو چکے تھے۔ اب میں بھی بضد تھا کہ زبردستی کیوں نہ کرنی پڑے، مگر اپنے دوست کو اس کے ابّے کا آخری دیدار کروا کر ہی چھوڑنا ہے۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر زور سے کھینچا تو وہ بچوں کی مانند زمین پر لیٹ گیا۔

میں نے بازو چھوڑ دیا۔۔۔۔ٹانگ پکڑ لی۔۔۔۔اور اسے کھینچنا شروع کر دیا۔

دوست کا رنگ فق۔۔۔منتیں جاری۔۔۔

وہ اب مجھے اپنے زخم دکھا دکھا کر بول رہا تھا کہ۔۔۔

''بھائی! مجھے مُردوں کے قریب مت لے کر جا، مت لے کر جا۔ میت کا آخری دیدار مجھے راس نہیں آتا ہے۔ بہت درد ہوتی ہے بھائی، بہت درد ہوتی ہے۔''

اپنے بچپن کے دوست کا زخموں سے چور بدن دیکھ کر میرے اپنے جسم پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی۔

آخر میرا دوست تھا وہ، لہٰذا۔۔۔۔میں اسے ٹانگ سے پکڑے کھینچتا ہی رہا۔

اماں بھی وہیں پر موجود تھیں اور جانے کب سے میری اس ساری تگ و دو کو دیکھ رہی تھیں۔

اماں ہمارے قریب آ گئیں۔ اماں نے ایک نظر میرے دوست کی آنکھوں میں موجود خوف کے تاثرات کو دیکھا اور پھر اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔

ماں، ماں ہوتی ہے۔
اماں نے فوراً ہی اپنی تشخیص کا اعلان کر دیا۔۔۔
''اس کم بخت کو تو سفید چادر دیکھ کر دورے پڑتے ہیں دورے۔''
اور پھر تشخیص کے ساتھ ہی اماں نے علاج کرنے کی بھی ٹھان لی۔ اماں کا ہاتھ جوتے کی جانب بڑھتے دیکھ کر مجھے اپنا ریاضی کا پرچہ یاد آ گیا۔ میرے دونوں ہاتھوں میں سے کسی ایک پر بھی پٹی موجود نہیں تھی۔ ابھی تک فیصلہ نہیں ہو پایا تھا۔
میں اماں کو اپنے ''کامیاب دورے'' کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ میں نے ٹوٹی ہوئی ناک کے نقد فائدے کی خوشخبری بھی ابھی تک اماں کو نہیں سنائی تھی۔ میں اماں کو اپنے زاویے کی درستگی سے بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا، مگر اماں کے ہاتھ میں جوتا دیکھ کر۔۔۔
مجھے میرا اپنا دورہ پڑ گیا۔ میں بھاگ گیا۔
وہ دن ہے اور آج کا۔۔۔۔۔ میں بھاگ رہا ہوں۔۔۔۔۔ مسلسل بھاگ رہا ہوں۔
میرا دل وقت بے وقت ڈوبتا رہا ہے۔۔۔۔۔ مجھے ہمیشہ دورے پڑتے رہے ہیں۔
میں نے اپنی ساری زندگی میں بس ایک ہی کام کیا ہے۔۔۔۔۔ میں بھاگا ہوں۔
میں ہر جگہ سے بھاگا ہوں۔۔۔۔۔ میں ہر جگہ کے لیے بھاگا ہوں۔
سکول، مدرسہ، یونیورسٹی، ہاسٹل، گھر۔۔۔
ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک جگہ سے دوسری جگہ۔۔۔
میں ہمیشہ بھاگتا رہا ہوں۔۔۔۔۔ میں بھگوڑا ہوں۔
جب بھی مجھے محسوس ہوا کہ حالات میرے لیے اچھے نہیں ہیں۔۔۔
مشکلات ہیں، پریشانیاں ہیں۔
مجھے دورہ پڑا۔۔۔۔۔ اور میں اس جگہ سے بھاگ گیا۔
میں ہمیشہ آسان سے آسان ترین راستے کی تلاش میں رہا ہوں۔ میں نے ہمیشہ حالات سے، حقائق سے نظریں چرائی ہیں۔ بھاگ جانا ہی ہمیشہ میری اوّلین ترجیح رہی ہے۔ ہمیشہ راہِ فرار کو اختیار کیا ہے میں نے اور شاید۔۔۔ شاید اسی کو Escapism بولتے ہیں۔
لیکن اب کی بار میں پکڑا گیا ہوں۔ فرار ناممکن ہے۔ میں ایک بند گلی میں ہوں۔ میرے بھاگنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں۔ لاکھ کوشش کے باوجود مجھے بچاؤ کا کوئی ایک راستہ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

میں جتنا مرضی بھاگ لوں، جو مرضی کرلوں۔۔۔۔۔موت مجھے آلے گی۔
موت سے فرار ناممکن ہے۔۔۔۔۔موت میرے بالکل سامنے موجود ہے۔
موت۔۔۔۔۔اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت۔
بس کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے، کوئی ایک چھوٹا سا بہانہ اور۔۔۔
اس دنیا سے ایک نام ختم ہوجائے گا۔
بس ایک ہی جھٹکا اور سب کچھ اِدھر سے اُدھر ہوجائے گا۔۔۔۔۔سب ختم ہوجائے گا۔
میرے سب دورے بھی ختم۔۔۔۔۔میرے لیے یہ تمام کائنات ختم۔
موت سے بھاگنا ناممکن ہے۔۔۔۔۔موت کی تدبیریں بڑی پختہ ہیں۔
ہر لمحہ، ہر سیکنڈ مَیں موت کے قریب۔۔۔۔۔اور قریب ہوتا چلا جارہا ہوں۔
فرار ناممکن ہے۔۔۔۔۔میں ایک بند گلی میں ہوں۔
جب ایک بھگوڑے انسان کے بھاگنے کے سبھی راستے بند ہوجائیں ناں۔۔۔
تو احساسات کچھ اچھے نہیں ہوا کرتے ہیں۔سانسیں بوجھل ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔سینے میں گھٹن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ایک نیا ہی دورہ پڑ جاتا ہے، مگر فرار ناممکن ہے۔
دورے پہ دورے پڑتے جاتے ہیں، لیکن بھاگنے کا کوئی بھی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔
پھر موت کے نام پر محض ایک عبداللہ کو ہی دورہ نہیں پڑتا۔یہاں تو ہر شخص ہی موت کے نام پر خود کو بے وقوف بناتا ہے۔موت کو نگاہوں کے بالکل سامنے محسوس کر لینے کے باوجود۔۔۔
خود کو زندگی کے۔۔۔۔۔ہمیشہ زندگی کے دھوکے دیے جاتے ہیں۔
انسانی زندگیوں میں Escapism کی بہترین مثال موت ہے۔
کیا ہوا اگر ہم موت کو شکست نہیں دے سکتے۔۔۔۔۔ہم موت سے نگاہیں تو چرا سکتے ہیں ناں۔
موت کے تصور کو بھی اپنے ذہنوں سے دور رکھ کر ہم حقیقت سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔
خود اپنی موت کے بارے میں مذاق میں بات کر لینا، لکھ لینا ایک الگ چیز ہے، لیکن حقیقت میں اپنی موت کے بارے میں سوچنا، خود کو بسترِ مرگ پر تصور کرنا ہم بالکل پسند نہیں کرتے ہیں۔
کیا ہم پسند کرتے ہیں؟ کیا آپ نے زندگی میں کبھی خود کو بسترِ مرگ پر تصور کیا ہے؟
ہمیں تو اپنی اور اپنے عزیز رشتہ داروں کی موت کے بارے میں بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔
موت اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ایک ایسی حقیقت جس کا سامنا مجھے، آپ

کو، ہم سب کو کرنا ہی کرنا ہے۔موت سے بھاگنا ناممکن ہے، مگر ہم موت کے تصور سے نظریں چرا کر خود کو دھوکا دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

حالات سے گھبرا کر آنکھیں بند کر لینا۔۔۔۔۔کیا اسی کو Escapism نہیں بولتے ؟

ہم میں سے ہر انسان لاشعوری طور پر موت کے تصور کو خود سے دور رکھتا ہے۔

مگر کب تک ؟۔۔۔۔۔کب تک ہم خود کو زندگی کا دھوکا دیتے رہیں گے؟

حقائق سے نظریں چرا کر۔۔۔۔۔کب تک خود کو موت کے تصور سے آزاد رکھیں گے؟

اور اگر محض سانسوں کے رک جانے کا نام موت ہے تو پریشانی کیا ہے؟

لیکن موت تو حقیقی زندگی میں داخلے کا واحد راستہ ہے۔جسم کی موت کے بعد ہی تو ہماری حقیقی زندگی کا آغاز ہوگا۔۔۔۔۔ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ کی زندگی۔

ایک لامحدود زندگی۔۔۔۔۔ایک حقیقی لامحدود زندگی۔

پھر عین موت کے لمحات میں ہی ہر شخص جان جائے گا کہ۔۔۔۔۔جنت یا جہنم؟

یا تو ہماری ہر ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پورا کیا جاتا رہے گا۔

یا پھر۔۔۔۔۔موت ہی ہماری آخری خواہش بن جائے گی۔ہماری فنا ہو جانے کی خواہش کو بھی حسرت میں بدل دیا جائے گا۔

میں کون ہوں؟

جنتی ہوں؟۔۔۔۔۔یا پھر۔۔۔۔۔جہنمی ہوں؟

مجھے بس جنت میں جانا ہے۔میں جنت میں جانا چاہتا ہوں۔

مجھے اپنی ہر ہر خواہش کو پورا کرنا ہے۔میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ۔

مجھے جینا ہے۔۔۔۔۔میں امر ہونا چاہتا ہوں۔۔۔۔۔مجھے وقت کی قید سے آزادی چاہیے۔

میں فنا نہیں ہونا چاہتا۔۔۔۔۔میں مرنا نہیں چاہتا۔

مجھے اپنی ایک الگ دنیا بسانی ہے۔۔۔۔۔مجھے اپنی ایک الگ کائنات چاہیے۔

جنت ہی میری خواہش ہے۔۔۔۔۔جنت ہی میری ضرورت ہے۔

مگر۔۔۔۔۔مگر جنت کا راستہ اتنا دشوار کیوں ہے؟

جنت کا راستہ اچھائی کا راستہ ہے، صبر کا راستہ ہے۔جنت کے حصول کے لیے خود کو نفسانی خواہشات سے روکنا ضروری ہے، لیکن اچھائی کرتے ہوئے دل گھبرانے لگتا ہے، ہاتھ پاؤں پھول

جاتے ہیں۔نیکی کے تو نام پر ہی اچھے اچھوں کو دورے پڑ جاتے ہیں۔

برائی دل کو بھاتی ہے۔جی چاہتا ہے تھوڑا اور حرامی پن دکھایا جائے،مگر ہر برائی جہنم کی طرف جاتی ہے۔برائی کا راستہ جہنم کا راستہ ہے،لیکن جہنم جانے کی خواہش نہیں ہے۔جہنم کے تو ذکر سے ہی خوف آتا ہے۔

ایک طرف راستہ دلکش ہے،حسین ہے۔۔۔۔۔مگر جہنم کا راستہ ہے۔

دوسری جانب راستہ دشوار ہے،صبر ضروری ہے۔۔۔۔۔لیکن منزل جنت ہے۔

اور ایک ہم ہیں۔۔۔۔۔ہم جہنم کے راستے پر چل کر جنت میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر کا گیارہ قسموں کے بعد اعلان ہے کہ اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوگا اور برائی کا بدلہ برائی ہوگا،لیکن ہم ساری زندگی برائی کے راستے پر چل کر نتیجہ اچھائی والا چاہتے ہیں۔

ایک کام کرتے ہیں۔۔۔خود کو دھوکا دیتے ہیں۔۔۔۔۔حقائق سے نظریں چرا لیتے ہیں۔

آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔۔۔۔۔اور موت کو بھول جاتے ہیں۔

موت جانے کب آنی ہے اور کیا پتہ۔۔۔۔۔ہمیں موت نہ آنی ہو؟

موت جب آئے گی تب سوچیں گے ناں۔۔۔۔۔ابھی کے لیے تو موت کے تصور سے بھی بھاگ جاتے ہیں۔فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔۔۔۔۔خود کو دھوکا دیتے ہیں۔

ٹھیک ہے؟۔۔۔۔۔ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں میں؟

ہم سب شعوری یا لاشعوری طور پر یہی کام تو کرتے چلے آرہے ہیں۔عبداللہ اکیلا بھگوڑا نہیں ہے۔یہاں تو بڑے بڑے ''حقیقت پسند'' حالات سے نظریں چراتے ہیں،بلکہ اس دنیا میں تو جو جتنا بڑا حقیقت پسند جانا جاتا ہے،درحقیقت وہ اتنا ہی بڑا بھگوڑا ہوتا ہے۔اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت موت ہے۔موت سے نظریں ملانا ہی حقیقت پسندی ہے۔موت سے پہلے پہلے موت کی تیاری کر رکھنا حقیقت پسندی ہے،لیکن ہم بھاگ رہے ہیں۔ہم تو موت کے تصور سے ہی خود کو دور رکھتے ہیں۔

مگر کب تک؟بھاگنے کے سبھی راستے بند ہیں۔

میں جس سمت میں بھی قدم اٹھاؤں گا،میرا ہر قدم موت کی جانب ہے۔

میں بند گلی میں ہوں۔مجھے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا ہے۔

مجھے میری زندگی کا شدید ترین دورہ پڑ چکا ہے۔دل گھبرا رہا ہے اور سینے میں گھٹن ہے کہ بڑھتی چلی جارہی ہے۔میں اپنے ہی اندر موجود غبار کی شدت سے پھٹنے کو ہوں۔

میں بھگوڑا ہوں۔

مجھے بھاگنا ہے۔۔۔۔۔ مجھے راستہ چاہیے۔

مجھے جہنم کے تصور سے وحشت ہوتی ہے۔۔۔۔۔ مجھے جنت میں جانا ہے۔

واحد راستہ اچھائی کا راستہ ہے، مگر اس راستے پر حالات میرے من پسند نہیں ہیں۔ بہت ساری چیزیں میری مرضی کے خلاف ہیں۔ اچھائی ہی واحد راستہ ہے، لیکن میں اس راستے پر چلنا نہیں چاہتا۔ اپنی نفسانی خواہشات کو چھوڑنا میرے لیے مشکل ہے۔

اور۔۔۔۔ اور اگر برائی کے راستے پر چلتا رہا تو مارا جاؤں گا۔

میں بھاگنا چاہتا ہوں۔ میں حقائق کا سامنا نہیں کرنا چاہتا۔

مجھے میری زندگی کا شدید ترین دورہ پڑ چکا ہے، مگر میرے فرار کے سبھی راستے بند ہیں۔

اب کی بار میں پکڑا گیا ہوں۔ میں بے بس ہوں۔ میں لاچار ہوں۔

مجھے خدا سے شکوہ ہے۔ آخر خدا مجھے بھاگنے کیوں نہیں دے رہا؟

جنت جانے کی خواہش میں مجھے جہنم کا رِسک لینا ہی نہیں ہے۔ میں یہ امتحان دینا ہی نہیں چاہتا۔ میں اپنے وجود سے دستبردار ہو جانا چاہتا ہوں۔

مجھے اپنا ریاضی کا پیپر نہیں آتا تھا۔ میں نے پرچے کو ادھر ہی پھینک دیا اور خود کمرۂ امتحان سے باہر چلا گیا۔۔۔۔۔ پریشانی ختم۔

لیکن دھوکا دہی کے اس امتحان میں میرے بھاگنے کے سبھی راستے بند کیوں کر دیے گئے ہیں؟

میں یہ والا پرچہ پھینک کر کمرۂ امتحان سے باہر کیوں نہیں جا سکتا؟

اس امتحان میں شمولیت کے لیے میں نے کوئی درخواست بھی دی تھی کیا؟

کیا اس کمرۂ امتحان میں داخل ہونے میں میری اپنی بھی کوئی مرضی شامل ہے؟

شاید۔۔۔۔ شاید ان سوالوں کا جواب ہمیں اس کمرۂ امتحان میں نہیں ملے گا۔ اس کے لیے ہمیں کمرائے امتحان سے باہر جانا ہوگا۔ وقت میں پیچھے۔۔۔۔۔ بہت پیچھے کی جانب سفر کرنا ہوگا۔

ان تمام سوالوں کا جواب ہمیں ہماری پہلی زندگی میں ملے گا۔

اس کمرۂ امتحان میں داخل ہونے سے پہلے بھی میں اور آپ، ہم سب ایک مکمل زندگی گزار چکے ہیں۔ بس اس زندگی کی یادداشت ہم سے چھین لی گئی ہے۔ ہمیں ہماری پہلی زندگی کی تمام چیزیں اور باتیں بھلا دی گئی ہیں۔ اب ذرا آپ اپنے ذہن پر زور دیجیے اور یاد کرنے کی کوشش کیجیے، ہماری پہلی زندگی کو۔۔۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا:

''روحوں کے جھنڈ کے جھنڈ الگ الگ تھے۔ پھر وہاں جن روحوں میں آپس میں جان پہچان تھی، ان میں یہاں بھی محبت ہوتی ہے اور جو وہاں غیر تھیں، یہاں بھی وہ خلاف رہتی ہیں۔'' (بخاری:3336)

ہماری پہلی زندگی میں ہمیں جسمانی وجود عطا نہیں کیے گئے تھے۔ ہماری پہلی زندگی ہماری ارواح نے بسر کی تھی۔ ہماری پہلی زندگی اس قدر مکمل زندگی تھی، ایسی بھرپور زندگی تھی کہ اس زندگی کے اثرات آج ہماری اس زندگی پر بھی موجود ہیں۔ بہت سا وقت گزر جانے کے باوجود پہلی زندگی کی مدہم، بہت مدہم یادیں آج بھی میرے اور آپ کے اندر زندہ ہیں۔

جن لوگوں کے ساتھ ہم اس زندگی میں ملتے ہیں، وقت گزارتے ہیں، جو لوگ ہماری زندگیوں کا ایک حصہ ہیں، زندگی ہیں، ہم ایسے تمام لوگوں سے ہماری پہلی زندگی میں مل چکے ہوں گے۔ ہماری ان لوگوں کے ساتھ جان پہچان ہماری پہلی زندگی میں ہی ہو چکی ہوگی۔

ہماری پہلی زندگی اس قدر طویل اور ایسی مکمل زندگی تھی کہ اس زندگی میں ارواح نے نہ صرف آپس میں ملاقاتیں کیں، بلکہ ارواح کے تعلقات بھی قائم ہوئے۔ جن لوگوں کے ساتھ ہم عالمِ ارواح میں اچھے تعلقات قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے، ان لوگوں کے ساتھ ہم اس زندگی میں بھی اچھا وقت گزارتے ہیں۔ وہ ہمیں اچھے لگتے ہیں اور ہم ان کو اور پھر جن لوگوں کی اپنی پہلی زندگی میں آپس میں نہ بن سکی، وہ لوگ اس زندگی میں بھی اچھے تعلقات قائم کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

خدائے بزرگ و برتر ہماری پہلی زندگی کو ہماری قیامت والے دن کی حاضری سے تشبیہ دیتے ہیں:

''(پھر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان سے کہے گا کہ) تم ہمارے پاس اسی طرح تن تنہا آ گئے ہو، جس طرح ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تمہیں بخشا تھا، وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہمیں تو تمھارے وہ سفارشی کہیں نظر نہیں آ رہے، جن کے بارے میں تمھارا دعویٰ تھا کہ وہ تمھارے معاملات طے کرنے میں (ہمارے ساتھ) شریک ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ساتھ تمھارے سارے تعلقات ٹوٹ چکے ہیں اور جن (دیوتاؤں) کے بارے میں تمہیں بڑا زُعم تھا، وہ سب تم سے گم ہو کر رہ گئے ہیں۔'' (الانعام:94)

''اور سب کو تمھارے رب کے سامنے صف باندھ کر پیش کیا جائے گا۔ آخر تم

ہمارے پاس اسی طرح آ گئے، جس طرح ہم نے تمہیں پہلی بار پیدا کیا تھا۔ اس کے برعکس تمھارا دعویٰ یہ تھا کہ ہم تمھارے لیے (یہ) مقرر وقت کبھی نہیں لائیں گے اور (اعمال کی) کتاب سامنے رکھ دی جائے گی۔ چنانچہ تم مجرموں کو دیکھو گے کہ وہ اس کے مندرجات سے خوف زدہ ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ ہائے ہماری بربادی! یہ کیسی کتاب ہے جس نے ہمارا کوئی چھوٹا بڑا عمل ایسا نہیں چھوڑا، جس کا پورا احاطہ نہ کر لیا ہو اور وہ اپنا سارا کیا دھرا اپنے سامنے موجود پائیں گے اور تمھارا پروردگار کسی پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔'' (الکہف:48-49)

ہماری پہلی زندگی میں ہم سے ایک عہد بھی لیا گیا تھا۔ اس عہد کو ''عہدِ الست'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہم نے خدا سے کچھ قول وقرار کیے تھے۔ اس عہد میں ہم نے اللہ کو اپنا اللہ تسلیم کیا تھا۔

''اور (اے رسول ﷺ! لوگوں کو وہ وقت یاد دلاؤ) جب تمھارے پروردگار نے آدم کے بیٹوں کی پشت سے ان کی ساری اولاد کو نکالا تھا اور ان کو خود اپنے اوپر گواہ بنایا تھا اور (پوچھا تھا کہ) کیا میں تمھارا رب نہیں ہوں؟ سب نے جواب دیا تھا کہ کیوں نہیں۔ ہم سب اس بات کی گواہی دیتے ہیں (اور یہ اقرار ہم نے اس لیے لیا تھا) تاکہ تم قیامت کے دن یہ نہ کہہ سکو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے یا یہ نہ کہہ دو کہ شرک (کا آغاز) تو بہت پہلے ہمارے باپ دادوں نے کیا تھا۔ تو کیا آپ ہمیں ان کاموں کی وجہ سے ہلاک کر دیں، جو غلط کار لوگوں نے کیے تھے؟ اور اسی طرح ہم نشانیوں کو تفصیل سے بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ (حق کی طرف) پلٹ آئیں۔'' (الاعراف:172-174)

''ہم نے یہ امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کا بوجھ اٹھا لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا ظالم بڑا جاہل ہے۔'' (الاحزاب:72)

خدا کی طرف سے پیش کی جانے والی امانت کو ہم نے خود ہی اٹھانا پسند کیا تھا اور یہاں امانت سے مراد ''اپنی رضامندی اور خوشنودی سے اللہ تعالیٰ کے احکامات کی ذمہ داری قبول کرنا'' ہے۔ [1]

---

[1] اس موضوع پر مزید تفصیلات کے لیے سورۃ الانعام آیت:172 اور سورۃ الاحزاب آیت:72 کی تفسیر ملاحظہ کیجیے۔ تفہیم القرآن از سید ابوالاعلیٰ مودودی آسان ترجمہ قرآن از مفتی محمد تقی عثمانی

اس کمرۂ امتحان میں ہماری موجودگی میں ہماری اپنی مرضی شامل ہے ۔اس امتحان میں شمولیت کا فیصلہ ہر انسان نے خود اپنے ہوش وحواس میں رہتے ہوئے لیا تھا۔ کمرۂ امتحان میں ہمارا داخلہ اللہ کے ساتھ کچھ قول وقرار، ایک عہد کے بعد ہی وقوع پذیر ہوا ہے ۔ عہدِ الست میں ہم خدا کو اپنا حاکم مان کر آئیں ہیں ۔ اس عہدِ الست میں مزید کیا کیا چیزیں شامل تھیں؟

ہم خدا کے ساتھ کون کون سے وعدے کر کے اس دنیا میں آئے ہیں؟

کمرۂ امتحان میں داخلے سے پہلے اس امتحان کے بارے میں ہمیں کس حد تک معلومات فراہم کی گئی تھیں؟ کیا میں جانتا تھا کہ مجھے کس جسم میں رہ کر یہ امتحان دینا ہے؟ کیا کمرۂ امتحان میں داخل ہونے سے پہلے مجھے پتہ تھا کہ اس امتحان کے دوران مجھے کس قسم کے حالات میں سے گزارا جائے گا؟ کیا میں پہلے سے ہی یہ بات جانتا تھا کہ اس امتحان کے دوران میں کون کون سے لوگوں کے ساتھ کتنا کتنا وقت گزاروں گا؟

ان تمام حقائق سے پردہ تو موت کے بعد ہی اٹھے گا۔ البتہ جو بات یقینی ہے، وہ یہی ہے کہ اس امتحان میں شمولیت کا فیصلہ میرا ذاتی فیصلہ ہے۔ اگر آج مجھے اس کمرۂ امتحان سے بھاگنے نہیں دیا جا رہا تو اس میں اللہ کا مجھ پر کوئی بھی جبر نہیں ہے۔ یہ ظلم میں نے خود اپنے اوپر کیا ہے۔ یہ جہالت میری اپنی ہے۔

میرے بھاگنے کے تمام راستے بند ہو چکے ہیں ۔ اپنے بھاگنے کے تمام راستوں کو میں نے خود بند کیا ہے ۔ میں جتنا مرضی بھاگنے کی کوشش کرلوں ۔۔۔

موت مجھے آلے گی اور پھر موت کے فوراً بعد ہی جنت یا جہنم ۔

جنت مجھے اچھی لگتی ہے، مگر راستہ دشوار ہے، حالات میری مرضی کے خلاف ہیں ۔

جہنم میں مجھے نہیں جانا، مگر راستہ دلکش ہے، دلفریب ہے ۔

اور میری خواہش یہ ہے کہ میں برائی کرتے ۔۔۔ کرتے ۔۔۔ کرتے ۔۔۔

جہنم کے راستے پر چلتے ۔۔۔ چلتے ۔۔۔ چلتے ۔۔۔

کسی طرح سے جنت میں پہنچ جاؤں ۔ یقیناً ۔۔۔

میں احمق ہوں ۔۔۔ میں ظالم ہوں ۔۔۔ میں جاہل ہوں ۔

باب:10

بصیرت کیا ہوتی ہے؟

سیانے، احمق سیانے۔۔۔

اس کتاب میں جس اہتمام، جس شدّ و مد اور جس کثرت کے ساتھ ان سیانوں کا ذکرِ خیر ہوتا رہا ہے، ایسا ذکر شاید اور کسی بھی چیز کا نہ ہوا ہوگا۔

آخر یہ سیانے ہیں کون؟

کیا یہ کچھ مخصوص افراد ہیں، جو سیانے ہیں؟

یا پھر۔۔۔

''سیانا'' ایک کردار ہے، جس میں کوئی بھی شخص سما سکتا ہے؟

ایک شخص میں کیا کیا ''خوبیاں'' ہوں تو اسے سیانا کہنا چاہیے؟

اور یہ بصیرت کیا ہوتی ہے؟

ملتی کہاں سے ہے؟

بنیادی طور پر اس زندگی کو سمجھنے کے لیے، زندگی کو بہترین طریقے پر بسر کرنے کے لیے ہر انسان کو رہنمائی اور ہدایت کی ضرورت ہوتی ہے، علم کی ضرورت ہوتی ہے۔ خدا کی جانب سے کمرۂ امتحان میں تمام انسانیت کو دو طرح کا علم دیا گیا ہے۔ ایک علم وہ ہے، جو انسانی حواس سے وجود میں آتا ہے۔ اس علم کو انسانی علم یا پھر Human Acquired Knowledge کہا جاتا ہے۔

انسانی علم کے ارتقاء، ترقی اور اس کی حدود و قیود پر ہم کتاب کے حصہ اوّل میں تفصیل کے ساتھ بات کر چکے ہیں۔ جبکہ انسانی علم کے ساتھ ساتھ خدائے بزرگ و برتر انسانیت کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً براہِ راست بھی کچھ علم انسانیت کے حوالے کرتا رہا ہے۔ یہ علم پیغمبروں کے ذریعے مختلف آسمانی صحیفوں اور کتابوں کی شکل میں نازل کیا جاتا رہا ہے۔ اس قسم کے علم کو ہم الہامی علم، خدا کا علم یا پھر Revealed Knwoledge کہتے ہیں۔

اور قرآنِ حکیم اسی سلسلے کی آخری کتاب ہے۔

قرآنِ حکیم کی طرح ،تورات ، زبور اور انجیل بھی الہامی کتابیں ہیں اور ان کے سوا مزید الہامی کتب بھی ہوسکتی ہیں، جن کے بارے میں ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ البتہ قرآنِ حکیم کے سوا کوئی بھی اور الہامی کتاب اس وقت اپنی اصل حالت میں موجود نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلیاں ہوچکی ہیں، جبکہ قرآنِ حکیم کے آخری الہامی کتاب ہونے کے ناطے اس کی حفاظت کا کام خدائے بزرگ و برتر نے خود اپنے ذمے لے رکھا ہے، لہٰذا قرآنِ حکیم میں کسی بھی تبدیلی کا ہوجانا ناممکن ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ یہ ذکر (یعنی قرآن) ہم نے ہی اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔'' (الحجر:9)

آج اس وقت پوری دنیا میں جو قرآنِ حکیم پڑھا جاتا ہے، پڑھایا جاتا ہے، یہ وہی قرآنِ حکیم ہے، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حوالے کیا تھا اور اس بات کو تو قرآنِ حکیم کے مخالفین بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ساڑھے چودہ سو برس گزر جانے کے باوجود قرآنِ حکیم میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یہ یقیناً قرآنِ حکیم کا ہی ایک اعجاز ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے لے کر تا دمِ قیامت، قرآنِ حکیم میں ساری انسانیت کے لیے ہدایت اور رہنمائی موجود ہے۔

قرآنِ حکیم محض ایک کتاب نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ یہ علمِ کامل ہے۔

اس زندگی کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے انسانی حواس سے وجود میں آنے والا علم ناکافی ہے۔

انسان کا علم اور عقل ؛ دونوں محدود ہیں، بہت محدود ہیں۔ حقائق کو ایک حد سے زیادہ جاننا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ ہم لاتعداد پردوں کی لپیٹ میں ہیں۔ ان پردوں سے پرے دیکھنے کے لیے ہمیں صرف انسانی علم یا عقل کی نہیں، بلکہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ انسانی حواس سے پوشیدہ حقائق کو جاننے کے لیے ہمیں خدا کے علم کی ضرورت ہے، قرآنِ حکیم کی ضرورت ہے۔

انسانی علم جب خدا کے علم کی روشنی میں سفر کرنے لگے تو بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

انسانی عقل جب اپنی حدود کو پہچان کر قرآنِ حکیم کو اپنا امام بنالے تو بصیرت جنم لیتی ہے۔

پھر بصیرت کے ذریعے ان حقائق کو جانا جا سکتا ہے کہ جن حقائق کو انسانی حواس سے براہِ راست جاننا ناممکن ہوتا ہے۔ مائیکروسکوپ اور ٹیلی سکوپ سے بھی نظر نہ آنے والی چیزوں کو بصیرت

کے ذریعے دیکھنا ممکن ہے، عین ممکن ہے۔قرآنِ حکیم کی بصیرت حاصل ہو جائے تو پھر انسانی زندگی کی پیچیدہ پہیلی سمجھ آ جاتی ہے، انسان کی حقیقت سمجھ آنا شروع ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر۔۔۔

انسان کا علم یہ کہتا ہے کہ ایک انسان کی زندگی کا آغاز رحمِ مادر میں حمل قرار پانے سے ہوتا ہے اور پھر جسم کی موت پر انسان کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔یہ انسانی علم اور عقل دونوں کی انتہا ہے۔محض انسانی علم کی مدد سے انسان اور انسانی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ بھی جاننا ناممکن ہے۔

رحمِ مادر میں حمل قرار پانے سے پہلے ایک انسان کہاں پر موجود تھا؟ موجود تھا بھی یا نہیں؟

کیا جسم کی موت ہی ایک انسان کی زندگی کا اختتام ہے؟

ان سوالوں کا جواب نہ تو کوئی انسان اپنے حواس سے جان پایا ہے اور نہ ہی کبھی جان پائے گا۔اگر خدا کا اور قرآنِ حکیم کا انکار کر دیا جائے تو انسانی علم کے مطابق ایک انسان کی زندگی محض یہ ساٹھ ستر سال کی زندگی ہی ہے اور بس، جبکہ قرآنِ حکیم کے مطابق ایک انسان کی زندگی لامحدود ہے۔

میں اس جسم کی تخلیق سے پہلے بھی موجود تھا۔

میں اس جسم کی موت کے بعد بھی زندہ رہوں گا۔

میں ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ زندہ رہوں گا۔

میں اَمر ہوں۔

ہماری اس زندگی سے پہلے والی ایک زندگی اور پھر اس زندگی کے بعد والی ایک زندگی، ان دونوں زندگیوں کو اسی کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر دیکھنے کے لیے ہمیں انسانی علم یا عقل کی نہیں، بلکہ بصیرت کی ضرورت ہے۔انسانی زندگی کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں خدا اور خدا کے علم کی ضرورت ہے۔

ہمیں قرآنِ حکیم کی ضرورت ہے۔

کہاں وہ ایک محدود، بہت ہی محدود ساٹھ ستر سال کی روتی رلاتی ہوئی ایک زندگی۔

اور کہاں یہ ایک لامحدود۔۔۔

ہمیشہ ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی۔

یہ محدود سے لامحدود تک کا سفر ہی بصیرت ہے۔

میرے اس فانی وجود کو امر کر دینے والی چیز انسانی علم یا عقل نہیں ہیں۔

یہ حقائق مجھ پر قرآنِ حکیم کے ذریعے منکشف ہوں گے۔

بالکل اسی طرح انسانی علم اور عقل یہی بتاتے ہیں کہ میں ایک پانچ چھ فٹ کا جسم ہوں۔ایک کمزور، ناتواں اور بیماریوں میں گھِرا ہوا جسم۔ یہ جسم نہ تو اپنی مرضی سے پیدا ہوا تھا اور نہ ہی اپنی مرضی سے مرے گا۔ میں اپنے ہی جیسے مزید 7.8 ارب جسموں کے ساتھ ایک نقطے کی قید میں ہوں۔اس لامحدود کائنات میں، میں کچھ بھی تو نہیں ہوں۔

میں ایک حقیر ترین چیز ہوں۔ میرا وجود غیر اہم ہے۔

میرے ہونے یا نہ ہونے سے کچھ بھی فرق واقع نہیں ہوتا۔

میں وقت کا غلام ہوں۔ میں غلام ابنِ غلام ہوں۔

یہ زندگی بے بسی ہے، شرمندگی ہے۔

یہ انسانی علم اور عقل دونوں کی انتہا ہے۔محض انسانی علم کی مدد سے انسان اور انسانی زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ بھی جاننا ناممکن ہے۔

جبکہ قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ نہیں نہیں، میں یہ جسم تو ہوں ہی نہیں۔

یہ جسم تو محض دھوکا ہے۔۔۔۔۔ میں کچھ اور ہوں۔۔۔۔۔ میں روح ہوں۔

میں اشرف المخلوقات ہوں۔

میں۔۔۔۔۔ میں تو مسجودِ ملائک ہوں۔

میں کہیں اور سے آیا تھا۔۔۔۔۔ مجھے کہیں اور ہی واپس چلے جانا ہے۔

انسان کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں انسانی علم یا عقل کی نہیں، بلکہ بصیرت کی ضرورت ہے۔

کہاں نقطہ کا ایک بے وقعت قیدی اور وقت کا غلام اور کہاں یہ حقیقت کہ تمام کائنات ہی میری ہے۔

یہ جسم سے روح تک کا سفر ہی بصیرت ہے۔

ایک قدرے ترقی یافتہ بندر کو مسجودِ ملائک بنا دینے والی چیز انسانی علم یا عقل نہیں ہیں۔

یہ حقائق مجھ پر قرآنِ حکیم کے ذریعے منکشف ہوں گے۔

پھر انسانی علم اور عقل کے مطابق انسان کی اس ساٹھ ستر سال کی زندگی کا کوئی بھی خاص مقصد نہیں ہے۔انسانی وجود دیگر بے شمار حادثات کی طرح بس ایک حادثہ ہے۔ زمین پر موجود دیگر جانداروں اور انسان میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ انسان تھوڑی زیادہ ترقی کر چکا ہے۔خود کو زندہ رکھنے کے لیے گندی نالی کے حقیر کیڑے مکوڑے بھی کوشش کرتے ہیں، انسان بھی بھاگ دوڑ کر رہا ہے۔نسل کی بڑھوتری کے لیے سور بھی جنسی روابط قائم کرتے ہیں، بچے پیدا کرتے ہیں، انسان بھی یہی کام کر رہا ہے۔

ایک جانور اور انسان میں عملی طور پر کوئی بھی فرق موجود نہیں ہے۔ بے مقصد پیدائش، ایک روتی رلاتی زندگی اور پھر بے وقت کی موت۔ زندگی میں کچھ ضروریات پوری ہوتی ہیں، وگرنہ اکثر تِشنہ ہی رہ جاتی ہیں۔ یاس، حسرت اور مایوسی ہی انسان کا مقدر ہے۔

اس زندگی میں کامیابی کسے کہنا چاہیے؟ ناکامی کیا ہے؟ اس زندگی میں بڑا آدمی کیسے بنا جا سکتا ہے؟ کسی امیر گھر میں پیدا ہونے کے لیے ایک بچے میں کیا کیا خوبیاں ہونا ضروری ہیں؟ ایک حقیر انسانی وجود میں لامحدود خواہشات کیوں پائی جاتی ہیں؟ ان لامحدود خواہشات کو پورا کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ان خواہشات کی پیروی کرتے وقت اچھے یا بُرے کی تمیز کیوں کی جائے؟ اخلاقیات کی پابندی کیوں کرنی چاہیے؟ اگر زندگی یہی زندگی ہے تو ایک کمزور انسان کو رگڑا کیوں نہ دیا جائے؟ طاقتور شیر جنگل کے کمزور ہرنوں پر رعب کیوں نہ جھاڑے؟

پھر سب سے بڑھ کر۔۔۔

اگر زندگی یہی زندگی ہے تو ایک جنسی سور معصوم بچوں کو اپنی درندگی کا نشانہ کیوں نہ بنائے؟

قرآنِ حکیم کے بِنا انسانی علم اور عقل کے پاس ان سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب موجود نہیں ہے۔ ایک جنسی سور کو اس کے حرامی پن سے روکنے کے لیے انسانی علم میں کوئی ایک بھی عقلی دلیل نہیں ہے۔

یہ انسانی علم اور عقل کی بے بسی کی انتہا ہے۔ یہ انسانی علم اور عقل کی اوقات ہے۔

یہ اس دنیا کے ''صاحبانِ علم و دانش''۔۔۔۔۔ اس دنیا کے سیانوں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

محض انسانی علم کی مدد سے زندگی کے بارے میں اس سے زیادہ کچھ بھی جاننا ناممکن ہے۔

اس زندگی کی حقیقت جاننے کے لیے ہمیں خدا اور خدا کے علم کی ضرورت ہے۔

ہمیں قرآنِ حکیم کی ضرورت ہے۔

قرآنِ حکیم کہتا ہے کہ ہماری حقیقی زندگی کا آغاز تو ابھی ہونا ہے۔ یہ زندگی، زندگی نہیں ہے محض ایک امتحان ہے۔ ہماری حقیقی زندگی میں درجات کا فیصلہ اس امتحان میں ہماری کارکردگی کی بنیاد پر ہوگا۔ جو جتنی اچھی کارکردگی دکھائے گا، مقام و مرتبہ بھی اتنا ہی بلند ہوگا۔ دھوکا دہی کے اس امتحان میں بہتر سے بہتر کارکردگی دکھانا ہی انسانی زندگیوں کا مقصد ہے۔

ہر انسان میں موجود ہر ہر خواہش بھی اسی خدا کے اِذن سے ہے اور ان تمام خواہشات کی کامل تسکین کے لیے ہمیشہ قائم رہنے والی جنت بھی بنا دی گئی ہے۔ ایک انسان کی ساری بھاگ دوڑ اس جنت کے لیے ہونی چاہیے۔ جنت حاصل کر لینے والے افراد ہی کامیاب ہوں گے۔

ایک ایسی کامیابی جس کے بعد ناکامی نہ ہوگی۔ ایک ایسا عروج جس کو زوال نہ ہوگا۔
جو شخص بھی جہنم میں پھینک دیا گیا، وہ ناکام ہوگیا۔
جنت کے حصول کے لیے اور جہنم سے بچاؤ کے لیے اخلاقیات کی پابندی بہت ضروری ہے۔
قرآنِ حکیم کی مدد سے اگر انسانی زندگی کو سمجھنے کی کوشش کی جائے تو زندگی کے اس سفر کو منزل مل جاتی ہے۔ یہ زندگی با مقصد بن جاتی ہے۔ زندگی میں موجود تمام ناانصافیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ ہر ہر چیز میں عقلی اور منطقی دلائل نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ پھر اس زندگی کا ہر لمحہ نہ صرف قیمتی، بلکہ امر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اس چند سالہ زندگی کے ہر ہر لمحے کے اثرات ہماری اس ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی پر مرتب ہو رہے ہیں۔ جو اعمال بھی اس دنیا میں کریں گے، موت کے فوراً بعد وہ ہماری نگاہوں کے سامنے موجود ہوں گے۔

یہ زندگی ایک سفر ہے اور اس سفر میں خواہشات کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خواہشات برداشت کرنے کے لیے بھی نہیں ہوتیں۔ سفر کے اختتام پر، منزل پر پہنچ کر تمام خواہشات کو پورا کیا جائے گا۔ منزل پر پہنچ جانے کا انتظار کرنا ضروری ہے۔

کہاں وہ ایک بے ہنگم، بے مقصد اور مایوسی والی زندگی۔۔۔
اور کہاں یہ ایک با مقصد، با معنیٰ اور زندگی سے بھرپور زندگی۔
یہ برداشت سے صبر تک کا سفر ہی بصیرت ہے۔
انسانی زندگیوں کو حیوانی زندگیوں سے جدا کر دینے والی چیز انسانی علم یا عقل نہیں ہیں۔
یہ حقائق مجھ پر قرآنِ حکیم کے ذریعے منکشف ہوں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے بِنا ایک انسان اور حیوان میں کوئی بھی خاص فرق نہیں ہے۔ اگر قرآنِ حکیم کو انسانی زندگیوں سے خارج کر دیا جائے تو گھٹیا پن، رذالت، مایوسی اور ناانصافی کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ قرآنِ حکیم کے بِنا انسانی زندگیوں میں اتنے رخنے، ایسی ایسی بے ضابطگیاں پائی جاتی ہیں کہ اس دنیا کے سبھی سیانے مل کر بھی ان بے ضابطگیوں کو دور نہیں کر سکتے۔ اگر زندگی یہی زندگی ہے تو پھر انسان کے اندر پائی جانے والی لامحدود خواہشات بے معنیٰ ہیں۔ اخلاقیات کا وجود نہ صرف غیر منطقی ہے، بلکہ حماقت اور جہالت بھی۔

Free-Will کی حقیقت جانے بِنا اس زمین پر موجود سزا اور جزا کے سارے قوانین ظلم ہیں، زیادتی ہیں۔

بہر حال انسان اور انسانی زندگی کو سمجھنے کے لیے ہمیں محض انسانی علم یا عقل کی نہیں، بلکہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ ہمیں خدا اور خدا کے علم کی ضرورت ہے۔ ہمیں قرآنِ حکیم کی ضرورت ہے۔

انسانی علم جب خدا کے علم کی روشنی میں سفر کرنے لگے تو بصیرت پیدا ہوتی ہے۔

انسانی عقل جب اپنی حدود کو پہچان کر قرآنِ حکیم کو اپنا امام بنا لے تو بصیرت جنم لیتی ہے۔

جاننا چاہتے ہیں یہ سیانے کون ہیں؟

ہر وہ شخص، ہر وہ شخص سیانا ہے، جس نے اپنی پیدائش کو بھول کر اپنے محدود اور ناقص علم کو خدائے بزرگ و برتر کے علمِ کامل پر ترجیح دی ہے۔ قرآن کی حکمتوں کے مقابلے میں اپنی عقل کو ترجیح دینے والا ہر شخص سیانا ہے۔ عقل کی بے راہ روی سے سیانے جنم لیتے ہیں۔

اس زندگی کو سمجھنے سمجھانے کے لیے ہزاروں دانشوروں نے لاکھوں کتابیں لکھی ہوں گی۔ اسی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کے مختلف طریقے بتائے جاتے ہیں، بڑا آدمی بننے کے گُر سمجھائے جاتے ہے۔

ایک سوال پوچھوں؟

پانچ روزہ ٹیسٹ میچ کا ٹاس جیت کر اپنی کامیابی کا اعلان کر دینا چاہیے کیا؟

اس دنیا کے سبھی سیانے بس یہی کام کر رہے ہیں۔

ایک لامحدود زندگی کو اس ساٹھ ستر سال کی زندگی کے تجربات کی روشنی میں کیسے بیان کیا جا سکتا ہے؟

قرآنِ حکیم سے بصیرت حاصل کیے بِنا ہی اس زندگی کو سمجھنے سمجھانے والا ہر شخص سیانا ہے۔ ایک عام انسان کو گمراہ کر دینے والے اس دنیا کے یہ ذہین ترین افراد، سیانے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے مطابق کائنات اور کائنات میں موجود ہر ہر چیز کو انسان کے لیے پیدا کیا گیا ہے، لہٰذا کائنات میں Aliens کا وجود ناممکن ہے۔ اس کائنات میں نہ پائے جانے والے Aliens میں اپنے خداؤں کو تلاش کرنے والے افراد سیانے ہیں۔ ان نادیدہ Aliens کے کبھی نہ ہونے والے حملوں سے خوفزدہ رہنے والے سائنسدان سیانے ہیں۔ اس کائنات میں سے Aliens ڈھونڈ نکالنے پر بضد، SETI پروجیکٹس پر کام کرنے والے تمام دانشور اور سائنسدان سیانے ہیں۔ اگر ان سیانوں نے خدا کے علمِ کامل پر بھروسہ کیا ہوتا تو ان پروجیکٹس پر کی جانے والی محنت کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا تھا اور۔۔۔

اور آپ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ سیانے کون ہیں؟

شعور اور Free-Will دونوں ایسے عقدے ہیں، جن پر صدیوں سے دانشور اور فلسفی

حضرات بحث کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ہر دور میں انسانیت کے ذہین ترین افراد ان مسائل پر اپنی اپنی آراء کا اظہار کرتے رہے ہیں، کر رہے ہیں۔شعور کو انسانی دماغ میں ڈھونڈنے والے یہ ذہین ترین افراد نہ صرف سیانے ہیں، بلکہ احمق ترین سیانے ہیں۔ اگر یہ سیانے اپنی عقل کی حدود کو پہچان کر قرآنِ حکیم سے رجوع کرتے تو صدیوں کی محنت کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکتا تھا۔شعور کا سارا تعلق انسان کے حقیقی وجود ''روح'' کے ساتھ ہوتا ہے، جبکہ یہ احمق سیانے روح کے متعلق ایک چیز کو انسان کے دماغ میں ڈھونڈ رہے ہیں۔

بہر حال یہ تو محض چند مثالیں آپ کے سامنے بیان کی گئی ہیں، وگرنہ اس زمین پر ہر جانب سیانے بکھرے پڑے ہیں۔ خدا کے علمِ کامل کو پسِ پشت پھینک کر اپنی ہی عقل کے گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں۔ اپنی ہی علمی ترقی کے گیت گائے جا رہے ہیں۔

جاننا چاہتے ہیں کہ سیانا کون ہے؟

ہر وہ شخص سیانا ہے جس نے خلافِ قرآن بات کی ہے اور ایسے ہر شخص کو بہت جلد اپنے تمام الفاظ واپس لینا ہوں گے۔عبداللہ، کرشن، چندو، چارلی، مولوی، معیشت دان۔۔۔

نام، رنگ ونسل یا پھر مذہب سے بھی کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔جس شخص نے بھی خدا کے علم کے خلاف اپنے علم سے کوئی بات کی، وہ شخص سیانا ہے۔

اگر یہ خلافِ قرآن بات لاعلمی میں کی گئی ہے تو۔۔۔۔۔جہالت ہے، گمراہی ہے اور۔۔۔

اگر شعوری طور پر قرآن کے ساتھ اختلاف کیا گیا ہے تو۔۔۔۔۔شیطنت ہے، دجالیت ہے۔

اور یہ ایک نکما انسان۔۔۔ یہ بھگوڑا، یہ عبداللہ۔۔۔

آخر ایک عام سے انسان عبداللہ کی یہ اوقات کیونکر ہے کہ وہ اس دنیا کے بہترین دماغوں کو جاہل اور احمق بول رہا ہے۔ نہ صرف بول رہا ہے، بلکہ اپنی اس بات کو عملی طور پر ثابت کرنے کی کوشش بھی کر رہا ہے۔ میرے اور سیانوں کے بیچ ہونے والی میری اس خود ساختہ اور یک طرفہ لڑائی میں۔۔۔کس کی بات ٹھیک ہے؟۔۔۔۔۔اور کس کی بات غلط؟

ان سیانوں کے نوبل انعام یافتہ نظریات درست ہیں؟۔۔۔۔۔یا پھر بھگوڑے کی باتیں؟

عبداللہ ٹھیک ہے؟۔۔۔۔۔یا پھر یہ سیانے؟

یہ دونوں ہی ٹھیک ہیں؟۔۔۔۔۔یا پھر یہ دونوں ہی غلط؟

آخر اس دنیا میں صحیح اور غلط کے یہ تمام فیصلے کیسے ہوں گے؟۔۔۔۔۔کون کرے گا؟

اگر اس دنیا کے مروّجہ اصولوں اور جمہوریت (جس کی لاٹھی اس کی بھینس) کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یقیناً میں اور میری باتیں ہی غلط ہیں۔آخر اس دنیا کے بہترین دماغ ،انسانوں کی عظیم اکثریت بیک وقت غلط تو نہیں ہو سکتی ،مگر۔۔۔

مگر خدا کے ہاں فیصلے کثرتِ رائے سے نہیں ہوا کرتے۔

خدا کے ہاں یہ جمہوریت نہیں چلتی۔

وہ خدا ہی سب سے زیادہ طاقتور ہے،اس کے سامنے سبھی لاٹھیاں ٹوٹ جاتی ہیں۔

اس زمین کے سبھی باشندے اگر مل کر بھی یہ کہہ دیں کہ چوری کرنا اچھی چیز ہے تو چوری کرنا ایک اچھی چیز نہیں بن جائے گی۔

یہ جنگل کا قانون ہے اور یہ قانون خدا کے ہاں نہیں چلتا۔

خدا کے ہاں تو حق کو ہی حق جانا جاتا ہے، نہ کہ کثرتِ رائے کو۔

مخلوق کے درمیان صحیح اور غلط کے تمام فیصلے کرنے کے لیے بس اللہ کا علم کامل ہی کافی ہے۔

> ''اور اگر تم زمین میں بسنے والوں کی اکثریت کے پیچھے چلو گے تو وہ تمھیں اللہ کے راستے سے گمراہ کر ڈالیں گے۔وہ تو وہم وگماں کے سوا کسی چیز کے پیچھے نہیں چلتے ہیں اور ان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ خیالی اندازے لگاتے رہیں۔
> یقین رکھو تمھارا رب خوب جانتا ہے کہ کون راستے سے بھٹک گیا ہے اور وہی ان لوگوں کو خوب جانتا ہے، جو صحیح راستے پر ہیں۔'' (الانعام:117-116)

اس زمین پر موجود انسانوں کی اکثریت تو ہمیشہ گمراہ رہی ہے۔

اس لیے کثرتِ رائے۔۔۔۔۔کوئی دلیل نہیں ہے۔

ہماری اس دنیا کی زندگی میں کون ٹھیک ہے؟۔۔۔۔۔اور کون غلط؟

کون ہدایت پر ہے؟ اور کون گمراہ؟۔۔۔۔۔کون جنتی ہے؟ اور کون جہنمی؟

ان باتوں کو ہم نہیں جان سکتے۔ان تمام فیصلوں کے لیے ایک روز مقرر کیا جا چکا ہے۔اس دن یہ تمام فیصلے کر دیے جائیں گے۔البتہ قیامت سے پہلے پہلے اسی زندگی میں۔۔۔

کیا چیز ٹھیک ہے؟ اور کیا چیز غلط؟

کس کی بات ٹھیک ہے؟ اور کس کی بات گمراہ کن؟

کس کی اخلاقی حِس اپنی صحیح حالت میں موجود ہے؟ اور کس کی اخلاقی حِس میں گڑبڑ ہو چکی ہے؟

اس زندگی میں مختلف چیزوں، باتوں اور نظریات کے مابین غلط اور ٹھیک کے فیصلے کرنا آسان کام ہے، بالکل بھی مشکل نہیں ہے۔ صحیح کو غلط سے جدا کر دینے والی چیز قرآنِ حکیم ہے۔

قرآنِ حکیم علمِ کامل ہے۔ انسانی علم کی صحت کو قرآنِ حکیم کی مدد سے جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

بالکل آسان سا فارمولا ہے۔۔۔

''جو چیز، جو بات اور جو نظریہ قرآنِ حکیم کی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے۔۔۔۔ وہ ٹھیک ہے، جبکہ جو چیز، جو بات اور جو نظریہ قرآنِ حکیم کی تعلیمات کے خلاف ہے۔۔۔ وہ غلط ہے۔''

قرآن نے کہہ دیا کہ چوری کرنا بُری بات ہے تو بُری بات ہے۔

چور نے ایک بُرا کام کیا ہے۔

اب وہ چور ایک اچھا انسان تھا یا بُرا؟۔۔۔۔ جنتی تھا یا جہنمی تھا؟

یہ باتیں خالق جانے اور اس کی مخلوق۔

ہم ان چیزوں کے فیصلے نہیں کر سکتے۔ ہم تو خود حالتِ امتحان میں ہیں۔

بالکل اسی طرح سے اس دنیا میں موجود ہر ایک انسان کی ہر ہر بات کی صحت کو قرآنِ حکیم کی مدد سے جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ ان سیانوں کا ہر وہ نظریہ جہالت ہے، گمراہی ہے، جو نظریہ خلافِ قرآن ہے۔ اب بھلے ہی اس نظریے کو ہزار نوبل انعام ہی کیوں نہ دیے جا چکے ہوں، خدا کی نظر میں ان کی یہ جہالت، جہالت ہی رہے گی۔

ہماری اس کتاب میں سیانوں کے ایسے ہی چند نظریات بیان کیے گئے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اللہ نے فرما دیا کہ معیشت کے لیے شرح سود صفر بہتر ہے تو شرح سود صفر ہی بہترین ہے۔ اس میں کسی شک کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی۔ اگر آج اسلامی جمہوریہ پاکستان کے تمام سیانے مل کر بھی یہ کہہ دیں کہ معیشت کے لیے شرح سود سات فیصد بہتر ہے تو یہ تمام سیانے احمق ہیں، جاہل ہیں۔ ان سیانوں کو بہت جلد اپنے تمام الفاظ واپس لینا ہوں گے۔

میرے اور سیانوں کے مابین میری اس خود ساختہ اور یک طرفہ لڑائی میں سیانوں کی تعداد کثیر سہی، ان کے نظریات کو نوبل انعام کا ''بڑا سرٹیفکیٹ'' بھی حاصل ہے۔

عبداللہ نکما سہی۔۔۔

عبداللہ بھگوڑا سہی۔۔۔

مگر عبداللہ کے پاس اللہ کا قرآن ہے۔ عبداللہ کے ہاتھ میں، سینے میں اللہ کا کلام موجود ہے۔ یہ قرآن حکیم کتاب نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔

یہ حکمت ہے۔ یہ دانش ہے۔ یہ کتابِ زندگی ہے۔

انسان اور انسانی زندگی کے تمام راز، تمام ''کوڈ ورڈز'' اسی ایک کتاب میں پوشیدہ ہیں۔ دھوکا دہی کے امتحان میں پوچھے گئے ہر سوال کا جواب اس میں ہے۔ قرآن حکیم کی انسانی علم پر وہی برتری ہے کہ جو برتری خود اللہ کو اپنی تمام مخلوقات پر ہے۔ اس زمین پر لاکھوں کتب خانوں میں موجود کروڑوں کتب مل کر بھی قرآن حکیم کی محض ایک سطر کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔

اس لیے جب تک عبداللہ کی باتوں میں قرآنِ حکیم کا عکس موجود ہے، خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم! اس دنیا کے سبھی سیانے مل کر بھی اکیلے بھگوڑے عبداللہ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انسان اور انسانی زندگی کی حقیقت کو عبداللہ سے بڑھ کر محض وہی شخص جان سکتا ہے، جس کے پاس قرآنِ حکیم کا علم عبداللہ سے زیادہ ہے اور ایسے ہر شخص پر عبداللہ کو رشک آتا ہے۔

اگر عبداللہ کی بات قرآنِ حکیم کی تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہے تو پھر عبداللہ کی بات ہی حق ہے، سچ ہے، لیکن۔۔۔

لیکن اگر کہیں عبداللہ نے خلافِ قرآن کچھ لکھ دیا تو پھر عبداللہ ذلیل ہو گیا، رسوا ہو گیا۔

پھر عبداللہ ہی سب سے بڑا احمق ہے، جاہل ہے۔

ہماری اس کتاب کی بس ایک ہی خاص بات ہے، لیکن یہ ایک خاص بات بھی بہت خاص ہے۔ اس کتاب کو اللہ کی کتاب کے ساتھ نسبت ہے۔ اس میں محمد رسول اللہ ﷺ کی فرمائی باتیں ہیں۔ اس کتاب میں قرآن حکیم کی 337 آیات اور 42 احادیثِ رسول ﷺ کے تراجم کو براہِ راست شامل کیا گیا ہے، جبکہ بالواسطہ طور پر کتاب کے بین السطور میں بیان کی گئی آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ رسول ﷺ کی تعداد اس سے کہیں بڑھ کر ہے۔

اس کتاب میں بیان کیے گئے تمام خیالات اور نظریات قرآن وسنت سے ماخوذ ہیں۔ کتاب کے حصہ اوّل میں اگرچہ قرآنِ حکیم کو براہِ راست شامل نہیں کیا گیا تھا، مگر حصہ اوّل بھی سارا قرآن حکیم سے ہی ماخوذ ہے۔ اگر انسانی خواہشات کا رونا بار بار رویا گیا ہے تو وہ جنت کی تمہید ہے۔ اگر اس کائنات اور شعور پر الگ الگ باب قائم کیے گئے ہیں تو یہ چیزیں بھی قرآن سے اخذ کی گئی ہیں۔ اس کتاب میں زیرِ بحث آنے والے تمام موضوعات درحقیقت قرآنِ حکیم کے موضوعات ہیں۔

مختصر یہ کہ اس کتاب میں بیان کیے گئے ہر ہر نظریے کے حق میں میرے پاس قرآن وسنت سے دلائل موجود ہیں۔انسانی علم اور خدا کے علم کی مدد سے اس کتاب میں بیان کیے گئے ہر ہر نظریے کا دفاع کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتا ہوں ،مگر۔۔۔

مگر ان تمام باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ میں انسان ہوں۔

میرے پیچھے بھی شیطان لگا رہتا ہے۔اپنے ساتھی شیطان سے اس کتاب کو محفوظ رکھنے کی میری تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود اس بات کا قوی امکان بھی موجود ہے کہ انجانے میں کہیں اس کتاب میں کوئی بات خلافِ قرآن نہ لکھ ہوگئی ہو۔

میرا علم اور میری عقل دونوں بہت محدود ہیں۔اس کتاب میں میری عقل سے ماوراء بہت ساری غلطیوں کا پایا جانا عین ممکن ہے۔ہر چیز کا حقیقی علم تو بس اللہ کے پاس ہے۔انجانے میں اس کتاب میں لکھی گئی ہر غلط بات کے لیے میں خدائے رحمن سے معافی کا طلب گار ہوں اور میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو اس کتاب کے شر سے محفوظ رکھیں اور اس کتاب کو ہماری دنیا وآخرت کی زندگی میں بہتری کا وسیلہ بنا دیں۔(آمین یا رب العالمین)

اور اب چلیں آپ کو ایک کہانی سناتا ہوں۔

اس کتاب کی کہانی۔۔۔

جب میں چھوٹا سا تھا تو میں چھوٹا تھا۔۔۔۔۔پھر میں بڑا ہوگیا تو میں بڑا ہوگیا۔

لیکن اس چھوٹے سے بڑا ہونے کے بیچ ایک زندگی۔۔۔۔۔ایک مکمل زندگی گزر گئی۔

میں اپنی اس زندگی میں بہت سارے کام کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔نہ کرسکا۔

میں اپنی اس زندگی میں بہت سارے کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔۔۔مجھے وہ کام کرنا پڑے۔

مجھے اس زندگی میں بہت سی ایسی چیزیں ملیں، جو میری اوقات سے بڑھ کر ہیں اور پھر اس زندگی نے مجھے کچھ بہت ہی معمولی چیزوں کے پیچھے بھگایا بھی ہے۔

اِس وقت نے ہمیشہ اپنی ہی من مانی کی ہے۔

یہ وقت کبھی میرے ہاتھ نہیں آیا۔

گرمیوں میں کھلے آسمان تلے سونے والے ہر بچے کی مانند یہ آسمان ہمیشہ میری توجہات کا مرکز رہا ہے۔یہ ستارے ہمیشہ مجھے اپنی جانب بلاتے رہے ہیں۔اس کائنات کی وسعتوں نے ہمیشہ مجھے میرے چھوٹے پن کا احساس دلایا ہے۔

معاشیات کے ہر طالبِ علم کی مانند انسانوں میں موجود معاشی، معاشرتی اور سماجی تفرقات مجھے پریشان کرتے رہے ہیں۔ انسانی خواہشات کو حسرتوں میں تبدیل ہوتے دیکھنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔ اس زندگی میں کامیابی کے اجزاء ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی ہے میں نے۔ حتیٰ کہ میرا ایم فِل کا Thesis بھی کچھ ایسے ہی موضوع پہ تھا۔ بہت سارے ''کامیاب'' اور ''ناکام'' لوگوں کے اعداد و شمار اکٹھے کیے، ان کی زندگیوں کے حالات پر غور و فکر کیا۔۔۔۔۔ مگر کوئی بات بن نہ سکی۔

بے شمار چیزیں میری سمجھ سے بالاتر تھیں۔ بہت ساری کڑیاں غائب تھیں۔

بلبلوں کی مانند بہت سے سوال میرے دماغ میں بنتے اور بکھرتے رہے ہیں۔ اپنی عقل سے میں نے ان تمام سوالوں کے جواب ڈھونڈنے کی ہر ممکن کوشش کی، لیکن کبھی کوئی مناسب جواب نہیں ملا۔ مجھے اپنی ناکامی کا مکمل اعتراف ہے۔ زندگی کو سمجھنے کے لیے بہت سے دانشوروں کی ''دانش'' پر مبنی گفتگو پڑھی اور سنی، مگر سوائے یاس، حسرت، مایوسی کے اور کچھ نہیں ملا۔

پھر فروری 2020ء میں میرے خدا کی رحمت نے مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔ خدا نے خود میری رہنمائی کرنے کا فیصلہ کیا اور قرآنِ حکیم کے ساتھ میرا پہلا معنوی ربط قائم ہو گیا۔

مجھے کتابِ زندگی مل گئی۔۔۔۔۔ مجھے میرے ہر سوال کا جواب مل گیا۔

یہ زندگی سکڑتے سکڑتے دو تین گھنٹوں کا ایک امتحان بن گئی اور۔۔۔۔۔ میں لامحدود ہو گیا۔

قرآنِ حکیم کے ساتھ میرا تعلق کوئی نیا نہیں تھا۔ حافظِ قرآن ہونے کے ناطے ساری زندگی قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک ربط ضرور رہا ہے، لیکن یہ تعلق ایک مذہبی کتاب کو ثواب کی نیت سے پڑھنے تک ہی محدود رہا تھا۔ سینکڑوں بار قرآنِ حکیم کو پڑھا ہو گا، لیکن یہ کبھی اندر، بہت اندر اتر کر دل کے تاروں کو چھیڑ نہ سکا، لیکن جیسے ہی قرآنِ حکیم کے ساتھ میرا معنوی ربط قائم ہوا تو سب سے پہلے جو چیز میں نے محسوس کی، وہ یہی تھی کہ۔۔۔

''یہ قرآن محض ایک کتاب نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے، یہ کچھ اور ہی ہے۔''

میرے دماغ میں کلبلانے والے سوالات کا جانے اسے کیسے علم ہو جاتا تھا؟

میرے ہر خیال اور سوچ کو قرآنِ حکیم نے پہلے جانا۔۔۔۔۔ اور پھر مجھے اس کا باقاعدہ جواب دیا۔ برسوں سے میرے اندر شور مچانے والے سبھی سوال خاموش ہو گئے۔

ابھی قرآنِ حکیم مکمل بھی نہیں ہوا تھا کہ محض تیس چالیس دنوں کے اندر اندر ہی میں ایک حقیر وجود سے مسجودِ ملائک بن چکا تھا۔

یہ زندگی سمٹ کر میری فنگر ٹپ پر آ گئی۔۔۔۔کائنات کو لپیٹ کر میرے ہاتھ میں تھما دیا گیا۔

میری مجھ سے ملاقات ہوگئی۔۔۔۔۔مجھے وقت کی قید سے آزادی مل گئی۔

میری ہر ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا۔۔۔۔۔میں امر ہوں۔

ان تمام چیزوں پر اگر تھوڑا سا، تھوڑا سا بھی یقین آ جائے تو پھر احساسات کو الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہوجاتا ہے۔ ہر خواہش تکمیل پا جاتی ہے۔ بس ایک انتظار باقی رہ جاتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مَیں بہک رہا تھا۔ میں بِن پیئے نشے میں تھا۔

شاید میں اپنی اس کیفیت میں۔۔۔۔۔''میں خدا ہوں'' کا نعرہ بھی لگا دیتا، لیکن پھر احساس ہوا کہ ہم کنویں کے مینڈک ہیں۔ ہماری سوچ بہت محدود ہے۔ اس کنویں میں رہتے ہوئے جو ہمارا خدا کا تصور ہے، اللہ نے اپنی بہترین مخلوق انسان کو اس سے بھی کہیں اوپر تخلیق کیا ہے۔

جبکہ وہ اللہ وہ ہمارے ہر تصور سے پاک ہے، ہماری ہر سوچ سے بلند ہے۔

بہت جلد بات میری سمجھ میں آ گئی کہ خدا بن کر سولی چڑھنے سے بہتر ہے کہ انسان بن کر اپنے ہی جیسے خود سے ناآشنا انسانوں کو انسان بنانے کی کوشش کی جائے۔ قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک معنوی ربط قائم کر کے اس کی حکمتوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی جائے، لہٰذا جون 2020ء سے میں نے اپنے قریبی دوست احباب کے ساتھ ملاقات اور گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔ انسان اور انسانی زندگی کو سمجھنے سمجھانے کی کوشش کی۔ قرآنِ حکیم کی جانب دعوت دی۔ ایک بار نہیں۔۔۔بار بار دی۔

کچھ افراد نے بات سنی۔۔۔۔۔توجہ سے سنی۔۔۔۔۔لیکن عملی طور پر کچھ نہ بدلا۔

کچھ افراد کو قرآنِ حکیم کے ذکر سے ہی گھبراہٹ ہونے لگی۔۔۔

دل ڈوب گیا، ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

آپ سمجھ رہے ہیں ناں میری بات؟؟؟

قصہ مختصر، میری اس مختصر دعوت کے کچھ حوصلہ افزاء نتائج برآمد نہ ہوئے۔

میں جس گرم جوشی کے ساتھ انسان کو انسان کی عظمت سے آگاہ کرنا چاہتا تھا، سامنے سے وہی گرم جوشی مجھے نظر نہیں آئی، بلکہ۔۔۔

بلکہ کچھ افراد نے تو ''مشکوک'' نگاہوں سے میری جانب دیکھا بھی۔

میری دعوت کا جوش ٹھنڈا پڑنا شروع ہوگیا۔

جبکہ قرآنِ حکیم سے ملی بصیرت مجھے یہی بتا رہی تھی کہ ''دعوت ضروری ہے، اشد ضروری ہے۔''

دعوت لازم تھی، لیکن میری اس دعوت کے کچھ خاص نتائج برآمد نہیں ہو رہے تھے۔

میں کشمکش میں تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا، وگرنہ میں اس زمین پر موجود ہر انسان کو قرآنِ حکیم کے ساتھ کسی کمرے میں بند کر دیتا اور پھر اس وقت تک باہر نہ نکلنے دیتا، جب تک اس شخص پر زندگی کے تمام حقائق منکشف نہ ہو جاتے، مگر میں بے بس تھا۔

یہ جولائی 2020ء کی بات ہو گی کہ میں اپنی اسی دعوت کے سلسلے میں زمانہ طالبِ علمی کے ایک بہت قریبی دوست سے ملاقات کے لیے دوسرے شہر بھی گیا۔ میرا یہ دوست نہ صرف جدّت پسند تھا، بلکہ صحت مند بھی۔ اس کے سامنے براہِ راست قرآن حکیم کی بات شروع کر دینے میں مجھے اپنی جان کا خطرہ بھی لاحق تھا۔ اس لیے ملاقات کرنے سے قبل میں نے کافی دن تک باقاعدہ منصوبہ بندی کی۔ دوست کو ''قابو'' کرنے کے لیے طریقہ کار وضع کیا، خدا سے دعا مانگی اور پھر بات میری سمجھ میں آ گئی۔ اگر پاکستان کے پڑھے لکھے اور تھوڑے ''جدّت پسند'' طبقے کو قرآن کی جانب دعوت دینی ہے تو۔۔۔

بات کو گھما کر کرنا ضروری ہے۔ بات کو گھما گھما کر کرنا ضروری ہے۔

ہماری ملاقات ہوئی، ساری رات جاری رہی۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق بات کو انسانوں میں موجود معاشی اور سماجی تفرقات سے شروع کیا۔ وہ معاشیات کا طالبِ علم رہا تھا۔ بات اسے اچھی لگی اور پھر بڑھتی چلی گئی۔ کامیابی اور ناکامی کے خواص زیرِ بحث آئے، ہمارے مشترکہ دوستوں کے حالاتِ زندگی سے مثالیں بیان کی گئیں، کائناتی وسعتوں کو ماپا گیا، انسان کا اختیار، علم اور عقل کی حدود کو جانچنے کی کوشش کی گئی، الغرض۔۔۔

میں بات گھما کر۔۔۔ بات کو گھما گھما کر خدا اور قرآنِ حکیم کی جانب لانے میں کامیاب ہو گیا۔ [1]

پھر میں نے انسان کی حقیقت اور قرآنِ حکیم کا بنیادی فلسفۂ زندگی دوست کے سامنے بیان کر دیا۔ ہماری اس ملاقات سے میرے اس دوست کے شب و روز پر کچھ اثرات مرتب ہوئے یا نہیں، مگر اس ''ماں دے لاڈے'' نے مجھے رخصت کرنے سے پہلے ایک کتاب لکھنے کا مشورہ ضرور دے ڈالا اور حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب کا ایک بالکل ابتدائی اور خام سا نقشہ ہماری اسی ملاقات میں واضح ہو چکا تھا، مگر شعوری طور پر میں نے اپنی ساری زندگی کتاب لکھنے کا کبھی نہیں سوچا تھا۔ کوئی ایسا خاص مقصد میرے سامنے موجود نہیں تھا، جس کے لیے شب بیداریاں کی

---

[1] ہماری اس کتاب میں بھی بات کو خدا اور قرآن حکیم کی جانب لے کر آنے کے لیے یہی طریقہ استعمال کیا گیا ہے۔

جا تیں۔اس لیے میں نے دوست کے مشورے پر غور نہ کیا۔

وقت تھوڑا اور گزرا اور پھر کسی اخبار کی تحریر کے نیچے لکھے گئے ایک تبصرے نے میری زندگی بدل ڈالی۔

کچھ تبصرے حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔کچھ لمحات جادوئی ہوتے ہیں۔

اس تبصرے کا تفصیلی ذکر تو پہلے ہو چکا ہے،بس اتنا جان لیجیے کہ اس قسم کا تبصرہ نگاہوں سے گزر جانے کے بعد میں نے ایک کتاب لکھنے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ دوسروں تک اور خاص طور پر پاکستان کے تعلیم یافتہ اور تھوڑے سیکولر مزاج طبقے تک حقائق پہنچانا ضروری تھا،بہت ضروری تھا۔اگست 2020ء کے اختتام سے پہلے پہلے میں اپنے تمام نکمے پن کے باوجود ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کر چکا تھا،جبکہ میرا خدا مجھ سے یہ کتاب لکھوانے کا ارادہ اس کائنات کی تخلیق سے بھی بہت پہلے کر چکا تھا۔

میں نے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تو کتاب کا عنوان منتخب کرنے کے لیے مجھے ایک لمحے کے لیے بھی سوچنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔۔۔

Who Am I?

یہ تین جادوئی الفاظ 2012ء سے ہر وقت،ہر آن میرے ساتھ موجود رہے ہیں۔

اور پھر انسانی زندگیوں میں ''تین الفاظ'' کی اہمیت کو تو یقیناً آپ بھی بہت اچھے سے جانتے ہوں گے۔ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی میں ''تین الفاظ'' سننا چاہتا ہے،بیان کرنا چاہتا ہے اور پھر مسلمان مرد تو ان ''تین الفاظ'' کی مدد سے اپنی زندگی میں ''چار چاند'' بھی لگا سکتا ہے۔

البتہ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہر انسان کی زندگی میں یہ ''تین الفاظ'' ساری عمر یکساں نہیں رہتے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ''تین الفاظ'' بھی اپنی شکل و صورت تبدیل کرتے رہتے ہیں اور پھر اس تبدیلی میں ایک خاص ترتیب بھی ضرور ہوتی ہے۔۔۔

''I Miss You.''

''I Love You.''

''قبول ہے،قبول ہے،قبول ہے۔''

''مُنا،گُڈی،پپو۔''

''ڈائپر،دوا،ڈائپر۔''

''موسم۔۔۔اچھا ہے۔''

''ساجا،گاما،پپنو۔''

''میں مائیکے ہوں۔''

''اللہ کا شکر۔''

''میٹنگ میں ہوں۔''

''گیارہ بجے۔۔۔میٹنگ؟''

''میں مصروف ہوں۔''

''گھر۔۔۔آؤ ذرا۔''

''I Hate You.''

''طلاق، طلاق، طلاق۔''

ترتیب کے ساتھ بیان کیے گئے ان پندرہ جادوئی ''تین الفاظ'' میں سے درمیان والے گیارہ ''تین الفاظ'' تو تقریباً ہر مسلمان ہی اپنی زندگی میں استعمال کرتا ہے۔

جبکہ پہلے اور آخری دو، دو۔۔۔۔۔''تین الفاظ'' کا تعلق محض خواص کے ساتھ ہے۔

اس لمحۂ موجود میں کسی بھی شخص نے کون سے ''تین الفاظ'' استعمال کیے ہیں؟

بس ان ''تین الفاظ'' کے چناؤ سے ہی اس شخص کی زندگی، پورے ماضی کو جانا جا سکتا ہے۔ اس شخص کی عمر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے، مصروفیات کو جانچا جا سکتا ہے اور اس شخص کے مستقبل کے بارے میں بھی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا ہے، یہ ''تین الفاظ'' بھی تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ شادی سے پہلے کے ''تین الفاظ'' کچھ اور ہوتے ہیں اور شادی کے بعد کے ''تین الفاظ'' کچھ اور۔ نگوڑ مارے!

ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمانوں میں بس گنتی کے چند ہی لوگ ہوں گے، جن کی ساری زندگی میں بس ایک ہی قسم کے ''تین الفاظ'' بنا اپنی شکل وصورت تبدیل کیے موجود رہتے ہوں گے اور میرا شمار۔۔۔

''Who Am I?''

اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو میری ہوش مندانہ زندگی کا بیشتر حصہ بس انہی ''تین الفاظ'' کے ساتھ گزرا ہے۔ 2012ء سے آج، اس لمحۂ موجود تک۔۔۔۔۔میرے موبائل، لیپ ٹاپ، ہر جگہ، ہر ہر جگہ یہ تین الفاظ میری نگاہوں کے سامنے موجود رہے ہیں۔ جب سے اس کتاب کو لکھنا شروع کیا ہے، تب سے میں ان ''تین الفاظ'' کے ساتھ باقاعدہ حالتِ عشق میں ہوں۔

لیکن اس سے پہلے بھی یہ ''تین الفاظ'' بس بلا وجہ ہی مجھے اچھے لگا کرتے تھے۔ ان کو دیکھ کر، ان کو بڑ بڑا کر خوشی محسوس ہوتی تھی۔

شاید وہ تمام کام جو ہم بس بلا وجہ کر رہے ہوتے ہیں، حقیقت میں ان تمام کاموں کے پیچھے ہی سب سے ''تگڑی وجہ'' موجود ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں اس ماسٹر مائنڈ کی پلاننگ کا ایک حصہ ہوتی ہیں۔ بس۔۔۔ ہم ان تمام چیزوں کی موجودگی سے، وجوہات سے لاعلم رہ جاتے ہیں۔

بالکل اسی طرح لاشعوری طور پر میں نے ساری زندگی یہ کتاب لکھی ہے۔ میں ساری زندگی اس کتاب کے لیے مواد اکٹھا کرتا رہا ہوں۔ بس ان تمام چیزوں کو میرے لاشعور سے شعور میں منتقل اگست 2020ء میں ہونا تھا۔

یہ کتاب میں نے نہیں لکھی، یہ کتاب مجھ سے لکھوائی گئی ہے۔

اس کتاب کو لکھتے وقت مجھے کہیں پر، کسی بھی قسم کا کوئی ایک بھی مسئلہ پیش نہیں آیا۔ سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا اور میں ایک اجنبی کی مانند بس اس کتاب کو لکھے جاتا دیکھتا رہا ہوں۔

آج 2 مارچ 2021ء ہے۔

یہ کتاب اب اپنے اختتامی مراحل کو پہنچ رہی ہے۔ اب بس دو باب مزید لکھنا باقی ہیں اور آج میں اس کتاب کے لکھے جانے کا مقصد بیان کرنا چاہتا ہوں۔

اس کتاب کا مقصدِ اوّل دعوت ہے۔ قرآن کے ساتھ ایک معنوی ربط قائم کر کے اس کی حکمتوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت، خود کو جاننے اور پہچاننے کی دعوت، انسان اور انسانی زندگی کی حقیقت پر غور و فکر کرنے کی دعوت۔ اس کتاب کے لکھے جانے کا مقصد بس یہی ہے کہ ہر انسان کا قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک تعلق قائم ہو جائے اور پھر قرآنِ حکیم کے ذریعے اللہ کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار ہو جائے۔ ہر انسان صاحبِ بصیرت بن جائے، ہر انسان ہی فلاح پا جائے، ہر انسان حقیقی ناکامی سے بچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کامیاب ہو جائے۔ اگر اس تمام کتاب کو بس ایک یا دو سطروں میں بیان کرنا ہو تو میں کچھ یوں لکھوں گا:

> ''قرآنِ حکیم خدا کی رسی ہے۔ یہی کتابِ زندگی ہے اور یہی خواہشات کو پورا کرنے کا واحد راستہ۔ قرآنِ حکیم کے ساتھ گوند کی مانند باقاعدہ چپک جائیے۔''

مگر قرآنِ حکیم خدائے ذوالجلال کا کلام ہے۔ اس کا اپنا ایک جلال ہے۔ اس کے ساتھ تعلق قائم کرنا بالکل بھی آسان نہیں ہے۔ آج ہمارے اپنے ہی اعمال کی بدولت، ہمارے اور قرآنِ حکیم کے بیچ پردے

حائل ہو چکے ہیں۔ آج ہم مسلمانوں کی اکثریت قرآن کے نام پر ہی بِدک جاتی ہے۔ خدا اور قرآن کا ذکر سن کر ہمارا دل گھبرانے لگتا ہے، ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ اگر میں حقیقت کی ترجمانی کرنے والے الفاظ استعمال کروں تو قرآن کے ذکر سے ہمیں باقاعدہ کوفت ہونے لگتی ہے۔ ان صاحبانِ علم و دانش کی محفل میں کبھی خدا اور قرآن کا ذکر کر کے تو دیکھیے۔ آپ کی جانب ایسی نگاہوں سے دیکھا جائے گا کہ بس۔۔۔

بات ہے تو تھوڑی بُری مگر حقیقت یہی ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت میں قرآن کا ریفرنس دینا دقیانوسیت سمجھی جاتی ہے۔ مغرب کے کسی احمق سیانے کے ریفرنس پر بات بڑی جلدی سمجھ آتی ہے، مگر قرآن کے ریفرنس کو ریفرنس ہی نہیں جانا جاتا۔

وہ دھوکے باز اپنا کام دکھا چکا ہے۔

آج ہمیں ہماری برائیاں ہی سب سے خوبصورت اور حسین نظر آتی ہیں۔

ایسے حالات میں اس کتاب کے مقصدِ اول کو حاصل کرنا ایک بہت دشوار، بلکہ ناممکن بات نظر آتی ہے، لہٰذا کتاب کا مقصدِ دوم۔۔۔

کتاب کے مقصدِ اوّل کو حاصل کرنے میں آسانی پیدا کی جائے۔

اگر پاکستان کے تعلیم یافتہ اور تھوڑے سیکولر مزاج طبقے کو قرآنِ حکیم کی جانب دعوت دینی ہے تو روایتی طریقوں سے تھوڑا ہٹ کر کام کرنا ہوگا۔

اب کی بار بات گھما کر کی جائے گی۔ اب کی بار بات گھما گھما کر کی جائے گی۔

اس کتاب میں میری کوشش بس یہی رہی ہے کہ قرآنِ حکیم کی جانب دعوت ایسے انداز میں دی جائے کہ کسی بھی شخص کو گھبراہٹ محسوس نہ ہو۔ قارئین کی دلچسپی کا سامان موجود ہو۔ صرف انہی موضوعات پر بات کی جائے جو تعلیم یافتہ طبقے کی توجہ اپنی جانب کھینچ لینے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ قرآنِ حکیم کی ضرورت اور اہمیت پر مدلّل انداز میں بحث کی جائے۔ قارئین کے ساتھ بات ان کی عقلی سطح پر کی جائے۔

مختصر یہ کہ اس کتاب کا مقصدِ دوم بھی مقصدِ اول ہی ہے، لیکن اب کی بار کوشش کی جائے گی کہ کتاب کے مضامین کو بتدریج اس طرح آگے بڑھایا جائے کہ سیکولر مزاج کا قاری بھی اس کتاب کو با آسانی پڑھ سکے اور قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک رشتہ استوار کر سکے۔

البتہ اس بات کا بھی قوی امکان موجود ہے کہ سبھی قارئین شاید قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک معنوی ربط قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو پائیں گے۔

ان حالات میں اس کتاب کا تیسرا اور آخری مقصد۔۔۔

اس کتاب کے ذریعے قرآنِ حکیم کے بنیادی عقائد اور فلسفۂ زندگی کو دوسروں تک اس انداز میں پہنچا دیا جائے کہ اگر کسی شخص کی قرآنِ حکیم تک براہِ راست رسائی نہ بھی ہو، تب بھی اس کتاب کے ذریعے کچھ نہ کچھ حقائق اس شخص تک ضرور پہنچ جائیں۔ کسی بھی قاری کو کم از کم ان ستاروں میں اپنا خدا ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس نہ ہو۔ اس کتاب میں انسان کو انسان اور اس زندگی کی حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیانوں کے مایوسی پھیلانے والے نظریات کی تردید کی گئی ہے۔

مقصد محض یہی ہے کہ شاید ہم سنبھل جائیں۔ شاید ہم اپنے ساتھ مخلص ہو جائیں۔

اس کتاب میں جدید مغربی فلسفہ اور اسلامی فلسفہ کے کافی پیچیدہ اور دقیق مسائل زیرِ بحث رہے ہیں، لیکن میری کوشش یہی رہی ہے کہ موضوعات کے بھاری پن اور ثقالت کے باوجود اس کتاب میں کسی قسم کا بوجھل پن پیدا نہ ہو۔ باتوں کو ان کی پیچیدگی کے باوجود ایک ہلکے پھلکے انداز میں بیان کر دیا جائے۔ اس کتاب کے ذریعے میں نے ہم مسلمانوں اور قرآنِ حکیم کے مابین حائل حجاب کو ختم کرنے کی اپنی سی ایک کوشش کی ہے۔

اب میں اپنی ان تمام کوششوں میں کس حد تک کامیاب ہوتا ہوں؟

یہ کتاب اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کس درجہ کامیاب ہوتی ہے؟

یہ باتیں اللہ ہی جان سکتا ہے۔ میرے ذمے تو بس اپنی حدود میں رہتے ہوئے بہترین کوشش کرنا فرض ہے۔ باقی ہر چیز کے نتائج تو اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

اور درحقیقت یہ کتاب میرے امتحان کا ایک حصہ ہے۔ (اور اب آپ کے امتحان کا بھی)

اس کتاب کو ویسے تو کوئی بھی شخص پڑھ سکتا ہے، مگر اس کتاب کو لکھتے وقت میرے ذہن میں ہر لحظہ یونیورسٹی اور کالج کے طلباء مستحضر رہے ہیں۔ قرآنِ حکیم کی جانب میری اس دعوت کا مرکز و محور پاکستان کے تعلیمی ادارے ہوں گے۔ قرآن کی حکمتوں پر غور و فکر کرنے کے لیے جدید علوم پر دسترس بھی ضروری ہے اور کچھ نہ کچھ فارغ اوقات بھی ضرور چاہیے ہوں گے۔ یونیورسٹی اور کالج کے طلباء کے پاس وقت، ذہانت اور صلاحیت؛ سب کچھ موجود ہے۔

البتہ قرآنِ حکیم کا مطالعہ کرتے وقت ایک اصول ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔ قرآنِ حکیم کا کچھ حصہ شرعی احکامات پر مشتمل ہے۔ ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگیوں میں بہتری کے لیے اللہ ہمیں کچھ چیزوں کو اختیار کرنے کا حکم دے رہا ہے اور کچھ چیزوں سے ہمیں روکا بھی جا رہا ہے۔ ان تمام

شرعی احکامات میں، ان تمام Do's & Don'ts میں ہرگز ہرگز اپنی عقل استعمال کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ یہ ہماری عقل کی حدود ہیں۔

اگر ہم شرعی احکامات میں بے جا عقل کا استعمال کریں گے تو منہ کے بل گریں گے۔ بہت سارے شرعی احکامات کی ہمیں کوئی بھی عقلی دلیل نہیں ملے گی، مگر ان پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی بھی چیز کی عقلی دلیل ہمیں سمجھ نہیں آ رہی تو اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس چیز میں عقلی دلائل موجود ہیں ہی نہیں، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ عقلی دلائل ہماری محدود عقل سے ماوراء ہیں۔

مثال کے طور پر قرآنِ حکیم میں ہمیں بار بار نماز قائم کرنے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ اب یہ نماز کس طرح سے قائم کی جائے گی؟ نمازوں کی تعداد کیا ہوگی؟ رکوع و سجود کیسے کیے جائیں گے؟ وضو کیسے ہوگا؟

ان سوالوں کا جواب ہمیں محض اپنی عقل سے کبھی نہیں ملے گا۔ تمام شرعی احکامات کی تفصیل جاننے کے لیے ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ ہمیں یہ جاننے کی کوشش کرنی ہوگی کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے کیسے نماز پڑھی اور کیسے پڑھائی؟ ہمیں تو بس محمد رسول اللہ ﷺ کی نقل کرنی ہے۔ ہمیں تو بس اپنے چوبیس گھنٹے کے اعمال کو محمد رسول اللہ ﷺ کے اعمال کے قریب تر کرنے کی کوشش کرتے رہنا ہے۔

> ''حقیقت یہ ہے کہ تمھارے لیے رسول اللہ ﷺ کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ پر اور روزِ آخرت سے امید رکھتا ہو اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتا ہو۔'' (الاحزاب:21)

اسی طرح سے اسلام میں ہر صاحبِ نصاب پر اڑھائی (2.5) فیصد زکوٰۃ فرض ہے۔ زکوٰۃ کی یہ شرح دو یا تین فیصد کیوں نہیں ہے؟ یہ ہماری عقل کی حدود ہیں۔ یہاں پر ہم عقل استعمال نہیں کر سکتے۔ اگر کسی شرعی حکم کی حکمت بھی سمجھ میں آ جائے تو اچھی بات ہے، لیکن اگر حکمت سمجھ نہ بھی آئے، تب بھی عمل ضروری ہے۔

عقل کی حدود کو پہچاننا بہت ضروری ہے۔ ہم ہر جگہ پر اپنی عقل استعمال نہیں کر سکتے۔

اللہ کو اللہ ماننے تک عقل استعمال کیجیے، ضرور کیجیے، مگر اللہ کو اللہ مان کر پھر اللہ کے احکامات میں عقل کا بے جا استعمال نقصان دہ ہے۔ شریعت میں ہمیں عقل نہیں، بس محمد رسول اللہ ﷺ کی نقل کرنی ہے۔ بس جو بات بھی محمد رسول اللہ ﷺ نے فرما دی، وہی بات اللہ کی بات ہے۔ وہی بات ہمارا دین ہے، ہمارا ایمان ہے۔

اسی چیز میں ہی ہماری بہتری ہے، کامیابی ہے۔

''اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہیں جو کچھ دیں، وہ لے لو اور جس چیز سے منع کریں، اس سے رک جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔'' (الحشر:7)

البتہ اس عملی پہلو کے ساتھ ساتھ قرآنِ حکیم کا ایک علمی پہلو بھی ہے۔قرآنِ حکیم میں حکمت اور فلسفہ کے مسائل بھی بیان ہوتے ہیں۔حکمت کے بارے میں تو اللہ تعالیٰ کچھ یوں ارشاد فرماتا ہے:

''وہ جس کو بھی چاہتا ہے حکمت عطا کر دیتا ہے اور جسے حکمت عطا کر دی گئی، اسے گویا خیرِ کثیر عطا کر دیا گیا اور اس بات کو صاحبانِ عقل کے سوا کوئی نہیں سمجھتا۔'' (البقرۃ:269)

اللہ تعالیٰ قرآنِ حکیم پر غور و فکر کی دعوت کچھ یوں دیتا ہے:

''بھلا کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ یا دلوں پر وہ تالے پڑے ہوئے ہیں، جو دلوں پر پڑا کرتے ہیں؟'' (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:24)

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔'' (النساء:82)

قرآنِ حکیم کے اس علمی، نظریاتی اور حکمت والے پہلو پر غور و فکر، سوچ بچار کرنا بہت ضروری ہے۔ یہاں پر ہم اپنی عقل استعمال کر سکتے ہیں، حتیٰ کہ ایک رائے سے دوسری رائے بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ قرآنِ حکیم کے اس علمی پہلو پر ہمیں بہت سے زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے۔بہت سارے علمی مسائل کا حل ہمیں قرآنِ حکیم سے ملے گا۔مثال کے طور پر۔۔۔

''اللہ لوگوں کے مرنے وقت ان کی روحیں قبض کر لیتا ہے اور جو مرے نہیں، ان کی روحیں سوتے میں (قبض کر لیتا ہے) پھر جن پر موت کا حکم کر چکتا ہے، ان کو روک رکھتا ہے اور باقی روحوں کو ایک وقتِ مقرر تک کے لیے چھوڑ دیتا ہے، جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں، ان کے لیے اس میں نشانیاں ہیں۔'' (الزمر:42)

قرآنِ حکیم کی اسی ایک آیتِ مبارکہ پر ہی اگر غور و فکر کر لیا جائے تو جدید فلسفہ کے لاتعداد مسائل حل ہو جاتے ہیں۔اس کائنات میں شعور کیوں اور کیسے پایا جاتا ہے؟ کیا مادی چیزوں سے غیر مادی چیزیں جنم لے سکتی ہیں؟ نیند کے دوران انسان ایک مشین کیسے بن جاتا ہے؟ نیند سے اٹھ کر ایک مشین

انسان کیسے بن جاتی ہے؟ ایک انسان کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے ان الیکٹرونز کی حرکت کا کیا تعلق ہے؟

ان سوالوں کا کوئی بھی حتمی جواب اس دنیا کے کسی انسان کے پاس نہیں ہے، لیکن ان تمام سوالوں کا بقدرِ رہنمائی جواب ہمیں قرآنِ حکیم کی اس ایک آیتِ مبارکہ سے ملے گا۔ اسی طرح سے کائنات میں Aliens کی غیر موجودگی کا علم بھی ہمیں قرآنِ حکیم سے حاصل ہوگا۔ اور تو اور۔۔۔

میری اُس ''آزاد نظم'' میں چھپے ہوئے چاروں سوالوں کا جواب بھی ہمیں قرآنِ حکیم سے ملے گا۔

اس کتاب میں ایسی ہی چند مثالیں بیان کی گئی ہیں اور یہ تو محض وہ چند چیزیں ہیں، جن کی حکمت میں جان پایا ہوں۔ وگرنہ قرآن تو پورے کا پورا حکمت ہے۔

قرآنِ حکیم کے اس علمی پہلو پر تحقیق کی ضرورت ہے، بہت ضرورت ہے۔

یقیناً قرآنِ حکیم پر تحقیق اور غور وفکر وہی شخص کر پائے گا کہ جس میں خود بھی کچھ صلاحیتیں موجود ہوں، جو جدید علوم پر مہارت رکھتا ہو۔ قرآنِ حکیم کو یونیورسٹی کے طلباء اور ان کی ذہانت کی ضرورت ہے۔ پاکستان کے بہترین دماغ پاکستان کی یونیورسٹیز میں موجود ہیں۔ آج قرآنِ حکیم کو یونیورسٹی کے پڑھے لکھے طلباء کی ضرورت ہے۔

جب تک مسلمانوں کے بہترین دماغ اور اعلیٰ ترین کردار اپنی پوری پوری زندگیوں کو قرآنِ حکیم کے سمجھنے سمجھانے میں صرف نہیں کر دیتے۔۔۔۔ اسلام بدنام رہے گا، مسلمان ذلیل وخوار رہے گا۔

اس کتاب کو یونیورسٹیز کے طلباء کے لیے لکھا گیا ہے، لکھوایا گیا ہے۔ اس کتاب کو لکھ لینا ایک الگ چیز ہے، جبکہ اس کتاب کو دوسروں تک پہنچانا ایک اور قسم کا مسئلہ ہے۔ میں اپنی تمام، مگر بہت محدود صلاحیتوں اور وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اس کتاب کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچا سکوں۔ میرے ذمے اپنی ہر ممکن کوشش کرنا فرض ہے۔ باقی ہر چیز کا اختیار اللہ کے پاس ہے۔

اس کتاب کو دوسروں تک پہنچانے میں آپ بھی میری مدد کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں بیان کیے گئے کچھ خیالات اور نظریات سے آپ کو اختلافات ہو سکتے ہیں، ضرور ہو سکتے ہیں۔ دو ذی شعور انسانوں کے بیچ کسی بھی چیز کے بارے میں اختلافِ رائے کا پایا جانا ایک فطری عمل ہے، ایک اچھی چیز ہے۔ بس یہ ہے کہ اختلاف ہونا قرآن کی حدود کے اندر اندر چاہیے۔

اس کتاب میں بیان کی گئی باتوں سے چھوٹے چھوٹے اختلافات سے قطع نظر۔۔۔

اگر آپ اس کتاب کے مقاصد کے ساتھ متفق ہیں۔۔۔

اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ کتاب اپنے مقاصد کو حاصل کرنے میں کسی بھی درجے میں مؤثر ثابت ہوسکتی ہے تو۔۔۔۔۔اس کتاب کو اور اس کتاب کے ذریعے قرآنِ حکیم کو اپنے اردگرد موجود لوگوں تک پہنچانے کی کوشش کیجیے لیکن اس سے بھی ضروری بات یہ ہے کہ۔۔۔

میں اور آپ، ہم سب ایک بار خود اپنے آپ کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کریں۔ پہلے ہم خود قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک معنوی ربط قائم کرنے کی کوشش کریں۔

اگر ایک بار قرآنِ حکیم ہمارے کے اندر اتر گیا تو میرے جیسے نکمے لوگوں کو کتابیں لکھنے کا موقع ہی نہیں ملے گا۔ہمیں دوسروں کو بھی قرآن کی جانب دعوت دینی ہے،ضرور دینی ہے،مگر اس دعوت کا آغاز ہمیں خود اپنے نفس سے کرنا ہے۔اس زندگی کو سمجھنے کے لیے ہمیں قرآنِ حکیم کے سوا کسی اور،کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔

اگرچہ یہ تمام کتاب ہم انسانوں کے لیے قرآنِ حکیم کی ضرورت پر لکھی گئی ہے،مگر میرے پاس وہ الفاظ موجود نہیں ہیں،جن سے میں قرآنِ حکیم کے اثرات کو،قرآنِ حکیم کی ضرورت اور اہمیت کو بیان کرسکوں۔ میں بےبس ہوں۔

بس اتنا جان لیجیے کہ قرآنِ حکیم کے ذریعے سیانوں کو صاحبِ بصیرت بنایا جا سکتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ذریعے مُردوں کو زندہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ جانوروں کو انسان بنا دینے کا نسخہ ہے۔

قرآنِ حکیم کتاب نہیں ہے۔

یہ کچھ اور ہے۔۔۔۔۔ یہ کچھ اور ہی ہے۔

میں قرآنِ حکیم کی بصیرت کو عام کرنا چاہتا ہوں۔

کیونکہ خدائے بزرگ و برتر کے خاص رحم و کرم اور فضل کی بدولت۔۔۔

میں حافظِ قرآن ہوں۔

میں صاحبِ بصیرت ہوں۔

باب:11

شارٹ کٹ

اور۔۔۔

اور یہ مرجانی صبا کون ہے؟

جس کی زندگی کا سارا دارومدار میرے پچاس روپے کے موبائل لوڈ پر ہے۔

اگر آپ پاکستانی ہیں اور آپ کو کسی ''مشکل میں پھنسی'' ہوئی صبا کی جانب سے پچاس روپے کا لوڈ کروانے کا پیغام موصول نہیں ہوا تو یقین کیجیے۔۔۔

اس کی بس دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔۔۔

یا تو آپ کے پاس صبا کا پیغام موصول کرنے کے لیے موبائل فون موجود نہیں ہے۔

اور یا پھر۔۔۔

یا پھر آپ خود صبا ہیں۔

وگرنہ قائداعظم کے چودہ نکات اور گاندھی جی کی ''دھوتی'' کے بعد برصغیر میں اگر کوئی چیز مشہور ہوئی ہے تو وہ صبا جی کے پیغامات ہی ہیں۔

میرا اور صبا کا تعلق کوئی نیا نہیں ہے۔ یہ کوئی دس بارہ سال پرانی بات ہوگی، جب مجھے صبا کی جانب سے پہلا پیغام موصول ہوا تھا۔ میں اس وقت، ہر وقت کی طرح نیم غنودہ، نیم مردہ حالت میں اپنے مراقبے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ایسے میں موبائل کی ٹوں ٹوں نے میرے اعصاب پر منفی اثرات مرتب کیے۔ میں نے اپنی چندھیائی آنکھوں سے موبائل پر نگاہ دوڑائی۔۔۔

کسی اجنبی نمبر سے صبا کا پیغام تھا اور الفاظ کچھ یوں تھے۔۔۔

''میرے اس نمبر *********03 پہ پچاس کا موبائل لوڈ کروادو۔

بعد میں واپس کر دوں گی۔

میں صبا۔''

پیغام پڑھتے ہی میں نے اپنے عزیز واقارب، دوست احباب سب پہ نگاہ دوڑائی۔۔۔ لیکن مجھے صبا نام کا کوئی کردار نہ مل سکا۔

میں نے اپنی یادداشت میں صبا لکھ کر تلاش کا بٹن دبایا۔۔۔۔۔ بار بار دبایا۔

میری اس بار بار کی تلاش کے نتیجے میں۔۔۔۔۔ فجا، ٹِلو، بگی، لنگر، دِتو جیسے لاتعداد نام اور ان ناموں سے منسلک کردار میری نگاہوں کے سامنے سے گزر گئے، مگر ان صحرائی بگولوں جیسے ناموں کے بیچ کوئی صبا نامی ہوا کا جھونکا میری سانسوں کو معطر نہ کر سکا۔

اس کے ساتھ ہی جہاں مجھے اس بات کا یقین ہوا کہ یہ پیغام میرے لیے نہیں تھا، وہیں پر مجھے اپنی زندگی میں خالی پن کا بھی شدّت سے احساس ہوا۔ میں نے ایک سرد آہ بھری، کروٹ بدلی اور پھر یاس وحسرت کی کیفیات میں صبا کے پیغام کو دوسری بار پڑھا۔

نہ تو یہ پیغام میرے لیے تھا اور نہ ہی میں صبا کو جانتا تھا، مگر اس پیغام کو پڑھ کر میں صبا کی عظمت کا قائل ضرور ہو گیا تھا۔ اگرچہ بحالتِ مجبوری صبا نے اپنے کسی ''عزیز'' سے پچاس روپے کا موبائل لوڈ مانگا، مگر صبا ایسی اَنا اور خودی والی تھی کہ ساتھ ہی پیسے لوٹانے کی بات بھی کر ڈالی۔

صبا کسی کا احسان لینا پسند نہیں کرتی تھی۔

میں من ہی من میں صبا کا گرویدہ ہو گیا۔

پھر۔۔۔۔۔ اماں بھی تو اپنے لیے ایک ایسے ہی مزاجوں والی بہو تلاش کر رہی تھیں۔

لہٰذا میں نے پیغام کو تیسری بار پڑھا اور پھر چوتھی بار بھی اور۔۔۔ اور پھر مجھ پر انکشافات کا ایک ہمالیہ ٹوٹ پڑا۔

میں فوراً اٹھ کر بیٹھ گیا، میری ساری غنودگی جاتی رہی۔

یہ پیغام کوئی عام پیغام نہیں تھا، بلکہ یہ تو ''کوڈ ورڈ'' میں مجھے ایک بہت اہم اور ضروری بات بتائی جا رہی تھی۔ اگر میں نے بچپن میں کچھ جاسوسی ناول نہ پڑھ رکھے ہوتے تو اس ''کوڈ ورڈ'' میں لکھے گئے پیغام کو کبھی نہ سمجھ پاتا۔ میں نے فوراً پیغام کو ''ڈی کوڈ'' کرنا شروع کر دیا۔

مجھے جس موبائل نمبر پر لوڈ کروانے کا کہا جا رہا تھا، اس موبائل نمبر کے پہلے تین اعداد کے حاصلِ جمع کو اگر آخری دو اعداد کے حاصلِ ضرب سے تفریق کر کے مربع لیا جاتا تو۔۔۔

تو اسرائیل کا کنٹری کوڈ حاصل ہوتا تھا۔

یہ انکشاف میرے اعصاب پر کسی بم کی طرح گرا، مگر میں نے ''ڈی کوڈنگ'' جاری رکھی۔۔۔

مجھے مہیا کیے گئے موبائل نمبر کے درمیانی دو عدد اس وقت کو ظاہر کرتے تھے، جس کے اندر اندر مجھے اپنا ''مشن'' مکمل کرنا تھا اور۔۔۔

اور اس مشکل ترین ''ڈی کوڈنگ'' کے ساتھ ہی پورا پیغام میری سمجھ میں آ گیا۔

اسرائیل کے ساتھ ہمارے تعلقات اچھے نہیں تھے اور ہماری سیکرٹ سروس نے ایک پاکستان مخالف لیبارٹری کو تباہ کرنے کے لیے اپنی ''سپر ایجنٹ صبا'' کو بھیجا ہوا تھا، لیکن۔۔۔

پھر ہوا یوں کے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی نے نہ صرف ہماری ایجنٹ صبا کو پکڑ لیا، بلکہ اسے ریل کی ایک پٹڑی پر باندھ بھی دیا۔

اب ٹرین کا انجن سٹارٹ ہو چکا تھا اور وہ ہر لمحہ اپنی رفتار بڑھاتی صبا کی جانب دوڑی چلی آ رہی تھی۔ یہ ٹرین ایک سیٹلائٹ کے ساتھ منسلک تھی اور۔۔۔

اور اگر مجھے مہیا کردہ سیٹلائٹ موبائل نمبر پر پچاس روپے کا لوڈ کروا دیا جاتا تو اس ٹرین کے پورے سسٹم کو کریش کیا جا سکتا تھا۔۔۔۔۔ٹرین کو روکا جا سکتا تھا۔

اب میرا مشن اس 165 کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑنے والی ٹرین کے سسٹم کو ہیک کر کے۔۔۔۔۔سپر ایجنٹ صبا کی زندگی بچانا تھا۔

پورا پیغام ڈی کوڈ ہو گیا۔۔۔۔۔ میں اپنا مشن اچھے سے سمجھ چکا تھا، مگر۔۔۔

مگر ریل کی پٹڑی پر بندھی ہوئی صبا نے یہ ساری معلومات کیسے حاصل کر لیں؟

نہ صرف حاصل کر لیں، بلکہ یہ ساری معلومات مجھے ارسال بھی کر دیں۔۔۔۔۔مگر کیسے؟

اور اگر یہ پیغام میری جگہ کسی اناڑی کے ہاتھ لگ جاتا تو۔۔۔؟

تو کیا ہوتا؟؟؟

یہ معمے مجھ سے حل نہ ہو سکے۔

اور یہ وقت ان معمّوں کو حل کرنے کا تھا بھی نہیں۔ وقت بہت قیمتی تھا۔

مجھے ٹرین روکنے کے لیے سترہ (17) منٹ کا وقت دیا گیا تھا، جبکہ اس مختصر وقت میں سے بھی میں گیارہ (11) منٹ پیغام سمجھنے میں ہی ضائع کر چکا تھا۔ اب میرے پاس صرف چھے (6) منٹ باقی تھے، جبکہ لوڈ والی سب سے قریبی دوکان بھی مجھ سے اٹھارہ (18) منٹ کی مسافت پر تھی۔

میں نے فوراً بھاگنا شروع کر دیا۔

بھاگنا بچپن سے ہی میرا پسندیدہ ترین مشغلہ رہا تھا، لیکن اب کی بار تو جذبۂ حب الوطنی میں

سرشار ہو کر میں نے تیز رفتاری کی تمام حدود کو عبور کر دیا۔

میں نے وقت بچانے کے لیے سڑک کی جگہ گھروں کی چھتوں کے اوپر سے دوڑنا شروع کر دیا۔ صبا کی جان بچانے کا بس ایک یہی ذریعہ تھا۔

ایک چھت سے دوسری اور پھر تیسری چھت ۔۔۔۔۔ میں کینگرو بنا چھلانگیں لگا تا رہا۔

سارے محلے میں ایک کھلبلی مچ گئی، مگر میں نے پرواہ نہ کی۔

صبا کی جان اس سب سے بہت قیمتی تھی۔

پھر گھر ختم ہو گئے ۔۔۔۔۔ میں نے نیچے سڑک پر چھلانگ لگا دی ۔۔۔۔۔ تیز رفتاری کے ساتھ دوڑنے والے ایک ٹرک کے نیچے سے پھسل کر سڑک پار کی ۔۔۔۔۔ عمودی دیوار پر کسی مار خور کی مانند چڑھ دوڑا ۔۔۔۔۔ سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کے اوپر سے کود گیا۔

اس ساری بھاگ دوڑ کے بعد میں جلد ہی لوڈ والی دوکان پر تھا، مگر ۔۔۔

مگر میں 43 سیکنڈ کی تاخیر کر چکا تھا۔

میں مایوسی میں اپنے گھٹنوں پر گر گیا ۔۔۔۔۔ میں اپنے پہلے ہی مشن میں ناکام ہو چکا تھا۔

ایک آخری امید کے طور پر میں نے صبا کے مہیا کردہ نمبر پر پچاس کا لوڈ کروا دیا۔

شاید کوئی معجزہ ہو جائے ۔۔۔۔۔ شاید صبا کی جان بچ جائے۔

لوڈ کروانے کے بعد میں بہت دیر تک موبائل ہاتھ میں پکڑے ادھر ہی کھڑا رہا۔

مجھے صبا کی جانب سے شکریہ کے پیغام کا انتظار تھا۔

مگر میرا یہ انتظار ۔۔۔۔۔ انتظار ہی رہا۔

صبا مر چکی تھی۔

محض میری غفلت اور سست روی کی وجہ سے صبا کی جان چلی گئی۔

میں اداس تھا، میں پریشان تھا۔

میرا ضمیر مجھے اندر ہی اندر کچوکے لگائے جا رہا تھا۔ میں خود کو کوستا ہوا بوجھل قدموں کے ساتھ گھر واپس آ گیا۔ میں شدید ڈپریشن میں تھا۔

اگلے دو دن میں بنا کچھ کھائے پیے، بنا کوئی بات کیے اپنے کمرے میں بند رہا۔

صبا کی آخری چیخیں مجھے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھیں۔

صبا کی کچلی ہوئی لاش بار بار میری آنکھوں کے سامنے آ رہی تھی۔

میں کمرے میں بند اپنی اس مجرمانہ غفلت پر پچھتا تا رہا اور شاید میں مزید بہت سارے دن بھی اسی کیفیت میں گزارتا، مگر پھر۔۔۔

پھر تیسرے دن۔۔۔۔۔صبا کا وہی پیغام مجھے دوبارہ موصول ہوا۔

اب کی بار مجھے اپنا مشن مکمل کرنے کے لیے 9 منٹ دیے گئے تھے۔

صبا مری نہ تھی، صبا زندہ تھی۔

صبا نے اپنی زندگی کا ثبوت دے کر مجھے ایک نئی زندگی بخش دی۔

میں نے خوشی خوشی بھاگنا شروع کر دیا۔

گھروں کی چھتیں۔۔۔۔۔دوڑتا ہوا ٹرک۔۔۔۔۔عمودی دیوار۔۔۔۔۔اور رکاوٹیں۔

113 سیکنڈ ابھی باقی تھے، جب میں لوڈ والی دوکان پر پہنچ بھی گیا۔

میں نے دوکاندار کو صبا کا مہیا کردہ نمبر بتا کر جلدی سے لوڈ کرنے کا کہا۔ میری آواز میں موجود کرختگی کے برعکس دوکاندار نے اپنا موبائل اٹھا کر سست روی سے بٹن دبانا شروع کر دیے۔

اس کم بخت کے ہاتھ بہت آہستہ چل رہے تھے، جبکہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میرا دل ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ مجھے ٹرین کی پہلی وِسل سنائی دے چکی تھی۔

میں نے دوکاندار کو پھر سے ہاتھ تیز چلانے کا حکم جاری کیا، لیکن اس چندرے پر کچھ خاص اثر نہ ہوا۔ وہ اسی سست روی سے ہاتھ چلاتا رہا۔

اس تمام سست روی کے باوجود، ابھی 14 سیکنڈ باقی تھے، جب دوکاندار نے لوڈ بھیجنے کے لیے OK کا بٹن دبا دیا۔ میں نے ایک اطمینان بھری سانس لی۔

میرے لبوں پر ایک گہری مسکراہٹ رقصاں تھی۔ سگریٹ لبوں میں دبا کر ایک فاتحانہ کش لگانے کا ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ٹوں، ٹوں، ٹوں۔۔۔

اس موبائل نے میرا مشن ادھورا چھوڑ کر ایک ہچکی لی۔۔۔۔۔اور بند ہو گیا۔

ساتھ ہی میرے ہاتھ پاؤں جیسے سُن ہو گئے۔

میں نے اپنی مایوس نگاہوں سے گھڑی پر وقت دیکھا۔۔۔

۔۔۔0۔۔۔1۔۔۔2۔۔۔3۔۔۔4۔۔۔5۔۔۔6۔۔۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹرین ایک زوردار چنگھاڑ کے ساتھ برآمد ہوئی اور۔۔۔۔صبا کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔

میں نے اپنی آستین سے چہرے پر پڑنے والے خون کے چھینٹوں کو صاف کیا۔

صبا نے میری نگاہوں کے سامنے ہی ایک آخری ہچکی لی۔۔۔۔۔اور دم توڑ دیا۔

صبا مر گئی۔۔۔۔۔اس دوکاندار کی غفلت کی وجہ سے صبا دوسری بار پھر مر گئی۔

میں نے آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو صاف کیا اور پاس ہی موجود ایک کانچ کی بوتل اٹھا کر دوکاندار کے سر پر دے ماری۔اس ''چرسی'' کو صبا کی اشد ضرورت کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔

اگرچہ میں اپنے مشن میں دوسری بار بھی ناکام ہو چکا تھا،لیکن اب کی بار میں زیادہ مایوس نہ ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ صبا کسی بھی طرح زندہ ہوکر مجھے اس مشن کو مکمل کرنے کا تیسرا موقع بھی ضرور دے گی اور۔۔۔۔۔صبا نے محض تیسرا ہی نہیں، بلکہ چوتھا، پانچواں، چھٹا اور ساتواں موقع بھی دیا۔

لیکن مجھے میرے مشن کے لیے وقت بتانے والے اعداد ہر بار صفر صفر تھے۔

میں ہر بار بِنا کوشش کیے ہی ناکام ہو گیا۔

جب مجھے آٹھویں بار صبا کا پیغام موصول ہوا تو اس وقت میں اماں کے پاس بیٹھا بینگن کا بھرتہ بنانے کی ترکیب سمجھ رہا تھا۔ میں نے ابھی تک اماں کو اپنی سیکرٹ سروس کی اس ''نوکری'' کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں پہلی تنخواہ پر اماں کو یہ سرپرائز دینا چاہتا تھا۔

جیسے ہی صبا کا آٹھواں پیغام مجھے موصول ہوا،سب سے پہلے میں نے وقت بتانے والے اعداد کی جانب دیکھا۔اب کی بار مجھے 13 منٹ میں اپنا مشن مکمل کرنا تھا۔

میں فوراً بھاگ پڑا۔

اور اماں نے فوراً سے پیشتر اپنا جوتا پھینک کر مجھے واپس بلا لیا۔

اماں کا اس چاہت بھرے انداز میں واپس بلانا مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔

پھر اماں تو میری بھی اماں تھیں۔

اماں کی پھینکی گئی چیزوں کی رفتار اور زاویہ۔۔۔۔۔دونوں ہی لاجواب تھے۔

اماں کا جوتا میرے وجود کے جس مقام کو بھی چھو جاتا،اس مقام پر خون کی مقدار بہت بڑھ جاتی۔اماں کے جوتوں کی اسی خصوصیت کے سبب میں نے قریبی ہسپتال میں لگنے والے بلڈ ڈونیشن کیمپ میں ہمیشہ اماں کے جوتوں کا ہی عطیہ دیا، بلکہ میں نے تو ایک دو مریضوں کو 'ڈیمو' دینے کی کوشش بھی کی،مگر پھر۔۔۔

خیر یہ ایک الگ داستان ہو جائے گی۔ابھی کے لیے بس یہ جان لیجیے کہ اماں نے مجھے واپس بلا کر اس تیز رفتاری کا سبب دریافت کیا اور اب میں بھی اپنے وجود پر لگے نکمے پن کے داغ کو دھو دینا

چاہتا تھا،لہٰذا میں نے پہلی تنخواہ کا انتظار کیے بِنا ہی اماں کو اپنی نوکری کی خوشخبری سنا دی۔

اور میری نوکری کی خوشی میں ۔۔۔۔۔اماں نے اپنا ماتھا پیٹ ڈالا۔

اماں کے چہرے پر پہلے بے بسی کے تاثرات نمایاں ہوئے اور پھر جلد ہی یہ بے بسی غصے میں تبدیل ہوگئی۔ اماں مجھ سے ناراض تھیں۔ اماں سخت غصے میں تھیں،لیکن اماں کے اس حد درجہ غصے کی وجہ مجھے سمجھ نہ آئی۔ اماں کو تو میری نوکری کی خبر سن کر مجھے لاڈ کرنا چاہیے تھا، میرا صدقہ اتارنا چاہیے تھا،مگر اماں کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

شاید۔۔۔۔شاید اماں اس لیے ناراض ہو رہی تھیں کہ میں نے اپنی نوکری کی اس خوشخبری کو اتنے دنوں تک ان سے چھپائے کیوں رکھا۔

محض اتنی سی بات پر ہی اماں نے میرے بدن کے کئی مقامات پر خون کی مقدار کو خطرناک حد تک بڑھا دیا۔اس دن ہمارے گھر بینگن کا بھرتہ بن رہا تھا۔اسی کام کے دوران اماں کی توجہ میری جانب ہوگئی۔

مجال ہے اماں نے مجھ میں اور بینگن میں کوئی امتیاز برتا ہو۔

نکما تو خیر میں ہمیشہ سے ہی تھا،لیکن اب کی بار حماقت اور جہالت کے تمغے بھی میرے سینے پر سج چکے تھے۔ میرے بعد اماں کی محبت کا رخ میرے موبائل کی جانب ہوگیا۔اماں نے میرے ہاتھ سے موبائل چھین لیا اور نظریں سکرین پر جما دیں۔اگرچہ اماں کو موبائل فون استعمال نہیں کرنا آتا تھا،مگر صبا کے پیغام کو ایک نظر دیکھتے ہی اماں نے سب جان لیا۔موبائل کے ذریعے صبا کی نبض اماں کے ہاتھ میں تھی۔

صبا سے دوری کے باوجود اماں نے اپنی تشخیص کا اعلان کر دیا۔۔۔

''اس مرجانی صبا کو تو محنت کے نام پر ہی دورے پڑتے ہیں دورے۔''

سیانوں کی طرح یہ صبا بھی کوئی ایک فرد یا چند اشخاص نہیں ہیں،صبا بھی ایک کردار ہے،جس میں کوئی بھی شخص سما سکتا ہے۔ صبا ایک کیفیت کا نام ہے، جو وقت بے وقت کسی پر بھی طاری ہوسکتی ہے۔

عقل کی بے راہروی سے سیانے جنم لیتے ہیں، جبکہ خواہشات کو شارٹ کٹ سے پورا کرنے کی کوشش میں صبا کی پیدائش ہو جاتی ہے۔ سارا دن دھوپ میں محنت مزدوری کرنے سے بہتر ہے کہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر بے شمار موبائل نمبروں پر صبا کی جانب سے پیغام ارسال کر دیا جائے۔ بھگوڑے جیسا کوئی احمق تو صبا کی مدد کو پہنچ ہی جائے گا۔

پھر شارٹ کٹ لگانے کی کوشش کرنے والی یہ ایک اکیلی/ اکیلا صبا نہیں ہے۔ ہم میں سے ہر شخص شعوری یا لاشعوری طور پر کسی نہ کسی شارٹ کٹ کی تلاش میں ہے۔

شارٹ کٹ۔۔۔۔۔خواہشات کو پورا کرنے کا سب سے آسان اور مختصر ترین راستہ۔

کم تنخواہ میں گزارا نہیں ہو رہا تو خواہشات پوری کرنے کے لیے رشوت کا شارٹ کٹ۔

بے روزگاری ہے یا پھر کام چوری کی عادت ہے تو دھوکا دہی، راہزنی، چوری کا شارٹ کٹ۔

سیدھے راستے پر چل کر نوکری نہیں مل رہی تو سفارش/ رشوت کا شارٹ کٹ۔

ایک فرد سے دوسرے فرد تک اس شارٹ کٹ کی نوعیت اور ماہیت بدل سکتی ہے، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم میں سے ہر شخص ہی کم سے کم وقت اور محنت میں زیادہ سے زیادہ خواہشات کی تکمیل کا خواہاں ہے، لیکن یہ سبھی راستے جنہیں ہم شارٹ کٹ سمجھ کر اپنا رہے ہوتے ہیں، کیا یہ راستے حقیقت میں بھی شارٹ کٹ ہیں؟ کیا برائی کا راستہ شارٹ کٹ ثابت ہوسکتا ہے؟

رشوت، دھوکا دہی، چوری، راہزنی۔۔۔

کیا ان چیزوں کی مدد سے تھوڑی محنت میں زیادہ خواہشات کو پورا کیا جا سکتا ہے؟

اگر تو زندگی بس یہی زندگی ہے تو پھر یہ تمام چیزیں حقیقت میں بھی شارٹ کٹ ثابت ہوسکتی ہیں۔ اگر ایک انسان کی موت پر ہی اس انسان کا اختتام ہو جاتا ہے تو پھر ہر قسم کے شارٹ کٹ لگانا نہ صرف عین حلال ہے، بلکہ باعثِ فرحت و تسکین بھی۔ آخر ایک فرد اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے سب سے آسان اور مختصر ترین راستے کا انتخاب کیوں نہ کرے؟؟؟

مگر۔۔۔۔مگر ہم اس وقت کمرۂ امتحان میں موجود ہیں۔ ہم حالتِ امتحان میں ہیں۔ ہم Tag ہو چکے ہیں۔ ہمارے ہر ہر عمل اور ہر ہر سوچ کو دیکھا جا رہا ہے، پرکھا جا رہا ہے۔

ہمیں ہمارے تمام اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

اچھائی کا بدلہ اچھائی ہوگا اور برائی کا بدلہ برائی ہوگا۔

ان حالات میں برائی کا راستہ حقیقی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ برائی کے راستے پر جانے والے یہ سبھی شارٹ کٹ حقیقت میں لمبے، بڑے ہی لمبے راستے ثابت ہونے والے ہیں۔

مگر ان تمام حقائق سے بے خبر ہمارے ہر جانب شارٹ کٹ بکھرے پڑے ہیں۔

بابا چورن شاہ المعروف بابا بنگالی۔

کاروبار کی بندش، امتحان کی تیاری، ساس بہو کے جھگڑے۔۔۔

شوہر جوتی کے نیچے، بیوی کے جوتوں سے نجات، محبوب آپ کے قدموں میں اور ہر قسم کے جادو ٹونے کا علاج بذریعہ مؤکلات کیا جاتا ہے۔

یہ سب کام ایک اکیلے باباجی کرتے ہیں اور شارٹ کٹ کے ذریعے خواہشات کو پورا کرنے کی کوشش کرنے والے حضرات جاتے ہیں مختلف باباجی لوگوں کے پاس۔ باقاعدہ قطاریں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔

بات شاید یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی۔ ہم تو مذہب کے نام پر بھی بہت سے شارٹ کٹ لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جانے انجانے ہم خدا کو بھی دھوکا دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

نیکی کا راستہ اختیار نہیں کرنا، برائی کا راستہ چھوڑنا بھی نہیں اور پھر آخرت میں نجات حاصل کرنے کے لیے ''پیر صاحب'' کا شارٹ کٹ لگانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ خود محنت نہیں کرنی، مگر پیر صاحب کی گاڑیوں، بلکہ کتوں کو بھی بوسے دیے جاتے ہیں۔

قبروں اور مزاروں پر جا کر ماتھے رگڑے جاتے ہیں۔

یہ سب جنت کا شارٹ کٹ لگانے کی ایک کوشش ہی تو ہے۔

پیر صاحبان کی خدمت کر کے سمجھا یہ جاتا ہے کہ یہ پیرانِ پیر خود ہی اللہ سے لڑ کر اپنے مریدین کو جنت میں داخل کروادیں گے۔ باقی سبھی حرام خوریاں بے شک چلتی رہیں، بس پیر صاحب کی خدمت میں کوئی کمی نہیں آنی چاہیے اور پھر پیر صاحبان بھی اپنے مریدین کو جنت کی نوید دیتے رہتے ہیں، مگر۔۔۔

''اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی شخص بھی کسی کے کچھ کام نہیں آئے گا۔ نہ کسی سے کوئی سفارش قبول کی جائے گی۔ نہ کسی سے کسی قسم کا فدیہ لیا جائے گا اور نہ ان کو کوئی مدد پہنچے گی۔'' (البقرۃ:48)

''بھلا کیا ان لوگوں نے اللہ (کی اجازت) کے بغیر کچھ سفارشی گھڑ رکھے ہیں؟ (ان سے) کہو کہ چاہے یہ نہ کوئی اختیار رکھتے ہوں، نہ کچھ سمجھتے ہوں (پھر بھی تم انہیں سفارشی مانتے رہو گے؟) کہو کہ سفارش تو ساری کی ساری اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ اسی کے قبضے میں آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے، پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹایا جائے گا۔'' (الزمر:43-44)

حد تو یہ ہے کہ۔۔۔

ہم جنابِ محمد رسول اللہ ﷺ کی شفاعت کو بھی بہ طور شارٹ کٹ استعمال کرتے ہیں۔

برائی کا راستہ نہیں چھوڑنا اور پھر امید یہ رکھنا کہ قیامت میں محمد رسول اللہ ﷺ بچا لیں گے۔

ذرا غور کیجیے کہ خود محمد رسول اللہ ﷺ اس معاملے میں کیا فرماتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''اے عبد مناف کے بیٹو! اپنی جانوں کو اللہ سے خرید لو (یعنی نیک کام

کر کے اللہ کے عذاب سے بچا لو)۔اے عبدالمطلب کے بیٹو! اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ سے خرید لو۔اے زبیر بن عوام کی والدہ! (رسول اللہ کی پھوپھی)اے فاطمہ بنتِ محمد! تم دونوں اپنی جانوں کو اللہ سے بچا لو۔میں تمھارے لیے اللہ کی بارگاہ میں کچھ اختیار نہیں رکھتا۔تم دونوں میرے مال میں جتنا چاہو، مانگ سکتی ہو۔'' (بخاری:3527)

اگر رسول اکرم ﷺ اپنی پھوپھی اور بیٹی کو یہ فرما رہے ہیں تو۔۔۔

میں اور آپ اس دن کہاں کھڑے ہوں گے؟

یہ بات ہمیں خود ہی سوچ لینی چاہیے۔

ایک بات تو یقینی ہے کہ برائی کا کوئی بھی راستہ شارٹ کٹ ثابت نہیں ہوسکتا، البتہ شارٹ کٹ لگانے کی خواہش بذاتِ خود کوئی بُری خواہش نہیں ہے، ایک بالکل فطری خواہش ہے۔ ہماری شارٹ کٹ لگانے کی اسی خواہش کے پیشِ نظر میں نے قرآنِ حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں اس زندگی کے کچھ حقیقی شارٹ کٹ اخذ کیے ہیں۔

اس زندگی کے جو شارٹ کٹ اب میں بیان کرنے جا رہا ہوں، یہی زندگی کے بہترین، آسان ترین اور مختصر ترین راستے ہیں۔

زندگی میں ان سے بہتر کوئی بھی شارٹ کٹ ناممکن ہیں، ناممکن ہیں۔

خواہشات کا شارٹ کٹ

انسانی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں۔

اس زندگی میں ہم جتنا مرضی بھاگ لیں، جو مرضی کرلیں، یہ خواہشات تو کبھی پوری نہیں ہوں گی۔

خواہشات کی تکمیل کا بس ایک ہی حقیقی راستہ ہے۔۔۔''جنت''

ہر جنتی کی ہر ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پورا کیا جاتا رہے گا۔خواہشات کی تکمیل کا بہترین اور مختصر ترین راستہ جنت ہے،لیکن جنت کے حصول کے لیے دھوکا دہی کے اس امتحان میں کامیابی ضروری ہے۔جنت کا راستہ اچھائی کا راستہ ہے،صبر کا راستہ ہےاور یہ دونوں چیزیں ہی ہمیں ناپسند ہیں۔

ہمیں تو برائی دلکش اور بھلی لگتی ہے۔ برائی کرنے کو جی چاہتا ہے،مگر کیا وجہ ہے کہ جنت جیسی عظیم ترین نعمت بھی ہمیں برائی چھوڑنے اور اچھائی کرنے پر آمادہ نہیں کر پاتی؟ جنت جیسا سب سے بڑا

Incentive بھی ہمیں متحرک کرنے میں،ہمیں Motivate کرنے میں کامیاب کیوں نہیں ہوپاتا؟

ذرااپنے اردگرد موجود دنیا کوایک نظر دیکھیں۔۔۔

انسانوں کی اکثریت محض اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے صبح سے شام تک محنت کر رہی ہے۔ معمولی سی نوکری کے لیے بیس بیس سال تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور پھر جونوکری ملتی ہے، اس پر دوبارہ سے محنت کی جاتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے فائدوں کے لیے ہم اپنی نیند قربان کر دیتے ہیں، ساری ساری رات جاگ کرمحنت کی جاتی ہے۔ یہ ساری محنتیں ہم خوشی خوشی کر لیتے ہیں، جبکہ اس ہمیشہ قائم رہنے والی جنت کے لیے ہم ذرا سا وقت دینے کو بھی تیار نہیں ہیں۔

ہم میں سے ہرانسان اپنی محنت بیچ رہا ہے۔

ہم میں سے ہرانسان کی محنت خریدی جاسکتی ہے۔فرق بس معاوضے کا ہے۔

کسی شخص کی بھاگ دوڑ کا مرکز ومحور پیسہ ہے توکسی کوشہرت میں دلچسپی ہے۔کسی کے دل کو عزت بھاتی ہےتوکسی کواقتدار کا نشہ سب سے اچھا لگتا ہے۔

کسی نہ کسی چیز کے لیے ہر انسان اپنی محنت کو بیچ رہا ہے،مگر کیا وجہ ہے، آخر ہم جنت کے عوض اپنی محنت کیوں نہیں بیچنا چاہتے ؟

نوکری پیشہ افراد کی تنخواہ میں صد فیصد اضافہ کر کے انہیں طلوعِ آفتاب سے پہلے کام پر بلایا جاسکتا ہے۔سب حضرات خوشی خوشی کام پرآ جائیں گے، جبکہ اللہ ہم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر ہر خواہش کو پورا کرنے کا وعدہ کر رہا ہے، مگر اللہ کا یہ وعدہ بھی ہمیں نمازِ فجر کے لیے اٹھانے میں ناکام رہتا ہے۔

جنت ہماری خواہش ہے، ضرورت ہے۔

خواہشات کو پورا کرنے کا بہترین شارٹ کٹ جنت ہے۔

مگر ہم انسان یہ سب سے بہترین اور حقیقی شارٹ کٹ کیوں نہیں لگانا چاہتے ؟

تیرے وعدے پر جیے ہم،تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

(غالب)

حقیقت یہ ہے کہ ہمیں اللہ کے وعدے پر یقین نہیں ہے۔

اللہ کا وعدہ ہی کیا، ہمیں تو اللہ کی ذات پر بھی یقین نہیں ہے۔

ہمیں جنت اور جنت کی نعمتوں پر بھروسہ نہیں ہے۔

ہمیں خدا کے ساتھ عنقریب ہونے والی ہماری ملاقات پر یقین نہیں ہے۔

اس زندگی میں خوشی اور غم ؛ دونوں فوراً ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس زندگی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ہم بڑی آسانی کے ساتھ محنت کر لیتے ہیں، جبکہ جنت کی نعمتیں اور جہنم کا عذاب، یہ سب کچھ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ اس لیے جنت کے لیے محنت کرنا ہمیں وقت کا ضیاع معلوم ہوتا ہے۔

روح، فرشتے، جنت، جہنم، قیامت۔۔۔۔۔۔ یہ سب کچھ ہماری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ہم سے پردے میں رکھی گئی ان چیزوں پر ہمارا ایمان جتنا مضبوط ہوگا، نیکی کرنا اتنا ہی آسان ہو جائے گا۔ وگرنہ چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے خون پسینہ ایک کر دینے والا یہ انسان احمق تھوڑی نہ ہے کہ جنت جیسی عظیم نعمت کے لیے محنت نہ کرے۔

ایک جانب آج ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ایمان کا فقدان ہے، جبکہ دوسری جانب جنت کے حصول کے لیے لازمی شرط ایمان ہی ہے۔

ہم سے غیب میں رکھی گئی چیزوں پر ایمان ہی شرطِ اوّل ہے۔

''زمانے کی قسم! انسان درحقیقت بڑے گھاٹے میں ہے۔ سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائیں اور نیک عمل کریں اور ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کریں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کریں۔'' (العصر:3-1)

آخرت کی کامیابی کا سارا دارومدار ایمان پر ہے۔ قرآنِ حکیم کی دعوت بنیادی طور پر ہے ہی ایمان کی دعوت۔

ایمان شرطِ اوّل ہے، ایمان کے بِنا تو نیک اعمال بھی قبول نہیں ہوں گے۔

لیکن کیا ہم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں؟

کیا ہمیں جنت اور جہنم کی موجودگی پر یقین ہے؟

ایمان رکھنے والے شخص کے لیے یہ دنیا ایک قید خانے جیسی ہوتی ہے۔ جنت پر یقین رکھنے والے شخص کے لیے موت سے محبوب اور کوئی چیز ہو ہی نہیں سکتی۔ موت تو حقیقی زندگی میں داخل ہونے کا واحد ذریعہ ہے۔ موت تو اس کمرۂ امتحان سے باہر نکلنے کا راستہ ہے۔

تو کیا ہم موت کو محبوب رکھتے ہیں؟

ہمیں تو موت کے نام پر ہی گھبراہٹ ہونے لگتی ہے۔ ہم تو اسی زندگی کو زندگی سمجھ کر اپنی ساری محنت یہاں کے چھوٹے چھوٹے فائدوں کے لیے ضائع کیے جا رہے ہیں۔

''فرما دیجیے: کیا ہم تمہیں ایسے لوگوں سے خبردار کر دیں، جو اعمال کے حساب سے سخت خسارہ پانے والے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں، جن کی ساری جدوجہد دنیا کی زندگی میں ہی برباد ہوگئی اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہم بڑے اچھے کام انجام دے رہے ہیں۔'' (الکہف:104-103)

اس زندگی میں ہم جن چیزوں کے پیچھے بھاگ رہے ہیں، یہ تمام چیزیں ہماری آزمائش کا ایک حصہ ہیں۔ کسی بھی لمحے، کسی بھی لمحے موت آسکتی ہے۔

یہ سب مال و دولت، بینک بیلنس، گھر گاڑی اور پورا خاندان؛ سب کچھ ادھر ہی رہ جائے گا۔ آگے صرف نیک اعمال جائیں گے۔ اس زندگی کا ہر ایک لمحہ یا تو ہمیں جنت کے قریب کر رہا ہے یا پھر جہنم کے۔ جیسے ہی موت کی صورت میں حقیقت ہم پر منکشف ہوگی، ہمیں اپنی زندگی کے ہر اس لمحے کے لیے افسوس ہوگا، جس لمحے میں ہم خود کو جنت کے قریب نہیں کر پائے۔ یہ دنیا تو ہمارے لیے ایک بہت بڑا موقع ہے۔ ایک بلینک چیک ہے یہ دنیا ہمارے لیے۔ اس دنیا میں ہمیں موقع دیا گیا ہے کہ ہم اپنی جنت کو، اپنی کائنات کو سنوار سکتے ہیں، لیکن ہم ہیں کہ غلاظت کی جانب ہی جھکے چلے جا رہے ہیں۔

اس چیز کی ایک بالکل خام سی مثال یوں بھی دی جاسکتی ہے کہ کسی شخص کو اگر ہیروں اور کوئلوں کی ایک اندھیری کان میں چوبیس گھنٹے کے لیے چھوڑ دیا جائے اور ساتھ ہی اس سے یہ کہا جائے کہ اس وقت میں جتنے ہیروں کو بھی چھولوگے، وہ سب تمھارے ہوں گے۔ وہ شخص چوبیس کے چوبیس گھنٹے اس اندھیری کان میں دوڑ دوڑ کر، ہیرے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ان کو ہاتھ لگاتا رہا۔

لیکن 24 گھنٹے بعد جب وہ شخص اندھیری کان سے باہر روشنی میں واپس آیا تو۔۔۔

اس کے ہاتھ مکمل سیاہ ہو چکے تھے۔

اپنی اس چوبیس گھنٹوں کی بھاگ دوڑ میں وہ بس کوئلوں کو ہی ہیرے سمجھ کر چھوتا رہا۔

ایسے شخص پر جب حقیقت منکشف ہوگی تو اس کے احساسات کیا ہوں گے؟

اب ذرا تصور کیجیے کہ۔۔۔

موت کے وقت اس دنیا کے سارے ساز و سامان کو ادھر ہی چھوڑ دینے کے بعد، مرنے والے شخص کے احساسات کیا ہوتے ہوں گے؟ ہمارے احساسات کیا ہوں گے؟

بہرحال خواہشات کا شارٹ کٹ جنت ہے اور جنت کے حصول کے لیے شرطِ اوّل ایمان ہے۔ ایمان بہت ضروری ہے۔ ایمان ہی وہ چیز ہے جو ہمارے لیے اچھائی کے راستے پر چلنا آسان کر سکتی

ہے۔ ہمارا جنت پر یقین ہوگا تو آخرت کے لیے محنت کرنا بالکل آسان ہو جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایمان ملتا کہاں سے ہے؟

اگر ایمان کمزور ہو تو اس کو پختہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟

قرآنِ حکیم۔۔۔ ایمان قرآنِ حکیم سے ملے گا۔

اللہ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان قرآنِ حکیم ہے۔ قرآنِ حکیم کے ساتھ اگر معنوی ربط قائم ہو جائے، قرآنِ حکیم کو اگر سمجھ کر پڑھا جائے تو اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی جنت کی نعمتوں کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ قرآنِ حکیم ہمیں ہماری پہلی زندگی کی باتیں یاد کرواتا ہے۔

قرآنِ حکیم کے ساتھ ایک معنوی ربط ہمارے شعور لاشعور کو اس طرح متاثر کرتا ہے، جسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

ہم میں سے ہر انسان کے اندر تمام حقائق پہلے سے موجود ہیں۔ ایمان ہمارے اندر کہیں بہت اندر پہلے سے ہی موجود ہے۔ بس اس پر ہماری نفسانی خواہشات کے پردے پڑ گئے ہیں۔ قرآنِ حکیم نے ان تمام پردوں کو ہٹا کر ہمارے اپنے ہی اندر موجود ایمان کو اجاگر کر دینا ہے۔

خواہشات کا مختصر ترین راستہ جنت ہے اور جنت کا مختصر ترین راستہ قرآنِ حکیم ہے۔

اس لمحۂ موجود میں اگر آپ اپنے ساتھ اور اپنی خواہشات کے ساتھ اخلاص کا رشتہ رکھتے ہیں اور اگر آپ محض خواب نہیں، بلکہ عملی طور پر اپنی تمام خواہشات کو پورا کرنا چاہتے ہیں تو بس قرآنِ حکیم کے ساتھ چپک جایئے۔ باقی کے سبھی کام یہ خود کر دے گا۔

اس میں ہر مرض کے لیے شفاء ہے۔

زندگی بدلنے کا شارٹ کٹ

کسی قریب ہی موجود کتابوں کی دوکان یا مارکیٹ جایئے۔۔۔

زندگی سمجھنے سمجھانے والی، زندگی بدل دینے والی بہت ساری کتابیں موجود ہوں گی۔ کچھ کتابیں تو ایسی عمدہ ہوتی ہیں کہ ان کا درجنوں زبانوں میں ترجمہ بھی کیا جاتا ہے۔ ان کتابوں کے ہزاروں نہیں، لاکھوں قارئین موجود ہوں گے۔

ایسی ہی چند کتابیں منتخب کریں اور خرید کر گھر لے آیئے۔

اب ذرا اپنے موبائل یا لیپ ٹاپ کے ذریعے یوٹیوب پر جایئے۔۔۔

زندگی بدل دینے والے، آنکھیں کھول دینے والے، دل پگھلا دینے والے اور رونگٹے ہلا دینے والے لاتعداد لیکچرز، انٹرویوز، تقاریر، بحث ومباحثہ موجود ہوں گے۔

ان پر تھوڑا وقت صرف کیجیے۔

ان تمام کتابوں اور ان تمام ویڈیوز میں کچھ دانشور، کچھ سیانے لوگ۔۔۔۔۔معاشرے کے کچھ ذہین ترین افراد اپنی زندگی کے تجربات کی روشنی میں نئی نسل کی رہنمائی کرتے ہیں۔ زندگی کی اس دوڑ میں آگے بڑھنے کے گُر بتائے جاتے ہیں۔

کامیابی کے اجزاء پر سیر حاصل بحث کی جاتی ہے۔

باالفاظِ دیگر۔۔۔

کنویں کا ایک بڈھا مینڈک اپنی ساری زندگی کنویں میں گزارنے کے بعد، اپنی لاتعداد خواہشات کو خود اپنے ہی ہاتھوں دفن کر دینے کے بعد، اب کنویں کی دیواروں کے ساتھ پھدک پھدک کر، پھدک پھدک کر کنویں کے دوسرے سبھی مینڈکوں کو یہ باور کروانے کی کوشش کر رہا ہے کہ اگر اس خاص انداز میں پھدکا جائے تو زندگی میں کامیابی وجود میں آتی ہے، وگرنہ ناکامی۔

ان تمام ویڈیوز، لیکچرز اور کتابوں میں آپ کو چند چیزیں مشترک ضرور ملیں گی۔

جیسا کہ۔۔۔

ایک انسان کی زندگی یہی ساٹھ ستر سالہ زندگی رہتی ہے۔

کنویں کا مینڈک کنویں کا مینڈک ہی رہتا ہے۔ نقطے کے قیدی کو آزادی نصیب نہیں ہوتی۔ وقت کا غلام وقت کا غلام ہی رہتا ہے، مگر۔۔۔

مگر یہ سب زندگی بدل دینے والی، زندگی میں انقلاب برپا کر دینے والی کتابیں اور ویڈیوز ہیں۔

دھت، دھت، دھت تیرے کی۔۔۔۔۔اگر مجھے پنجابی کے کچھ گاڑھے اور شُستہ الفاظ کو اس کتاب کا حصہ بنانا ہوتا تو میں کتاب کے اس مقام پر ایسے تمام الفاظ استعمال کر دیتا۔

پوری انسانیت کا بس ایک ہی مسئلہ ہے۔۔۔''خواہشات''

آج تک کسی سیانے نے ان خواہشات کو پورا کرنے کا کوئی طریقہ بتایا؟

خود اپنی ہی خواہشات کے لیے ترسنے والا ایک شخص دوسرے انسانوں کو ان کی خواہشات کی تکمیل کا طریقہ کیسے بتا سکتا ہے؟

ان سیانوں سے سوائے حسرت، یاس اور مایوسی کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ یہ احمق سیانے یا تو ان

خواہشات کو بہتر انداز میں برداشت کرنے کا کوئی خودساختہ طریقہ بتا رہے ہوں گے یا پھر یہ بتانے کی کوشش کی جائے گی کہ ان خواہشات کے پیچھے کتوں کی طرح دوڑا کیسے جاتا ہے۔

صبر تک رسائی حاصل نہیں ہوئی ہے ابھی ان سیانوں کی۔ کسی بھی مسئلے کا حل موجود نہیں ہے ان کے پاس۔ بس لفاظی کرنا آتی ہے انہیں۔ ایک ہی بات کو الفاظ بدل بدل کر بیان کرتے رہیں گے۔

زندگی کو حقیقی طور پر بدل دینے والی چیز بس ایک ہی ہے۔۔۔ ''قرآنِ حکیم''

اب ذرا قرآن وحدیث سے ماخوذ ان چند نکات پر توجہ کیجیے گا۔۔۔

1: میں اس جسم کی پیدائش سے پہلے بھی موجود تھا۔ میں جسم کے فنا ہو جانے کے بعد بھی زندہ رہوں گا۔ میں ہمیشہ، ہمیشہ، ہمیشہ زندہ رہوں گا۔

میں امر ہوں۔

2: میں یہ حقیر بیماریوں میں گھرا ہوا جسم نہیں ہوں۔ یہ جسم محض ایک دھوکا ہے۔

میں کچھ اور ہوں۔

میں روح ہوں۔

3: یہ تمام کائنات میری ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ میرے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔

میں اشرف المخلوقات ہوں۔ میں مسجودِ ملائک ہوں۔

4: یہ زندگی میری حقیقی زندگی نہیں ہے۔ میری حقیقی زندگی کا آغاز اس جسم کی موت کے بعد ہوگا۔ میری حقیقی زندگی ایک لامحدود زندگی ہے۔

5: میری یہ زندگی محض ایک امتحان ہے۔ میری اس زندگی کے ہر ہر لمحہ، ہر ہر پل کو محفوظ کیا جا رہا ہے۔ میری ہر ہر سوچ اور ہر ہر عمل کو دیکھا جا رہا ہے۔ میری محنت اور میری اچھائی کبھی ضائع نہیں جائے گی۔ مجھے میرے ہر چھوٹے بڑے عمل کا، میری ہر اچھی سوچ اور نیک ارادے کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

6: میری موت، میری موت نہیں ہے۔ موت درحقیقت اس جسم کی موت ہے۔ موت تو کمرۂ امتحان سے باہر نکلنے کا واحد راستہ ہے۔

جسم کی موت پر میرا امتحان ختم ہو جائے گا اور میری حقیقی زندگی شروع۔

7: اگر میں امتحان میں کامیاب ہو گیا تو مجھے کمرۂ امتحان سے باہر نکالنے کے لیے، محض میرا استقبال کرنے کے لیے ہی اتنے زیادہ فرشتے آئیں گے کہ تا حدِ نگاہ بس فرشتے ہی فرشتے ہوں گے۔

ہر طرف سلام ہو گا۔ اس Universal VVIP Protocol کے ساتھ مجھے تمام

کائنات کی سیر کروائی جائے گی۔

8: اگر میں امتحان میں کامیاب ہو گیا تو میری حقیقی زندگی میں میری ہر ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پورا کیا جاتا رہے گا۔ مجھے ایسی ایسی صلاحیتیں عطا کی جائیں گی، جن کا اس وقت تصور بھی ناممکن ہے۔جسم کو لباس کی مانند بدلنا عین ممکن ہوگا۔ اربوں کلومیٹر کی مسافت پر موجود چیزیں بھی میری نگاہوں کے بالکل سامنے موجود ہوں گی۔

حکومت کرنے کے لیے مجھے ایک جنت، ایک ایسی کائنات عطا کی جائے گی، جس کی وسعت اور خوبصورتی کا کچھ بھی اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔

9: میری حقیقی زندگی کا آغاز بس کسی بھی وقت، کسی بھی لمحے ہوسکتا ہے۔ کسی بھی لمحے موت آسکتی ہے۔ کسی بھی لمحے امتحان ختم ہوسکتا ہے۔ میری جنت، میری ہر ہر خواہش مجھ سے بس اتنی دور ہے کہ میں جنت والے اعمال کرتا ہوا مر جاؤں۔

یہ نو (9) نکات قرآن وحدیث سے ماخوذ ہیں اور ان کے ریفرنس پہلے گزر چکے ہیں۔ ان تمام باتوں میں کسی بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تمام باتیں حقیقت ہیں۔

محض ان حقائق پر اعتبار کر لیجیے۔۔۔

ان نو (9) نکات پر یقین کر لیجیے، ایمان لے آیئے۔۔۔

زندگی بدل جائے گی۔ زندگی بن جائے گی۔

پھر صد فیصد یقین کرنا بھی لازم نہیں ہے۔ کامل یقین تو ہم عام انسانوں کے لیے ویسے بھی ناممکن ہے۔ انسان کی عظمت کا بوجھ اٹھانا ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔

ان نکات پر بس ایک دو فیصد یقین کر لیجیے، زندگی صد فیصد بدل جائے گی۔

ہر احساس تھم جائے گا۔ ہر تکلیف ختم ہو جائے گی۔

بس ایک انتظار باقی رہ جائے گا۔

اپنے آپ سے ملاقات کا انتظار۔ اس امتحان کے ختم ہونے کا انتظار۔

ذرا اوپر آسمان کی جانب دیکھیں۔ اس آسمان کا جو حصہ ہمیں نظر آتا ہے، اس آسمان کے ہر ایک سینٹی میٹر جگہ میں اربوں کہکشائیں دور، کہیں بہت دور موجود ہیں اور یہ سب آپ کے لیے ہیں۔

خدائے بزرگ وبرتر کی عزت کی قسم! ہم انسانوں کے لیے ہے یہ سب کچھ۔

اگر اس حقیقت پر ذرا بھی یقین آجائے تو کیا اس نقطے کی قید میں مزید وقت گزارنا اچھا لگے گا آپ کو؟

اس کائنات میں Uy-Scuti جیسے بڑے بڑے اور بے شمار ستارے ایسے بھی ہیں، جو مکمل طور پر ہیروں سے بنے ہوئے ہیں اور یہ سب کچھ آپ کے لیے ہے۔ اگر اس بات پر یقین آ جائے تو کیا پاکستان میں سونے کا بھاؤ اوپر تلے ہونے پر آپ پریشان ہوا کریں گے؟

یہ تمام کائنات آپ کے لیے ہے۔ اگر اس بات پر یقین آ جائے تو کیا اس کنویں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے مزید بھاگنا پسند کریں گے آپ؟

اس چھوٹے کانوں والے، اس مرے ہوئے میمنے کا مزید گوشت نوچنا اچھا لگے گا آپ کو؟

ایک بات پوچھوں؟

کیا لگتا ہے؟۔۔۔۔۔ کیوں پیدا کیا ہے اللہ نے آپ کو؟

کیا یہ ساری تخلیق بے مقصد ہے؟

کیا اللہ نے آپ کو محض اس لیے پیدا کیا ہے کہ آپ ساری زندگی نقطے کی قید میں چھوٹی چھوٹی خواہشات کے لیے ترستے رہیں؟

کیا آپ کی تمام خواہشات اور خواب اللہ کی نگاہوں سے پوشیدہ ہیں؟

آپ کی تمام خواہشات کو پورا کر دینے سے، آپ کا ہر خواب سچ کر دینے سے اللہ کے خزانوں میں کوئی کمی واقع ہو جائے گی کیا؟

ارے بھئی! یہ زندگی امتحان ہے۔ ہماری اس مختصر سی زندگی کا مقصد بس آزمائش ہے۔

ہم اس وقت کمرۂ امتحان میں موجود ہیں۔۔۔۔۔ یہ زندگی محض ایک دھوکا ہے۔

ہماری حقیقی زندگی۔۔۔۔۔اس ہمیشہ قائم رہنے والی زندگی کا آغاز تو ابھی ہونا ہے۔

میں تو ریاضی میں شروع سے ہی کمزور ہوں، لیکن آپ کسی ریاضی دان سے ضرور مشورہ کیجیے گا کہ ایک لامحدود زندگی کے مقابلے میں ہماری اس ساٹھ ستر سالہ زندگی کی کیا اوقات ہے؟

صفر۔۔۔۔۔صفر تصور کی جائے گی یہ زندگی اور پھر محض یہ ساٹھ ستر سال ہی کیا، ایک لامحدود زندگی کے مقابلے میں تو پچاس ارب سال کی زندگی بھی صفر تصور ہو گی۔

بس۔۔۔

ان حقائق پر اعتبار کر لیجیے۔

جس دن اس زندگی کے امتحان ہونے پر اور جنت کے انعام ہونے پر یقین آ گیا۔۔۔

زندگی بدل جائے گی۔ زندگی بن جائے گی۔

خوشی کا شارٹ کٹ

ایک کام کیجیے۔۔۔

ایک کاغذ پنسل اٹھائیے۔۔۔

اب اس کاغذ پر اپنی زندگی کی تین سب سے بڑی۔۔۔

خواہشات، خواب یا پھر Fantasies لکھ دیجیے۔

اپنی ان خواہشات کو لکھتے وقت بلا وجہ کنویں کے مینڈکوں والی حقیقت پسندی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ لمحات کے لیے ہر قسم کی اخلاقیات کو بھی خیر آباد کہہ دیجیے۔ جو بھی، جیسی بھی، جس بھی قسم کی آپ کی یہ تین خواہشات یا خواب ہیں۔۔۔

انہیں کسی کاغذ پر لکھ دیجیے۔

اگر کاغذ پر نہیں لکھنا چاہتے تو اپنے دماغ میں ہی سوچ لیں۔

مگر آگے بڑھنے سے پہلے سوچ ضرور لیں۔

گھر، گاڑی، کوکین، گانجا، ہالی ووڈ۔۔۔ بالی ووڈ کی ہیروئین، ورلڈ ٹور۔۔۔

آپ کی زندگی کی کوئی بھی خواہش یا پھر۔۔۔۔۔''خواہش''

کچھ بھی سوچ لیجیے۔۔۔۔۔ کچھ بھی لکھ دیجیے۔

لکھ لیا؟۔۔۔۔۔ سوچ لیا؟

اب ایک بار پھر سے اس فہرست کو پڑھ لیجیے۔

پھر سے پڑھ لیجیے۔۔۔۔۔ کوئی تبدیلی کرنی ہے تو وہ بھی کر لیجیے۔

اپنی زندگی کی تین سب سے بڑی خواہشات پر مشتمل اس فہرست کو ایک آخری بار پھر سے پڑھ لیجیے اور اب فرض کیجیے کہ۔۔۔

آج سے ٹھیک سات دن بعد۔۔۔

آپ کی ان تینوں خواہشات کو پورا کر دیا جائے گا۔

اگر آپ کو اس بات پر یقین آ جائے کہ آج سے ٹھیک سات دن بعد آپ کی زندگی کی تین سب سے بڑی خواہشات عملی طور پر پورا ہو جائیں گی تو ایسے حالات میں آپ کے یہ سات دن کیسے گزریں گے؟

ان سات دنوں میں آپ کے احساسات کیا ہوں گے؟

اگر آپ کی قوتِ تخیل ذرا سی، ذرا سی بھی کام کرتی ہوئی تو آپ جان جائیں گے کہ ان خواہشات کے پورا ہو جانے کا تو محض خیال ہی آپ کے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دینے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اگر کہیں آپ کو ان خواہشات کے سات دن بعد عملی طور پر پورا ہو جانے پر یقین آ جائے تو ان سات دنوں میں آپ کو اچھے سے نیند بھی نہیں آئے گی۔ آپ کے یہ سات دن بہت اچھے، بہت خوش گزریں گے۔

خوشی کے ساتھ ساتھ بس آپ کو ایک انتظار ہو گا۔

ان سات دنوں کے جلدی سے گزر جانے کا انتظار۔ لیکن کیا کوئی انسان صد فیصد یقین کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہے کہ وہ اگلے سات دن زندہ رہے گا؟

ارے بھئی! یہ سات دن بہت دور ہیں۔۔۔۔۔ موت بہت قریب ہے۔

اگر آپ حالتِ ایمان میں، جنت والے اعمال کرتے ہوئے اس کمرۂ امتحان سے باہر نکلتے ہیں تو ان تین چھوٹی چھوٹی خواہشات کی اوقات ہی کیا ہے۔ آپ کی ہر ہر خواہش کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پورا کیا جاتا رہے گا۔

آپ کی تمام خواہشات آپ کے بالکل قریب ہی تو ہیں۔

سات دنوں سے بھی زیادہ قریب۔

اور۔۔۔

خواہشات کے پورا ہو جانے کا نام ہی خوشی ہے۔

اگر ہم ایمان کی لذت سے آشنا ہو جائیں تو اس زندگی میں جنت کا تصور ہی اصل اور حقیقی خوشی ہے۔ کمرۂ امتحان میں حقیقی خوشی امتحان کو اچھے طریقے سے حل کرنے میں ہی موجود ہوتی ہے۔ کمرۂ امتحان میں تھوڑی اچھل کود کر کے چند لمحاتی لذات تو حاصل ہو سکتی ہیں، مگر حقیقی خوشی اور سکون کبھی نہیں ملے گا۔

دورانِ امتحان ہی اگر کامیابی کا یقین ہونا شروع ہو جائے، تب حقیقی خوشی جنم لیتی ہے۔

اللہ ہی نے پیدا کیا ہے ناں ہمیں؟

تو پھر جو طریقے اللہ نے ہمیں بتائے ہیں، ان طریقوں پر چل کر ہی خوشی ملے گی۔

اس زندگی میں خوشی کا شارٹ کٹ ایمان ہے۔

آپ کی ہر خوشی آپ کے اپنے ہی اندر موجود ہے۔

باہر کی دنیا کے حالات جیسے بھی ہوں، آپ کے اندر اگر ایمان ٹھیک حالت میں موجود ہے تو باہر موجود کوئی بھی چیز آپ سے آپ کی خوشی نہیں چھین سکتی۔

قرآنِ حکیم کی دعوت محض ایمان کی دعوت نہیں ہے، یہ خوشی کی دعوت بھی ہے۔
قرآن بشارتیں دینے والا اور خوشیاں بانٹنے والا ہے۔
قرآنِ حکیم کی مدد سے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور۔۔۔
خوش رہیں۔

ہر شارٹ کٹ کا بس ایک ہی شارٹ کٹ

ہماری یہ دنیا کی زندگی اور پھر وہ ہمیشہ قائم رہنے والی حقیقی زندگی۔۔۔
ہماری اس لامحدود زندگی میں ہر کامیابی کا حقیقی شارٹ کٹ بس ایک ہی ہے۔۔۔
''قرآنِ حکیم''

یہ کتابِ زندگی ہے۔قرآنِ حکیم میں ہمارے خالق نے ہماری کامیابی کے مختصر ترین اور بہترین راستے ہمیں بتا دیے ہیں۔اس سے بہتر کچھ بھی ناممکن ہے۔

بس ہمیں تو اس قرآنِ حکیم کے ساتھ چپک جانا ہے۔باقی کا ہر کام یہ خود ہی کر دے گا۔

پھر اگر اس قرآنِ حکیم کو مجسم انسانی شکل میں دیکھنا مقصود ہو تو محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا مطالعہ کیجیے۔قرآنِ حکیم محمد رسول اللہ ﷺ کی سیرت بیان کرتا ہے۔رسول اللہ ﷺ قرآنِ حکیم کی وضاحت کرتے ہیں۔آپ ﷺ ہی پوری انسانیت کے لیے کامل اسوہ ہیں۔اگر ہم عملی طور پر اپنا آئیڈیل محمد رسول اللہ ﷺ کو بنالیں تو ہمیشہ ہمیشہ کی کامیابی نصیب ہو جائے گی۔

اور اب سیانوں کے ساتھ ایک آخری بات۔۔۔
زمین پر بہت سے انسان خدا کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔بقول ان سیانوں کے۔۔۔
اَن دیکھے خدا پر یقین رکھنا دقیانوسیت ہے۔
سیانوں سے اختلافات اپنی جگہ،مگر سیانوں کی یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔
خدا کو دیکھا تو آج تک میں نے بھی نہیں ہے اور یقیناً آپ نے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔
تو پھر۔۔۔۔۔ایک اَن دیکھے خدا پر ایمان کیوں لایا جائے؟
اس زمین پر بہت سارے لوگ ایک سے زائد خداؤں پر یقین رکھتے ہیں۔
اللہ کے ''احد'' ہونے پر میرے پاس کیا دلیل ہے؟
زمین پر بسنے والے انسانوں کی اکثریت جنابِ محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کرتی ہے۔

حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا میرے پاس کیا ثبوت ہے؟
مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے یا نہیں؟
کسی مرنے والے نے آج تک واپس آ کر موت کے بعد کے حالات نہیں بتائے۔
پھر اسی طرح یہ جنت، جہنم، روح، فرشتے، جن اور قیامت۔۔۔
ان چیزوں کو ہم نے کبھی اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا تو پھر ان تمام اَن دیکھی چیزوں پر یقین کیوں رکھا جائے؟ ان تمام چیزوں کے حق اور سچ ہونے پر میرے پاس کیا دلیل ہے؟
ان تمام سوالوں کا بس ایک ہی جواب ہے۔۔۔ ''قرآنِ حکیم''
خدا کے وجود پر، خدا کے احد ہونے پر، جنابِ محمد ﷺ کے رسول ہونے پر۔۔۔
جنت، جہنم، قیامت، روح، فرشتے اور جن۔۔۔
ہم سے پوشیدہ ان تمام چیزوں کی موجودگی پر سب سے بڑی دلیل اور ثبوت قرآنِ حکیم ہے۔
ان تمام چیزوں کی خبریں ہمیں قرآنِ حکیم نے دی ہیں۔
اس لیے یہ تمام چیزیں حق ہیں۔
قرآنِ حکیم کا ہر ایک لفظ، ہر ایک حرف۔۔۔۔۔حق ہے، سچ ہے۔
اب سوال یہ ہے کہ قرآنِ حکیم کے اپنے حق اور سچ ہونے پر کیا دلیل ہے؟
ہم سے پوشیدہ ان تمام چیزوں کی حقانیت پر دلیل اگر قرآنِ حکیم ہے تو قرآنِ حکیم کی اپنی حقانیت پر کیا دلیل ہے؟
قرآن اللہ کے علم سے اتاری گئی کتاب ہے، اس بات کا میرے پاس کیا ثبوت ہے؟
ان تمام سوالوں کا جواب ایک بار پھر۔۔۔ ''قرآنِ حکیم''
قرآنِ حکیم کی اپنی حقانیت پر دلیل بھی قرآنِ حکیم ہی ہے۔ قرآنِ حکیم کے حق اور سچ ہونے کو ثابت کرنے کے لیے ہمیں کسی بھی اور دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآنِ حکیم اپنی حفاظت اور وضاحت خود کرتا ہے اور اگر کسی انسان کو قرآنِ حکیم کے حق ہونے پر شک ہے تو پھر ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ دو قدم آگے آئے اور اپنے خدا کے چیلنج کو قبول کرے۔

''ہاں کیا وہ یہ کہتے ہیں: ان صاحب نے یہ (قرآن) خود گھڑ لیا ہے۔ نہیں،
بلکہ یہ (ضد میں) ایمان نہیں لا رہے۔ اگر یہ واقعی سچے ہیں تو اس جیسا کوئی
کلام (گھڑ کر) لے آئیں۔'' (الطور:34-33)

چلیں اگر اس قرآن جیسا پورا قرآن تصنیف کرنا مشکل ہے تو۔۔۔

''بھلا کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وحی اس (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی طرف سے گھڑ لی ہے؟ (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے) کہہ دو کہ پھر تم بھی اس جیسی گھڑی ہوئی دس سورتیں بنا لاؤ اور (اس کام میں مدد کے لیے) اللہ کے سوا جس کسی کو بلا سکو، بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ اس کے بعد اگر یہ تمھاری بات قبول نہ کریں تو (اے لوگو) یقین کر لو کہ یہ وحی صرف اللہ کے علم سے اتری ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ تو کیا اب تم فرماں بردار بنو گے؟'' (ہود:13-14)

دس سورتیں بھی زیادہ ہیں تو۔۔۔

''اور اگر تم اس (قرآن) کے بارے میں ذرا بھی شک میں ہو، جو ہم نے اپنے بندے (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتارا ہے تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا لاؤ اور اگر سچے ہو تو اللہ کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو بلا لو۔ پھر بھی اگر تم یہ کام نہ کر سکو اور یقیناً کبھی نہیں کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ وہ کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔'' (البقرۃ:24-23)

''اور یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی اس کو اپنی طرف سے بنا لائے۔ ہاں (یہ اللہ کا کلام ہے) جو (کتابیں) اس سے پہلے (کی) ہیں، ان کی تصدیق کرتا ہے اور انہی کتابوں کی (اس میں) تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں (کہ) یہ رب العالمین کی طرف سے (نازل ہوا) ہے۔ کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کو اپنی طرف سے بنا لیا ہے؟ کہہ دو کہ اگر سچے ہو تو تم بھی اس طرح کی ایک سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا جن کو تم بلا سکو، بلا بھی لو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کے علم پر یہ قابو نہیں پا سکے، اس کو (نادانی سے) جھٹلا دیا اور ابھی اس کی حقیقت ان پر کھلی نہیں ہے۔ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے تھے، انہوں نے تکذیب کی تھی۔ سو دیکھ لو ظالموں کا کیا انجام ہوا۔'' (یونس:39-37)

ایک سورت، محض ایک چھوٹی سی سورت۔۔۔ دو سطروں پر مشتمل بس تین جملے۔۔۔ جو فصاحت و بلاغت میں قرآنِ حکیم کے ہم پلّہ ہوں۔

چلیں قرآنِ حکیم کا یہ چیلنج تو صرف عربی زبان جاننے والوں کے لیے ہے اور پچھلے ساڑھے چودہ سو برس میں تو کوئی اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکا۔

اب پوری انسانیت کے لیے قرآنِ حکیم کا چیلنج بھی سن لیجیے۔۔۔

''کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر سے کام نہیں لیتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس میں بکثرت اختلاف پاتے۔'' (النساء:82)

قرآنِ حکیم میں 114 سورتیں ہیں، 6000 سے زائد آیات ہیں۔قرآنِ حکیم میں زندگی کے تقریباً ہر اہم موضوع پر بات کی گئی ہے، حتیٰ کہ آج اکیسویں صدی میں ہونے والی سائنسی ایجادات کے بارے میں بھی اشارے موجود ہیں۔اگر کسی کو قرآنِ حکیم پر شک ہے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں ہے تو اس پورے قرآن میں بس کوئی ایک حقیقی اختلاف ڈھونڈ دے یا پھر قرآنِ حکیم میں بیان کی گئی کسی ایک بات کو غلط ثابت کر دے۔اگر ایسا کر دیں گے تو قرآنِ حکیم غلط ثابت ہو جائے گا۔

خدائے بزرگ و برتر کی عزت کی قسم!

اس دنیا کے سبھی سیانے مل کر بھی نہ تو قرآنِ حکیم میں کوئی اختلاف ڈھونڈ پائیں گے اور نہ ہی قرآنِ حکیم میں بیان کی گئی کسی بات کو غلط ثابت کر سکیں گے۔قرآنِ حکیم اللہ کے علمِ کامل سے اتارا گیا ہے اور اس کی حفاظت بھی اللہ ہی کی ذمہ داری ہے۔قرآنِ حکیم اللہ کا انسانیت پر سب سے بڑا احسان ہے۔ قرآنِ حکیم کے ذریعے ہمیں دھوکا دہی کے اس امتحان میں بہت بڑی مدد فراہم کی گئی ہے۔وہ تمام چیزیں جن کے پیچھے ہم بھاگ رہے ہیں، دوڑ رہے ہیں، وہ تمام چیزیں جو ہم جمع کر رہے ہیں۔۔۔

قرآنِ حکیم ان تمام چیزوں سے کہیں بڑھ کر قیمتی ہے۔

لیکن افسوس! ہم مسلمان قرآنِ حکیم کو پہچان نہ سکے۔ہم اس کی قدر و قیمت کا اندازہ نہ کر سکے۔ہمیں اپنی خوش قسمتی پر یقین ہی نہ آیا۔علم و حکمت کے سارے خزانے ہمارے اپنے پاس موجود ہیں اور اس زندگی کو سمجھنے کے لیے ہم اپنا قبلہ و کعبہ ان لوگوں کو بنا رہے ہیں، جنہیں خود قرآنِ حکیم کی ہدایت کی ضرورت ہے۔ہم مسلمانوں کو تو یہ قرآن دوسروں تک پہنچانا تھا۔

تمام غیر مسلموں کو بھی قرآن کی دعوت دے کر پوری انسانیت کو جہنم سے بچانے کی کوشش کرنی تھی، مگر آج ہم نے اپنی نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہوئے قرآن کو عملی طور پر بھلا دیا ہے۔بس ایک نام کا عقیدہ باقی ہے، وگرنہ حقیقت یہ ہے کہ آج ہماری چھوٹی چھوٹی نفسانی خواہشات ہی ہماری معبود بن چکی ہیں۔

کاش! اس زندگی کی حقیقت ہماری سمجھ میں آ جائے۔

کاش! ہمیں اس کنویں میں گھٹن کا احساس ہونا شروع ہو جائے۔

اور کاش! ہماری حقیقی زندگی کی حقیقت ہماری سمجھ میں آ جائے۔

''اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے اور (ہمیشہ کی) زندگی (کا مقام) تو آخرت کا گھر ہے۔ کاش یہ (لوگ) سمجھتے۔'' (العنکبوت:64)

''ہر متنفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے اور تم کو قیامت کے دن تمھارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ تو جو شخص آتشِ جہنم سے دور رکھا گیا اور جنت میں داخل کیا گیا، وہ مراد کو پہنچ گیا اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔'' (آلِ عمران:185)

''مومنو! تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لیے) نکلو تو تم (کاہلی کے سبب) زمین پر گرے جاتے ہو۔ (یعنی گھروں سے نکلنا نہیں چاہتے) کیا تم آخرت کی نعمتوں کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو بیٹھے ہو؟ دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابلے میں بہت ہی کم ہیں۔'' (التوبہ:38)

''یہ تو دنیا کی ظاہری زندگی کو جانتے ہیں اور آخرت (کی طرف) سے غافل ہیں۔'' (الروم:7)

''جنھوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا تھا اور دنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا تھا تو جس طرح یہ لوگ اس دن کے آنے کو بھولے ہوئے اور ہماری آیتوں سے غافل ہو رہے تھے، اسی طرح آج ہم بھی انہیں بھلا دیں گے۔'' (الاعراف:51)

''جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی توقع نہیں اور دنیا کی زندگی سے خوش اور اسی پر مطمئن ہو بیٹھے اور ہماری نشانیوں سے غافل ہو رہے ہیں، ان کا ٹھکانا ان (اعمال) کے سبب جو وہ کرتے تھے، دوزخ ہے۔'' (یونس:8-7)

اور ایک ہم ہیں۔۔۔

ہمیں حالات کی سنگینی کا ذرا بھی احساس نہیں ہے۔

ہم اپنے اسی کھیل کود میں مصروف ہیں۔

یاد رکھیے!

اس امتحان میں شمولیت کا فیصلہ، ہر انسان کا اپنا فیصلہ ہے۔

ہر انسان کے بھاگنے کے تمام راستے بند ہیں۔ ہر انسان نے اپنے بھاگنے کے راستے خود بند کیے ہیں۔آنکھیں بند کر لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

بالکل سامنے موت کھڑی ہے۔

بس کسی بھی وقت کسی بھی لمحے۔۔۔

بس ایک ہی جھٹکا اور ہر چیز اِدھر سے اُدھر۔

اس کے فوراً بعد جنت یا پھر جہنم۔

ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمام خواہشات کو پورا کیا جائے گا یا پھر۔۔۔

موت ہی سب سے بڑی خواہش بن جائے گی۔

موت کی اس خواہش کو بھی حسرت میں تبدیل کر دیا جائے گا۔

لیکن۔۔۔

ہمیں تو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہم اس وقت حالتِ امتحان میں ہیں۔

ہم اس زندگی سے اور اس دنیا کی رونقوں سے۔۔۔۔۔دھوکا کھا چکے ہیں۔

تکلیف کے لمحات میں پھر بھی کبھی کچھ سوچ لیں گے، لیکن جیسے ہی تکلیف دور ہوئی۔۔۔

پھر سے وہی شب و روز، پھر سے وہی بھاگ دوڑ اور پھر سے وہی اچھل کود۔

کوئی چیز، کوئی بات، کوئی حادثہ ہم پر اثر نہیں کرتا۔شاید۔۔۔

میں بے حِس ہوں۔

میں سنگ دل ہوں۔

میں پتھر ہوں۔

باب:12

وہ۔۔۔اور میں

ایک بات محسوس کی آپ نے ؟

اس کتاب کے تقریباً نوّے فیصد حصے کا مطالعہ آپ کر چکے ہیں اور یہ اس کتاب کا آخری باب ہے۔ اس کتاب میں اب تک آپ سے جتنی بھی باتیں کی گئی ہیں، ان میں یقیناً بہت ساری چھوٹی چھوٹی غلطیاں موجود ہوں گی ،لیکن ان معمولی ،نظر انداز کر دینے لائق غلطیوں کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں ایک تضاد بھی موجود ہے۔

ایک بہت بڑا تضاد۔۔۔۔۔ایک قابلِ گرفت غلطی۔

اگر تو آپ میری اس غلطی کو میرے بتانے سے پہلے ہی محسوس کر چکے ہیں، اپنی گرفت میں لا چکے ہیں تو یقیناً آپ مبارک باد کے مستحق ہیں، کیونکہ اس کا مطلب ہے کہ آپ انسانی وجود کے دہرے پن کو اپنے دل و دماغ میں بسا چکے ہیں۔آپ نے خود کو جاننے اور پہچاننے کی کوشش کی ہے اور آپ نے اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ وقت ضرور گزارا ہے اور اگر اس کتاب میں موجود ایک بڑی ہی بنیادی غلطی ابھی تک آپ کی نگاہوں سے اوجھل رہی ہے تو۔۔۔

چند لمحات کے لیے سوچیں، ڈھونڈیں ،غور کریں ،مل جائے گی یا پھر۔۔۔

چلیں میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔

اس کتاب میں بار بار، بار بار انسانی خواہشات کا تذکرہ ہوا ہے۔انسانی خواہشات کی لامحدودیت کا رونا رویا گیا ہے۔۔۔

مگر یہ کون سا انسان ہے جس کی خواہشات لامحدود ہوتی ہیں؟

انسان کا ایک روحانی وجود ہوتا ہے اور ایک جسمانی وجود۔انسان کا حقیقی وجود اس کا روحانی وجود ہے،لیکن ہماری اس کتاب میں جتنی بھی خواہشات کو انسانی خواہشات کا نام دے کر بار بار بیان کیا گیا ہے، ان میں سے انسان کی اپنی خواہش تو کوئی ایک بھی نہیں ہے۔

یہ بطن و فرج کے تمام تقاضے تو انسان کے جسم سے منسلک ہیں۔ یہ سب کچھ تو جسم کی ضروریات ہیں اور ہم مسلسل ایک دھوکے کا شکار ہو کر انسان کے جسمانی وجود کے ان تقاضوں کو ہی انسانی خواہشات سمجھ کر بیان کرتے چلے آ رہے ہیں۔

میں اگر روح ہوں تو اس جسم کی ضروریات سے ہٹ کر، میری روح کی اپنی بھی تو کچھ خواہشات ہوں گی ناں؟ روح کی خواہشات کی نوعیت کیا ہو سکتی ہے؟

کیا جسمانی وجود کی ضروریات ہی روحانی وجود کی خواہشات ہیں؟ یا پھر روح کی خواہشات اس جسم کی ضروریات سے یکسر مختلف ہیں؟

میں انسان ہوں۔ ایک میرا جسم ہے اور ایک میری روح۔

اگر جسم کی تمام ضروریات کو مجھ سے دور کر دیا جائے، اگر میں جسم کی قید سے یکسر آزاد ہو جاؤں، تب میری خواہشات کی نوعیت کیا ہوگی؟

انسانی خواہشات تہہ در تہہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپی ہوئی موجود ہوتی ہیں۔ اگر ان تمام تہوں کو، اگر ان تمام پردوں کو ہٹا دیا جائے تو۔۔۔۔۔سب سے آخر میں کیا موجود ہوگا؟

اب چند لمحات کے لیے خواہشات کے ذکر کو ذرا اِدھر ہی موقوف کرتے ہیں۔

اگر آپ نے محسوس کیا ہو تو اس کتاب کے بنیادی طور پر تین ہی اہم کردار رہے ہیں۔۔۔

میں، خدا اور کائنات۔

اس کتاب کا ہر باب، ہر سطر اور ہر ہر لفظ انہی تین کرداروں کے گرد گردش کرتا رہا ہے۔ ان تین کرداروں کے سوا اس کتاب میں کچھ شامل نہیں۔

میرے اردگرد موجود ہر چیز، ریت کے ایک ذرّے میں چھپی دنیا سے کہکشاؤں کے اَن گنت جھرمٹوں تک، تمام قدرتی مناظر اور خوبصورتیوں سے انسانی اور حیوانی زندگیوں تک۔۔۔

یہ سب کچھ میرے لیے، میرے نقطۂ نظر سے میری کائنات کا ایک حصہ ہے۔

جبکہ اس تمام کائنات کو دیکھنے کے لیے، محسوس کرنے کے لیے، جذب کرنے کے لیے یا پھر برداشت کرنے کے لیے۔۔۔۔۔ایک ''میں'' موجود ہوں۔

اگر ہم نے ذرّے میں چھپی دنیا کو کھوجنے کی کوشش کی ہے تو اس کائنات کی وسعتوں کو بھی ماپا گیا ہے اور اگر انسانی وجود کے دہرے پن کو سمجھنے کی کوشش کی ہے تو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے، جبکہ اس کتاب کے تیسرے کردار، اس حقیقی لامحدود

ذات کی چند صفات کا ذکر کرنے کے بعد اس ہستی کی لامحدودیت کا اعتراف بھی کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے تینوں کرداروں پر انفرادی طور پر بحث کرنے کے ساتھ ساتھ ہم نے ان کرداروں کے آپس کے تعلق کو جاننے کی کوشش بھی کی ہے۔ اگر اللہ اور اس کائنات کے تعلق کی بات کی جائے تو ہر چیز، ہر ہر چیز مخلوق ہے۔ ہر چیز اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔ بس وہ اکیلا اللہ ہی ہر چیز کا خالق ہے، مالک ہے۔ دوسری جانب انسان اور اس کائنات کا تعلق بھی اب ہم سے کسی طور پوشیدہ نہیں رہا۔ سائنس کے مطابق میں ایک نقطہ کا قیدی ہوں، جبکہ قرآنِ حکیم کے مطابق یہ تمام کائنات میرے لیے تخلیق کی گئی ہے۔ یہ کائنات میری ہے۔ یہ کائنات آپ کی ہے۔

اب اس کتاب میں بات کرنے کے لیے بس ایک ہی موضوع باقی رہ جاتا ہے۔۔۔

وہ۔۔۔اور میں۔

اللہ اور انسان کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ اللہ کے ساتھ میرا رشتہ کیا ہے؟

اللہ نے اس لامحدود کائنات کو میرے لیے پیدا کیا، مگر کیوں؟

اگر اس کائنات کو میرے لیے پیدا کیا گیا ہے تو مجھے کس لیے پیدا کیا گیا ہے؟

میری تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اس تمام کائنات کو میری نگاہوں کے سامنے عیاں کر کے اللہ نے خود کو میری نگاہوں سے چھپا کیوں رکھا ہے؟

ان تمام سوالوں کا جواب ہم اس باب میں ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے، مگر اب کی بار بات ایک مختلف انداز میں کی جائے گی۔ زیرِ مطالعہ باب سے پہلے تک اس کتاب میں جتنے بھی نظریات اور خیالات بیان کیے گئے ہیں، ان سب پر بات چیت عقلی بنیادوں پر کی گئی ہے۔ ان تمام خیالات اور نظریات کا دفاع عقل کے ذریعے کیا جا سکتا ہے، مگر انسانی عقل محدود ہے، بہت محدود ہے، بہت ہی محدود ہے۔

سرخ رنگ، چائے کا ذائقہ، پٹرول کی خوشبو اور پانی کا گیلا پن۔۔۔

ان تمام چیزوں کو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں محسوس کرتے ہیں، لیکن ہم میں سے کوئی ایک انسان بھی یہ نہیں جانتا ہے کہ ہم ان چیزوں کو محسوس کیوں کرتے ہیں؟ کیسے کرتے ہیں؟

پھر ان تمام احساسات کو الفاظ دینے کے لیے انسانی عقل کے پاس الفاظ بھی موجود نہیں ہیں۔ ایسی محدود عقل کے ذریعے اللہ اور انسان کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کرنا محض ایک حماقت ہی ہو گی۔

جبکہ میں روح ہوں۔۔۔۔۔روح انسانی عقل اور فہم سے ویسے ہی بالاتر ہے اور وہ اللہ تو ہے ہی حقیقی لامحدود۔۔۔۔۔وہ ہر جگہ ہوتے ہوئے بھی کہیں نہیں ہے۔

ایک لامحدود ہستی کو محدود عقل کے ذریعے کیسے جانا جا سکتا ہے؟

عقل کے ذریعے روح اور خدا کی موجودگی پر منطقی دلائل دینا تو عین ممکن ہے، مگر روح اور اللہ کے وجود کو باقاعدہ محسوس کرنا اور ان دونوں کے تعلق کو جاننا۔۔۔

یہ عقل کی سمجھ سے باہر کی بات ہے۔

آگے کے سفر کے لیے ہمیں عقل کی ضرورت نہیں ہے۔ محدود عقل کو اب رخصت کر دیتے ہیں اور اب۔۔۔۔۔اب عشق کی بات کرتے ہیں۔

انسانی عقل محض محدود ہی نہیں، بلکہ اکنامکس کی طرح سارا دن حساب کتاب بھی کرتی رہتی ہے۔

عقل دو جمع دو چار کرتی ہے۔۔۔۔۔عقل کاروبار کرتی ہے۔

''اس کام سے یہ فائدہ ہوگا تو اس کام سے یہ نقصان۔ فلاں چیز اگر یوں ہو جاتی تو زیادہ بہتر ہوتا اور اگر یوں ہو جاتی تو کم نقصان۔ میں نے فلاں کام کیا تو اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟''

یہ سارے جوڑ توڑ تو بس کوئی عقل سے ہی سیکھے، جبکہ یہ عشق۔۔۔

یہ عشق تھوڑا ملنگ ہوتا ہے، تھوڑا اجھلّا ہوتا ہے۔

عشق فائدے اور نقصان سے ویسے ہی بالاتر ہے۔

یہ عشق۔۔۔۔۔کچھ اور ہے۔

عشق تو بنا حساب کتاب کیے بس۔۔۔۔۔فنا ہو جانا ہی جانتا ہے۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل　　عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی
بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق　　عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی
عشق فرمودۂ قاصد سے سبک گامِ عمل　　عقل سمجھی ہی نہیں معنئ پیغام ابھی

(اقبال)

اب جسم کے بندھن سے خود کو تھوڑا آزاد کر دیتے ہیں۔ کچھ لمحات کے لیے اس کمزور اور ناتواں جسم سے باہر نکل کر کھلی ہوا میں سانس لیتے ہیں۔ محدود کنویں سے باہر نکلتے ہیں، اسی لامحدود سمندر میں واپس چلتے ہیں۔ اب انسان کے حقیقی وجود، روح کی خواہشات کا بھی تو کچھ ذکر ہونا چاہیے۔

اب اس خالقِ حقیقی ، اس خواہشِ حقیقی کا دیدار بھی تو کرنا چاہیے۔
محدود عقل کو اب رخصت کر دیتے ہیں۔
اور اب۔۔۔۔۔اب عشق کی بات کرتے ہیں۔

وہ اللہ اگر لامحدود ہے تو یہ اپنا عشق بھی تو ہر قسم کی حدود و قیود سے آزاد ہے۔انسانی روح اگر تھوڑی پُراسرار ہے، نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے تو اس عشق سے بڑا مبہم جو بھی تو اور کوئی نہیں۔

اگر آپ موت سے پہلے ہی اپنی روح کو باقاعدہ محسوس کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ خود اپنا ہی سامنا کرنا چاہتے ہیں، اگر اسی زندگی میں ہی تمام نگاہوں سے اوجھل اللہ کو دیکھنا چاہتے ہیں، محسوس کرنا چاہتے ہیں اور اگر روح اور اللہ کے تعلق کو جاننا چاہتے ہیں، محسوس کرنا چاہتے ہیں تو۔۔۔

بس ایک ہی راستہ ہے۔۔۔۔"عشق"

ہم اس وقت حالتِ امتحان میں ہیں۔عقل کے لیے یہ امتحان دھوکے کا امتحان ہے۔عقل کو ہر جانب سے دھوکا دیا جا رہا ہے۔دھوکے پہ دھوکا دیا جا رہا ہے۔انسان کے اندر اور باہر ہر جانب دھوکے بکھرے پڑے ہیں۔ان تمام دھوکوں سے بچ کر حقائق تک رسائی حاصل کرنا عقل کا امتحان ہے، جبکہ روح کے لیے یہ زندگی عشق کا امتحان ہے۔روح کو اس کی منزل بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ہر روح اپنی منزل پہلے سے جانتی ہے، خوب جانتی ہے۔ہر روح میں اللہ کی معرفت اور محبت پہلے سے موجود ہے۔

ہر انسان چاہے وہ کسی بھی رنگ، نسل یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو، ہر انسان کے روحانی وجود کی بس ایک ہی خواہش ہے۔ہر روح اللہ کے قریب، قریب اور قریب ہونا چاہتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> "ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے، لیکن اس کے ماں باپ اسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔بالکل اسی طرح جیسے ایک جانور ایک صحیح سلامت جانور جنتا ہے۔کیا تم اس کا کوئی عضو (پیدائشی طور پر) کٹا ہوا دیکھتے ہو؟
> پھر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:
> یہ اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔اللہ تعالیٰ کی خلقت میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔یہی دین القیم ہے۔" (بخاری:1359)

ہر انسان کی فطرت، فطرتِ سلیمہ ہوتی ہے۔ہر انسان کی پیدائش اللہ کی فطرت پر ہوتی ہے۔

ہر روح میں اللہ کی معرفت اور محبت پہلے سے موجود ہے۔ ہر روح اللہ کو دیکھنا چاہتی ہے، اللہ سے محبت کرنا چاہتی ہے۔اللہ کا قرب حاصل کرنا ہی ہر روح کی حقیقی خواہش ہے۔

روح کی اس خواہش کو پورا بھی کیا جائے گا، مگر پہلے روح کے عشق کو ٹھوک بجا کر دیکھا جائے گا، جانچا اور پرکھا جائے گا۔اللہ کو حاصل کرنے کے لیے یہ روح کس حد تک جا سکتی ہے؟ کہاں تک جا سکتی ہے؟ کیا کیا کھو سکتی ہے؟

روح کے اسی عشق کو آزمانے کے لیے اللہ نے اسے خود سے دور، بہت دور کر دیا ہے۔ اللہ نے خود کو انسان کی نگاہوں سے چھپا لیا۔ یوں جیسے وہ کہیں بھی نہ ہو اور پھر خود انسان کو بھی انسان سے چھپا دیا گیا۔ انسان سے اس کی یادداشت بھی چھین لی گئی۔ بس ایک مدھم سی یاد ہر انسان کے اندر، کہیں بہت اندر موجود ہے۔ روح کی آزمائش کے لیے اسے ایک حقیر، مگر اَڑیل جسم کے ساتھ باندھ کر ایک نقطے کا قیدی بنا دیا گیا ہے۔

اس جسم کے اب اپنے تقاضے ہیں۔اس جسم کی اب اپنی ہی اُمنگیں اور آرزوئیں ہیں۔

''لوگوں کے لیے ان چیزوں کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے، جو ان کی نفسانی خواہشات کے مطابق ہوتی ہیں۔ یعنی عورتیں، بچے، سونے چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر، نشان لگائے ہوئے گھوڑے، چوپائے اور کھیتیاں۔ یہ سب دنیوی زندگی کا سامان ہے۔ (لیکن) ابدی انجام کا حسن تو صرف اللہ کے پاس ہے۔'' (آلِ عمران:14)

جنسی خواہشات، مال اور اولاد کی محبت، تیز رفتار گاڑیاں اور پھلتے پھولتے کاروبار؛ یہ تمام چیزیں ہماری اس زندگی کا ایک حصہ ہیں۔ یہ سب کچھ ایک دھوکا ہے، ایک آزمائش ہے۔

روح کے اوپر جسم کا غلاف ہے۔ جسم کو ظاہر کر کے روح کو جسم کے اندر کہیں چھپا دیا گیا ہے۔ بالکل اسی طرح سے روح کی خواہش کے اوپر جسم کی ضروریات کے پردے ڈال دیے گئے ہیں۔ ہمیں اپنے اردگرد جتنی بھی خواہشات نظر آتی ہیں، ان میں سے کوئی ایک چیز بھی ہماری حقیقی خواہش نہیں ہے۔ یہ سب کچھ بس ایک حجاب ہے۔۔۔۔۔حجاب در حجاب ہے۔

اگر ایک انسان کو جسم کے بوجھ سے یکسر آزاد کر دیا جائے تو۔۔۔

باقی محض ایک ہی خواہش رہ جاتی ہے۔۔۔

اللہ سے محبت۔۔۔۔۔اللہ سے بے پناہ محبت۔

اس جسم کی قید میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو اور اپنی خواہشات کو پہچاننا ہی ہمارا حقیقی امتحان ہے۔ اپنے اندر موجود ایک مدھم سی آواز کا پیچھا کرتے کرتے اللہ تک پہنچنا ضروری ہے۔اگر اسی زندگی میں انسان کی خود سے ملاقات ہو جائے، اگر انسان اپنی حقیقی خواہش کو پہچان لےتو پھر۔۔۔

سن لیجیے، جان لیجیے اور ایمان لے آیئے اس بات پر کہ اس ایک نقطے کی قید میں رہتے ہوئے بھی اللہ کو دیکھنا اور محسوس کرنا ممکن ہے، عین ممکن ہے۔

مگر یہ دیکھنا جسم کا دیکھنا نہیں ہوگا۔اس حقیر جسم میں اتنی سکت کہاں کہ اللہ کا مشاہدہ کر سکے۔

یہ روح ہے، جو اللہ کو دیکھے گی، محسوس کرے گی۔ یہ روح ہے، جو اللہ سے اپنی دوری پر اشک بار ہوگی۔ یہ روح ہے، جو اللہ سے روٹھے گی، منائے گی۔شکوے شکایتیں ہوں گی۔

یہ تو روح ہے، جو اپنی یادداشت کھو جانے پر ماتم کرے گی اور یہ روح ہی ہے جو کسی ضدی بچے کی مانند گھر واپس جانے کی رَٹ لگائے گی۔

وہ الظاہر بھی ہے اور الباطن بھی۔

اس جسم کے لیے اللہ کہیں نہیں موجود۔جسم کی آنکھوں سے اللہ کو دیکھنا ناممکن ہے۔

مگر وہ اللہ روح سے پوشیدہ نہیں ہے۔روح کو تو ہر جانب بس وہ ہی وہ دکھائی دیتا ہے۔

بس۔۔۔۔۔روح کو اس جسم کے بوجھ سے تھوڑا آزاد کرنے کی ضرورت ہے۔

جسم کے دھوکے سے باہر نکل کر خود اپنے آپ کو اور اپنی خواہشات کو پہچاننے کی ضرورت ہے۔اللہ کی نشانیاں تو ہر ایک انسان کے اپنے ہی وجود کے اندر موجود ہیں۔

خود اپنے آپ پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

> ''اور ان کے لیے جو یقین کرنے والے ہوں، زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمھارے اپنے وجود میں بھی، کیا پھر بھی تمہیں دکھائی نہیں دیتا؟'' (الذاریات:21-20)

اللہ کو جاننے کے لیے اپنی ذات پر غور وفکر ضروری ہے۔

جو خود کو جاننے میں کامیاب ہو گیا، جو اس جسم کے دھوکے سے باہر نکل کر اپنی روح کو پہچاننے میں کامیاب ہو گیا، وہ اللہ کو بھی پہچان لے گا۔آخر یہ روح اللہ ہی کی روح ہے۔

لیکن اگر ہم اللہ کو بھول گئے تو اللہ ہمیں اپنے آپ سے غافل کر دے گا۔پھر جسم کو ہی

حقیقت سمجھ کر انسان کو بندروں میں تلاش کیا جائے گا۔

''اور تم ان جیسے نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے۔ تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ وہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔'' (الحشر:19)

اللہ کی معرفت اور ایک انسان کے لیے اپنی ذات کا شعور۔۔۔

دونوں چیزیں آپس میں گہرا ربط رکھتی ہیں۔ جہاں خود پر غور و فکر کا یقینی نتیجہ اللہ کی معرفت ہے، وہیں پر اللہ کو بھول جانے کی لازمی سزا خود فراموشی ہے۔

اس لیے اللہ کو جاننے کے لیے اپنی ذات پر غور و فکر ضروری ہے۔ اگر ایک انسان خود پر غور و فکر کرنا شروع کر دے تو وہ اپنی اور اپنی خواہشات کی حقیقت جان لے گا۔ ایسے انسان کے لیے پھر جسم کی ضروریات سے روح کی خواہش زیادہ اہم ہو گی اور پھر روح کی خواہش کی پیروی کرتے کرتے انسان کو پہلے اللہ سے محبت ہو گی اور پھر۔۔۔۔۔عشق۔

آپ جانتے ہیں کہ اگر اللہ سے عشق ہو جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟

پھر انسان اپنے ہی بیٹے کی گردن پر چھری چلانے پر بھی آمادہ ہو جاتا ہے۔

پھر تپتے انگاروں پر لیٹ کر بھی ''احد احد'' کی صدا بلند کی جاتی ہے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسی کامل شخصیت۔۔۔

اگر عشق ہو جائے تو پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بدنِ اطہر پر بھی پتھروں کی بارش ہوتی ہے۔

ساحر بولا جاتا ہے۔۔۔۔۔مجنوں پکارا جاتا ہے۔

مگر ان برستے پتھروں تلے لہولہان بدن کے ساتھ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عشق کچھ اور چاہتا ہے۔ کچھ اور ہی چاہتا ہے۔

''اگر میں اپنی امت پر (اس کام کو) دشوار نہ سمجھتا تو لشکر کا ساتھ نہ چھوڑتا اور میری خواہش ہے کہ اللہ کی راہ میں مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر مارا جاؤں۔'' (بخاری:36)

کیا یہ عشق نہیں ہے؟

یہ عشق ہے۔۔۔اور بس یہی عشق ہے۔

اللہ کے عشق میں اپنی ذات کو فنا کر دینا، اپنی ہستی کی مکمل نفی کر دینا ہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

اوراب ذرارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دعا پر بھی غور کیجیے۔۔۔

''اے اللہ! میں تجھ سے نیکی کے کام کرنے، برائیوں کو ترک کرنے، مسکینوں سے محبت کرنے، مجھے بخشنے اور مجھ پر رحم کرنے کا سوال کرتا ہوں اور جب تُو کسی قوم میں فتنہ برپا کرنے لگے تو مجھے اس فتنے میں مبتلا کیے بغیر فوت کر دینا اور میں تجھ سے تیری محبت کا، تجھ سے محبت کرنے والے کی محبت کا اور ایسے عمل کی محبت کا سوال کرتا ہوں، جو مجھے تیری محبت کے قریب کر دے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ حق ہے،لہٰذا اس کو سیکھو اور سکھاؤ۔'' (مسند احمد:8978)

نہ صرف اللہ سے محبت ضروری ہے، بلکہ باقی تمام محبتوں کو بھی اللہ کی محبت کے تابع کرنا ہو گا۔ اگر کسی سے محبت کی جائے تو وہ بھی اللہ کے لیے اور اگر کسی سے دشمنی کا رشتہ نبھانا ہو تو یہ دشمنی بھی اللہ ہی کے دشمنوں سے ہونی چاہیے۔

اللہ کے ساتھ عشق و محبت کا تعلق استوار کرنے کی ایک مسلسل کوشش کرتے رہنا نہ صرف قرآنِ حکیم کی تعلیمات کا ایک حصہ ہے، بلکہ یہی وہ بلند ترین مقام ہے جو کوئی بھی انسان حاصل کر سکتا ہے۔

اللہ کا قرب تلاش کرنے کی اس کوشش کو ہمارے ہاں عموماً تصوف کا نام دیا جاتا ہے، جبکہ قرآن و حدیث کی اصطلاح میں اسے احسان یا پھر درجۂ احسان کہا جاتا ہے۔

ایک دن نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں میں تشریف فرما تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور پوچھنے لگا:

''ایمان کسے کہتے ہیں؟''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پاک کے وجود پر اور اس کی وحدانیت پر ایمان لاؤ اور اس کے فرشتوں کے وجود پر اور اس (اللہ) کی ملاقات کے برحق ہونے پر اور اس کے رسولوں کے برحق ہونے پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر ایمان لاؤ۔''

پھر اس نے پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر جواب دیا:

''اسلام یہ ہے کہ تم خالص اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور رمضان کے روزے رکھو۔''

پھر اس نے احسان کے متعلق پوچھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

''تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر یہ درجہ حاصل نہ ہو تو پھر یہ تو سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔'' (بخاری:50)

اگر کوئی شخص درجۂ احسان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اس زندگی میں ہی اللہ کو دیکھنا اور محسوس کرنا ممکن ہے، عین ممکن ہے، مگر یہ دیکھنا روح کا دیکھنا ہوگا۔

بنیادی طور پر اللہ اور انسان کے درمیان خالق اور مخلوق کا رشتہ تو ہے ہی، لیکن اس کے ساتھ ساتھ دوستی اور ولایت کا رشتہ بھی پایا جاتا ہے۔

''وہ اللہ کے مقابلے میں تمھارے ذرا بھی کام نہیں آ سکتے، حقیقت یہ ہے کہ ظالم لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور اللہ متقی لوگوں کا دوست ہے۔'' (الجاثیہ:19)

''جو لوگ ایمان لائے ہیں، ان کا دوست اللہ ہے کہ ان کو اندھیرے سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے اور جو کافر ہیں ان کے دوست شیطان ہیں کہ ان کو روشنی سے نکال کر اندھیرے میں لے جاتے ہیں۔ یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں کہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔'' (البقرۃ:257)

ہم میں سے ہر انسان اللہ کو اپنا دوست، ولی اور اپنا پشت پناہ بنا سکتا ہے۔

اللہ کے ساتھ دوستی کرنے کے لیے جنگلوں یا بیابانوں میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کوئی خاص قسم کا چلّہ یا مشقت کرنا بھی لازم نہیں ہے۔ اللہ کی دوستی حاصل کرنے کے لیے اللہ کی جانب سے بس ایک ہی شرط ہے۔

اللہ کو اپنا خالق اور مالک مانا جائے۔۔۔۔۔اللہ کو اپنا اللہ مانا جائے۔

اللہ پر ایمان، پختہ ایمان، یقین والا ایمان۔۔۔۔۔اللہ کی دوستی حاصل کرنے کی یہی پہلی شرط ہے اور یہی آخری بھی۔ اللہ پر ایمان کا ایک لازمی نتیجہ تقویٰ ہے۔ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام جانا جائے اور حلال کردہ چیزوں کو حلال۔ اللہ کا حکم مانا جائے۔ تقویٰ اختیار کیے بِنا ہی اللہ پر ایمان کا دعویٰ محض ایک دھوکا ہے، ایک خوش فہمی ہے اور پھر ہمارے ہاں تو تقویٰ کا ہر شخص کا اپنا ہی ایک معیار ہے۔ البتہ اللہ کے ہاں جو تقویٰ قابلِ قبول ہوگا، اس کی تفصیل قرآنِ حکیم کی محض ایک ہی آیتِ مبارکہ میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کر دی گئی ہے۔

''نیکی بس یہی تو نہیں کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسافروں اور سائلوں کو دیں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں اور جب کوئی عہد کر لیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت صبر و استقلال کے عادی ہوں، ایسے لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔'' (البقرۃ:177)

یہ ہے وہ تقویٰ جو اللہ کے ہاں قبول ہوگا۔ تقویٰ کے اس معیار پر پورا اترنے والا ہر شخص پھر اللہ کا دوست بن جاتا ہے۔ اللہ کی دوستی حاصل کرنے کے لیے ان تمام شرائط کا پورا کیا جانا ضروری ہے۔ ہر وہ شخص جو اِن شرائط کو پورا کر رہا ہے یا پھر ان شرائط کو پورا کرنے کی اپنی بھرپور کوشش کر رہا ہے۔۔۔

یہ ہے وہ شخص جو حقیقی مومن ہے، متقی ہے اور ہر ہر متقی اللہ کا دوست ہے۔ جیسے جیسے تقویٰ بڑھے گا، دوستی گہری ہوتی چلی جائے گی۔

یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ابھی ہم درجۂ احسان کی بات نہیں کر رہے، بلکہ یہ درجہ، درجۂ ایمان ہے۔ درجۂ ایمان پر پہنچ جانے والے شخص کو اللہ اپنا دوست بنا لیتا ہے، جبکہ درجۂ احسان تو چیز ہی کچھ اور ہے۔ درجۂ احسان پر بات دوستی سے آگے، بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ درجۂ احسان پر تو پھر۔۔۔

تُو نہیں مَیں ہوں، مَیں نہیں تُو ہے
اب کچھ ایسا گمان ہے پیارے
(جگر مرادآبادی)

درجۂ ایمان پر گفتگو مکمل کرنے کے بعد درجۂ احسان پر بھی بات کی جائے گی۔ ابھی کے لیے بس اتنا جان لیجیے کہ اللہ پر عملی طور پر ایمان رکھنے والا ہر شخص اللہ کا دوست ہے اور جب کسی انسان کو اللہ کی دوستی نصیب ہو جائے تو پھر ایسے انسان پر فرشتوں کا نزول ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ میرے اور آپ کے جیسے عام انسانوں کے پاس بھی فرشتے آ کر خوشخبریاں سناتے ہیں۔

''جن لوگوں نے کہا: ہمارا رب اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے تو ان پر بے شک فرشتے (یہ کہتے ہوئے) اتریں گے کہ نہ کوئی خوف دل میں لاؤ، نہ کسی بات کا غم کرو اور اس جنت میں خوش ہو جاؤ، جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا تھا۔ ہم دنیا والی زندگی میں بھی تمھارے ساتھی تھے اور آخرت میں بھی رہیں گے اور اس جنت میں ہر وہ چیز تمھارے ہی لیے ہے، جس کو تمھارا دل چاہے اور اس میں ہر وہ چیز تمھارے ہی لیے ہے، جو تم منگوانا چاہو۔'' (حم السجدۃ:30-31)

اس کائنات کا خالق اور مالک ہی جب انسان کا دوست بن جائے تو پھر اس شخص کی زندگی میں کسی قسم کا کوئی رنج وغم باقی رہ سکتا ہے کیا؟ اللہ کے دوستوں کے لیے یہ زندگی بھی سکون اور راحت والی ہوگی اور آخرت کی زندگی بھی۔

''یاد رکھو کہ جو اللہ کے دوست ہیں، ان کو نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور تقویٰ اختیار کیے رہے۔ ان کے لیے خوشخبری ہے دنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اللہ کی باتوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔'' (یونس:62-64)

اللہ پر ایمان اور پھر تقویٰ کی شکل میں اس ایمان کا عملی ثبوت۔۔۔۔۔بس یہی شرط ہے اللہ کی دوستی حاصل کرنے کی۔ اگر اللہ پر یقین رکھا جائے تو پھر اللہ اپنے دوستوں کی ہر پکار سنتا ہے، جواب دیتا ہے۔ اللہ پھر دعائیں قبول فرماتا ہے۔

''اور (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں پوچھیں تو (آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے کہہ دیجیے کہ) میں اتنا قریب ہوں کہ جب مجھے کوئی پکارتا ہے تو میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں، لہٰذا وہ بھی میری بات دل سے قبول کریں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ راہِ راست پر آجائیں۔'' (البقرۃ:186)

اللہ کو پکارنے کے لیے کسی خاص مزار یا دربار پر حاضری لگوانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کسی پیر صاحب کی گاڑی کو بوسے دینے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر انسان اللہ کی مخلوق ہے اور اللہ ہر انسان کی بات سنتا ہے۔ ہر انسان جب چاہے، جیسے چاہے اللہ سے بات کرسکتا ہے۔ اللہ اور انسان کے درمیان اللہ کی جانب سے تو کسی قسم کا کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور پردہ حائل ہو بھی کیسے سکتا ہے؟

اللہ تو ہر وقت ، ہر آن ، ہر ہر انسان کے ساتھ ہے ۔ اللہ کو اگر ہم اپنا دوست نہیں بنا پا رہے تو اس میں ہماری اپنی غلطی ہے ۔ یہ ہماری اپنی بے راہ روی ہے، جس کی وجہ سے ہم اپنے اور اللہ کے بیچ پردے محسوس کرتے ہیں، وگرنہ اللہ تو ہر آن ہمارے ساتھ ہے ۔

میں یہ الفاظ لکھ رہا ہوں تو اللہ میرے پاس ہے۔ آپ ان الفاظ کو پڑھ رہے ہیں تو اللہ آپ کے پاس ہے ۔ نہ صرف اللہ اپنے ہر ہر بندے کے ساتھ ہوتا ہے، بلکہ وہ تو اپنے بندوں کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے ۔

''اور حقیقت یہ ہے کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے دل میں جو خیالات آتے ہیں، ان سے ہم خوب واقف ہیں اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں ۔'' (ق:16)

ہاں! بس یہ ہمارے امتحان کا ایک حصہ ہے کہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے ہیں، لیکن ہماری نگاہوں سے اوجھل ہونے کے باوجود۔۔۔۔۔ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے، ہر پل دیکھ رہا ہے ۔

''نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ تمام نگاہوں کو پا لیتا ہے۔ اس کی ذات اتنی ہی لطیف ہے اور وہ اتنا ہی باخبر ہے۔'' (الانعام:103)

''اللہ انسان کا دوست ہے''

یہ جملہ حقائق کی ٹھیک ترجمانی نہیں کرتا ۔

حقیقت یہ ہے کہ صرف ، صرف اور صرف اللہ ہی انسان کا دوست ہے ۔

اللہ کے سوا انسان کا کوئی بھی حقیقی دوست نہیں ہے ۔

''خدا ہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور جو چیزیں ان دونوں میں ہیں، سب کو چھے دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر جا ٹھہرا۔ اس کے سوا نہ تمھارا کوئی دوست ہے اور نہ سفارش کرنے والا۔ کیا تم نصیحت نہیں پکڑتے؟'' (السجدة:4)

اللہ کی جانب سے دوستی کا یہ دعوت نامہ ہر انسان کو بھیجا جا چکا ہے اور اس دعوت نامے کے ارسال کیے جانے میں رنگ ونسل یا پھر مذہب کے اعتبار سے بھی کوئی تفریق نہیں برتی گئی ۔ اب یہ کام انسان کا ہے کہ اللہ کی دوستی کی شرائط (سورة البقرة:177) کو پورا کر کے اللہ کو اپنا دوست بنا لے ۔

اللہ کے ساتھ دوستی کا رشتہ استوار کرنے اور پھر اس دوستی کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے

والی بنیادی چیز تقویٰ ہی ہے۔ جیسے جیسے تقویٰ بڑھے گا، دوستی گہری ہوتی چلی جائے گی اور پھر یہاں تک کہ ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے کہ اللہ کا یہی دوست، یہی متقی شخص اپنے تقویٰ کی بنیاد پر درجۂ ایمان سے ترقی کرتا ہوا درجۂ احسان پر پہنچ جاتا ہے۔

درجۂ احسان پر پہنچ جانے والے انسان بھی بالکل ہم عام انسانوں جیسے ہی ہوتے ہیں۔ دو پاؤں، دو ہاتھ۔بس ایسے انسانوں میں اللہ کا عشق موجود ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے جسم کی ضروریات سے زیادہ اپنی روح کی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔

اللہ کی دوستی حاصل کرنے کی شرائط کو سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر 177 میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور ہم اس پر بات بھی کر چکے ہیں۔ یہ درجۂ ایمان ہے اور قرآنِ حکیم کے مطابق یہ تقویٰ کا معیار ہے، جبکہ درجۂ احسان پر پہنچ جانے کے لیے اسی بنیادی تقویٰ میں دو مزید شرائط کا اضافہ کیا گیا ہے۔

اللہ سے عشق کا دعویٰ تو ایک الگ چیز ہے، کوئی بھی شخص کر سکتا ہے۔ البتہ اگر حقیقی معنوں میں اللہ سے عشق کرنا ہے تو سب سے پہلے اس دنیا کی محبت کو کھرچ کھرچ کر اپنے دل سے باہر نکال پھینکنا ہوگا۔ ایک نقطے کی محبت اور اس حقیقی لامحدود ذات کا عشق، دونوں ایک ہی دل میں اکٹھے بسیرا نہیں کر سکتے۔ یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے۔ یہ اس حقیقی لامحدود ذات کی توہین ہے۔ اس نقطے کو تو ختم ہونا ہی ہوگا۔ یہ ساری دنیا اللہ کے نزدیک ایک چھوٹے کانوں والے مرے ہوئے میمنے سے بھی زیادہ حقیر اور ناپسندیدہ ہے۔ اللہ سے عشق کا دعویٰ بھی ہو اور اللہ کی ناپسندیدہ چیز سے محبت بھی، یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے۔

جس دل میں بھی اس دنیا کی محبت موجود ہوگی، اللہ اس دل میں داخل نہیں ہوگا۔ پہلے دل میں سے دنیا کی محبت کو ختم کرنا ہوگا۔ جیسے جیسے دنیا کی محبت کم ہونا شروع ہوگی، اللہ سے محبت ہونا شروع ہو جائے گی، جبکہ اللہ سے عشق کی دوسری شرط، اللہ کی مخلوق سے محبت ہے۔ اللہ کی تمام مخلوقات اور خاص طور پر انسان سے محبت، اللہ سے عشق کرنے کے لیے ضروری ہے۔

اللہ سے عشق ہو اور اللہ کی مخلوق کو تکلیف میں دیکھ کر دل میں درد نہ ہو۔۔۔

یہ کیسے ممکن ہے؟

مخلوق کی محبت دل میں رکھے بِنا خالق سے محبت کے سبھی دعوے، بس دعوے ہیں۔ اللہ سے عشق کرنے کے لیے اللہ کی پیدا کی ہوئی ہر ایک چیز سے محبت ضروری ہے۔ درجۂ ایمان پر

پہنچ جانے کے بعد درجۂ احسان پر ترقی کرنے کے لیے ضروری شرائط اور لائحۂ عمل قرآنِ حکیم میں کچھ یوں بیان ہوتا ہے:

''اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف تیزی سے بڑھو، جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آجاتے ہیں، جو پرہیزگاروں (متقی لوگوں) کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے اور (یہ) ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کی بخشش کون کرتا ہے؟ اور پھر جو گناہ وہ کر بیٹھے تھے، ان پر جان بوجھ کر اصرار بھی نہیں کرتے۔'' (آلِ عمران:133-135)

یہ ہے درجۂ ایمان سے ترقی کر کے درجۂ احسان پر پہنچنے کا طریقہ کار۔۔۔

اللہ کی دی ہوئی دولت کو اللہ کی مخلوق پر خرچ کرنا ضروری ہے۔ اس عمل سے ایک جانب تو دولت اور اس دنیا کی محبت میں کمی ہوگی، جبکہ دوسری جانب مخلوق کی محبت میں اضافہ ہوگا۔

اللہ سے عملی طور پر عشق کرنے کی بس یہی دو شرائط ہیں۔

پھر مخلوق سے محبت کرنے کا ایک اور طریقہ، ایک اور شرط بھی بیان کی جا رہی ہے۔ اپنے غصے کو قابو میں رکھ کر دوسرے انسانوں سے نرمی والا سلوک کرنا ضروری ہے۔ اس چیز کا عملی نمونہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارک سے ملے گا۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا: ''میں نے (تقریباً) دس سال تک رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی۔ اللہ کی قسم! آپ ﷺ نے مجھے کبھی اُف تک نہیں کہا اور نہ کبھی کسی چیز کے لیے مجھ سے یہ کہا کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا؟ یا فلاں کام کیوں نہ کیا؟'' (مسلم:6011)

یہ ہے اللہ سے عملی عشق۔ مخلوق کے لیے دل کا نرم ہو جانا ہی اللہ کے عشق کی علامت ہے۔

پھر درجۂ احسان پر پہنچ جانے والے افراد بھی کوئی فرشتے نہیں ہوتے، گناہوں سے معصوم نہیں ہوتے، اللہ سے محبت کرنے کے لیے یہ چیز شرط نہیں ہے کہ گناہ بالکل ہوں ہی ناں۔ ہر انسان گناہ گار

ہے۔گناہ تو ہر انسان سے ہونے ہی ہونے ہیں۔گناہ کا ہوجانا اتنی بُری بات نہیں ہے، جتنا گناہ کر کے اس پر ڈٹ جانا۔گناہ پر اَڑ جانا بُری بات ہے۔گناہ کر کے اس کے حق میں پھر عقلی دلائل ڈھونڈنے کی کوشش کرنا اور گناہ کی تاویل کرنے کی کوشش کرنا بُری بات ہے۔

درجۂ احسان پر پہنچ جانے والے انسانوں سے جب بھی گناہ سرزد ہوجائے تو وہ اپنے گناہوں پر ڈٹ نہیں جاتے، بلکہ فوراً سے اللہ کی جانب متوجہ ہوکر اللہ سے اپنے گناہ کی معافی مانگ لیتے ہیں۔

کون ہے اللہ کے سوا جو گناہوں کو معاف کر سکے؟

جب تک احساسِ گناہ زندہ رہے گا۔۔۔۔۔توبہ کی توفیق ملتی رہے گی۔

بہرحال اسی زندگی میں اگر آپ اللہ کو دیکھنا چاہتے ہیں، اگر آپ خود اپنے آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ اپنی روح کو محسوس کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ اللہ اور روح کے تعلق کو جاننا چاہتے ہیں، اس تعلق کو جینا چاہتے ہیں تو بس ایک ہی راستہ ہے۔۔۔

اللہ سے محبت، بے پناہ محبت۔اللہ سے عشق۔

اللہ سے یہ عشق اور یہ محبت کیسے کی جائے گی؟ یہ بات بھی ہمیں قرآنِ حکیم بتائے گا۔اللہ سے محبت کرنے کا طریقہ بھی ہمیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ سے معلوم ہوگا۔

ہمیشہ یاد رکھیے! ہر چیز میں، ہر ہر چیز میں حقیقی اور موٴثر طریقہ وہی ہے، جو قرآن وحدیث سے ثابت ہو اور قرآن وحدیث کے بھی محض کسی ایک جزو کو پکڑ کر اسی کا وِرد کیے جانا بھی ٹھیک نہیں ہے۔کسی بھی چیز کی مکمل تصویر دیکھ کر کوئی رائے قائم کرنی چاہیے۔

اس لیے ہمیں نہ صرف یہ دیکھنا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زندگی میں کون کون سے کام کیے، بلکہ ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ کس کام کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کتنا وقت اور کتنی اہمیت دی اور پھر اسی حساب سے ہمیں اپنے شب وروز بسر کرنا ہوں گے۔

دیگر تمام معاملات کی طرح، اللہ سے محبت کرنے کا طریقہ بھی ہمیں قرآن وحدیث سے ہی معلوم ہوگا۔اللہ کو پانے کے لیے ہمیں کیا کیا کرنا ہوگا؟ ان تمام شرائط کو، اللہ سے محبت کرنے کے طریقہ کار کو بہت جامع انداز میں قرآنِ حکیم کے دو مختلف مقامات پر بیان کر دیا گیا ہے۔ان آیات کا ایک بار پھر سے مطالعہ یقیناً فائدے سے خالی نہیں ہوگا۔

''نیکی بس یہی نہیں کہ اپنے چہرے مشرق یا مغرب کی طرف کرلو، بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر اور اللہ کی کتابوں

پر اور اس کے نبیوں پر ایمان لائیں اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، مسافروں اور سائلوں کو دیں اور غلاموں کو آزاد کرانے میں خرچ کریں اور نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور جب کوئی عہد کر لیں تو اپنے عہد کو پورا کرنے کے عادی ہوں اور تنگی اور تکلیف میں، نیز جنگ کے وقت صبر و استقلال کے عادی ہوں۔ ایسے لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو متقی ہیں۔'' (البقرۃ:177)

''اور اپنے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف تیزی سے بڑھو جس کی وسعت میں سب آسمان اور زمین آجاتے ہیں، جو پرہیز گاروں (متقی لوگوں) کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو فراخی اور تنگی (دونوں حالتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے (ان کی غلطیوں پر) درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت فرماتا ہے اور (یہ) ایسے لوگ ہیں کہ جب کوئی برائی کر بیٹھتے ہیں یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کا ذکر کرتے ہیں، پھر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا گناہوں کی بخشش کون کرتا ہے؟ اور پھر جو گناہ وہ کر بیٹھے تھے، ان پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔'' (آلِ عمران:133-135)

قرآنِ حکیم کی ان چار آیاتِ مبارکہ میں درجۂ ایمان اور درجۂ احسان کا مکمل فلسفہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اللہ سے محبت کرنے کی شرائط بھی بتا دی گئی ہیں اور اللہ سے عشق کرنے کا عملی طریقہ بھی۔ اگر ہم آج ان تمام شرائط کو پورا کر دیں، ان تمام باتوں پر اپنی استطاعت کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیں تو اللہ سے عشق خود بخود ہو جائے گا۔ ہمارے اندر کی صفائی یہ تمام اعمال خود ہی کر دیں گے۔ اپنی محبوب ترین چیز دولت کو جب محض اللہ کی رضا کے لیے دوسروں پر خرچ کرنا شروع کریں گے تو اندر بالکل پاک صاف ہو جائے گا۔

یہ اعمال کوئی آسان کام نہیں ہیں۔ اپنے نفس کے ساتھ ایک جنگ لڑ کر ہی ان اعمال کو اپنایا جا سکتا ہے اور اگر کہیں آپ عملی طور پر اللہ سے محبت کی ان تمام شرائط کو پورا کر دیتے ہیں یا ان شرائط کو پورا کرنے کی اپنی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں تو اللہ کی عزت کی قسم!

آپ ہی وہ شخص ہوں گے، جس پر فرشتے بشارتیں دینے کے لیے اتریں گے۔

پھر آپ ہی متقی ہیں، آپ ہی مومن ہیں۔ آپ ہی ہیں وہ ہستی جو درجۂ احسان پر فائز ہو چکی ہے۔ اور جانتے ہیں کہ اگر کوئی انسان تقویٰ اختیار کرتا ہوا درجۂ احسان تک پہنچ جائے تو پھر کیا ہوتا ہے؟ جب ایک انسان محض باتوں سے نہیں، بلکہ عملی طور پر اللہ سے محبت کرنے لگے تو پھر یہ محبت یک طرفہ نہیں رہتی۔ پھر اللہ بھی اپنے بندے سے محبت کرنا شروع کر دیتا ہے، بلکہ درجۂ احسان پر پہنچ جانے والے انسان کی تو یہ تمام کائنات ہی دیوانی ہو جاتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل علیہ السلام سے فرماتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے، تم بھی اس سے محبت رکھو۔ چنانچہ جبریل بھی اس سے محبت رکھنے لگتے ہیں۔ پھر جبریل تمام اہلِ آسمان کو پکار کر کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت رکھتا ہے، اس لیے تم سب لوگ اس سے محبت رکھو۔ چنانچہ تمام آسمان والے اس سے محبت رکھنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد روئے زمین والے بھی اس کو مقبول سمجھتے ہیں۔'' (بخاری: 3209)

انسان اللہ سے محبت کرتا ہے تو اللہ بھی اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔

لیکن اللہ کی محبت ہر قسم کی غرض و غایت سے پاک ہے۔

اللہ کی اپنے بندے سے محبت شدید ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوتا ہوں اور جب وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے مجلس میں یاد کرتا ہے تو میں اسے اس سے بہتر فرشتوں کی مجلس میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھ سے ایک بالشت قریب آتا ہے تو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ مجھ سے ایک ہاتھ قریب آتا ہے تو میں اس سے دو ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کے پاس دوڑ کر آ جاتا ہوں۔'' (بخاری:7405)

مگر ایک ہم ہیں۔۔۔۔ ہم اللہ کی دوستی کو ٹھکرا کر، اللہ کی محبت سے منہ موڑ کر اس ایک نقطے پر اپنے ہی جیسے کمزور اور بے بس انسانوں میں اپنے دوست اور مددگار ڈھونڈ رہے ہیں۔

ہمیں خود اپنی اور اپنی خواہشات کی حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ نہ تو یہ کمزور اور ناتواں جسم انسان ہے اور نہ ہی اس جسم کی ضروریات انسان کی حقیقی خواہشات ہیں۔ یہ جسم ایک دھوکا ہے۔ انسان اس جسم کے پردے کے پیچھے کہیں موجود ہے۔

اسی طرح اس جسم کی ضروریات بھی محض فریب ہیں۔ ہماری حقیقی خواہش اس جسم کی ضروریات کے نیچے، کہیں بہت نیچے دب چکی ہیں۔ جسم کی ضروریات بھی پوری کرنی ہیں، ضرور پوری کرنی ہیں۔ اس جسم کا بھی حق ہے ہمارے اوپر، مگر جسم کی ضروریات کے چکر میں خود اپنی خواہش کو بھولنا نہیں ہے۔ جسم کی ضروریات کی قیمت روح کی خواہش نہیں ہونی چاہیے کبھی بھی اور ہماری روح کی خواہش تو بس ایک ہی ہے۔۔۔

اس حسین وجمیل اللہ سے عشق۔

جیسے ہم اپنی روح سے ناواقف ہیں، بالکل اسی طرح سے ہم اپنی حقیقی خواہش سے بھی ناآشنا ہیں۔ یہ تو ہم پر اس جسم کی ضروریات کے پردے پڑے ہوئے ہیں، وگرنہ اللہ کی محبت میں فنا ہو جانا ہی ہم میں سے ہر ایک انسان کی حقیقی خواہش ہے۔ اللہ کو دیکھنا اور جاننا ہی ہماری حقیقی آرزو اور تمنا ہے۔

حدیث کا راوی بیان کرتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودھویں رات کو ہمارے پاس تشریف لائے اور فرمایا:

> ''تم اپنے رب کو قیامت کے دن اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو۔ اس کے دیکھنے میں کوئی مزاحمت نہیں ہو گی۔ کھلم کھلا دیکھو گے۔ بے تکلف، بے مشقت، بے زحمت۔'' (بخاری:7436)

> ''بہت سے چہرے اس دن شگفتہ وتر وتازہ ہوں گے اور (بلا حجاب) اپنے رب (کے حسن و جمال) کو تک رہے ہوں گے اور کتنے ہی چہرے اس دن بگڑی ہوئی حالت میں (مایوس اور سیاہ) ہوں گے۔'' (القیامۃ:24-22)

جہنم بُری جگہ ہے، بہت بُری جگہ ہے۔ ایسی بُری کہ دن میں سو بار اس کے شر سے پناہ مانگنا بھی کم ہو گا۔ جنت ایسی حسین اور خوبصورت ہے کہ اگر اسے دن میں ہزار بار طلب کیا جائے، تب بھی کم ہے، جبکہ میرا وہ اللہ۔۔۔

اللہ تو اتنا حسین ہے، ایسا پیارا اور اتنا اچھا ہے کہ محض ایک لمحے کے لیے بھی اسے بھول

جانا گناہ ہے۔ گناہِ کبیرہ ہے۔ ہمیں اپنی اس زندگی کے ہر اس لمحے کے لیے پچھتانا ہوگا، جو لمحہ اللہ کی یاد سے خالی چلا گیا۔

ہر وہ چیز گناہ ہے، جو انسان کو اللہ کی یاد سے غافل کر دے، انسان کو اس کی منزل سے دور کر دے۔ کیا گزرے گی اس روح پر جب یہ جسم کے بوجھ سے آزاد ہو جائے گی۔

روح اگر اپنے امتحان میں ناکام ہوگئی تو اس نقصان کا حساب کیسے ہوگا؟ ساری زندگی ہم نے کسی اور کے لیے گزار دی، ساری زندگی بس اس اجنبی جسم کی ضروریات کے پیچھے دوڑتے رہے اور خود اپنے بارے میں، اپنی خواہش کے بارے میں تو کبھی کچھ سوچا ہی نہیں۔

جب یہ حقیقت کھلے گی تو اِزالہ نہ ہو پائے گا۔ بہت دیر ہو چکی ہوگی۔

ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ چکا ہوگا۔

ابھی وقت ہمارے ہاتھ میں ہے۔ اللہ کی رحمت کے دروازے کھلے ہیں۔ اللہ ہمارے ہر گناہ کو، ہر ہر گناہ کو معاف کرنے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔ اللہ محبت سے، چاہت سے ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ اللہ نہ صرف ہمارا انتظار کر رہا ہے، بلکہ ایسے انتظار کر رہا ہے کہ جیسے اس کائنات میں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا۔

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا: ''تم اس شخص کی خوشی کے متعلق کیا کہتے ہو جس کی اونٹنی ایسی بے آب و گیاہ زمین میں، جہاں کھانے کی کوئی چیز ہو نہ پینے کی، اپنی نکیل کی رسی کھینچتی ہوئی (کسی طرف) نکل گئی۔ اس کا کھانا اور پانی بھی اسی پر تھا۔ اس شخص نے اسے بہت ڈھونڈا حتیٰ کہ تھک ہار گیا۔ پھر وہ (اونٹنی چلتے چلتے) ایک درخت کے ٹنڈ منڈ تنے کے پاس سے گزری تو اس کی نکیل کی رسی اس کے ساتھ اٹک گئی اور اس شخص نے اس (اونٹنی) کو اس (تنے) کے ساتھ لگی کھڑی پا لیا؟
>
> ہم (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم) نے عرض کی:
>
> اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! (اس شخص کی خوشی) بے پناہ ہوگی۔
>
> اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:
>
> اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ پر اس سے کہیں زیادہ خوش ہوتا ہے، جتنا یہ شخص اپنی سواری کو پا کر ہوتا ہے۔'' (مسلم:6959)

کرتا ہے اس دنیا میں کوئی ایسا انتظار کسی کا؟۔۔۔۔۔کبھی کسی نے آپ کا ایسا انتظار کیا ہے؟

ارے بھئی! اللہ نے آپ کو اس نقطے پر چھوٹی چھوٹی خواہشات کے پیچھے دوڑنے کے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔آپ بہت خاص ہیں۔اللہ کو بہت لاڈ ہے آپ کے ساتھ۔

بلا وجہ ہی تو ساری ساری رات انتظار نہیں کرتا ہے وہ۔

یہ زندگی امتحان ہے۔اللہ اور انسان کے بیچ جو محبت موجود ہے، اس محبت کا امتحان ہو رہا ہے۔

آیئے! واپس چلتے ہیں۔۔۔۔۔واپس ادھر ہی جہاں سے سفر کا آغاز کیا تھا۔

روح کی خواہش کو پورا کرتے ہیں۔۔۔۔۔جسم کی نگاہوں سے اوجھل اللہ کو دیکھتے ہیں۔

اللہ کو اپنا دوست بنا لیتے ہیں۔۔۔۔۔اللہ سے عشق کرتے ہیں۔

اور جانتے ہیں کہ اگر اللہ سے عشق ہو گیا تو پھر کیا ہو گا؟

جانتے ہیں پھر کیا ہو گا؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

> ''اللہ فرماتا ہے کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی، اس سے میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے اور میرا بندہ جن عبادتوں سے میرا قرب حاصل کرتا ہے اور کوئی عبادت مجھ کو اس سے زیادہ پسند نہیں ہے، جو میں نے اس پر فرض کی ہے۔(یعنی فرائض مجھ کو بہت زیادہ پسند ہیں۔جیسے نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ) اور میرا بندہ فرض ادا کرنے کے بعد نفل عبادتیں کر کے مجھ سے اتنا نزدیک ہو جاتا ہے کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔پھر جب میں اس سے محبت کرنے لگ جاتا ہوں تو میں اس کے کان بن جاتا ہوں، جن سے وہ سنتا ہے۔اس کی آنکھ بن جاتا ہوں، جن سے وہ دیکھتا ہے۔اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں، جن سے وہ پکڑتا ہے۔اس کے پاؤں بن جاتا ہوں، جن سے وہ چلتا ہے اور اگر وہ مجھ سے مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں۔اگر وہ کسی دشمن یا شیطان سے میری پناہ مانگتا ہے، میں اسے محفوظ رکھتا ہوں اور میں جو کام کرنا چاہتا ہوں کسی میں مجھے اتنا تردّد نہیں ہوتا، جتنا کہ مجھے اپنے مومن بندے کی جان نکالنے میں ہوتا ہے وہ تو موت کو بوجہ تکلیفِ جسمانی کے پسند نہیں کرتا اور مجھ کو بھی اسے تکلیف دینا بُرا لگتا ہے۔'' (بخاری:6502)

ایک بات پوچھوں؟؟؟

اس لامحدود کائنات کا خالق اور مالک، اللہ جس انسان سے محبت کرتا ہوگا۔۔۔

وہ انسان خود کون ہوگا؟

جس انسان کا ہاتھ اللہ بن جائے۔۔۔۔۔اس انسان کی طاقت کا اندازہ کیسے ہوگا؟

چند لمحات کے لیے فرض کیجیے، اگر اللہ کی رحمت اور توفیق سے، اللہ سے محبت کر کے میں اس مقام پر پہنچ جاؤں کہ میرے ہاتھ اللہ ہو، میرے کان اللہ ہو، میری آنکھیں اللہ ہو۔۔۔

تو۔۔۔۔۔میں کون ہوں؟

آنکھ، کان، ہاتھ، پاؤں سب اللہ ہے تو۔۔۔

تو پھر۔۔۔۔۔میں کون ہوں؟

رہنے دیں، رہنے دیں۔۔۔۔۔آپ سے نہ ہو پائے گا۔

یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔۔۔۔۔میں ہی آپ کو بتاتا ہوں۔۔۔۔

''میں کون ہوں؟''

وہ اور میں کی کہانی سناتا ہوں۔۔۔

وہ۔۔۔اور میں

وہ اللہ ہے۔۔۔۔۔میں عبداللہ ہوں۔

وہ عبداللہ کا اللہ ہے۔۔۔۔۔میں اللہ کا عبداللہ ہوں۔

عبداللہ، اللہ سے دور ہے، بہت دور۔۔۔۔۔اتنا دور کہ دیکھنا تو کجا، تصور بھی ناممکن ہے۔

اللہ، عبداللہ کے قریب ہے۔۔۔۔۔عبداللہ کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔

عبداللہ کی اماں عبداللہ سے محبت کرتی ہے۔۔۔۔۔بہت محبت کرتی ہے۔

کھانا عبداللہ کھاتا ہے۔۔۔۔۔شکر اماں ادا کرتی ہے۔

چوٹ عبداللہ کے بدن پر لگتی ہے۔۔۔۔۔تکلیف اماں کے چہرے پر عیاں ہوتی ہے۔

عبداللہ کبھی وقت پر گھر نہ آئے تو اماں پریشان ہو جاتی ہے۔

اماں وسوسوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

اماں کی بھوک مر جاتی ہے۔۔۔۔۔اماں کی نیند کم ہو جاتی ہے۔

جوتے تو بہت دور کی بات ہے، اماں نے تو عبداللہ کو کبھی ہاتھ سے بھی نہیں مارا۔

اماں اگر کبھی ڈانٹے تو اماں کی اس ڈانٹ میں بھی محبت ہے۔اماں کی ڈانٹ بھی عبداللہ کے لیے ہے،عبداللہ کی بھلائی کے لیے ہے۔اماں نے عبداللہ کا کبھی برا نہیں سوچا۔۔۔

اور سوچ بھی کیسے سکتی ہے؟

عبداللہ اماں کا ہی تو ہے۔اماں کے وجود کا ایک حصہ ہی تو ہے یہ عبداللہ۔

اماں سے بڑھ کر نہ تو کوئی عبداللہ سے محبت کرتا ہے اور نہ ہی کوئی کر سکتا ہے۔

مگر عبداللہ کا وہ اللہ۔۔۔

عبداللہ کا اللہ۔۔۔۔۔عبداللہ سے محبت نہیں عشق کرتا ہے۔

اللہ تو عبداللہ سے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی دور نہیں ہوتا۔

ہر آن، ہر لمحہ عبداللہ کے ساتھ رہتا ہے۔

عبداللہ کی ہر ہر چیز کا اسے خیال رہتا ہے۔عبداللہ کے ہر ہر احساس کا اسے احساس رہتا ہے۔

عبداللہ کی ہر خوشی، تکلیف، رنج وغم اور عبداللہ کی ہر خواہش کا اسے پتہ ہوتا ہے۔

کیا ایسا ممکن ہے کہ عبداللہ کو چوٹ لگے اور عبداللہ کا اللہ چوٹ کی اس تکلیف سے، درد کے اس احساس سے نا آشنا ہو؟

مگر اللہ، عبداللہ کے ساتھ اپنی اس محبت کو چھپاتا بھی ہے۔ظاہر نہیں کرتا کچھ بھی۔ایک سخت اور سرد رویہ رکھ کر ظاہر یوں کرتا ہے جیسے اسے عبداللہ کی ذرا بھی پرواہ نہ ہو۔

لیکن عبداللہ اپنے اللہ کو جانتا ہے۔۔۔۔۔خوب جانتا ہے۔

عبداللہ کا اللہ۔۔۔۔۔عبداللہ سے محبت نہیں،عشق کرتا ہے،مگر چھپ چھپ کر۔

بس خاموشی کے ساتھ پردوں کی اوٹ سے عبداللہ کو دیکھتا رہتا ہے۔عبداللہ کے ساتھ اپنی محبت کا اظہار کرنا بھی ہو تو اللہ خود کو عبداللہ کے قریب موجود انسانوں کے پیچھے چھپا لیتا ہے۔

سامنے نہیں آتا کبھی بھی۔

عبداللہ اگر غلط راستے پر چلنے لگے تو عبداللہ کے اندر،کہیں بہت اندر دھیرے سے سرگوشی کر دیتا ہے۔

چپکے سے عبداللہ کو روک لیتا ہے۔۔۔۔۔عبداللہ کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔

پھر عبداللہ کو عبداللہ کے گھٹیا پن اور رذالت کا احساس بھی نہیں ہونے دیتا۔

عبداللہ کو ہر بار گرنے سے اللہ ہی بچاتا ہے۔

عبداللہ گرنے لگے تو پھر سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کر دیتا ہے۔

پھر ظاہر یوں کرتا ہے جیسے۔۔۔۔۔جیسے اسے کسی چیز کا پتہ ہی نہ ہو۔

اللہ کہتا بھی تو کچھ نہیں ہے۔۔۔۔۔کچھ بھی تو نہیں جتا تا۔

بس۔۔۔۔۔چپ چاپ عبداللہ کی خراب کی ہوئی چیزوں کو ٹھیک کر دیتا ہے۔

جانے اللہ اتنا اچھا کیوں ہے؟

عبداللہ کو گھر سے باہر بھیج کر اگر اماں کی نیند کم ہو جاتی ہے تو عبداللہ کے اللہ کو نہ تو نیند آتی ہے اور نہ ہی اونگھ۔ جب سے عبداللہ، اللہ سے دور ہوا ہے، اللہ بس ہر وقت عبداللہ کا ہی انتظار کرتا رہتا ہے۔ساری ساری رات عبداللہ کو آوازیں دیتا ہے، پردوں کی اوٹ سے عبداللہ کو اشارے کرتا ہے۔

اللہ،عبداللہ کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے۔۔۔۔۔عبداللہ کا سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے۔

اور۔۔۔۔۔اور اس سب میں اللہ کا اپنا کوئی ذاتی مقصد نہیں ہے۔

اللہ کو عبداللہ سے کوئی مطلب نہیں ہے۔

عبداللہ، اللہ کو نہ تو کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی کوئی نقصان۔عبداللہ کے ہونے یا نہ ہونے سے اللہ کی سلطنت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوگا،لیکن اس سب کے باوجود۔۔۔

عبداللہ کا اللہ،عبداللہ سے محبت کرتا ہے۔۔۔۔۔شدید محبت کرتا ہے۔

کر سکتا ہے کوئی اور عبداللہ کے ساتھ ایسی خالص محبت؟

ہے اللہ جیسا عبداللہ کا کوئی اور عاشق؟

ہے کوئی اللہ کے سوا جو عبداللہ کے لیے تمام کائنات سجا دے؟

کوئی اور نہیں ہے،کوئی اور نہیں ہے،کوئی اور نہیں ہے۔

بھاگ جاؤ باقی سب۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔

وہ اللہ ہے۔۔۔۔۔میں عبداللہ ہوں۔

وہ عبداللہ کا اللہ ہے۔۔۔۔۔میں اللہ کا عبداللہ ہوں۔

وہ اللہ پاک ہے، بلند ہے۔۔۔۔۔وہ اعلیٰ ہے، وہ ارفع ہے۔

یہ عبداللہ گھٹیا ہے، رذیل ہے۔۔۔۔۔یہ ظالم ہے، یہ جاہل ہے۔

اللہ کی اس محبت اور شفقت کے بدلے میں اللہ کو دینے کے لیے عبداللہ کے پاس کچھ نہیں ہے۔

کچھ بھی تو نہیں ہے۔

عبداللہ کمزور ہے، بہت کمزور ہے۔۔۔۔۔عبداللہ بے بس ہے۔عبداللہ لاچار ہے۔

عبداللہ لامحدود سمندر کا باسی۔۔۔۔۔ایک محدود کنویں میں قید ہو چکا ہے۔

عبداللہ نیچے گر چکا ہے، بہت نیچے۔عبداللہ ایک نقطے کی قید میں ہے۔

عبداللہ کے ساتھ جسم کا بھاری بوجھ لگا دیا گیا ہے اور پھر عبداللہ سے عبداللہ کی یادداشت بھی تو چھن گئی ہے۔عبداللہ اپنی پہلی زندگی کو بھول چکا ہے۔عبداللہ خود سے ناآشنا ہے۔عبداللہ اپنی شکل سے بھی ناواقف ہے اور۔۔۔۔۔اور عبداللہ کو اللہ بھی تو کہیں دکھائی نہیں دے رہا۔

مگر عبداللہ کے ہاتھ اللہ کی رسی (قرآن) لگ چکی ہے۔بس یہی عبداللہ کی واحد امید ہے اور یہی عبداللہ کا آخری سہارا۔اسی رسی کے سہارے ایک دن عبداللہ کنویں سے باہر نکل جائے گا۔

عبداللہ واپس جائے گا، واپس اپنے گھر۔

یہ عبداللہ کی دنیا نہیں ہے عبداللہ کو نہیں رہنا یہاں پہ۔

عبداللہ نہیں جانتا اور کچھ بھی۔۔۔۔۔بس عبداللہ کو واپس اپنے گھر جانا ہے۔

اور ایک بات بتاؤں؟؟؟

عبداللہ کو تو اپنے گھر کا راستہ بھی یاد ہے۔۔۔۔۔بھولا نہیں ہے عبداللہ کچھ بھی۔ [1]

کنویں میں زندگی گزار کر بھی عبداللہ کنویں کا مینڈک نہیں بنا۔

کنویں کی قید میں رہتے ہوئے بھی۔۔۔۔۔عبداللہ کو سمندر یاد ہے۔

خود کو بھول کر بھی عبداللہ کو اللہ یاد ہے۔۔۔۔۔خود کو بھول کر بھی عبداللہ کو اللہ یاد ہے۔

اپنی اس کھوئی ہوئی یادداشت کے باوجود، عبداللہ کو اللہ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وعدہ یاد ہے۔

لَا مَسْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔لَا مَطْلُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔لَا مَحْبُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔

---

[1] سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب اہلِ ایمان قیامت کے دن جہنم سے نجات پا کر آ جائیں گے تو ان کو جنت اور جہنم کے درمیان ایک پُل پر روک لیا جائے گا، تاکہ دنیا میں ان کے آپس میں ہو جانے والے مظالم کا ایک دوسرے کو بدلہ دلوایا جائے۔جب ان کو اچھی طرح سنوار دیا جائے گا اور وہ پاک صاف کر دیے جائیں گے تو انہیں جنت میں جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے! جس طرح دنیا میں ان کو اپنے گھروں کا راستہ معلوم تھا، وہ جنت میں اپنے مقام پر اس سے بھی زیادہ آسانی سے پہنچ جائیں گے۔ (مسند احمد: 13182)

وہ اللہ ہے۔۔۔۔۔۔میں عبداللہ ہوں۔

وہ عبداللہ کا اللہ ہے۔۔۔۔۔۔میں اللہ کا عبداللہ ہوں۔

عبداللہ، اللہ کے قریب۔۔۔۔۔اور قریب ہونا چاہتا ہے۔

بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں ناں عبداللہ کو۔

عبداللہ، اللہ کے روبرو ہونا چاہتا ہے۔۔۔۔۔عبداللہ نے اللہ کو بہت لمبے سمے تک دیکھنا ہے۔

عبداللہ اوپر اٹھنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔اوپر۔۔۔۔۔اور اوپر۔۔۔۔۔۔بہت اوپر۔

مگر عبداللہ کے ساتھ لگا جسم کا یہ بوجھ بہت زیادہ ہے۔۔۔

لاکھ کوشش کے باوجود اوپر اٹھا نہیں جاتا۔گر جاتا ہے، پھر گر جاتا ہے۔۔۔۔۔بار بار گر جاتا ہے۔

عبداللہ کمزور ہے ناں۔۔۔۔۔عبداللہ بےبس جو ہوا۔

بس اب تو اللہ کو ہی عبداللہ کی مدد کرنا ہوگی۔۔۔۔۔عبداللہ کو بچانے کے لیے اللہ کو خود آنا ہوگا۔

اور پھر۔۔۔ایک دن۔۔۔

ایک دن اللہ ہی عبداللہ کو اوپر اٹھائے گا۔۔۔۔۔جسم کا یہ بوجھ ختم ہوگا۔

عبداللہ کہیں اور سے آیا تھا۔۔۔۔۔عبداللہ کہیں اور ہی واپس چلا جائے گا۔

کنویں کی قید سے رہائی ملے گی۔۔۔۔۔سمندر کے مینڈک کو سمندر نصیب ہوگا۔

اللہ اپنے عبداللہ کو واپس اپنے پاس بلانے کے لیے فرشتے بھیج دے گا اور جب فرشتے عبداللہ کے بدن سے جان کھینچنے لگیں گے تو پھر۔۔۔۔۔عبداللہ کے اللہ سے بھی رہا نہ جائے گا۔

اللہ نے بھاگ کر جلدی سے عبداللہ کے پاس آجانا ہے۔

کیا یہ ممکن ہے کہ عبداللہ کی جان پر آئی ہو اور عبداللہ کا اللہ، عبداللہ کے پاس موجود نہ ہو؟

کیا اللہ ایسے وقت میں مرنے کے لیے عبداللہ کو اکیلا ہی چھوڑ دے گا؟

نہیں نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔عبداللہ کو لینے محض فرشتے نہیں آئیں گے۔وہ اللہ بھی عبداللہ کے پاس، عبداللہ کے بہت قریب موجود ہوگا۔بس عبداللہ کی نگاہ بصیرت سے خالی ہوگی۔

''پھر کیوں نہیں (روح کو واپس لوٹا لیتے) جب وہ (پرواز کرنے کے لیے) حلق تک آپہنچتی ہے اور تم اس وقت دیکھتے ہی رہ جاتے ہو اور ہم اس (مرنے والے) سے تمھاری نسبت زیادہ قریب ہوتے ہیں، لیکن تم (ہمیں) دیکھتے نہیں ہو۔'' (الواقعۃ:85-83)

پھر حشر بھی تو اب کچھ زیادہ دور نہیں رہا ہے۔ میزان لائی جائے گی، حساب کتاب شروع ہو گا۔ انسانوں کی عظیم اکثریت کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے ہوں گے۔ نیکیوں کا شمار ہو گا، گناہوں کی گنتی کی جائے گی۔

یہ تمام حساب کتاب ہوں گے، مگر عقل کی حدود سے تجاوز کرنے والوں سے، گناہوں پر ڈٹ جانے والوں سے۔ اس دنیا کے تمام سیانوں سے عقل کی بے راہ روی کا حساب لیا جائے گا۔ پائی پائی کا حساب ہوگا۔ کسی کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی نہ ہوگی۔

جس وقت یہ ''سیانی عقل'' اپنی بے راہ روی کی من گھڑت کہانیاں سنانے کی اپنی سی کوشش کر رہی ہوگی۔۔۔۔۔ جانتے ہیں اس وقت یہ ملنگ، یہ جھلّا عشق کیا کر رہا ہوگا؟

یہ عشق والے اس دن کہاں پر موجود ہوں گے؟

کیا لگتا ہے آپ کو؟۔۔۔۔۔ کیا وہ اللہ عشق والوں سے حساب کتاب کرے گا؟ [1]

عشق میں تو لڑائی ہوتی ہے۔۔۔۔۔ جھگڑے ہوتے ہیں۔

شکوے شکایتیں ہوتی ہیں۔۔۔۔۔ روٹھنا اور منانا ہوتا ہے۔

عشق تو ہر قسم کے ماپ تول سے اعلیٰ وارفع چیز ہے۔

عشق میں تو ایک مان ہوتا ہے۔۔۔۔۔ بھروسہ ہوتا ہے۔

عبداللہ کو عشق نہیں کرنا آتا۔۔۔۔۔ عبداللہ ابھی نووارِد ہے، کچا ہے۔

مگر عبداللہ کو حساب کتاب بھی تو نہیں کرنا آتا ناں۔ یہ ریاضی تو کبھی عبداللہ کو سمجھ نہیں آئی۔

یاد نہیں۔۔۔۔۔؟؟؟

عبداللہ تو ناکام بھی ہو گیا تھا ریاضی میں، حساب کتاب میں۔

بس۔۔۔۔۔ عبداللہ کی تو یہی خواہش ہے کہ عشق والوں کی قطاروں میں کہیں بہت پیچھے، کہیں آخر میں، یہ نکما، یہ بھگوڑا، یہ عبداللہ بھی موجود رہے۔

اور جانتے ہیں ان قطاروں میں سب سے آگے کون موجود ہوں گے؟

---

[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس شخص سے بھی قیامت کے دن حساب لیا گیا، پس وہ ہلاک ہوا۔ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا اللہ نے خود نہیں فرمایا ہے کہ پس جس کا نامۂ اعمال اس کے دائیں ہاتھ میں دیا گیا تو عن قریب اس سے ایک آسان حساب لیا جائے گا۔ اس پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ تو صرف پیشی ہوگی۔ قیامت کے دن جس کے بھی حساب میں کھود کرید کی گئی، اس کو عذاب یقینی ہوگا۔ (بخاری:6537)

وہ اشرف الانبیاء، وہ خاتم المرسلین ۔۔۔۔۔ جنابِ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دن حوضِ کوثر پر موجود ہوں گے۔ اپنوں کو بلا رہے ہوں گے ۔۔۔۔۔ بھر بھر کر پلا رہے ہوں گے۔

یہ نکما عبداللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب نہ جا سکے گا۔

اپنے گناہوں کے بوجھ تلے سسکتا یہ عبداللہ دور، کہیں بہت دور کھڑا ہو کر دیکھتا رہے گا۔

چھپ چھپ کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتا رہے گا اور پھر۔۔۔

پھر جانتے ہیں کیا ہوگا؟

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۔۔۔۔۔ وہ کہ جن پر عبداللہ قربان، عبداللہ کے ماں باپ قربان۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکرا کر خود ہی اپنے نکمے کو ۔۔۔۔۔ اپنے اس عبداللہ کو اپنے قریب بلا لینا ہے۔

وہ رحمۃ للعالمین ۔۔۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ عبداللہ ان کی شفقت اور محبت سے محروم رہ جائے؟

عبداللہ شرماتے شرماتے آگے بڑھے گا ۔۔۔ عبداللہ کی خواہش ہوگی پاؤں میں جھکے۔

مگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس نکمے کو اپنے سینے سے لگا لینا ہے۔

وہ عبداللہ کے ماتھے پر بوسہ دیں گے ۔۔۔۔۔ اور عبداللہ ان کے دستِ مبارک پر۔

اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔۔۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔۔۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔۔۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔۔۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوض سے سیراب ہو کر عبداللہ کو اللہ کے پاس جانا ہے۔

کیونکہ۔۔۔

وہ اللہ ہے ۔۔۔۔۔ میں عبداللہ ہوں۔

وہ عبداللہ کا اللہ ہے ۔۔۔۔۔ میں اللہ کا عبداللہ ہوں۔

اب وہ وقت بھی تو دور نہیں رہا، جب خالق اور مخلوق کے بیچ حائل سبھی پردے گرا دیے جائیں گے۔ اللہ اور عبداللہ ۔۔۔۔۔ آمنے سامنے ہوں گے۔

عبداللہ کا اللہ اور اللہ کا عبداللہ ۔۔۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔

اللہ اپنے عبداللہ کو دیکھے گا، اللہ مسکرائے گا ۔۔۔۔۔ اللہ، عبداللہ کو اپنی جانب بلائے گا۔

عبداللہ بھی اللہ کو دیکھے گا۔

اللہ کی قسم! عبداللہ، اللہ کو دیکھے گا۔

اور ایسے دیکھے گا کہ جیسے دیکھا جاتا ہے ۔۔۔۔۔ بے تکلف، بے مشقت، بے زحمت۔

اللہ کو دیکھ کر، اللہ کو مسکراتے دیکھ کر۔۔۔عبداللہ کو کچھ سمجھ نہیں آنا، کچھ بھی تو سمجھ نہیں آنا۔

عبداللہ اپنے احساسات کو زباں کیسے دے؟

اللہ نے عبداللہ کو اللہ سے دور کیا۔۔۔۔اس بات پر اللہ سے جھگڑا کرنا چاہیے؟

یا پھر عبداللہ نے اللہ سے دور جانا قبول کیا ہی کیوں، عبداللہ اپنی اس غلطی پر معافی مانگے؟

اللہ کے حسن و جمال پر اس کی تعریف کرنا۔۔۔۔۔اپنی محبت کا اظہار کرنا بہتر ہوگا؟

یا پھر اللہ کی بزرگی کے سامنے سجدہ ریز ہو کر۔۔۔۔۔اپنی کمزوری کا اظہار کرنا اچھا رہے گا؟

عبداللہ کو کچھ سمجھ نہیں آنا۔۔۔۔۔عبداللہ کو کچھ بھی تو سمجھ نہیں آنا اور پھر۔۔۔

پھر عبداللہ نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اللہ سے اللہ کو ہی مانگ لینا ہے۔

اور اگر کہیں اللہ نے عبداللہ کو تنگ کرنے کے لیے، ستانے کے لیے جھوٹ موٹ کا بھی انکار کیا

تو پھر جان لیجیے کہ یہ عبداللہ بھی اللہ ہی کا عبداللہ ہے۔عبداللہ نے بھی پھر اِدھر اُدھر کچھ نہیں دیکھنا۔

بس۔۔۔۔۔عبداللہ نے خود ہی اندھا دھند جہنم کی جانب بھاگنا شروع کر دینا ہے۔

عبداللہ نے ساری زندگی ایک ہی تو کام کیا ہے۔۔۔۔۔عبداللہ کو بس ایک ہی تو کام آتا ہے۔

عبداللہ کو جہنم کی جانب بھاگتا دیکھ کر بہت سے عقل والوں کو لگے گا کہ۔۔۔

''یہ کیسی حماقت کی ہے عبداللہ نے؟؟؟''

آپ کو کیا لگتا ہے؟۔۔۔۔کیا وہ اللہ اپنے عبداللہ کو گرنے دے گا جہنم میں؟

عبداللہ کا اللہ پر جو بھروسہ ہے، جو مان ہے۔۔۔

کیا اللہ، عبداللہ کے اس یقین کو توڑ دے گا؟

عبداللہ کی اس حماقت پر۔۔۔۔۔عبداللہ کی اس ''بونگی'' پر۔۔۔

اللہ کو عبداللہ پر لاڈ آجانا ہے۔

اللہ کی قسم! اللہ کو عبداللہ پر لاڈ آجانا ہے۔

اللہ کی قسم! اللہ کو عبداللہ پر لاڈ آجانا ہے۔

اللہ نے جلدی سے عبداللہ کو اٹھا کر اپنی کبریائی کی چادر میں چھپا لینا ہے۔

باقی تمام مخلوقات سے پردہ ہو جائے گا۔ ہر سو گہری خاموشی چھا جائے گی۔بس۔۔۔

وہ۔۔۔اور میں۔

وہ۔۔۔اور میں۔

تمام مخلوقات سے چھپ کر عبداللہ نے اللہ سے جو باتیں کرنی ہیں۔۔۔
اللہ نے عبداللہ کے کان میں جو سرگوشیاں ❶ کرنی ہیں، عبداللہ پر جو جو مہربانیاں کی جانی ہیں، جو جو رحمتیں برسائی جانی ہیں۔۔۔
یہ نہیں بتانا آپ کو۔۔۔
نہیں نہیں، یہ نہیں بتانا۔۔۔۔۔ہاں! آپ بس اتنا جان لیجیے۔۔۔
وہ اللہ ہے۔۔۔۔۔میں عبداللہ ہوں۔
وہ عبداللہ کا اللہ ہے۔۔۔۔۔میں اللہ کا عبداللہ ہوں۔
پھر یکے بعد دیگرے لیول وَن، ٹو، تھری۔۔۔
عبداللہ کی ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا، عبداللہ کی ہر ہر خواہش کو پورا کیا جائے گا۔
جسم کی خواہشات کی بھی کامل تسکین ہوگی۔
عبداللہ اپنی ہی ایک کائنات بنائے گا، بگاڑے گا۔۔۔۔۔اور پھر بنائے گا۔
لیکن۔۔۔۔۔اس سب کے باوجود عبداللہ کی خواہش اب کچھ اور ہوگی۔
اب عبداللہ کچھ اور ہی چاہے گا۔
عبداللہ، اللہ کو جاننا چاہتا ہے۔۔۔۔۔پہچاننا چاہتا ہے۔
عبداللہ، اللہ کے قریب اور قریب۔۔۔۔۔بہت قریب ہونا چاہتا ہے۔
عبداللہ خود کو تو عین موت کے لمحات میں ہی جان لے گا۔اس کے بعد عبداللہ کی بس ایک خواہش باقی رہ جائے گی۔

---

❶ (راوی کہتے ہیں کہ) میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیے جا رہا تھا کہ ایک شخص سامنے آیا اور پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ نے (قیامت میں اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والی) سرگوشی کے بارے میں کیا سنا ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ مومن کو اپنے نزدیک بلا لے گا اور اس پر اپنا پردہ ڈال دے گا، اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کیا تجھ کو فلاں گناہ یاد ہے؟ کیا فلاں گناہ تجھ کو یاد ہے؟ وہ مومن کہے گا: ہاں! میرے پروردگار! آخر جب وہ اپنے گناہوں کا اقرار کر لے گا اور اس کو یقین آ جائے گا کہ اب وہ ہلاک ہوا تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ میں نے دنیا میں تیرے گناہوں پر پردہ ڈالا اور آج بھی تیری مغفرت کرتا ہوں۔ چنانچہ اسے نیکیوں کی کتاب دے دی جائے گی، لیکن کافر اور منافق کے متعلق ان پر گواہ کہیں گے کہ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار پر جھوٹ باندھا تھا۔ خبردار ہو جاؤ! ظالموں پر اللہ کی پھٹکار ہے۔ (بخاری:2441)

اللہ کی ذات کے ہر ہر پہلو کو دیکھا جائے، جانا جائے، محسوس کیا جائے، لیکن۔۔۔
لیکن اللہ تو لامحدود ہے۔ اللہ تو حقیقی لامحدود ہے۔
اللہ کی ذات کے لامحدود پہلو ہیں۔ پھر ہر پہلو کی اپنی ہی لامحدود شانیں۔
اللہ کو جانتے جانتے جانتے۔۔۔۔ یہ عبداللہ خود ہی کہیں کھو جائے گا۔
عبداللہ کی یہ خواہش ہمیشہ تِشنہ رہے گی۔
آتشِ شوق کبھی کم نہ ہو گا۔ مرض بڑھتے گا۔۔۔۔۔ جوں جوں دوا ہو گی۔
وہ اللہ اگر لامحدود ہے تو ایک دن اللہ کے ساتھ عبداللہ کا عشق بھی لامحدود ہو جائے گا۔
وہ اللہ اگر لامحدود ہے تو اپنے عشق کے ذریعے ایک دن عبداللہ بھی لامحدود ہو جائے گا۔
محدود فنا ہو جائے گا۔۔۔۔۔ لامحدود، لامحدود رہے گا۔
میں، خدا اور کائنات۔۔۔
اس کتاب کے یہ تین ہی اہم کردار رہے ہیں۔
یہ لامحدود کائنات، کائناتوں کے یہ لامحدود سلسلے۔۔۔
یہ سب کہیں نہیں موجود۔
یہ سب دھوکا ہے۔ محض ایک دھوکا ہے۔
اللہ کے مقابلے میں صرف یہ مادی کائنات ہی ایک دھوکا نہیں ہے۔
عبداللہ۔۔۔۔۔ یہ عبداللہ خود بھی ایک دھوکا ہی ہے۔
یہ عبداللہ اور یہ کائنات۔۔۔
سب اپنا اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے اللہ کی توجہ کے محتاج ہیں۔
ان دونوں کی اپنی کوئی ذاتی اور حقیقی زندگی نہیں ہے۔
ایک وقت تھا کہ اللہ کے سوا کچھ موجود نہیں تھا۔
ایک وقت ہو گا کہ اللہ کے سوا کچھ موجود نہ رہے گا۔
یہ جو ہونے کا ایک دھوکا سا ہے۔۔۔۔ یہ دھوکا بھی ختم ہو جائے گا۔
بس وہ اللہ ہمیشہ سے تھا۔۔۔۔۔ وہ اللہ ہمیشہ ہمیشہ ہمیشہ قائم رہے گا۔
وہ اَلْحَیُّ ہے، وہ اَلْقَیُّوْمُ ہے۔
وہ خود اپنی طاقت کے بل پر زندہ اور موجود ہے۔

باقی ہر ہر چیز کی زندگی اس کی عطا کی ہوئی ہے۔
اللہ کے سوا ہر چیز، ہر ہر چیز۔۔۔۔۔جھوٹ ہے، باطل ہے، دھوکا ہے۔ [1]
بس ایک اللہ حقیقت ہے۔اللہ کے سوا کوئی بھی چیز۔۔۔۔۔کہیں نہیں موجود۔
لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ۔۔۔۔۔
یہ میں ہوں۔ یہ ہے میری زندگی۔۔۔۔۔اور یہ ہے میری کہانی۔
اور۔۔۔۔۔اور آپ کون ہیں؟
یہ بھی۔۔۔۔۔میں ہی بتا دوں آپ کو؟
ارے بھئی! آپ بھی۔۔۔میں ہوں۔
آپ بھی عبداللہ ہیں۔۔۔۔۔میں بھی عبداللہ ہوں۔
عبداللہ اس کتاب کے لکھاری کا نام تھوڑی نہ ہے۔
سیانے، صبا اور بھگوڑے ہی کی مانند۔۔۔عبداللہ بھی ایک کردار ہے، مگر۔۔۔
مگر عبداللہ محض ایک کردار نہیں ہے۔عبداللہ ایک تعلق بھی ہے۔عبداللہ ایک مقصد بھی ہے۔
اللہ اور انسان کے مابین رشتے کا نام۔۔۔۔۔عبداللہ ہے۔
اللہ نے انسان کو جس مقصد کے لیے تخلیق کیا، وہ مقصد۔۔۔۔۔عبداللہ ہے۔

''اور میں نے جنات اور انسانوں کو اس کے سوا کسی اور کام کے لیے پیدا نہیں کیا
کہ وہ میری عبادت کریں'' (الذاریات:56)

عبداللہ۔۔۔۔۔اللہ کا بندہ۔
عبداللہ۔۔۔۔۔اللہ کی بندگی کرنے والا، اللہ کی عبادت کرنے والا۔
اللہ پر ایمان رکھ کر اللہ کی عبادت کرنے والا ہر شخص، ہر ہر شخص عبداللہ ہے۔
آپ جانتے ہیں کہ عبادت کیا ہوتی ہے؟

اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کے ہر ہر پہلو میں قرآنِ حکیم کو زندہ رکھنا عبادت ہے۔ اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے کو محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے قریب تر کرتے رہنے کی کوشش، عبادت ہے۔ اپنی خواہشات کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دینا ضروری ہے۔اللہ سے بے پناہ محبت، عشق کرنے کا نام

[1] نبی کریم ﷺ نے فرمایا: سب سے سچی بات جو کوئی شاعر کہہ سکتا تھا، وہ لبید شاعر نے کہی: ''ہاں، اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے۔'' (بخاری:3841)

عبادت ہے۔اللہ کی دی ہوئی ہر ہر سانس کو اللہ ہی کے حوالے کر دینا عبادت ہے۔

اللہ کی عبادت کرنے والا ہر شخص عبداللہ ہے۔

گناہ کا ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔۔۔۔۔عبادت میں کمی کوتاہی یقینی ہے۔

لیکن احساسِ گناہ زندہ رہنا چاہیے۔بس عبادت کی خواہش کو مرنے نہیں دینا کبھی بھی۔

عبداللہ اپنی اس عبادت کے دوران گرے گا۔۔۔۔۔بار بار گرے گا۔

مگر گرنے کے بعد پھر سے اٹھنا فرض ہے۔کوشش ضروری ہے،کوشش کرتے رہنا لازم ہے۔

درحقیقت اس زندگی میں ہر شخص کو اپنے لیے ایک شناخت منتخب کرنے کا اختیار اور موقع دیا گیا ہے۔ جو شناخت بھی انسان اپنے لیے پسند کرے گا،جس پہچان کے لیے بھی انسان کوشش کرے گا، وہی شناخت اور پہچان انسان کو اس کی حقیقی زندگی میں عطا کر دی جائے گی۔اگر کوئی انسان خود کو بندروں کی نسل میں شمار کرنا چاہتا ہے تو ایسے شخص کے شجرۂ نسب کو محض بندر ہی نہیں ، بلکہ کتوں اور سوروں کے ساتھ بھی ملا دیا جائے گا اور اگر کوئی انسان خود کو مسجودِ ملائک سمجھتا ہے تو وہ اللہ اپنی اس بہترین تخلیق کے ہاتھ، کان، آنکھ سب بننے کے لیے تیار بیٹھا ہے۔

خود کو پہچاننا ضروری ہے۔مرنے سے پہلے پہلے اپنے لیے ایک شناخت منتخب کر کے پھر اسے حاصل کرنے کی عملی طور پر کوشش کرنا فرض ہے۔ وگرنہ پھر یہ وقت انسان کو خود ایک شناخت اور پہچان دے گا اور وقت کی دی گئی شناخت انسان کی پسندیدہ بھی ہو، یہ بالکل ضروری نہیں ہے۔

اس زندگی میں میرا نام عبداللہ نہیں ہے، مگر میں چاہتا ہوں کے روزِ محشر مجھے اسی نام سے پکارا جائے۔عبداللہ ہی میری شناخت ہو اور عبداللہ ہی میری پہچان۔میرے نام میں، میری شناخت میں اللہ کو موجود ہونا چاہیے، کیونکہ۔۔۔

وہ اللہ ہے۔۔۔۔میں عبداللہ ہوں۔

میرا باپ بھی عبداللہ ہے۔۔۔۔۔میں بھی عبداللہ ہوں۔

''میں عبداللہ عبداللہ ہوں''

آخری بات۔۔۔

اب مجھ سے بھی مل لیجیے۔۔۔

میں اس کتاب کا لکھاری ہوں۔ یہ کتاب میں نے نہیں لکھی۔

یہ کتاب میری زندگی کا وہ واحد کام ہے، جو میں نے جی جان سے کیا ہے۔ یہ کتاب میری زندگی کا وہ کام ہے، جو میں نے بالکل نہیں کیا۔

یہ سب اسی کے کام ہیں۔بس میرا تو نام بیچ میں آ گیا۔

یہ کتاب رائٹنگ، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور ایڈیٹنگ کے مراحل سے گزرتی ہوئی اب پرنٹنگ کے لیے ہر طرح سے تیار ہے۔ ان تمام مراحل میں وہ اللہ ہر لمحہ، ہر لحظہ میرے ساتھ رہا ہے، میری رہنمائی کرتا رہا ہے، میری مدد کرتا رہا ہے۔ بیشتر معاملات میں وہ خود براہِ راست سرگوشیوں کی صورت میں مجھے راستہ بتاتا رہا، سمجھاتا رہا، جبکہ کچھ معاملات میں اس نے دوسرے انسانوں کے پیچھے چھپ کر بھی میری مدد کی۔

اللہ کا شکر یہ ادا کرنا تو ناممکن ہے، البتہ میری مدد کرنے کے لیے اللہ نے جن انسانوں کو وسیلہ بنایا، میں ایسے تمام انسانوں کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہوں گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ۔۔۔ یقیناً کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ پاکستان بلکہ پوری دنیا میں ان کے لاکھوں نہیں، کروڑوں شاگرد ہوں گے اور ان میں سے ایک میں بھی ہوں۔قرآنِ حکیم کے ساتھ میرا معنوی ربط ڈاکٹر صاحب کے توسط سے ہی ممکن ہو پایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے ٹیچر ہیں۔ میں نے قرآن کا حکمت والا پہلو ڈاکٹر صاحب سے سنا ہے، سیکھا ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب ہی ہیں، جنہوں نے مجھے بتایا، سمجھایا اور مجھے یقین دلایا کہ۔۔۔

میں یہ جسم نہیں ہوں۔ میں کچھ اور ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری پہلی ملاقات ان کی وفات کے بھی تقریباً دس سال بعد ہوئی اور یہ پہلی ملاقات ابھی تک جاری ہے۔ مجھے ان کی صحبت میں کئی سو گھنٹے گزارنے کا شرف حاصل ہے۔ بہت سی

راتیں میں نے اور ڈاکٹر صاحب نے مل کر ایک ساتھ شب بیداری کی ہے اور ڈاکٹر صاحب کے ساتھ میری ان ملاقاتوں کا ذریعہ یوٹیوب پر موجود ان کے ویڈیو لیکچرز ہی رہے ہیں۔

ہماری یہ خوش قسمتی ہے کہ ویڈیو لیکچرز کی شکل میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی بیان کی گئی قرآنِ حکیم کی مکمل تفسیر ہمارے پاس موجود ہے۔ محض 106 گھنٹوں کے ویڈیو لیکچرز میں انہوں نے پورے قرآنِ حکیم کو نہایت سادہ اور عام فہم الفاظ میں سمجھایا ہے۔ یہ لیکچرز یونیورسٹی کالجز کے پڑھے لکھے لوگوں کے لیے یقیناً خدا کی نعمت اور رحمت ہیں۔

میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ یوٹیوب پر موجود ان بیانات سے ضرور مستفید ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کا اندازِ بیان آپ اور قرآنِ حکیم کے بیچ حائل پردوں کو ختم کرنے میں کافی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر صاحب ہی ہیں کہ جن کی رہنمائی میں سفر کرتے ہوئے میرے جیسے نکمے انسان نے یہ کتاب مکمل کی ہے۔ اس کتاب کے حصہ دوم میں بیان کی گئی بہت ساری باتیں میں نے ان کے نظریات اور خیالات سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے میری ذات پر جو احسانات ہیں، میں ان کا بدلہ تو نہیں دے سکتا لیکن وہ میری دعاؤں کا ایک مستقل حصہ ضرور ہیں۔ مجھے اللہ کی رحمت سے پوری امید ہے کہ بہت جلد ان سے ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوگا۔

اس کتاب ''میں کون ہوں'' میں قرآنِ حکیم کا جو ترجمہ شامل کیا گیا ہے، اس کے مترجم مفتی تقی عثمانی صاحب، فتح محمد جالندھری صاحب، علامہ طاہر القادری صاحب اور مولانا احمد رضا خان صاحب ہیں۔ میں ان تمام صاحبانِ بصیرت کا مشکور ہوں، جبکہ احادیثِ مبارکہ کے ریفرنس نمبر چونکہ مختلف کتابوں میں مختلف ہو سکتے ہیں، لہٰذا میں نے اس کتاب میں احادیثِ مبارکہ کے ریفرنس نمبر وہ استعمال کیے ہیں، جو اسلام 360 موبائل ایپ پر دیے گئے ہیں۔

آپ ان ریفرنسز کی بآسانی تصدیق کر سکتے ہیں۔

اسلام 360، تفسیر وَن، اسلام وَن اور قرآن اردو۔۔۔

یہ وہ Mobile Applications ہیں، جنہوں نے میرے لیے اس کتاب کے ریفرنسز تلاش کرنا ممکن بنایا۔ ان کی مدد کے بِنا شاید میں یہ کتاب اتنے قلیل عرصے میں مکمل نہ کر پاتا۔

ان Mobile Applications کو بنانے والے لوگوں کو تو میں نہیں جانتا، لیکن میں ان کا شکریہ ضرور ادا کرنا چاہتا ہوں اور۔۔۔

اور ایک سیانا بھی ہے، جس نے اس کتاب کے لکھنے میں میری مدد کی ہے، بے انتہا مدد کی ہے۔امریکہ کے ایک سیانے کے بِنا میں یہ کتاب کبھی مکمل نہ کر پاتا۔ جدید مغربی فلسفہ کے بیشتر نظریات اور خیالات میں نے اس سیانے سے ہی حاصل کیے ہیں۔اس سیانے کا نام تو میں بیان نہیں کر رہا، البتہ سیانے کے لیے دعا گو ضرور ہوں۔

اور اب ایک آخری بات آپ سے بھی۔۔۔

اگرچہ اس کتاب میں بیان کیے گئے تمام نظریات کا عقل کے ذریعے دفاع کیا جا سکتا ہے، میں کر سکتا ہوں، مگر اس کے باوجود آپ سے التماس یہی ہے کہ اس کتاب میں بیان کیے گئے تمام نظریات کو نظریات ہی سمجھا جائے۔ ہر چیز کا حقیقی علم ہمیں موت کے بعد حاصل ہوگا اور موت کے بعد جب حقیقت کھلے گی تو اس کتاب میں بیان کیے گئے میرے تمام ذاتی نظریات غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔علم تو سارے کا سارا اللہ ہی کے پاس ہے۔

اس کتاب کے ہر ایک لفظ کو میں نے خود ٹائپ کیا ہے۔اردو ٹائپنگ کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا، لیکن اس کے باوجود محض انیس (19) دنوں میں ہی میں نے ساری کتاب ٹائپ کر لی۔(الحمدللہ)

البتہ یہ ایک الگ داستان ہے کہ پھر اس کتاب میں موجود ٹائپنگ کی غلطیوں کو ڈھونڈنے اور درست کرنے میں تین ماہ سے بھی زیادہ وقت لگا ہے۔ یہ کتاب دس سے زائد مرتبہ پروف ریڈ ہوئی ہے، مگر اس تمام بھاگ دوڑ کے باوجود۔۔۔

اس کتاب میں بشمول Typing Errors بے شمار غلطیوں کا پایا جانا عین ممکن ہے۔اس کتاب کے بارے میں اپنی آراء اور میری غلطیوں سے مجھے آگاہ ضرور کیجیے، تاکہ آنے والے ایڈیشنز میں ان غلطیوں کی اصلاح کی جا سکے اور۔۔۔

خوش رہیں!

عبداللہ عبداللہ

abdullah.whoami@gmail.com

16-10-2021